شرح پیامِ مشرق

در جوابِ دیوانِ شاعرِ المانوی گوئٹے

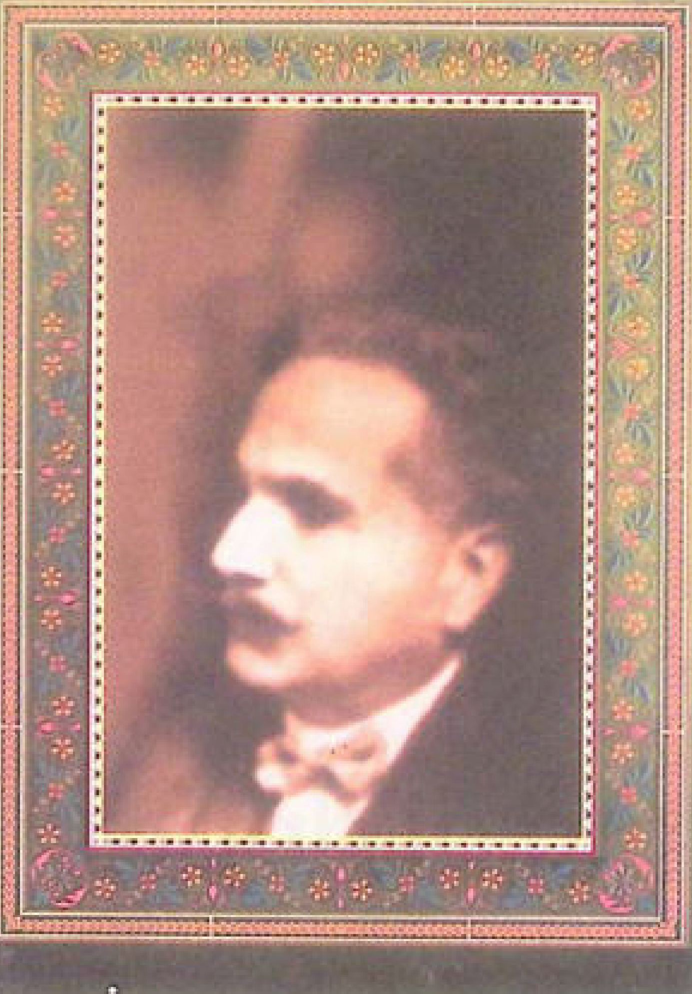

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

شرح پیام مشرق

مؤلّفہ

☆

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مکتبہ
تعمیر انسانیت
اردو بازار ○ لاہور

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مکتبہ تعمیر انسانیت سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

......

ISBN: 978-969-8980-69-6

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ناشر : محمد سعید اللہ صدیق
مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور
مطبع : عرفان افضل پرنٹرز لاہور
طبع : اوّل
قیمت : ۹۰۰ روپے

مقدمہ

پیام مشرق کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نسخوں کی مجموعی تعداد ۹ ہزار ہے۔ یہ تعداد بظاہر بہت حوصلہ شکن اور یاس انگیز ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم فارسی زبان اور علمی ذوق دونوں سے بڑی حد تک بیگانہ ہو چکی ہے اسلئے ان دونوں باتوں کو مدِنظر رکھنے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایں ہم غنیمت است۔ اقبال کے علاوہ کسی دوسرے مصنف (شاعر) کی ایسی مشکل تصنیف شاید ہی دوبارہ شائع ہوتی۔

یہ کتاب بلاشبہ جاوید نامہ کے بعد اقبال کی مشکل ترین تصنیف ہے کیونکہ اس میں انہوں نے وہ حقائق اور معارف بیان کئے ہیں جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے۔

پہلے حصہ میں جس کا نام لالۂ طور ہے رباعیات درج کی ہیں اور ان میں فلسفہ کے ادق مسائل نظم کئے ہیں ان مسائل میں وحدت الوجود کا مسئلہ سب سے زیادہ مشکل ہے اور جب تک اس مسئلہ کے مبادی اور اصول موضوعہ سے واقفیت نہ ہو۔ ان رباعیات کا سمجھنا بہت زیادہ دشوار ہے۔

دوسرے حصہ میں جس کا عنوان افکار ہے۔ اقبال نے خدا، انسان اور کائنات سے متعلق مسائل پر اپنے نتائج افکار، شاعرانہ انداز میں پیش کئے ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو کس زاویہ نظر سے دیکھا اس حصہ میں جیسا کہ قدرتی بات ہے دشوار نظموں کے پہلو میں چند آسان نظمیں پائی جاتی ہیں لیکن علمی نکات ان میں بھی موجود ہیں۔

تیسرا حصہ جس کا عنوان مئے باقی ہے، غزلیات پر مشتمل ہے اور اسی لیے یہ اس کتاب کا سب سے زیادہ دلکش حصہ ہے اور میرا قیاس یہ ہے کہ اگر یہ حصہ اس

کتاب میں شامل نہ ہوتا، تو شاید یہ کتاب اب تک دو یا تین مرتبہ سے زیادہ شائع نہ ہوتی۔

ان غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان اور اندازِ بیان میں حافظ اور نظیری کا رنگ جھلکتا ہے اور ان کے مضامین میں بیدل اور غالب کی سی بلندی نظر آتی ہے۔ لیکن شاعر کی انفرادیت ہر غزل سے نمایاں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال نے غزلوں میں بھی جا بجا اپنے مخصوص فلسفۂ حیات کی تبلیغ کی ہے۔

چوتھے حصہ میں، جسے انہوں نے نقشِ فرنگ سے تعبیر کیا ہے، حکمائے مغرب کے افکار پر تنقید کی ہے۔ اور یہ اس کتاب کا سب سے زیادہ مشکل حصہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک پڑھنے والا ان حکماء کے افکار (فلسفہ) سے آگاہ نہ ہو، تنقید سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

پانچویں حصہ میں جس کا عنوان خردہ ہے، انہوں نے چند قطعات اور چند متفرق اشعار (ابیات) درج کئے ہیں۔ اس حصہ کی خصوصیت یہ ہے کہ حکیمانہ نکات کو ظریفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ اس کتاب کا آسان ترین حصہ ہے۔

maablib.org

دیباچۂ کتاب

اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں صرف دو کتابوں پر دیباچہ لکھا، ایک اسرارِ خودی اور دوسری یہی پیامِ مشرق جو زیرِ نظر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی دو کتابیں ان کی نظر میں اس لائق تھیں کہ وہ خود ناظرین سے ان کو متعارف کریں۔

(۱) اسرارِ خودی بالکل نئی کتاب تھی اور ان کے مخصوص افکار کی علمبردار تھی، جن سے لوگ بالکل ناآشنا تھے۔

(۲) پیامِ مشرق جن اسباب کی بنا پر لکھی گئی وہ بھی تمام لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ اسلئے خود مصنف کو وضاحت کی ضرورت لاحق ہوئی۔

پیامِ مشرق کا دیباچہ بہت پُرمغز، پُراز معلومات اور بصیرت افروز ہے۔ اس لیے اس کو بہت غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت تو نہیں ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کے اہم مقامات کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کر دوں۔

(۱) اقبال نے یہ کتاب مشہور جرمن حکیم گوئٹے کی غیر فانی تصنیف "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی ہے جس کی نسبت ہائنا لکھتا ہے کہ "یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے"۔

(۲) گوئٹے نے یہ دیوان مشرقی تحریک سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اس تحریک کا جو مختصر تذکرہ اقبال نے قلم بند کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گوئٹے کی ہمہ گیر طبیعت ابتدائے شباب ہی سے مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی۔

(۳) ۱۸۱۲ء میں خواجہ حافظ کے دیوان کا مکمل ترجمہ جرمن زبان میں شائع ہوا۔ اور اس کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں "مشرقی تحریک" کا آغاز ہوا۔

(۴) حافظ کی شاعری نے گوئٹے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا بلکہ اُس نے اس کے "مغربی دیوان کے لیے محرک کا کام دیا۔ چنانچہ اس دیوان میں حافظ کا رنگ جابجا نظر آتا ہے۔ گوئٹے کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ "وہ ہر بات میں اسے

حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔

(۵) اگر گوئٹے حافظ کے علاوہ شیخ عطارؒ اور شیخ سعدیؒ کا بھی ممنونِ احسان ہے۔

(۶) گو گوئٹے کو عجمی تصوف سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تغزلِ محض کا دلدادہ تھا۔ نیز مولانا رومؒ کے فلسفیانہ حقائق و معارف اس کے نزدیک مبہم تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مثنوی کا غور سے مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ جو شخص حکیم اسپنوزا کا مداح ہو، جو حکیم مرصوف مسئلہ وحدت الوجود کا قائل تھا، اس سے ممکن نہیں کہ رومیؒ کا معترف نہ ہو۔

(۷) پیامِ مشرق کا محرک گوئٹے کا دیوان ہے اور اس کا مدعا اور مقصد اُن اخلاقی، ملی اور مذہبی حقائق کو پیش کرنا ہے جن کا تعلق افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔

باطنی تربیت کی اہمیت اور ضرورت کا احساس اقبال کو اس لیے ہوا کہ انھوں نے ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء چار سال تک مسلسل اس مغربی تہذیب کے ہولناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے جس پر اہلِ یورپ کو بہت ناز تھا اور جب انھوں نے اس کے اسباب پر نظر ڈالی تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اس تہذیب کی بنیاد، مادیت اور الحاد پر تھی۔ اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا۔ اگر کسی قوم کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ جاگزین ہو جائے انسان، محض سالماتِ مادّی کے مجموعہ کا نام ہے نہ کوئی اس کا خالق ہے نہ کوئی اس پر حاکم ہے اور نہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گا نہ اُسے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہو گی، تو پھر دنیا کی کونسی طاقت اس کو نیکی کی طرف مائل کر سکتی ہے۔ اور دُنیا کا کونسا فلسفہ اس کو انسان بنا سکتا ہے؟

اس لیے اقبال نے پیامِ مشرق میں مشرق اور مغرب دونوں کو عشق کا پیغام دیا ہے جس کے بغیر باطنی تربیت ناممکن ہے۔ بلکہ وہ باطنی تربیت ہی کا دوسرا نام ہے۔

(۸) یورپ کی جنگِ عظیم اقبال کی نظر میں ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب فطرت اس تہذیب

تمدن کے خاکستر سے زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دُنیا تعمیر کر رہی ہے۔

(۹) یورپ کے مدبرین چونکہ قدامت پرست اور کوتاہ نظر ہیں اس لیے اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ ؎

(۱۰) امریکہ اقبال کو مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ ان کی رائے میں یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے۔

امریکہ کے عروج کی یہ پیشگوئی اقبال نے آج سے تیس ۳۰ سال پہلے کی تھی اور ہم لوگ جو اس وقت ۱۹۵۳ء میں زندہ ہیں اس پیشگوئی کو اپنی آنکھوں سے پوری ہوتی ہوئی دیکھ رہے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں اقبال نے یہ کہا تھا کہ یورپ نے چونکہ نظام حکومت کی بنیاد لادینی تہذیب پر رکھی ہے اس لیے اس کی تباہی یقینی ہے ؎

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد

زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

چنانچہ دوسری جنگِ عظیم میں اقبال کی یہ پیشگوئی بھی پوری ہو گئی۔ اور آج روس کے سوا باقی سب یورپین طاقتیں امریکہ کے زیرِ اقتدار ہیں۔

(۱۱) "مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند بلکہ خوابِ غفلت کے بعد آنکھ کھولی ہے" اس جملہ میں اقبال نے اس جدوجہد کی طرف اشارہ کیا ہے جو اسلامی ممالک میں یورپ کی غلامی

؎ اقبال نے یہ خیالات ۱۹۲۳ء میں ظاہر کیے تھے۔ مقامِ افسوس ہے کہ یورپ کے مدبرین تیس ۳۰ سال گذر جانے کے بعد بھی جنت الحمقاء میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان دانشمندوں نے دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء سے بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ اقبال کا یہ دلخراش تبصرہ

سے آزادی کے لیے برپا ہے۔ مراقش، الجیریا، ٹیونس، طرابلس، مصر، سوڈان، شام، فلسطین، عراق اور ایران ان تمام ملکوں کے مسلمان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

(۱۲) اس کے بعد اقبال یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ "اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ پہلے خود اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب برپا نہ ہو۔ اور کوئی نئی دُنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جبتک پہلے اس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن حکیم نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کے سادہ مگر بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

یہ اس دیباچہ کی اہم عبارت ہے یعنی سب سے زیادہ لائق توجہ اسی لیے میں نے پورا پیراگراف نقل کر دیا ہے تاکہ ناظرین پر اس کی اہمیت واضح ہو سکے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر اقبال پیام مشرق کے بجائے صرف اسی نکتہ کی وضاحت کر دیتے جو قرآن حکیم نے اس آیت شریفہ میں پیش کیا ہے تو مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے بالکل کافی ہوتا۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال سے تذکر، تفکر، تدبر، تعقل اور تفقہ یعنی تمام خداداد قوائے دماغی سے کام لینا چھوڑ دیا ہے جب وہ قرآن حکیم ہی میں غور و فکر نہیں کرتے تو پیام مشرق کا یہ دیباچہ کس شمار و قطار میں ہے؟

جو انھوں نے ۱۹۲۲ء میں قلمبند کیا تھا آج بھی مغربی سیاست پر بعینہٖ صادق آ رہا ہے:-

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

قرآن حکیم کی اس مہتم بالشان آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم پہلے اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں تبدیلی یا انقلاب پیدا نہ کرے اُس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی اس قوم کی ظاہری حالت میں کوئی تبدیلی یا انقلاب پیدا نہیں کیا کرتا۔

بالفاظِ دگر، اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ فرمایا ہے کہ جو قوم انقلاب (یہاں انقلاب سے ترقی مراد ہے) کی آرزو مند ہو (یعنی یہ چاہتی ہو کہ اللہ تعالےٰ اُسے دُنیا میں سرداری یا عزت عطا فرمائے) اُس کا فرض یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے اندر اس انقلاب (ترقی، بلندی، سروری) کی اہلیت یا قابلیت پیدا کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی زندگی میں باطنی انقلاب کے بغیر ظاہری انقلاب وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔

اور تقسیم کار اِس طرح ہے کہ :-

(ا) باطنی انقلاب، بندوں سے متعلق ہے اور مقدم ہے۔

(ب) ظاہری انقلاب، خدا سے متعلق ہے اور مؤخر ہے۔

اس قانون کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآنِ حکیم کی رو سے اللہ تعالیٰ بلاشبہ رحیم ہے۔ لیکن وہ انہی لوگوں پر رحم[1] کرتا ہے جو پہلے اپنے طرزِ عمل سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کا مستحق بنا لیں۔

راقم الحروف کی رائے میں مسلمانانِ عالم کی سب سے بڑی ٹریجڈی (المناک داستان) یہ ہے کہ وہ ایک ہزار سال سے فطرت کے اس قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اور اگرچہ انہوں نے ہر زمانہ میں اور ہر محاذ پر اس قانون شکنی (بغاوت) کا خمیازہ بھگتا ہے اور آج بھی بھگت رہے ہیں۔ لیکن اپنے غیر اسلامی

---

[1] آیت ذیل اس پر شاہد ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۝

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور بعد ازیں انہوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالےٰ کی رحمت کے اُمیدوار ہو سکتے ہیں ۱۲

(غیر فطری طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتے ۔

اس طرز عمل کی تازہ ترین مثال درکار ہو تو پاکستان کے مسلمانوں کے مطالبۂ حکومتِ الٰہیہ پر غور کر لیجیے۔ ہر طرف ایک شور برپا ہے کہ ہم اس ملک میں اسلامی حکومت چاہتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص اپنے اندر اسلامی حکومت کو نافذ کرنے یا اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اہلیت اور صلاحیت پیدا نہیں کرتا ہم زبان سے اسلام اور اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کر رہے ہیں، لیکن اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہمیں اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ ہمارا معبود وہ ہے جسے مشرق میں روپیہ اور مغرب میں "ڈالر" کہتے ہیں۔

چونکہ میں اس مقدمہ میں پاکستان کے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تفصیل تبصرہ نہیں کر سکتا، اس لیے اس فقرہ پر اس دلخراش داستان کو ختم کرتا ہوں۔ کہ اگر واقعی مسلمان اس ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں تو ان کو سب سے پہلے اپنے ضمیر میں اس حکومت کو جاگزین کرنا ہوگا اور زرپرستی اور خدا پرستی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب دل اور دماغ مسلمان بن جائیں گے، تو حکومت اسلامیہ خود بخود قائم ہو جائے گی۔ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اگر مثال درکار ہو تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار پر نظر کرو۔ آپ نے

(۱) سب سے پہلے عربوں کے دل و دماغ کو بتوں کی اور بُت پرستی کی نجاست سے پاک کیا۔

(ب) اس کے بعد اللہ اور اس کے رسول کی محبت ان کے دلوں میں راسخ کی۔

(ج) تیسری منزل میں مال و دولت، باغات، محلات اور سامان زندگی کی محبت اُن کے دلوں سے خارج کی (یہی ہجرت کا حقیقی مفہوم ہے)۔

(د) اس کے بعد ان کو غیر اسلامی نظام سے متصادم ہونے کا حکم دیا (یہی غزوات یا اسلامی جنگوں کا حقیقی مفہوم ہے)۔

نکلا) اس تصادم کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ جس میں نہ کوئی کسی کا غلام تھا اور نہ کوئی کسی کا دست نگر تھا۔ اور نہ کوئی کسی پر حکمران تھا۔ بلکہ سب مسلمان اللہ تعالیٰ کے غلام تھے اور ساری دنیا ان کی غلام تھی (یہی حکومت الٰہیہ کا حقیقی مفہوم ہے)۔

اب ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو قوم رشوت ستانی اور اخذ بگاڑی اور اقربا نوازی اور زر پرستی کو منجملہ اجزائے ایمان سمجھتی ہو، وہ اسلامی حکومت کیسے قائم کر سکتی ہے، یا اگر وہ قائم ہو جائے تو اُسے کیسے برقرار رکھ سکتی ہے؟ یا اگر وہ برقرار رہ جائے۔ تو اس سے وفا کیسے کر سکتی ہے؟۔

پیش کش بحضور فیض گنجور امیر امان اللہ خان بالقابہ (سابق) فرمانروائے دولتِ خداداد افغانستان

تمہید پیام مشرق کی تصنیف کا سلسلہ ۱۹۱۸ء سے شروع ہوا اور ۱۹۲۳ء میں ختم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ امیر امان اللہ خان سابق حکمران افغانستان ہندی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں امیر موصوف الصدر اپنے باپ امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد تخت نشین ہوئے اور انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان کی خارجی سیاست انگریزوں کے زیر اثر تھی اور امیر موصوف اسے بالواسطہ غلامی تصور کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانہ میں رولٹ ایکٹ کی بنا پر سارے ہندوستان میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے انگریزوں نے پہلے معرکے میں شکست کھا جانے کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ افغانستان سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد راولپنڈی میں صلح نامہ مرتب ہوا۔ جس کی رو سے برطانیہ نے افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد امیر موصوف نے ملکی اور قومی اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ اور ابتداء میں اس معاملہ میں بھی انہیں کامیابی حاصل ہوئی اس لیے علامہ مرحوم نے ان کی ذات سے بہت کچھ توقعات وابستہ کر لیں۔ اور اپنی اس مایۂ تصنیف کو اُن کے نام سے منسوب کر دیا۔

امیر موصوف کی ناکامی، تخت سے دستبرداری اور جلاوطنی کی افسوسناک داستان میرے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ اصلاح کے جوش میں امیر موصوف نے اپنی قوم کی ذہنیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اگر وہ طبقہ علماء کو اپنا ہمخیال بنا لینے کے بعد اصلاحات نافذ کرتے تو نہ انگریز اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوتے اور نہ امیر موصوف کو

ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

علامہ نے اس پیشکش میں کمال دلسوزی اور اخلاص کے ساتھ ملی، مذہبی اور سیاسی ترقی کا پروگرام مرتب کر کے امیر موصوف کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس کو مدِّ نظر رکھتے تو اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ بہر کیف اقبال نے اپنا فرض ادا کر دیا اور بلاشبہ جو حقائق و معارف انہوں نے اس پیشکش کے ضمن میں بیان کئے ہیں وہ حرزِ جان بنانے کے قابل ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اس کی شرح ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:۔

پیشکش کا تجزیہ اس پیشکش میں سات بند ہیں۔ پہلے بند میں اپنا مُدعا بیان کیا ہے۔

دوسرے بند میں گوئٹے سے اپنا موازنہ کرنے کے بعد اپنی قوم کی کوتاہ نظری کا شکوہ کیا ہے اور آخری شعر میں اس بند کی روح کھینچ دی ہے۔

بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

تیسرے بند میں مسلمانانِ عالم کی حالت زار کا نقشہ بیان کیا ہے اور اس المناک داستان کا خلاصہ آخری شعر میں درج کر دیا ہے:۔

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

چوتھے بند میں ممدوح سے خطاب کیا ہے۔ اور آخری شعر میں وہ نصب العین پیش کیا ہے جسے ہر مسلمان فرمانروا کو مدِّ نظر رکھنا چاہیئے تاکہ وہ ملت کے لیے سرمایۂ قوت بن سکے:۔

تا ز صدیقانِ ایں اُمت شوی
بہرِ دیں سرمایۂ قوت شوی

پانچویں بند میں جو اس پیشکش کی جان ہے، اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ صحیح معنی میں ترقی کے لیے دو چیزیں شرط ہیں، حکمت

اور دولت۔

چھٹے بند میں ممدوح کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ارکانِ دولت کے انتخاب میں بہت دانائی سے کام لینا چاہیئے۔ جیسے مشیر ویسا مشورہ۔ جیسا مشورہ ویسا عمل۔ جیسا عمل ویسا نتیجہ۔ اِس بند کو مرشد رومیؒ کے اس شعر پر ختم کیا ہے:۔

ہر ہلاک اُمّت پیشیں کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بردند عود

ساتویں بند میں ممدوح کو اصلاحِ باطن کا مشورہ دیا ہے کیونکہ اس کے بغیر شانِ فقر پیدا نہیں ہو سکتی اور شانِ فقر کے بغیر ایک مسلمان حکمران اور چنگیز یا ہلاکو میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ آخری شعر میں ساری پیشکش کی رُوح کھینچ کر رکھ دی ہے:۔

خیز د اندر گردش آور جام عشق
در قہستاں تازہ کن پیغام عشق

اَب میں ہر بند کا مطلب واضح کرتا ہوں:۔

پہلا بند اے امیر! تو اگرچہ نوجوان ہے لیکن بوڑھوں کی طرح سمجھدار ہے تیری آنکھ مخفی امور کو دیکھ سکتی ہے۔ تیری ذہانت، تیری دانائی عزم و ہمت بلاشبہ لائقِ تحسین ہیں۔ تیرے خزانہ میں کسی شئے کی کمی نہیں ہے اُٹھتے دن تیرے پاس بادشاہوں کی طرف سے تحفے آتے رہتے ہیں اس لیے تو ہدایا کا آرزومند نہیں ہے۔ لیکن ایک ہدیہ مجھ فقیر بے نوا کی طرف سے بھی قبول کرلے۔

دوسرا بند اے بادشاہ! اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے، اس لیے میرے دل میں یہ آرزو موجزن ہے کہ میں اپنی قوم کو اس نعمت سے بہرہ ور کردوں۔

اے امیر! زندگی کی رمز (حقیقت) عشق میں پوشیدہ ہے۔ اگر انسان شیوۂ عشق اختیار کرلے تو اپنی زندگی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اسلئے میں نے قوم کو عشق کا پیغام دیا ہے۔

حکیم مغرب جرمن شاعر گوئٹے نے، جو فارسی ادبیات کا دلدادہ تھا "مغربی دیوان" کی وساطت سے اہلِ مشرق کو سلام محبت بھیجا تھا۔ میں نے اسکے جواب میں "پیام مشرق" لکھا ہے۔

آپ کی آگاہی کے لیے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ گوئٹے کون تھا۔ اور میں کون ہوں؟ لیکن یہ مدِنظر رہے کہ جو کچھ میں اپنے متعلق لکھوں گا اس میں خود بینی (خود ستائی) کا رنگ مطلق نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں خود شناس ہوں یعنی اپنی استعداد اور علمیت سے آگاہ ہوں:۔

(۱) گوئٹے مغربی حکما کا خوشہ چیں تھا۔ میں نے عرفائے مشرق کے خیالات سے استفادہ کیا ہے۔

(۲) وہ ایک آزاد، سربلند اور ترقی یافتہ قوم میں پیدا ہوا۔ میں غلام ملک میں پیدا ہوا اور غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

(۳) اس کی قوم نے اس کے کلام کی قرار واقعی قدر کی اور اس کے خیالات سے استفادہ کیا۔ لیکن میری قوم میرے پیغام سے بالکل غافل ہے۔

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ گوئٹے کی شاعری حسین اور دلکش ہے۔ اور دنیا کو سکون (راحت) کا پیغام دیتی ہے۔ میری شاعری اس کے برعکس قوم کو جہاد پر آمادہ کرتی ہے۔

(۴) ہم دونوں کائنات اور زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور دونوں نے دنیا کو زندگی کا پیغام دیا ہے (اگرچہ اس کی نوعیت مختلف ہے)۔

(۵) ہم دونوں باطل کے خلاف جنگ آزما ہیں، دونوں کا کلام منور اور تابناک ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کی قوم نے اس کو پہچان لیا۔ لیکن میری قوم ہنوز مجھ سے اور میرے کلام سے ناآشنا ہے۔

موازنہ کرنے کے بعد اب اقبال اپنی قوم کی تغافل شعاری اور کوتاہ نظری کا شکوہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:۔

افسوس کا مقام ہے کہ میری قوم مجھ سے بالکل بیگانہ ہے اور جو لوگ میرے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اس کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتے۔

میں اپنی قوم کو دنیا میں سرداری حاصل کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں۔ لیکن

وہ مجھ سے شاعری کی توقع رکھتی ہے۔ مسلمان، رمزِ حیات سیکھنے کے بجائے مجھ سے شعر سُنانے کی فرمائش کرتے ہیں! حقیقتِ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھ کو دین اور سیاست کے رموز و اسرار سے آگاہ فرمایا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ غیر معمولی علم و فضل کے باوجود مجھے ہندوستان[۱] میں پیدا کیا جہاں کوئی میرا رازداں نہیں یعنی میں اپنی قوم میں رہتا ہوں لیکن اجنبی شخص کی طرح کوئی شخص مجھ سے آگاہ نہیں ہے، اس میں کیا شک ہے کہ آسمان سفلہ پرور ہے۔ اس لیے افسوس ہے اُس شخص کے حال پر جو صاحبِ ہنر ہو۔[۲]

تیسرا بند اے امیر! آپ بھی اس المناک حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہماری قوم کی عزت اور سربلندی کا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ دُوسرے مصرع کا مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:-

حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۸ : ۳۲)

یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا۔

(۵) عرب بطحیٰ: وادیٔ بطحیٰ کے باشندے، جن کے گھر میں اسلام پیدا ہوا۔ اِسلام کے اصولوں سے قطعاً بیگانہ ہو چکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُنکے سینوں میں اللہ کی محبت کی آگ بالکل سرد ہو چکی ہے۔

اِس شعر میں تلمیح ہے عربوں کی اسلام کش روش کی طرف کہ ۱۹۱۶ء۱۴ میں انھوں نے ترکوں کے خلاف ــ اُن ترکوں کے خلاف جنھوں نے چار سو سال تک اپنے خون سے سرزمین حجاز کی آبیاری کی تھی۔ اور لفظیہ

---

[۱] اسی جذبہ کو ضربِ کلیم میں یوں ظاہر کیا ہے:-

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے !
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

[۲] اُستاد ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے:-

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال! افسوس ہے تجھ پر! کمال افسوس ہے

"خادمِ حرمین شریفین" کو اپنے لیے سب سے بڑا اعزاز تصور کیا تھا۔ اعلانِ جنگ کر دیا اور دشمنانِ اسلام یعنی انگریزوں کے دوش بدوش اپنے محسنوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

(ب) مصری، انگریزوں کی غلامی میں مبتلا ہیں۔ ترکستان کے باشندے رُوسیوں کے زیرِ اقتدار ہیں۔

(ج) ترکوں (ترکانِ عثمانی) کی حالت یہ ہے کہ یورپ اور ایشیا، (مشرق اور مغرب) میں ان کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔

(د) ایرانی مسلمان مدتوں سے ختم ہو چکے ہیں۔ کسی ایرانی کے اندر حضرت سلمان فارسیؓ کا سا عشق (دینی ولولہ) نظر نہیں آتا۔

(ہ) اب رہے ہندی مسلمان، تو ان کی حالت سب سے زیادہ بد تر ہے وہ بندۂ شکم ہیں۔ ضمیر فروش ہیں اور دین سے بیگانہ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان میں اب کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن سکے۔ نہ اس میں حضرت خالدؓ کی سی شجاعت ہے نہ حضرت فاروق اعظمؓ کی سی شانِ عدالت ہے، نہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا سا جذبۂ سرفروشی ہے۔

چوتھا بند اے امیر! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام اور مسلمانوں کی محبت عطا فرمائی ہے۔ اس لیے میں آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ شیخین (صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ) کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

آپ کی قوم (افغان) اس وقت بلکہ عرصۂ دراز سے منتشر اور غیر منظم ہے علم و فن سے عاری ہے۔ ترقی کے اصولوں سے نا آشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین فطری صلاحیتوں کے باوجود ابھی تک اقوامِ عالم کی صف میں اپنے لیے کوئی مقام حاصل نہیں کر سکی، نہ اسے دُنیا کی نعمتوں سے کوئی حصہ ملا۔ اور نہ اس کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ وہ کوہستان میں خلوت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ دُنیا اس سے ناواقف ہے۔ وہ دُنیا سے نا آشنا ہے۔ چونکہ کشمکشِ حیات اور تنازع للبقا سے بیگانہ ہے اس لیے جہاں دو سو سال پہلے تھی، وہیں آج بھی ہے۔

اگر آپ اس غیور قوم کی تعلیم اور تہذیب میں کوشش کریں، تو بلاشبہ اُمّتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم کریں گے۔ اور آپ کی ذات ملّتِ اسلامیہ کے حق میں، صدیق اکبرؓ کی طرح معزز ہو جائے گی۔

پانچواں بند

واضح ہو کہ یہ بند اس پیشکش کی جان ہے۔ اقبال نے جو حقائق و معارف اس میں بیان کئے ہیں، وہ ہر زمانہ میں، ہر اُس حکمران کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں جو مسلمانوں کی دینی اور دُنیاوی ترقی کا آرزومند ہو۔ کہتے ہیں کہ:۔

اے امیر! زندگی کے کمالات سے وہی شخص بہرہ اندوز ہو سکتا ہے، جو ان کے حصول کے لیے جدوجہد کرے (زندگی جہداست) کمالاتِ زندگی فطرت کی بارگاہ سے لوگوں میں مفت (فی سبیل اللہ) تقسیم نہیں ہوتے۔ (استحقاق نیست) جس طرح ہر شخص کو ہوا، پانی، روشنی اور زمین سے بہرہ ور ہونے کا حق پیدائشی طور پر حاصل ہے۔ اس طرح کمال زندگی کی لذتوں سے مستفید ہونے کا حق پیدائشی طور پر کسی فرد کو حاصل نہیں ہے۔

مسلمانوں نے عرصۂ دراز سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جس طرح خدا تعالےٰ نے ہماری کوشش (جدوجہد) کے بغیر ہمیں خلعتِ وجود عطا کر دیا ہے۔ اسی طرح بلا محنت و مشقت، کمالاتِ وجود بھی مل جائیں گے۔ اِس بنیادی غلطی نے ان کو نہ دین کا رکھا نہ دُنیا کا۔ اِس لیے اقبال نے نہایت دانشمندانہ طریقہ پر سب سے پہلے قوم کو اس بنیادی حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ

زندگی جہداست و استحقاق نیست

بلاشبہ یہ مصرع اس قابل ہے کہ پاکستان کے ہر کالج اور ہر اسکول کے ہر کمرے میں جلی قلم سے لکھ کر طلبہ کے سامنے آویزاں کیا جائے۔ تاکہ ہر نوجوان (لڑکا اور لڑکی) ہر وقت اس نکتہ کو مدِّ نظر رکھے کہ زندگی کے کمالات سے وہی شخص بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ جو ان کمالات کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔

دوسرا مصرع

دُوسرے مصرع میں اقبال نے جدوجہد کا طریقہ بتایا ہے کہ اَنفس اور آفاق کا علم حاصل کرو۔

علم اَلنفسُ کو اصطلاح میں فلسفہ اور علم آفاق کو اصطلاح میں سائنس کہتے ہیں۔ اور مادی ترقی انہی دو چیزوں پر موقوف ہے۔ لفظِ اَلنفسُ اور آفاق میں تلمیح ہے اس آیت کی طرف:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ (۴۱:۵۳)

عنقریب دکھائیں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں کائنات میں، اور خود ان کے نفوس میں۔

چونکہ اَلنفسُ اور آفاق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ اس لیے اسلام نے ان دونوں کے مطالعہ کا حکم دیا ہے اور ابتدائی دور کے مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اُن کے مطالعہ کی بدولت زندگی کے ہر شعبہ میں غیر معمولی ترقی کی۔ سارا یورپ سیاسی اور ذہنی اعتبار سے ان کا غلام تھا۔ غرناطہ اور قرطبہ کی درسگاہوں میں جرمنی، اٹلی، فرانس اور انگلستان کے طلبہ مسلمانوں سے سائنس اور فلسفہ پڑھنے آتے تھے۔ لیکن جب پانچویں صدی ہجری سے عجمیت، یہودیت، مجوسیت، لاادریت، رہبانیت، زندیقیت اور دیگر غیر اسلامی عناصر، دین اسلام میں مختلف طریقوں سے راہ پاتے لگے۔ تو رفتہ رفتہ یہ ترقی پذیر، حرکت انگیز اور انقلاب آفرین نظام (دستور العمل) حیات، جامد، بے حس اور مُردہ ہو کر رہ گیا۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی زندگی سے واضح ہو سکتا ہے۔

اَلنفسُ (انسان) کے مطالعہ کا نتیجہ، علم النفس، علم المعیشت اور علم الاخلاق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور آفاق کے مشاہدہ کا ثمرہ، طبیعات، کیمیا اور علم الحیات کی صورت میں مرتب ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سابقہ اور فرنگیوں کی موجودہ ترقی کا سارا راز انہی علوم میں پوشیدہ ہے۔

اس شعر کے بعد، اس بند کے آخر تک، اقبال نے اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ:۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست

کہتے ہیں کہ اے امیر! حکمت (سائنس) کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے "خیر کثیر" سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس مصرع کا مضمون حسب ذیل آیت قرآنی سے ماخوذ ہے :۔
مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ۔

اور جسے حکمت عطا کی گئی (گویا) اُسے خیر کثیر (بہت بڑی بھلائی) عطا کی گئی ۔

علم و حکمت کی قدر و قیمت کا مزید اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات کے سردار ہیں ، مہبط وحی ہیں ۔ اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیب کا علم بھی جس قدر چاہا عطا فرمایا۔ اور اس وصف خاص میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں ہے ۔ لیکن اس کے باوجود آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ التجا فرمایا کرتے تھے کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۔
یعنی اے میرے رب ! میرے علم میں اضافہ فرما ۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم و حکمت سب سے بڑی نعمت ہے ۔ پس اے امیر ! آپ کو بھی لازم ہے کہ اپنی قوم کو زیور علم و حکمت (سائنس) سے آراستہ کریں۔

اِس بات کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جب فرشتوں نے اللہ تعالےٰ سے یہ عرض کی کہ آپ آدم کے بجائے ہمیں خلیفہ بنائیں کیونکہ ہم آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں ۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم تم سے افضل ہے ، کیونکہ اس میں اشیائے کائنات کے خواص دریافت کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور تم اس صلاحیت سے محروم ہو ۔

اِس شعر کا مضمون حسب ذیل آیت قرآنی سے ماخوذ ہے :۔
وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (۲ : ۳۱)

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو کائنات کی تمام اشیاء کے نام سکھائے
اِس آیت میں " اسماء " سے اشیاء کے خواص کا علم مراد ہے ۔ اسی لیے اقبال نے یہ کہا ہے کہ ؎

علم اشیاء ، علم الاسماء ستے

یعنی تعلیم اسماء سے علم اشیاء مراد ہے ۔ اور یہ علم اشیاء (اشیاء کے خواص کا علم) عصا بھی ہے اور ید بیضا بھی ہے یعنی سائنس کی بدولت انسان معجزے دکھا سکتا ہے ۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ آج مغربی اقوام ،

سائنس کی بدولت آئے دن معجزات دکھاتی رہتی ہیں اور اسی کی بدولت ساری دنیا پر حکمران ہیں۔ اور اسی علم اشیا (سائنس) سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے عرب، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک کے باشندے اپنے ملکوں کی دولت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ چونکہ مسلمان سائنٹیفک علم سے بے بہرہ ہیں، اس لیے وہ اس بات کا احساس نہیں کر سکتے کہ

خاک رہ جز ریزہ الماس نیست

یعنی جو قوم سائنس سے آگاہ ہوتی ہے وہ مٹی میں سے سونا نکال سکتی ہے جیسا کہ مغربی اقوام بلا مبالغہ نکال رہی ہیں۔ وہ ہم سے خام اشیاء کوڑیوں کے مول خرید لیتی ہیں اور ان سے مصنوعات نادرہ کار تیار کر کے ہمارے ہاتھ سونے سے بھی زیادہ گراں قیمت پر فروخت کرتی ہیں۔

اے امیر! دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک علم (سائنس) دوسری دولت (اقتصادی خوشحالی) اور دوسری کا حصول پہلی پر منحصر ہے۔ آج دنیا میں وہی قوم دولت مند ہو سکتی ہے جو سائنسدان ہو۔ لہٰذا آپ علم تو "سینۂ احرار" یعنی آزاد مغربی قوموں سے حاصل کریں۔ اور جب آپ کی قوم سائنسدان ہو جائے گی تو وہ "سینۂ کہسار" یعنی ملک کی قدرتی پیداوار سے دولت حاصل کر سکے گی جس طرح سومنات کے بت کا شکم جواہرات سے معمور تھا، اسی طرح کائنات کے باطن میں بھی بے شمار جواہرات پوشیدہ ہیں۔ آپ کا فرض یہ ہے کہ اپنی قوم کو کائنات کے باطن کو عریاں کرنے کا فن سکھائیں تاکہ وہ دولتمند ہو سکے۔

چھٹا بند اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی سلطنت کی بنیادیں استوار ہو جائیں تو آپ کو مردم شناسی کا فن حاصل کرنا چاہیئے۔ یاد رکھیے! دنیا میں بہت سے انسان ابلیس صفت پائے جاتے ہیں اور بہت سے شیاطین ایسے ہیں جو بظاہر نیک (ادریس) نظر آتے ہیں۔ اس شعر میں اشارہ

ہے ضمیر فروش اور غدار افراد کی طرف جو ہر زمانہ میں، ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔

جعفر از بنگال وصادق از دکن

ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن (جاوید نامہ)

اِن غدارانِ ملت کا طریق (رنگ) سراسر عیاری (نیرنگ) اور ان کی گفتگو (لبود) سراپا ریاکاری (نمود) ہوتی ہے۔ ان کا ظاہر کچھ ہوتا ہے باطن کچھ۔ یہ لوگ بظاہر بڑے مخلص (پاکباز) ہوتے ہیں لیکن بباطن بڑے دغاباز ہوتے ہیں۔ ان کے دِل دغا، فریب، مکاری اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں۔

نوٹ:۔ کعبتین، تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی دو کعب یا قمار کے شش پہلو پاسے۔ کعبتین دغل ان پاسوں کو کہتے ہیں جن کے اندر اسکے کی طرف (اندرونی جانب) سیسہ چپکا دیتے ہیں۔ تاکہ جب ان کو پھینکا جائے تو چھکا اُوپر کی طرف رہے یعنی ہمیشہ پو آئے یہیں سے اُردو زبان میں دو محاورے پیدا ہوئے۔

(ا) مثلاً وہ تو دن رات چھکا پنجا میں مشغول ہے یعنی جُوا کھیلتا ہے

(ب) اُس کی کیا بات کرتے ہو؟ آجکل اُس کے پوبارہ ہیں۔ یعنی وہ کامیاب ہے۔

اَے امیر! اس نکتہ کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیئے کہ ہر چمکدار چیز موتی نہیں ہوتی۔ اسکالیے مرشد رومیؒ نے قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ بایں طور بیان کیا ہے:۔

فرماتے ہیں کہ زمانہ گذشتہ کی تاریخ سے واضح ہے کہ ہر قوم کی تباہی کا سب سے بڑا سبب یہی ہوا کہ اس نے پتھر (جندل) کو لکڑی (عود) سمجھا یعنی حقیقت حال سے چشم پوشی اختیار کرلی۔ یعنی جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا یقین کرلیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تباہ ہوگئے۔

ساتواں بند اے امیر! اس بات کو مدِ نظر رکھیئے کہ اسلام میں سرداری کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کا سردار (امیر) ہو، وہ

ان کی خدمت کرے۔ چنانچہ فاروقِ اعظمؓ اور حیدرِ کرارؓ کی زندگی اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اگر مسلمانوں کے امیر میں فاروقؓ کا سا عدل اور حیدرؓ کا سا فقر نہ ہو تو اسلام کی رُو سے وہ امارت (حکومت) کا اہل نہیں ہے۔

اس لیے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ گاہے گاہے آپ تنہائی میں بیٹھ کر احتساب نفس کیا کریں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ آپ کے اندر یہ خوبیاں کس حد تک پائی جاتی ہیں۔ جو شخص اپنے نفس امارہ سے محاسبہ نہیں کر سکتا۔ وہ دُنیا میں کبھی سربلند یا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ افغانوں کی اصلاح و تہذیب کے آرزومند ہیں، تو پہلے اپنی اصلاح کی طرف توجہ کیجئے۔ یعنی بادشاہی (قبائے خسروی) کے ساتھ ساتھ درویشی کا رنگ بھی پیدا کیجئے۔ اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدِ نظر رکھیے۔ اگر مثال درکار ہو تو سلطان مراد کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔ یہ بادشاہ اردشیر کی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ حضرت ابوذر غفاریؓ کی سی شانِ فقر کا حامل تھا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ اپنے جسم پر سلاح جنگ سجائے رکھتا تھا۔ لیکن اس کا دل فقیروں کا سا (مُوئینہ پوش) تھا۔

مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ جن بادشاہوں نے دُنیائے اسلام میں عزت (امیری) حاصل کی ہے۔ ان سبھوں نے بادشاہت کے پردہ میں درویشی کی ہے۔ مثلاً سلطان نورالدین زنگی، سلطان محمود بیگڑہ، سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ اور سلطان ٹیپو شہید۔

ان سبھوں کی زندگی میں امارت کے ساتھ ساتھ فقر کی شان جلوہ گر تھی ان لوگوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کے اسوہ پر عمل کیا۔ جن کی کیفیت یہ تھی کہ اگرچہ وہ مدائن کے والی تھے لیکن اُن کے مکان میں کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ اور ان کی زندگی کی کائنات صرف دو چیزیں تھیں قرآن اور تلوار۔

اے امیر! حقیقت بھی یہی ہے کہ جو مسلمان عاشقِ رسول ہوتا ہے وہ بظاہر کوئی ساز و سامان نہیں رکھتا۔ لیکن ساری کائنات پر حکمران ہوتا ہے، اگر مثال درکار ہو تو سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ۔ حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ۔ حضرت محبوب الٰہی دہلوی اور حضرت سید محمد گیسو دراز دکنیؒ

کی زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

اس لیے آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کریں کہ وہ آپ کو حضرت صدیق رضؓ اور حضرت علیؓ کا سا سوز و گداز یعنی عشقِ رسول کا جذبہ عطا فرمائے۔

یاد رکھیے کہ مسلمان قوم صرف عشقِ رسولؐ ہی سے زندگی اور سربلندی حاصل کر سکتی ہے۔ بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ ساری کائنات آپؐ ہی کے عشق کی بدولت زندہ اور سرسبز ہے۔

آپؐ ہی کے جلوے کی بدولت اس کائنات کا جوہرِ مخفی عیاں ہوا[1] یعنی اگر آپؐ نہ ہوتے تو یہ کائنات کبھی عدم سے وجود میں نہ آتی۔ انسان کو صرف عشقِ رسولؐ ہی کی بدولت سکونِ قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ اور آپؐ کی محبت انسان کو غیر فانی بنا سکتی ہے۔

لہٰذا آپ خود بھی عشقِ رسولؐ اختیار کیجیے اور اپنی قوم کو بھی اِس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیجیے۔

بقیہ حواشی متعلقہ پیشکش

(۱) شہنشاہ مراد سے اقبال کا اشارہ سلطان مراد اوّل کی طرف ہے۔ جو سلطان اُرخان کی وفات کے بعد ۱۳۵۹ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ سلطان سلاطینِ عثمانی میں بہت بلند مقام رکھتا تھا۔ اس نے ۱۳۶۰ء میں ایڈریا نوپل فتح کیا۔ اور اپنی شہادت کے وقت تک جو ۱۳۸۹ء میں واقع ہوئی، مسلسل فتوحات میں مشغول رہا۔ لیکن اس کے باوجود نہایت درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

(۲) اردشیر بابکاں ساسانی خاندان (ایران) کا بانی تھا۔ اس نے ۲۲۲ء میں اردوان کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی۔ ۲۳۸ء میں

---

[1] ان اشعار میں اس حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ ہے:-

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ۔

اے میرے محبوب اگر میں آپؐ کو پیدا نہ کرتا تو آسمانوں (کائنات) کو بھی پیدا نہ کرتا۔ یعنی یہ کائنات آپؐ کی بدولت معرضِ وجود میں آئی ہے ۱۲۰

تخت وتاج اپنے بیٹے شاپور اوّل کے حوالے کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ یزدجرد سوم اسی خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ جس کا خاتمہ خلافتِ فاروقی میں ہوا۔

(۳) حضرت ابوذر غفاریؓ اَلسَّابِقُونَ الْاَوَّلُوْن میں سے ہیں۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابوذر سے بڑھ کر راستباز انسان دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر فقر و فاقہ اور مختلف مصائب و آلام میں مبتلا رہے۔ کیونکہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان جس قدر زیادہ راست باز ہوتا ہے۔ اربابِ اقتدار اسی قدر زیادہ اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا۔ کہ وہ اکتناز (سرمایہ داری) کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ اس لیے ساری عمر تنہا رہے اور تنہائی ہی میں وفات پائی۔

پہلا باب

رُباعیات

موسومہ بہ لالۂ طور

تمہید | ان رباعیات میں اقبال نے انسانی زندگی کے باطنی پہلو کو شاعرانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے اور اس سے متعلق اہم مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جن کی تفصیل ذیل میں درج کرتا ہوں۔ تاکہ ناظرین کو فکر اقبال کی وسعت اور گہرائی کا کچھ اندازہ ہو سکے :-

خودی، درسِ خودی، عشق، مقامِ حیرت، مقام آدم، دل، صفتِ دل، وجود، لذتِ وجود، سوز و ساز، لذتِ سوز و گداز، مقامِ بندگی، جبر و اختیار، کوتاہیٔ خرد، مقامِ خرد، حقیقتِ زندگی، کمالِ زندگی، حیاتِ جاوداں، حقیقتِ کائنات، آخرت، مساواتِ انسانی، وسعتِ دل، مطالعۂ فطرت، اصلِ خودی، ابدیت خودی، ارتباطِ جان و تن، پیوندِ رُوح و جسم، قیمت آہ و نالہ، حقیقتِ روح، سوزِ ناتمام، انسان معما ہے۔ رُوح غیر فانی ہے۔ انا ئے مقید کی اصل، انسان زبدۂ کائنات ہے، عقل اور عشق دونوں ضروری ہیں۔ جسم بھی رُوح ہی کی ایک شکل ہے۔ خارجی کائنات کا وجود اعتباری ہے۔ انسان عالم صغیر ہے۔

ان مسائل کے علاوہ اقبال نے پندرہ رباعیات میں وحدت الوجود کی تعلیم دی ہے۔

ان رباعیات کے علاوہ چونکہ غزلیات میں بھی اکثر مقامات میں انہوں نے اسی مسلک کی تلقین کی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عقیدہ کی کسی قدر تشریح کر دی جائے تاکہ ان مقامات

کے سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔[1]

واضح ہو کہ وحدت الوجود کے مسئلہ میں دو مذہب (اندازِ تعبیر) ہیں۔ پہلا مذہب شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی رح کا ہے۔ اصطلاح میں اسے وحدت الوجود یا ہمہ اوست کہتے ہیں۔

دوسرا مذہب مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی رح کا ہے۔ جسے اصطلاح میں وحدتِ شہود یا ہمہ از اوست کہتے ہیں۔

اگرچہ اقبال نے اپنی تصانیف میں بعض مقامات پر اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اس کی سرحدیں شیخ اکبر رح کے مذہب سے مل جاتی ہیں اور پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اقبال ہمہ اوست کے قائل ہیں لیکن اگر ان کے کلام کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو دراصل وہ حضرت مجدد رح کے متبع ہیں چنانچہ میں ان کے سارے کلام کو پڑھ کر اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ ہمہ از اوست کے قائل ہیں۔

ہمہ اوست (وحدت وجود) اور ہمہ از اوست (وحدت شہود) میں جو نازک سا فرق ہے اس کو حضرت مجدد الف ثانی رح کی عبارت سے واضح کرتا ہوں۔ اس کے بعد اپنے الفاظ میں اس کی وضاحت کروں گا۔

حضرت مجدد صاحب رح نے اپنے گنجینۂ جواہرات یعنی مکتوبات میں اس دقیق مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بڑے عالمانہ انداز سے اظہار خیالات فرمایا ہے اور اس کے مخفی گوشوں کو تفصیل کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ میں بخوفِ طوالت ان تمام مکتوبات کو تو اس جگہ نقل نہیں کر سکتا (من شاء فلیراجع الی المکتوبات) لیکن اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے صرف وہ

---

[1] میں نے اپنی شرح میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اس لیے نہیں کی کہ کلامِ اقبال کی شرح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میری رائے میں اس مسئلہ کی اہمیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔ چنانچہ کلام اقبال کی شرح سے فارغ ہونے کے بعد انشاءاللہ اس موضوع پر اقبال اور تصوف کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھوں گا۔

مکتوب اس جگہ درج کرتا ہوں جو حضرت موصوفؒ نے اپنے ایک عقیدتمند شیخ عبدالعزیز جونپوری کے استفسار کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"لائق حمد وثنا وہ ذاتِ پاک ہے جس نے امکان کو وجوب کا آئینہ اور عدم کو وجود کا مظہر بنایا۔ اگرچہ وجوب اور وجود حق تعالےٰ کے کمال کی دو صفتیں ہیں۔ لیکن وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تمام اسما، وصفات تمام شئونِ اعتبارات، ظہور وبطون، بروز وکمون تجلیات وظہورات، مشاہدات ومکاشفات، محسوسات ومعقولات، اور تمام موہومات و متخیلات سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔"

"کسی حمد کرنے والے کی حمد اس کی بارگاہ عالیہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس ذاتِ اقدس نے اپنی حمد وثناء خود ہی فرمائی ہے۔ وہ آپ ہی حامد اور آپ ہی محمود ہے۔ تمام مخلوقات اس کی حمد وثنا سے عاجز ہیں۔ کسی بشر کی کیا مجال ہے کہ اس کی حمد وثنا کما حقہٗ کر سکے۔ جب کہ سید البشر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حمد وثناء سے عاجز ہیں۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ یہ ہے کہ آپؐ ہی قیامت کے دن لوائے حمد کو بلند فرمائیں گے۔ جس کے نیچے حضرت آدمؑ سے لیکر تمام انبیاء علیہم السلام ہوں گے۔ اور آپؐ باعتبارِ ظہور، تمام مخلوقات میں افضل اور اکمل اور اعلیٰ ہیں۔ آپؐ مرتبۂ عزت میں سب سے اونچے ہیں، آپ جمال وکمال کے سب سے زیادہ جامع ہیں، آپؐ کی منزلت سب سے زیادہ بلند ہے۔ آپؐ کی شان سب سے زیادہ افضل ہے، آپؐ کا دین سب ادیان سے زیادہ مضبوط ہے، آپؐ کی ملت سب ملتوں سے زیادہ راست اور درست ہے۔ مختصر اینکہ اگر اللہ تعالیٰ آپؐ کو پیدا نہ کرتا تو کائنات کو پیدا نہ کرتا۔ آپؐ اس وقت نبی تھے جبکہ حضرت آدمؑ پانی اور مٹی میں تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ برادرِ عزیز شیخ محمد طاہر نے آپ کا خط مجھے پہنچایا۔ جس کو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ چونکہ آپ کا خط اربابِ کشف و شہود کے بیان کردہ حقائق ومعارف سے لبریز تھا۔ اس لیے یہ فقیر بھی آپ

کے خط کی مطابقت میں اس طائفہ عالیہ کے ذوق کی بعض باتیں آپ کے مطالعہ اور غور وفکر کے لیے لکھتا ہے۔

مخدومی! آپ کو معلوم ہے کہ وجود، ہر کمال کا مبداء اور عدم، ہر نقص و عیب کا منشاء ہے۔ عقلاً اور نقلاً وجود، صرف حق تعالےٰ کے لیے ثابت ہو سکتا ہے۔ عقلاً اس لیے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اور نقلاً اس لیے کہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ کسی ممکن کو وجود سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ بلکہ اس کے لیے عدم ثابت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ خیر وکمال کا منبع ہے اور ممکن عیب و نقص کا مصدر ہے۔ ممکن کے لیے وجود کا اثبات اور خیر وکمال کو اس کی طرف منسوب کرنا دراصل اس کو ملک اور ملک دونوں میں حق تعالیٰ کا شریک قرار دینا ہے۔ اسی طرح ممکن کو عین واجب کہنا اور صفاتِ ممکن کو حق تعالیٰ کی صفات کا عین قرار دینا بہت بڑی گستاخی ہے بلکہ شرک اور الحاد ہے۔ کیا مجال ہے اس ذلیل خاکروب کی جو از سر تا پا غلاظت اور نجاست سے آلودہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو شہنشاہ و ہفت اقلیم کا عین (عدیم مقابل) قرار دے؟

لیکن علمائے ظاہر نے، ممکن (مخلوق) کے لیے بھی وجود ثابت کیا ہے، اور واجب تعالیٰ کے وجود اور ممکن کے وجود کو وجود کے افراد میں شمار کیا ہے۔ یعنی وجود کو کلی مشکک قرار دیا ہے اور قاعدۂ تشکیک کے مطابق واجب تعالےٰ کے وجود کو اَولیٰ اور اقدم اور ممکن کے وجود کو اضعف اور ادنیٰ گردانا ہے۔ حالانکہ یہ بات ممکن کو واجب کے ساتھ ان تمام کمالات اور فضائل میں جو وجود کا لازمی ثمرہ ہیں، شریک بنا دیتی ہے یعنی اس طرح شرک فی الوجود لازم آتا ہے۔ تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا یعنی اللہ تعالےٰ اس بات سے کہ کسی ممکن کو کسی بات میں بھی اس کا شریک قرار دیا جائے بہت بلند ہے۔ نیز حدیث قدسی میں آتا ہے۔ کہ الکبریاءُ ردائی والعظمۃُ ازاری۔ یعنی تکبیر میری چادر ہے۔ اور عظمت میری ازار ہے۔

مرادوارسد کبیریا ومنی
کہ ملکش قدیم است وذاتش غنی

اگر علمائے ظاہر اس نکتہ سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ممکن کے لیے وجود ثابت نہ کرتے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا - اے اللہ! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے یا کوئی خطا سرزد ہو جائے، تو باز پرس مت کیجیو۔

اس امر میں جو کچھ اس فقیر پر مکشوف ہوا ہے مفصل آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے شیخ اکبر ابن عربی کا مذہب بیان کروں گا۔ جو متاخرین صوفیا کے امام ہیں۔ اس کے بعد اپنا مسلک واضح کروں گا۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے اسماء وصفات اس کے عین ذات ہیں۔ یعنی ان میں باہم دگر کسی نوع کی مغائرت (دوئی) نہیں ہے۔ نیز یہ اسماء وصفات آپس میں بھی عین یکدگر ہیں۔ مثلاً

(۱) صفاتِ علم وقدرت وارادہ تینوں عین ذات ہیں۔

(۲) اور ذاتِ باری تعالیٰ، عین وجودِ باری تعالیٰ ہے۔

(۳) اور یہ صفات آپس میں بھی عین یک دگر ہیں۔

یعنی ذاتِ حق میں تعدد و تکثر کا کوئی نام ونشان نہیں ہے۔ اور نہ کسی قسم کا تمایز یا تباین ہے۔ اگر ایسا ہو تو وحدت باطل ہو جائے گی۔

(ب) لیکن اسماء وصفات اور شئون واعتبارات نے حضرتِ علم میں اجمالی اور تفصیلی رنگ میں تمایز اور تباین (امتیاز) پیدا کیا ہے۔ تمیزِ اجمالی کو اصطلاح میں تعین اوّل اور تمیزِ تفصیلی کو تعین ثانی کہتے ہیں۔

(ج) تعینِ اوّل کو اصطلاح میں وحدت سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی تعین اوّل کو حقیقت الحقائق یا حقیقتِ محمدیہ بھی کہتے ہیں۔

تعین ثانی کو اصطلاح میں واحدیت کہتے ہیں اور اسی کو حقائق ممکنات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی واجب تعالیٰ کا علم تفصیلی ہی تمام ممکنات کی حقیقت ہے۔

(د) ان حقائقِ ممکنات کو اصطلاح میں اعیانِ ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

(ک) ان ہر دو تعینات علمی (وحدت اور واحدیت) کو مرتبۂ وجوب میں ثابت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان اعیانِ ثابتہ نے وجود خارجی کی خوشبو بھی نہیں سونگھی ہے۔

(و) خارج میں احدیت مجردہ کے سوا اور کچھ موجود نہیں ہے۔ یہ کثرت جو دکھائی دیتی ہے۔ ان اعیانِ ثابتہ کا عکس ہے جو ظاہر وجود کے آئینہ میں، جس کے سوا خارج میں اور کوئی شے موجود نہیں ہے۔ منعکس ہوا ہے۔

(ز) ان اعیانِ ثابتہ کے عکوس (اشیائے کائنات) نے محض تخیلی وجود پیدا کر لیا ہے۔ جس طرح آئینہ میں زید کی صورت منعکس ہو کر بظاہر ایک طرح کا تخیلی وجود پیدا کر لیتی ہے۔ (حالانکہ درحقیقت آئینہ میں کچھ بھی نہیں ہے) یعنی اس عکس (صورتِ زید) کا وجود، خیال کے سوا اور کہیں ثابت نہیں ہے۔ آئینہ میں نہ تو کسی شے نے حلول کیا ہے اور نہ کوئی شے اس پر منقش ہوئی ہے۔ اگر کچھ منقش ہوا ہے تو تخیل میں ہوا ہے جو آئینہ میں وہمی طور پر ظاہر ہوا ہے۔

(ح) یہ متخیل اور متوہم عکس (عالم خارجی) چونکہ صنعتِ ایزدی ہے۔ اس لیے بڑا استحکام اور ثبات رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رفع وہم و تخیل سے رفع نہیں ہو سکتا۔ ثواب اور عذاب ابدی، اسی عکس پر مرتب ہوتا ہے۔

(ط) یہ کثرت جو خارج میں نظر آتی ہے، تین اقسام میں منحصر ہے۔
قسم اوّل تعین روحی۔ قسم دوم تعین مثالی۔ اور قسم سوم تعین جسدی جس کا تعلق عالمِ شہادت (کائناتِ محسوس) سے ہے۔
ان تعیناتِ سہ گانہ کو تعیناتِ خارجیہ بھی کہتے ہیں اور ان کو مرتبہ امکان میں ثابت کرتے ہیں۔

(ی) چونکہ حق تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء و صفات کے سوا جو عین ذات ہیں، شیخ اکبرؒ کے نزدیک کائنات خارجی کا وجود ثابت نہیں ہے۔ اور انہوں نے صورت علمیہ کو اس صورت کا عین سمجھا ہے نہ کہ شبیہ

(مثال)، نیز اعیانِ ثابتہ کی صورتِ منعکسہ کو جو ظاہر وجود کے آئینہ میں نمودار ہوئی ہے۔ ان اعیانِ ثابتہ کا عین تصور کیا ہے نہ کہ ان کی تشبیہ (مثال) اس لیے عقلاً عینیت کا حکم کیا ہے۔ یعنی کائنات عینِ خدا ہے اور خدا عین کائنات ہے۔[۱]

(۱) کائنات، عینِ اعیانِ ثابتہ ہے۔

(۲) اعیانِ ثابتہ، عین علم باری تعالیٰ ہیں۔

(۳) علم باری تعالیٰ، عین ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اس لیے

(۴) کائنات، عینِ ذات باری تعالیٰ ہے۔

(۵) اسی کو اصطلاح میں "ہمہ اوست" کہتے ہیں۔

یہ ہے شیخ کے مذہب کا بیان اجمالی طور پر مسئلہ وحدت الوجود میں اب میں اپنا مذہب بیان کرتا ہوں:-

واجب الوجود کی صفاتِ ہشت گانہ (حیات، علم، قدرت، ارادہ، خلق، سمع، بصر اور کلام) جو اہلِ حق کے نزدیک خارج میں موجود ہیں۔ حق تعالیٰ کی ذات سے خارج میں متمیز ہیں۔ لیکن یہ امتیاز بھی ذات وصفات کی طرح بیچون وبیچگوں ہے۔ اسی طرح یہ صفات بھی ایک دوسری سے متمیز ہیں۔ اگرچہ یہ تمیز بھی بیچون وبیچگوں ہے۔ یعنی ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ذات وصفات میں امتیاز ہے۔ لیکن اس امتیاز کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے۔ لِاَنَّهُ الْوَاسِعُ بِالْوُسْعِ الْمَجْهُوْلِ الْكَيْفِيَّةِ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کائنات کو اس طرح محیط ہے کہ اس کے احاطہ کی کیفیت فہم انسانی سے باہر ہے۔ اسی لیے ذات وصفات میں جو امتیاز ہے وہ بھی فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ کیونکہ تبعّض، تجزّی، تحلیل، یا ترکیب کا اس کی جناب میں گذر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وہاں حال اور محل کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ مختصر

---

[۱] غیر خدا تو موجود ہی نہیں ہے پھر عین کہنے کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا ہے کیا خوب کہا ہے۔ بیدل نے:-

تحقیق ز صنعت گری مرہم مبراست
از ہر چہ در آئینہ نمایند بہ پرہیز

یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ ممکن کے صفات و اعراض سے منزہ ہے ۔
"لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ فِی الذات وَلا فی الصفات وَ لا فی الافعال"
یعنی ذات، صفات اور افعال میں کوئی ممکن اس کی مثال نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ذات و صفات فہمِ انسانی سے بالاتر ہے۔

(ب) اس بے چونی اور بے چگونی کے باوجود، حق تعالےٰ کے اسماء و صفات نے مرتبۂ علم میں تفصیل و تمیز پیدا کی ہے اور ہر صفت اور ہر اسم متمیزہ کے لیے مرتبۂ علم میں ایک مقابل اور نقیض ہے ۔ مثلاً مرتبۂ علم میں صفتِ علم کا مقابل اور نقیض، عدم علم ہے جس کو جہل سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ اسی طرح صفتِ قدرت کا مقابل، عدم قدرت ہے ۔ جسے عجز کہہ سکتے ہیں ۔ وقس علیٰ ھذا ۔

(ج) اِن صفاتِ متقابلہ نے بھی حق تعالیٰ کے علم میں تفصیل و تمیز پیدا کی ہے اور اسی بناء پر اپنے متقابلہ اسماء و صفات کے آئینے اور ان کے عکوس کے مظاہر بن گئے ہیں ۔ فقیر کے نزدیک وہ عدمات، مع عکوسِ اسماء، حقائقِ ممکنات ہیں ۔ بالفاظِ دگر، وہ عدمات، ان ماہیات کے لیے بمنزلۂ مواد ہیں ۔ اور وہ عکوس، اس مواد میں بمنزلۂ صُوَرِ حلول کردہ ہیں ۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:۔

(۱) شیخ اکبر کے نزدیک، حقائقِ ممکنات وہ اسماء و صفات ہیں، جو مرتبۂ علم میں ایک دوسرے سے متمیز ہیں ۔

(ب) فقیر کے نزدیک حقائقِ ممکنات، وہ عدمات ہیں جو نقیضِ اسماء و صفات ہیں ۔ مع عکوسِ اسماء و صفات، جو مرتبۂ علم میں اِن عدمات کے آئینہ میں ظاہر ہوئے ہیں ۔

جب حق تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان ماہیات میں سے کسی ماہیت کو وجودِ ظلی کے ساتھ رجو پرتوے وجودِ مطلق کا ہے متصف کر کے خارج میں موجود کر دے، تو اس ماہیت پر اپنے وجود کا پرتو ڈالا ۔ اور اس طرح اس کو آثارِ خارجیہ کا مبداء بنایا ۔ پس خارج میں ممکن کا وجود، حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمالات کا ظل یا عکس یا پرتو ہے ۔ مثلاً ممکن الوجود کا علم،

واجب الوجود کے علم کا پرتو ہے، جو اپنے مقابل میں منعکس ہوا ہے۔ اور ممکن الوجود کی قدرت بھی ظلّ ہے یا پرتو ہے، واجب الوجود کی قدرت کا جو عجز میں (جو اس کا مقابل ہے) منعکس ہوا ہے۔ اسی طرح ممکن الوجود کا وجود، واجب الوجود کے وجود کا عکس یا ظل یا پرتو ہے، جو آئینۂ عدم میں (جو وجود کا مقابل ہے) منعکس ہوا ہے۔ اسی مضمون کو نظامی نے یوں ادا کیا ہے :-

نیاوردم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

یعنی میرا وجود، خانہ زاد یا ذاتی نہیں ہے۔ جسے مَیں خودی سے تعبیر کرتا ہوں، یہ "مَنْ" یا یہ "اَنا" بھی تیرا ہی عطا کردہ ہے یعنی میری ماہیت تو عدم ہے۔ مَیں اگر موجود ہوں تو تیرے موجود کرنے سے موجود ہوں۔

لیکن فقیر کے نزدیک کسی شے کا عکس یا ظلّ یا پرتو اس شے کا عین نہیں ہے۔ (گویا یہاں سے حضرت مجددؒ اور شیخ اکبرؒ میں اختلاف شروع ہوتا ہے) بلکہ اس کا شبیہ و مثال ہے اور منطقی طور پر ثابت ہے کہ ظلّ اور ذی ظلّ، عین یک دگر نہیں ہو سکتے۔ یعنی ان میں مغایرت پائی جاتی ہے اور چونکہ وہ غیر یک دگر ہیں، اس لیے ایک کو دوسرے پر حمل نہیں کر سکتے۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کائنات، حق (خدا) ہے یا حق کائنات ہے۔ غور کرو :-

حق تعالیٰ ذی ظلّ ہے یعنی واجب الوجود ہے۔
کائنات ظلّ ہے یعنی ممکن الوجود ہے۔
ذی ظلّ اور ظلّ میں غیریت پائی جاتی ہے۔
اِسلئے یہ کائنات، عین خدا نہیں ہے۔

پس فقیر کے نزدیک ممکن الوجود، کبھی ہرگز واجب الوجود کا عین نہیں ہو سکتا۔ اور اس لیے ممکن کو واجب پر حمل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ممکن کی ماہیت عدم ہے۔ اور واجب کی حقیقت وجود ہے۔

اور وہ عکس جو اسماء و صفات سے اس عدم میں منعکس ہوا ہے، وہ

ان اسماء وصفات کا شبیح (مثال) ہے نہ کہ ان کا عین۔ پس ہمہ اوست کہنا درست نہیں ہے۔ بلکہ ہمہ از اوست کہنا درست ہوگا۔ یعنی جو کچھ کمالات ممکن میں پائے جاتے ہیں، وہ سب حق تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ سے عطا ہوئے ہیں۔ اور حق تعالیٰ ہی کے کمالات کا ظل یا عکس ہیں۔ یہی مطلب ہے اس آیت شریفہ کا:-

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط الخ

اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ الخ

اس کے سوا سب ظلمت ہی ظلمت ہے۔ اور ایسا ہونا بالکل قرین عقل ہے۔ کیونکہ ماسوی اللہ عدم ہے۔ اور عدم، ظلمت سے بدتر ہے بلکہ ظلمت ہی کا دوسرا نام عدم ہے۔ [1]

پس شیخ محی الدین ابن عربی کے نزدیک عالم تمامہ ان اسماء وصفات سے مراد ہے۔ جنہوں نے خانۂ علم میں تمیز پیدا کر کے ظاہر وجود کے آئینہ میں نمود و نمائش حاصل کی ہے۔

لیکن فقیر کے نزدیک عالم تمامہ ان عدمات سے مراد ہے جن میں حق تعالیٰ کے اسماء وصفات منعکس ہوئے ہیں اور وہ عدمات ان عکوس کے ساتھ حق تعالیٰ کی ایجاد سے خارج میں موجود ہو گئے ہیں۔ چونکہ عالم کی ماہیت عدم ہے، اس لیے ظلمت، شر، خبث اور نقص اس کی ذات میں داخل ہے اسی نکتہ کو اس آیت میں واضح کیا گیا ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔

اے انسان! جو کچھ بھلائی تجھے پہنچتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے (کیونکہ وہ ذات پاک منبع خیر ہے) اور جو کچھ برائی تجھے پہنچتی ہے وہ وہ تیرے ہی نفس کی طرف سے ہے (کیونکہ نفس منبع سوء و شر ہے)

---

[1] وجود کی حقیقت اور ماہیات ممکنات کی تحقیق اس مکتوب میں مندرج ہے جو حضرت مجددؒ نے اپنے فرزند اکبر مرحوم کو لکھا تھا۔ ۱۲

پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ عالم، وجود ظلی کے ساتھ خارج میں موجود ہے۔ اور حق تعالیٰ وجود حقیقی کے ساتھ یعنی بذاتِ خود خارج میں موجود ہے چونکہ عالم، حق تعالیٰ کا ظل ہے۔ اس لیے ہم اسے عین حق نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ ایک دوسرے پر حمل کر سکتے ہیں۔

کسی شخص مثلاً زید کے ظل کو زید کا عین نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ اگر ذی ظل کا وجود نہ ہو تو ظل کا وجود بھی نہیں ہو سکتا۔ یعنی ظل اپنے وجود کے لیے ذی ظل کا محتاج ہے۔

اگر یہ کہا جائے شیخ اکبرؒ اور ان کے اتباع بھی عالم کو حق سبحانہٗ کا ظل تسلیم کرتے ہیں، تو ان کے اور میرے مسلک میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضرات کائنات کے وجودِ ظلی کو موہوم قرار دیتے ہیں یعنی اس کا وجود صرف وہم و خیال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہیں، اور وجود خارجی کی خوشبو بھی اس کے حق میں تجویز نہیں کرتے۔ یہ حضرات عالم کثرت کو وجود مطلق کا ظل تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس ظل کو موہوم مانتے ہیں اور خارج میں صرف حق تعالیٰ ہی کو موجودِ حقیقی جانتے ہیں۔

یہ حضرات چونکہ ظل (کائنات) کے لیے وجود خارجی ثابت نہیں کرتے اس لیے اس کو اصل (ذی ظل یعنی واجب تعالیٰ) پر حمل کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے۔

یہ فقیر چونکہ ظل (کائنات) کو خارج میں موجود جانتا ہے اسلئے اس کو ذی ظل پر حمل کرنے کی جسارت نہیں کرتا۔ فقیر اور یہ حضرات دو باتوں میں متفق ہیں:۔

(۱) کائنات کا وجود ظلی ہے۔ حقیقی یا مستقل نہیں ہے۔

(۲) ظل کا وجود، ذی ظل پر موقوف ہوتا ہے۔

اس لیے کائنات اپنے وجود میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ لیکن ان میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ یہ فقیر اس ظل یا ظلی وجود کو خارج میں موجود مانتا ہے اور یہ حضرات اس ظل کو موہوم قرار دیتے ہیں۔ یعنی صرف وہم و تخیل میں تسلیم کرتے ہیں۔ خارج میں احدیت مجردہ (ذات حق) کے

سوا کسی کو موجود نہیں جانتے۔ بلکہ حق تعالیٰ کی صفاتِ ہشت گانہ کو بھی مرتبہ علم کے علاوہ خارج میں تسلیم نہیں کرتے۔

ان کے مقابلہ میں علمائے ظاہر نے افراط کا پہلو اختیار کر لیا۔ یعنی کائنات کو حقیقی معنی میں موجود سمجھ لیا۔ اس افراط اور تفریط میں "حق متوسط" اس فقیر کے حصہ میں آیا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

اگر قائلینِ وحدت الوجود، ظل کو خارج میں تسلیم کر لیتے تو عالم کے خارجی وجود کا انکار نہ کرتے اور اگر علمائے ظاہر اس سِر سے واقف ہوتے کہ عالم ظل ہے اسماء و صفات کا، تو ممکن کے لیے حقیقی وجود ثابت نہ کرتے میرا مسلک یہ ہے کہ عالم کو حق تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہیں ہے۔ " اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" اللہ تعالیٰ تمام کائنات اور مافیہا سے بے نیاز ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ کو عالم کا عین یا عالم کو حق تعالیٰ کا عین قرار دینا میرے لیے بہت دشوار ہے۔"

انتہیٰ بتغیرِ جزوی۔

حضرت مجدد کے مکتوب کا خلاصہ دو سطروں میں یہ ہے:۔

(ا) شیخ اکبرؒ اور حضرت مجددؒ دونوں یہ تعلیم دیتے ہیں، کہ کائنات کا وجود حقیقی یا اصلی نہیں ہے بلکہ ظلی ہے۔

(ب) حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ یہ ظل خارج میں موجود ہے۔

حضرت شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ظل خارج میں موجود نہیں ہے۔

بالفاظِ دگر، اس کا وجود وہم کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھتا جیسے شعلۂ جوالہ کا وجود دکھائی تو دیتا ہے۔ لیکن موجود نہیں ہے۔ یعنی اس کا وجود خارجی نہیں ہے بلکہ وہمی ہے۔ بقول بیدل:۔

بیدلؔ آں گوہرِ نایاب سراغ ٭ محیطے است کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ بآئینۂ ہوشش ٭ گل تواں گفت ولے چیدن نیست

اب میں حضرت مجددؒ کے عقیدہ کی تشریح میں چند سطور سپردِ قلم کرتا

ہوں۔

واضح ہو کہ جب انسان میں غور و فکر کا مادہ پیدا ہوا تو اس نے یہ دیکھا کہ میں بھی موجود ہوں اور کائنات بھی موجود ہے۔ بالفاظِ دگر ہر طرف وجود یا ہستی جلوہ گر ہے۔ سب سے پہلے اس نے اس بات پر غور کیا کہ ہستی ہے تو کیسی ہے؟ یعنی یہ ہستی جو چاروں طرف نظر آتی ہے، یہ تو غیر مستقل ناپائیدار اور عارضی ہے مثلاً فلاں شئے کل نہیں تھی، آج ہے۔ اور چند روز کے بعد پھر نہ ہوگی۔ کسی شے کو ثبات نہیں ہے۔ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اشیائے کائنات (انسان، حیوان، شجر، حجر وغیرہ) سب ممکن الوجود ہیں۔ (ممکن الوجود وہ ہے جس کے لیے ہستی بھی متصور ہو سکے، اور نیستی بھی) لہٰذا کوئی ہستی ایسی بھی ہونی چاہیئے جو احد المقدورین میں سے کسی ایک صورت کو ترجیح دے سکے۔ یعنی عدم اور وجود میں سے مثلاً وجود کو ترجیح دے سکے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی، جو عقلاً محال ہے۔ تو وہ واجب الوجود ہستی کون ہے اور کیا ہے؟ اور کہاں ہے اور کیسی ہے۔ یعنی ہستی کا مبداء اور وجود کا منشاء کیا ہے؟ پس یہی سوال فلسفہ کا نقطۂ آغاز ہے؟

(۱) ایک گروہ نے یہ کہا کہ عقل انسانی اس سوال کے جواب سے عاجز ہے: یہ گروہ فلسفہ کی تاریخ میں لاادریہ (متشککین) کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) دوسرے گروہ نے یہ کہا کہ مادہ اس ساری کائنات کی اصل ہے قائم بالذات اور ازلی ابدی ہے۔ رُوح بھی مادہ ہی کی ایک لطیف شکل ہے۔ مادہ مختلف اشکال میں جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ یہ گروہ مادہ پرست کہلاتا ہے۔

(۳) تیسرے گروہ نے یہ کہا کہ مادہ کے علاوہ رُوح بھی موجود ہے۔ دونوں مستقل بالذات ہیں۔ دونوں ازلی ابدی ہیں، اور یہ دونوں مل کر اس کائنات کے صانع ہیں۔ یہ فلسفہ سانکھ درشن کہلاتا ہے۔ بعض ہندو اور تمام جینی اس فلسفہ کے پیرو ہیں۔

(۴) چوتھے گروہ نے کہا کہ مادہ اور رُوح کے علاوہ خدا بھی موجود اور قائم بالذات ہے۔ گویا تین ازلی ابدی ہستیوں نے مل کر یہ دُنیا بنائی ہے۔

یہ نظریہ مغرب میں فلسفۂ مشائین اور مشرق میں نیائے درشن کہلاتا ہے۔

قرآن حکیم ان چاروں گروہوں کی تردید کرتا ہے۔ اور ان کے برعکس یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ نہ مادہ قدیم ہے، نہ رُوح قدیم ہے، نہ کائنات قدیم ہے، صرف اللہ قدیم ہے۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے، سب حادث ہے۔

اقبال چونکہ قرآن حکیم کے پیرو اور متبع ہیں۔ اس لیے وہ اس کائنات کو قدیم یا ازل یا قائم بالذات تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ یہ کائنات معدوم تھی۔ (یعنی اس کی ماہیت عدم ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی مرضی (مشیئت یا ارادہ) سے موجود کیا تو موجود ہوئی۔

اب ایک مسلمان کے لیے یہ بات تحقیق طلب باقی رہ جاتی ہے۔ کہ اگر یہ کائنات کسی کے موجود کرنے سے موجود ہوئی ہے تو اس پر وجود کا اطلاق کس معنی میں کیا جائے؟

اگر کائنات کا وجود، حقیقی، اصلی، قائم بالذات اور مستقل تسلیم کیا جائے تو مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ تو پیروان مسلک ارسطو یا نیائے درشن یا جین دھرم یا مادہ پرستوں کو زیب دیتا ہے۔ مسلمان کے لیے صرف ایک ہی صورت ممکن ہے۔ کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ کائنات کا وجود مجازی ہے، ظلی ہے، قائم بالغیر ہے، اور عارضی ہے کائنات اگر موجود ہے تو اسے کسی نے موجود کیا ہے۔ اس لیے اس کا وجود، موجد کے وجود سے بالکل جداگانہ نوعیت کا ہوگا۔ یعنی اللہ کا وجود حقیقی اور اصلی ہے۔ کائنات کا وجود مجازی اور ظلی ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس کائنات کو بھی حقیقی معنی میں موجود تسلیم کرتا ہے تو وہ موحد نہیں رہ سکتا۔ غور کیجیے۔

(۱) خدا بھی اِلٰہ ہے۔ رام یا کرشن یا عیسیٰ بھی اِلٰہ ہے۔ یہ شرک فی الذات ہے۔

(ب) خدا بھی حقیقی معنی میں موجود ہے۔ انسان بھی حقیقی معنی میں موجود ہے یہ شرک فی الوجود ہے۔ پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ انسان کا وجود ظلی ہے۔ یہی تعلیم امام غزالیؒ نے دی ہے۔ چنانچہ ایک مستفسر کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"تمام موجوداتِ عالم کا وجود عارضی اور ہنگامی ہے۔ کوئی شے ذاتی طور سے وجود میں نہیں آئی ہے۔ تمام اشیاء کا وجود اللہ تعالےٰ کی ذات سے وابستہ ہے۔ اور اس کا وجود ذاتی اور حقیقی ہے۔ یہی وہی در حقیقت موجود ہے۔

اشیائے کائنات، اس شخص کی نگاہ میں جو ان کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے، بظاہر موجود دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے سوا جو کچھ ہے سب ہلاک ہونے والا ہے۔ تو اس پر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ ہلاکت ازلی اور ابدی ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص وقت مخصوص اور معین نہیں ہے۔ یعنی ساری کائنات ہر وقت معدوم ہے۔ یہ اگر موجود نظر آتی ہے، تو محض اس لیے کہ اسے وجودِ حقیقی سے ایک نسبت حاصل ہو گئی ہے۔ یا یُوں سمجھو کہ یہ پرتَو ہے اسماء و صفاتِ الٰہیہ کا۔ پس یہ قول کہ لَا مَوْجُوْدَ إِلَّا اللّٰهُ بالکل درست اور بجا ہے۔"

یہ چھٹی صدی ہجری کے ایک نامور عالمِ دین کا فیصلہ ہے۔ اب میں موجودہ صدی کے ایک ایسے عالمِ دین کا قول نقل کرتا ہوں جو امام غزالیؒ کی طرح شریعت اور طریقت دونوں کا جامع تھا۔ اور بلاشبہ اُسے اللہ تعالیٰ نے اس دَور کے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے مامور فرمایا تھا :-

"اللہ تعالیٰ کا وجود حقیقی ہے، کائنات کا وجود ظلی ہے۔ اور یہ بات عقلاً اور نقلاً دونوں طرح ثابت ہے۔ اب اگر اس وجودِ ظلی کا اعتبار نہ کیا جائے تو صرف وجودِ حقیقی کا ثبوت ہو گا۔ اور وجود کو واحد کہا جائے گا۔ یہی وحدۃ الوجود ہے۔ اور اگر اس بات کا بھی اعتبار کیا جائے کہ آخر کچھ تو ہے۔ یعنی یہ کائنات بالکل معدوم تو نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نورِ حقیقی کے غلبہ کی وجہ

سے سالک کو کچھ نظر نہ آئے، تو یہ وحدت الشہود ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ نورِ ماہتاب، نورِ آفتاب سے حاصل ہوتا ہے۔ بظاہر دونوں منوّر نظر آتے ہیں۔ اگر نورِ ظلّی کا اعتبار نہ کیا جائے تو صرف آفتاب کو منوّر اور ماہتاب کو تاریک کہا جائے گا۔ یہ وحدت الوجود کی مثال ہے اور اگر ماہتاب کے نور کا یعنی اعتبار کیا جائے کہ آخر اس کے بھی کچھ آثار خاصہ ہیں۔ تو یہ وحدت الشہود ہے۔ ان مثالوں پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرات وجودیہ اور شہودیہ میں جو اختلاف نظر آتا ہے۔ یہ اختلاف محض لفظی ہے۔"

(حکیم الامت مولینا تھانوی)

ان تصریحات سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ایک مسلمان کے لیے وحدت الوجود کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بروئے تعلیمات قرآن اللہ کو خالقِ کائنات تسلیم کرتا ہے، نہ کہ صانع کائنات۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اپنی تالیف "سوانح مولینا روم" میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ وحدت الوجود کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ پہلی صدی ہجری سے تا ایں دم جس قدر علماء اور عرفاء گذرے ہیں سب نے یہی تعلیم دی ہے کہ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ ظلّی ہے۔ اختلاف جو کچھ ہوا ہے، وہ اس بات میں کہ اس ظل کی کیفیت کیا ہے۔

شیخ اکبرؒ یہ فرماتے ہیں کہ ظل موہوم ہے: ہمہ اوست

حضرت مجددؒ یہ فرماتے ہیں کہ یہ ظل موجود ہے: ہمہ از اوست

اقبال اگرچہ کہیں بالکل شیخ اکبرؒ کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی حضرت مجددؒ کے متبع ہیں۔

نوٹ:- میں نے شرح اسرار خودی کے مقدمہ میں اس مسئلہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، شائقین شرح مذکور کے صفحات ۱۸۰ تا ۲۲۵ ملاحظہ فرمالیں۔ تاکہ اس کتاب کی اُن رباعیات کا مطلب ذہن نشین ہو سکے جن میں حضرتِ اقبال نے وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ ۱۲

شرحِ عنوان

اقبال نے رباعیات کے اس مجموعہ کو استعارۃً "لالۂ طور" سے موسوم کیا ہے۔ طُور جیسا کہ سب جانتے ہیں، وہ مقام ہے جہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے حسنِ مطلق کی تجلّی دیکھی تھی۔

لالہ، اقبال کے کلام میں ایک علامت (SYMBOL) ہے۔ یعنی مظہرِ عشق ہے۔ اِسی لیے عالمِ نباتات میں اس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ جیسا کہ سعدی کے اس مصرع سے ثابت ہوتا ہے:۔

ع در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

آگ چونکہ دُور سے سُرخ دکھائی دیتی ہے، اس لیے اسے بھی لالہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چراغ کی لَو کو بھی جو عموماً صنوبری شکل کی ہوتی ہے، لالہ کہتے ہیں۔ اسی لیے اقبال نے اس نور کی چمک کو جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھی تھی، لالہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور چونکہ ان رباعیات میں اکثر و بیشتر مقامات میں حقیقتِ وجود سے بحث کی ہے۔ اور ان کا مرکزی تصور، ظہور یا تخلیق ہے۔ اس لیے ان رباعیات کا عنوان "لالۂ طور" قرار دیا ہے۔ یعنی ان رباعیات میں اسماء و صفاتِ الٰہیہ کی تجلّیات کا بیان کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دگر، یہ رباعیات وہ تجلّیات ہیں جو حسنِ مطلق نے شاعر کے دل پر نازل فرمائیں، اور اس نے بذریعہ الفاظ ان کی تصویریں صفحۂ قرطاس پر کھینچ دیں +

شہیدِ نازِ او بزمِ وجود است — نیاز اندر نہادِ ہست و بود است

نمی بینی کہ از مہرِ فلک تاب — بسیمائے سحر داغِ سجود است

بنیادی تصور چونکہ یہ پہلی رباعی ہے، اس لیے دستورِ قدیم کے مطابق اقبال نے اس میں حمدِ باری تعالیٰ بیان کی ہے اور ضمناً اپنا مسلک بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی وحدتِ شہود کا نظریہ پیش کیا ہے اس نظریے کی رُو سے وجودِ واحد کا اثبات، حقیقتین میں کیا جاتا ہے۔ یعنی ذی ظل بھی حقیقت ہے اور ظل بھی حقیقت ہے۔ یعنی عالم اور معلوم دونوں موجود ہیں۔ اگرچہ (خدا) عالم کا وجود حقیقی ہے (کائنات) معلوم کا وجودِ ظلی ہے

وحدتِ شہود اور وحدتِ وجود میں فرق یہ ہے کہ

(۱) وجودِ واحد در حقیقتین مانا جائے تو وحدتِ شہود ہے۔

(۲) وجودِ واحد در حقیقتِ واحد تسلیم کیا جائے تو وحدتِ وجود ہے۔

وجودِ حقیقی کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہے۔ خالق ہے۔ معبود ہے۔ محتاج الیہ ہے۔ وجودِ ظلی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ معلوم ہے، مخلوق ہے عبد ہے، محتاج ہے۔

مطلب "شہیدِ ناز" میں خالص تغزل کا رنگ ہے۔ شعرا اس ترکیب سے عاشق مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے

"نیاز" کے دو معنی ہیں (۱) رنگِ عاشقی (۲) شانِ احتیاج۔ اور اس رباعی میں یہ دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

اقبال نے اپنے کلام میں ناز اور نیاز یہ دو لفظ جا بجا استعمال کیے ہیں۔ ناز بھی دو معنوں میں مستعمل ہے (۱) اندازِ معشوقانہ، رنگِ محبوبی (۲) شانِ استغنا، یا شانِ بے نیازی۔

بیٹھے بیٹھے حکم دے بیٹھے وہ قتلِ عام کا
جب کہا یہ کیا؟ تو بولے نازِ معشوقانہ تھا

لفظِ نیاز کے پہلے معنی کے اعتبار سے رباعی کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری کائنات حسن مطلق پر مفتون ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کا جذبہ ہر شئے کی سرشت (نہاد) میں داخل ہے۔ دیکھ لو! یہ مہر فلک تاب سحر کی پیشانی پر سجدہ ہائے نیاز کا داغ بن کر چمک رہا ہے۔

بالفاظِ دگر یہ کائنات، محبوب حقیقی کی شانِ شہود کا نتیجہ ہے۔ یعنی ہر شئے میں وہی جلوہ گر ہے۔

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

دوسرے معنی کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات خلقت کا ہر ہر فرد اپنے وجود اور اپنی بقا کے لیے اس کا محتاج ہے۔ افتقار الی الواجب (وجود حقیقی کی طرف احتیاج) ہر ممکن کی عینِ فطرت ہے۔ ہر شئے میں احتیاج کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شئے جو عدم سے وجود میں آئی ہے، اپنی اصل کے اعتبار سے ذاتِ واجب کی محتاج (نیاز مند) ہے۔ غور سے دیکھو! یہ آفتاب سحر کی نیاز مندی پر ایک روشن دلیل ہے۔ یعنی یہ کائنات تمام تر رہونِ منت ہے آفتاب کی۔ اور آفتاب بذاتِ خود محتاج ہے خالقِ کائنات کا۔

شاعر نے آفتاب کو استعارۃً سحر کی پیشانی پر سجدہ ہائے نیاز کا داغ قرار دیا ہے۔ یعنی آفتاب کیا ہے؟ سحر کی نیاز مندی پر ایک روشن دلیل ہے۔ اگر خدا نہ ہوتا، تو آفتاب بھی نہ ہوتا۔ اور آفتاب نہ ہوتا تو سحر کہاں ہوتی؟ یعنی ساری کائنات اپنے وجود اور بقا میں خدا کی محتاج ہے۔ ۱۲

دلِ من روشن از سوزِ درون است	جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد	کسے کو عشق را گوید جنون است

بنیادی تصور عشق، زندگی کی حقیقت (رمز) ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کی بدولت میرا دل منور ہو گیا ہے اور دل کے منور ہو جانے کی وجہ سے میری نگاہ اس کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو گئی ہے۔ یعنی عشق وہ طاقت ہے۔ جس کی بدولت انسان کائنات کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور کائنات کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ مظہر ہے اسماء و صفاتِ الٰہیہ کی۔ ہر شے میں اس کی تجلی ہو رہی ہے۔ اگر اس کی تجلیات کا سلسلہ ایک لمحہ کے لیے بھی منقطع ہو جائے تو یہ کائنات معاً نیست و نابود ہو جائے۔ کیونکہ اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے۔ بلکہ مستعار ہے۔

اس لیے جو شخص عشق کی اہمیت سے منکر ہے، یا جو شخص عشق کو محض جنون سمجھتا ہے، وہ زندگی (کائنات) کی حقیقت سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔

فلسفی اس کائنات کو درحقیقت موجود سمجھتا ہے۔ اور یہ تصور ساری خرابیوں کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر یہ کائنات درحقیقت موجود ہے تو خدا کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جین دھرم اور سانکھ درشن کے پیرو جو کائنات کو بذاتِ خود، موجود تسلیم کرتے ہیں۔ وہ خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ پھر منطقی طور پر خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس لیے عاشق یہ کہتا ہے کہ حقیقی معنی میں صرف خدا موجود ہے۔ اور یہ کائنات بذاتِ خود موجود نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اسے خدا نے خلعتِ وجود عطا کیا ہے۔ پس حقیقتِ کائنات یہ ہے کہ اس کی کوئی حقیقت

نہیں ہے۔ یعنی وہ اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہے نہ کہ موجود
وہ اس لیے موجود ہے کہ اسے خدا نے موجود کر دیا۔

بباغاں باد فروردیں دہد عشق
براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق

شعاع مہر او قلزم شگاف است
بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

بنیادی تصور کائنات میں ہر جگہ اور ہر شے میں عشق ہی کی جلوہ گری ہے۔

مطلب واضح ہو کہ اقبال نے اپنے کلام میں عشق کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے :-

(۱) ایک تو عرفی معنی ہیں۔ یعنی محبت جو محب کو محبوب سے ہوتی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں (۱) انسان کا انسان کے ساتھ عشق۔ (۲) انسان کا خدا یا رسول کے ساتھ عشق۔ پہلی صورت کو عشق مجازی اور دوسری کو عشق حقیقی کہتے ہیں۔

(۲) اُبھرنے کی آرزو یا نمود کا جذبہ۔ اس اعتبار سے، عشق اس کائنات میں ایک عنصر فعال کی حیثیت رکھتا ہے اور اس رباعی میں اقبال نے عشق کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

بریں تقدیر رباعی کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق اس نہج پر فرمائی ہے کہ یہاں ہر ذرہ محو خود نمائی ہے۔ ہر شئے ظہور کی آرزو مند ہے۔ ہر شئے میں ظاہر ہونے کا جذبہ کارفرما ہے اور اسی جذبۂ نمائش کو اقبال نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ باغوں اور صحراؤں میں جو پھول کھلتے ہیں اس کا باعث یہ ہے کہ گلوں میں اپنی نمائش کا شدید جذبہ کارفرما ہے اور یہی جذبہ (عشق) انہیں شگفتگی پر مائل کرتا ہے۔ اسی کی بدولت اس دنیا کی رونق برقرار ہے اور یہ جذبہ ہر جگہ کارفرما ہے۔ زمینی اشیاء کے علاوہ سمندر کی تہ میں جو حیوانات پائے جاتے ہیں، ان میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ چنانچہ

یہی جذبہ ہے جو مچھلی کو قعرِ دریا میں راستہ دکھاتا ہے۔ اور وہ سطحِ آب پر آجاتی ہے۔

نوٹ:۔ لفظِ ماہی برل کر اقبال نے تمام غیر ذوی العقول حیوانات مراد لیے ہیں۔ یعنی جذبۂ نمود و نمائش کائنات کی ہر شے میں کارفرما ہے۔ ۱۲

عقاباں را بہائے کم نہد عشق	تذرواں را بباز آں سر دہد عشق
نگہ دارد دلِ ما خویشتن را	ولیکن از کمینش بر جہد عشق

بنیادی تصور عشق (جذبۂ محبت) ایک فطری جذبہ ہے۔ جو ہر انسان میں کارفرما ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ عشق کا طریق کار، دنیا سے نرالا ہے۔ عام طور سے لوگ (پیروانِ عقل و خرد) عقاب کو بیش بہا اور چکور (تدرو) کو کم قیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن عشق کی بارگاہ میں مغرور، سرکش، خونریز (عقاب کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ تو عاجزوں مسکینوں اور حلیم الطبع (تدرو) افراد کو سربلندی عطا کرتا ہے۔ یعنی عشق میں وہ طاقت ہے کہ اس کی بدولت تدرو (کمزور) عقاب (طاقتور) پر غالب آسکتا ہے۔ عشق کمزوروں کو طاقتور بنا دیتا ہے۔

اگرچہ انسان عافیت کوشی کرنے کی بنا پر عشق سے جی چراتا ہے لیکن عشق تو ہر انسان کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ اس لیے وہ اپنی کمین گاہ سے نکل کر اپنے شکار (انسان) پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اور اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ عقل انسان سے یہ کہتی ہے کہ عشق کی راہ بہت کٹھن ہے۔ اس لیے اس سے احتراز واجب ہے۔ لیکن عشق عقل پر غالب آجاتا ہے۔ بالفاظِ دگر عشق ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔

بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیِ عشق　　بجانِ ما بلا انگیزیِ عشق

اگر این خاکداں را وا شگافی　　درونش بنگری خونریزیِ عشق

بنیادی تصور | کائنات میں ہر جگہ عشق ہی کی حکومت ہے۔

مطلب | یہاں عشق سے جذبۂ نمائش مراد ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ عالمِ نباتات، ہو یا عالمِ حیوانات، ہر جگہ ہر شئے میں جذبۂ نمود و نمائش کارفرما ہے۔ یہی جذبہ گلِ لالہ میں رنگ آمیزی کرتا ہے۔ یہی جذبہ انسانوں کو مشکلات کا مقابلہ کرنے پر مائل کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر تم اس کائنات کو چیر کر دیکھ سکو، تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس کی بنیاد ہی جذبۂ نمود پر ہے۔ اگر یہ جذبہ فنا ہو جائے، تو رفتہ رفتہ ساری کائنات فنا ہو جائے گی۔

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است　　نہ با ہر کس محبت سازگار است

بروید لالہ با داغِ جگر تاب　　دلِ لعلِ بدخشاں بے شرار است

بنیادی تصور | دنیا میں ہر شخص فرہاد یا مجنوں نہیں بن سکتا۔ یعنی ہر شخص میں عشق کی اہلیت یا استعداد نہیں پائی جاتی

بقولِ سرمدؔ

ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

مطلب | کہتے ہیں کہ نہ تو اللہ نے ہر شخص کو محبت کی دولت عطا فرمائی ہے۔ اور نہ ہر شخص کو یہ نعمت (محبت) راس آسکتی ہے عشق اگرچہ ایک عالمگیر جذبہ ہے لیکن جب تک کسی شخص میں عشق کرنے کی صلاحیت نہ ہو، وہ اس نعمت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔

اگر مثال درکار ہو تو دیکھو! لالہ کے دل میں محبت کی استعداد پائی جاتی ہے۔ اس لیے وہ محبت کا داغ لے کر دنیا میں آتا ہے۔ لیکن لعلِ

بدخشاں ، اگرچہ رنگ اس کا بھی سرخ ہے ۔ لیکن اس میں "داغ الفت" کہیں نظر نہیں آتا ۔ کیونکہ اس میں محبت کی صلاحیت نہیں ہے ۔
خلاصۂ کلام ایں کہ ہر شے کو یہ نعمت (محبت) عطا نہیں ہوئی ہے ۔

دریں گلشن پریشاں مثل بویم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جویم
برآید آرزو یا برنیاید — شہید سوز و ساز آرزویم

بنیادی تصور | ہر شخص گرفتارِ دامِ آرزو ہے ۔

مطلب | یہاں آرزو سے وہ مخصوص آرزو مراد نہیں ہے جسے اقبال نے عشق یا نصب العین کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ بلکہ اس جگہ یہ لفظ فطرتِ انسانی کا آئینہ دار ہے ۔ یعنی انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی آرزو کے حصول میں کوشاں رہتا ہے ۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی خواہش دامنگیر رہتی ہے ۔ اور جب ایک آرزو (تمنّا) پوری ہوجاتی ہے ، تو اس کے بطن سے دوسری آرزو فوراً پیدا ہوجاتی ہے ۔ اور یہ جذبہ اس قدر شدید ہے کہ انسان روزانہ مشاہدہ کرتا ہے کہ ؎

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس کے باوجود ہر لحظہ شہیدِ سوز و سازِ آرزو رہتا ہے ۔
اس دامِ آرزو سے صرف اللہ کی محبت ، انسان کو رہائی عطا کر سکتی ہے ۔ اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ آگاہ ہو جاؤ کہ صرف یادِ الٰہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوسکتا ہے (۱۳ - ۲۸)

جہاں مشت گل و دل حاصل اوست — ہمیں یک قطرہ خوں مشکل اوست
نگاہ ما دو بیں افتاد ورنہ — جہان ہر کسے اندر دل اوست

بنیادی تصوّر "جہانِ ہر کسے اندرِ دلِ اوست"

تمہید اس رباعی کا مطلب بیان کرنے سے پہلے امام عاشقان جناب حسین رضؓ اور امام عارفان شیخ اکبرؒ کا قول نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، تاکہ اس کا مطلب واضح ہو جائے۔

امام حسین رضؓ نے اپنی حیاتِ ارضی کی آخری شب میں جسے شبِ شہادت کہتے ہیں اپنے جانشین امام زین العابدینؒ کو جو وصایا تلقین فرمائیں۔ ان میں سے سب سے قیمتی یا اہم وصیت یہ تھی۔

اَتَکَ جِرمٌ صَغِیرٌ وَفِیکَ عَالَمٌ کَبِیرٌ وَفِکرُکَ فِیکَ یَکفِیکَ

تو بظاہر جسم حقیر نظر آتا ہے۔ لیکن تیرے اندر بہت بڑا عالم پوشیدہ ہے اس لیے اگر تو اپنے باطن پر غور و فکر کو اپنا شیوہ بنائے تو یہ تیرے لیے کافی ہوگا۔ تجھے سب کچھ اندر ہی مل جائے گا۔ باہر (خارج) کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ یعنی حقیقت پژوہی کے سلسلہ میں خارجی عالم کے بجائے باطنی عالم (دل) کی سیر انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ کیونکہ حقیقت خارج میں نہیں ہے۔ بلکہ باطن میں پوشیدہ ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں کیوں نہ کہہ دوں کہ باہر تو کچھ ہے ہی نہیں، جو کچھ ہے اندر ہی ہے۔

امام عارفان شیخ اکبرؒ اپنی غیر فانی تصنیف فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ قلبِ مومن کی وسعت، کائنات سے بھی فزوں تر ہے۔ کیونکہ قلبِ مومن عرشِ الٰہی ہے اور جو شے مہبطِ انوارِ الٰہی ہو۔ اس کی وسعت کا کیا ٹھکانا! کائنات کی وسعت اور گہرائی مسلم ہے۔ لیکن بہرحال وہ محدود اور متناہی ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قلبِ مومن کی وسعت رحمتِ الٰہی سے بھی فزوں تر ہے۔ کیونکہ رحمت اس کائنات سے منوط و مربوط ہے اور یہ کائنات محدود ہے اس لیے رحمت بھی محدود دائرہ ہی میں کارفرما ہوگی۔ شانِ رحمت بذاتِ خود غیر متناہی ہے۔ لیکن اس کا اظہار بہرحال اسی کائنات ہی کے اندر ہوگا۔ اور یہ کائنات ہر آئینہ محدود ہے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ شیخ اکبرؒ نے موازنہ کے لیے رحمت کا انتخاب اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کی وسعت کا ذکر فرمایا ہے:۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ (۷-۱۵۶)

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری رحمت نے ہر شے کا احاطہ کر لیا ہے یا میری رحمت نے ساری کائنات کو اپنے اندر سما لیا ہے۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ بے شک رحمت بہت وسیع ہے کیونکہ ساری کائنات اس میں سما گئی ہے۔ لیکن قلب مومن اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ غیر محدود اس میں سما جاتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ قلب کی وسعت بھی غیر محدود ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ یہ کائنات بظاہر اس قدر وسیع اور عریض نظر آتی ہے لیکن دراصل ایک مٹی خاک سے زیادہ قیمتی نہیں ہے یعنی اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

"مشتِ گل" میں ابہام ہے (۱) مٹھی بھر خاک یعنی ہیچ و پوچ (۲) جہاں واقعی مٹی ہی سے بنا ہے۔

اس کائنات میں اگر کوئی شے قیمتی ہے تو وہ "دل" ہے۔ بس یہی حاصل (زبدہ) کائنات ہے۔ یہی خلاصہ موجودات ہے۔ لیکن ہماری ساری دشواریاں (ذہنی مسائل) کا مبنیٰ بھی یہی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری دشواریوں کا مبنیٰ ہماری دُوربینی ہے یعنی ہم خدا اور کائنات کو دو مستقل بالذات جداگانہ وجود سمجھتے ہیں۔ یعنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خدا بھی موجود ہے اور یہ کائنات بھی موجود ہے۔ اسی دوربینی (DUALISM) سے سینکڑوں الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ سینکڑوں لاینحل مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ

(ا) ساری کائنات معلوم باری تعالیٰ ہے۔ یعنی اس کے علم میں ہے۔

(ب) یہی علم باری تعالیٰ، متمثل ہو کر قلب بن جاتا ہے۔

(ج) اس لیے ساری کائنات قلب میں محصور ہو جاتی ہے

اِسے آسان لفظوں میں یوں بیان کر سکتے ہیں :-

(ا) دل حاصل کائنات ہے - اس لیے ہر شخص کا جہاں دراصل اس کے دل میں پوشیدہ ہے -

(ب) لیکن انسان دوئی کا خوگر ہے - اس لیے وہ وجودَین (خدا اور کائنات) کو جدا جدا تسلیم کر لیتا ہے - اور

(ج) اس طرح کائنات کو خارج میں موجود جانتا ہے -

(د) حالانکہ خارج میں کچھ بھی نہیں ہے ، جو کچھ ہے وہ اندر ہے یعنی نفس مدرک (PERCEIVING MIND) سے باہر کوئی شئے موجود نہیں ہے -

(ہ) اس لیے کائنات میں انسان کے لیے جو مسئلہ مشکل ہے وہ یہ عالم وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهٖ نہیں ہے بلکہ خود نفس قلب ہی ہے - اگر انسان دل کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو کائنات کی حقیقت سے بھی آگاہ ہو جائے گا اور اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے - اس وقت اسے معلوم ہوگا کہ ساری دنیا مجھ میں یعنی دل میں پوشیدہ ہے - باہر کچھ نہیں ہے -

بیدلؔ مرحوم نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :-

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ

تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ؛ در دل کشا بہ چمن درآ

نوٹ :- مادہ پرست یہ کہتے ہیں کہ مادہ ہی حقیقت ہے - شعور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے - ارباب معرفت اس غلط خیال کی تردید کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شعور حقیقت کائنات ہے - مادہ بظاہر موجود ہے لیکن وہ کوئی مستقل یا جداگانہ ہستی نہیں رکھتا - وہ اپنے وجود میں نفس مدرک (PERCEIVING MIND) کا محتاج ہے - چنانچہ برکلے کہتا ہے کہ اس کا وجود ہمارے حواس پر منحصر ہے - بالفاظ دگر ہمارے شعور سے باہر مادہ یا مادی کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے - برکلے کے فلسفہ کو ہمارے زمانہ میں کروچے (CROCE) نے بڑی قوت کے ساتھ پیش کیا ہے

اس کے فلسفہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کائنات، روح یا شعور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مادہ کا اصلی یا ازلی ہونا کجا اس کا تو مستقل وجود ہی ثابت نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اگر کوئی چیز یقینی ہے تو وہ ہمارا احساس (شعور) ہے۔ اور اگر کائنات کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ تو وہ لامحالہ ہمارے تجربات شعوری سے مربوط و مماثل ہوگی۔ اور چونکہ شعور ذات، اعلیٰ اور ارفع احساس ہے۔ اس لیے کائنات کا شعور بھی ایک اعلیٰ اور ارفع قسم کا شعور ذات ہی ہے، اس کے علاوہ یا اس سے جداگانہ کوئی چیز نہیں ہے۔ ۱۲

بیسویں صدی میں مادہ کا بت خود سائنسدانوں کے ہاتھوں پاش پاش ہو گیا۔ آج تمام سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ مادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ قوت، توانائی، حرکت، فاصلہ، زمان، مکان اور ایتھر سب لاشئے ہیں۔ جن میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے۔ یہ سب دیکھنے والے ہی کے شعور کا امتداد ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھو جوڈ، ایڈنگٹن، جینز۔ طامس اور کروچے کی تصانیف)

پروفیسر روزیٹر لکھتا ہے۔ "مادہ انجام کار برقی پاروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہ برقی پارے (ELECTRON) برقی امواج میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور امواج فنا ہوتی رہتی ہیں۔ ہر شئے فنا کی طرف جا رہی ہے۔ یہ خیال کہ مادہ مستقل بالذات اور ناقابلِ فنا ہے اب بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے۔"

ڈاکٹر ہیری شمٹ لکھتا ہے۔ "نظریہ اضافیت نے زمان و مکان کو لاشئے ثابت کر دیا ہے۔ بلکہ اب تو حرکت بھی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ نیز مادی اجسام کی شکل و صورت ہمارے شعور پر موقوف ہے۔"

گویا بقول اقبال :-

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
چہ زماں و چہ مکاں ؟ شوخیِ گفتارِ من است

والا مضمون ہے۔ اس کائنات کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے۔ اگر ہمارا شعور اس کا اثبات نہ کرے تو اس کا تحقق کسی اور صورت سے نہیں ہو سکتا۔

یورپ کے اکثر نامور ماہرین طبیعیات مثلاً ایڈنگٹن، پلانک، طامس مارگن، جینز، آئنسٹائن، اور وائٹ ہیڈ وغیرہ مادی دنیا کی وضاحت روح (شعور) کے نقطۂ نظر سے کر رہے ہیں۔ چنانچہ آئنسٹائن رقمطراز ہے۔

"میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری کائنات پر شعور کی حکومت ہے۔ خواہ یہ شعور کسی مہندس کا ہو یا شاعر کا یا مصور کا۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جو زندگی میں مفہوم پیدا کرتی ہے۔ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے، تو حیات بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہمیں اس وقت یقین کی طاقت عطا کرتی ہے جب ہمارا علم عاجز اور درماندہ ہو جاتا ہے۔"

سر جیمس جینز لکھتا ہے: "ریاضی اور ہندسہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ کائنات میں ریاضی کے قانون جاری و ساری ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کائنات کو کسی ذی شعور ہستی نے پیدا کیا ہے۔ ورنہ نہ تو دنیا میں قوانین کا وجود ہوتا اور نہ خود ہمارے اندر شعور موجود ہوتا۔"

کائنات کی کوئی مادی تشریح عند العقل قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ پہلے ہم کائنات کو مشین تصور کرتے تھے لیکن اب وہ کسی عظیم الشان تصور کا پرتو معلوم ہوتی ہے۔ شعور مادہ کی دنیا میں اتفاقاً ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ شعور ہی اس مادی دنیا کا خالق ہے۔

"کائنات ایسی ہستی کا پتہ دیتی ہے جو ہمارے شعور کے ساتھ زبردست

لے گویا سائنس اور تصوف دونوں ایک ہی صداقت کا اعلان کر رہے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف طرزِ ادا یا لفظوں کا۔ یعنی سائنس اس کائنات کو کسی ذی شعور ہستی کے تصور کا پرتو قرار دیتا ہے۔ اور تصوف اس کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو (ظل) سے تعبیر کرتا ہے۔ ۱۲

مماثلت رکھتی ہے۔ یعنی شعور ذات رکھتی ہے اسی ہستی نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اور اسی نے اس کائنات کو ارتقائی منازل میں سے گذارا ہے۔"

ان تصریحات سے ثابت ہو سکتا ہے کہ اقبال نے جو یہ بات کہی ہے۔ کہ

نگاہِ مادو بین افتادور نہ!
جہانِ ہر کسے اندر دل اوست

یہ شاعری نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت ہے۔

سائنس نے جس حقیقت کو آج دریافت کیا ہے، ارباب معرفت نے اس کو صدیوں پہلے آسان لفظوں میں بیان کر دیا تھا۔ تصوف نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ واضح کیا ہے کہ۔

لَا مَوْجُودَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی شے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

سحر می گفت بلبل باغباں را — دریں گل جز نہالِ غم نگیرد

بہ پیری می رسد خار بیاباں — ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

بنیادی تصور دنیا میں دلکش اور حسین اشیاء کو ثبات و قرار نہیں ہے۔

مطلب بلبل سے حسن و جمال کا قدردان، اور باغبان سے وہ شخص مراد ہے، جو دُنیا میں حسن و جمال یا حسین و جمیل اشیاء کی تربیت کرے۔ سحر کا لفظ اس لیے لائے ہیں کہ اس وقت پھولوں پر شادابی کا عالم ہوتا ہے۔

بلبل نے باغباں سے کہاں "دُنیا" کا کارخانہ بھی عجیب ہے۔ یہاں کی زمین کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں صرف رنج و غم کا پودا سرسبز رہتا ہے۔ یعنی انسان اس دنیا میں قدرتی طور پر حسین جمیل اشیاء سے دل لگاتا ہے لیکن ان اشیاء کو ثبات و قرار نہیں ہے (حسن ہر لحظہ رو بزوال ہے) اس لیے جب یہ حسین و جمیل اشیاء چند روز اپنی بہار دکھا کر فنا ہو جاتی ہیں تو

عاشق کفِ افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔ دیکھ لو! کانٹے میں نہ حسن ہے نہ دل کشی۔ اسی لیے کوئی شخص اسے حاصل کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن وہ عرصۂ دراز تک شاخ پر لگا رہتا ہے، یعنی بوڑھا ہو کر مرتا ہے مگر پھول، جس میں حسن پایا جاتا ہے، ادھر جوان ہوا، اُدھر موت آئی۔ یعنی صبح کو شگفتہ ہوا شام کو مرجھا گیا۔

نوٹ:۔ اس رباعی کا مضمون اُس نظم سے مطابقت رکھتا ہے
جو بانگِ درا میں اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا

جہانِ ما کہ نابود است بودش | زیانِ تو ام ہمی زاید ز سودش
کہن را نو کن و طرحِ دگر ریز | دلِ ما بر نتابد دی و دوشش

بنیادی تصور ایسی دنیا پیدا کرو جس میں سود (نیکی) زیاں (بدی) پر غالب آ سکے۔

مطلب پہلے مصرع میں جہان کی حقیقت واضح کی ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ماہیت عدم ہے۔
"نابود است بودش" اس کے لفظی معنی ہوئے "اس کی ہستی در اصل نیستی ہے" یعنی وہ بظاہر موجود نظر آتی ہے۔ لیکن بباطن معدوم ہے۔
مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات کوئی مستقل بالذات شے نہیں ہے جس میں تغیر نہ ہو سکے یہ نکتہ اس لیے واضح کیا کہ آگے چل کر اقبال نے ہمیں تجدیدِ کائنات (انقلاب) کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ہمارا حالت یہ ہے کہ ہر شے میں نفع کے ساتھ نقصان کا بھی پہلو موجود ہے۔ زیاں تو زیاں ہے ہی۔ سود میں بھی زیاں مضمر ہے۔ مثلاً حکومت بہت اچھی چیز ہے۔ لیکن اس کا لازمی نتیجہ عیش و عشرت ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہے۔

اس لیے اے مخاطب! اُٹھ اور اُس پُرانے نظام کو تہ و بالا کر دے اور نئی دنیا پیدا کر۔ یعنی ایسی دنیا جس میں نیکی کا پلہ بھاری ہو۔

"دیرِ زود رش" کنایہ ہے موجودہ اخلاقی اقدار (STHICAL VALUE) سے، جو اقبال کی رائے میں پسندیدہ نہیں ہیں، جس کا اظہار انہوں نے "دل بار نیاید" سے کیا ہے۔ یعنی ہمارا دل کائنات کی مروجہ اقدار سے مطمئن نہیں ہے۔

نوائے عشق را ساز است آدم | کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید این خوب تر ساخت | مگر با ایزد انباز است آدم

بنیادی تصور آدم کو خلیفۃ اللہ ہونے کے اعتبار سے مشیتِ ایزدی کی تکمیل میں کوشاں رہنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا، تو وہ اپنے مقام سے نیچے گر جائے گا۔

مطلب آدم کی حیثیت عرفی یہ ہے کہ وہ نوائے عشق کے لیے بمنزلہ ساز ہے۔ یعنی اس کے ذریعہ سے کائنات میں عشق کا ظہور ہوتا ہے اگر آدم نہ ہوتا، تو عشق کا وجود متحقق نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی ساری کائنات میں صرف آدمی ہی "بارِ امانت" اُٹھا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی میں اس کی صلاحیت یا استعداد نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ اسرارِ کائنات کو بے نقاب کر سکتا ہے لیکن بذاتِ خود سب سے بڑا راز ہے جسے نہ وہ حل کر سکتا ہے نہ کوئی اور

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن (اقبال)

آدم سارے رازوں کو حل کر سکتا ہے لیکن اپنے راز کو حل نہیں کر سکتا اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ آدم اپنی اصل کے اعتبار سے خدا کے ساتھ ایسا ارتباط و اتصال رکھتا ہے۔ کہ اس کو لفظوں کے ذریعہ سے بیان

نہیں کر سکتے۔

اتصال بے تکیف بے قیاس
ہست رب النّاس را با جان ناس (رومیؒ)

اس نکتہ کو قرآن حکیم نے بایں الفاظ واضح کیا ہے :۔
نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ
ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں :۔

بیدلؔ نے اس رباعی میں اسی آیت کی تشریح کی ہے :۔
بیدلؔ چمنِ حسن کماہی بنگر ٭ کیفیتِ ہر لور و سیاہی بنگر
کوتاہ نظر! غبارِ اوہام مباش ٭ ما چشم تو ایم ہر چہ خواہی بنگر

اسی حقیقت کو صوفیائے کرام نے (علی الخصوص شیخ اکبرؒ نے) یوں بیان کیا ہے :۔

انائے مقید (انسان) مظہر انائے مطلق (خدا) ہے۔ اسی لیے بلحاظ حقیقت "راز" ہے اور اسی لیے بلحاظ فاعلیت اس کا دمساز ہے۔

ایزد اور آدم میں یہ رشتہ ہے کہ ایزد نے یہ جہاں پیدا کیا اور آدم نے اس کی دلکشی میں اضافہ کیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ آدم کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم اپنے منصب اور مقام کے لحاظ سے ایزد کا رفیق کار یا معاون و مددگار ہے۔

اسی خیال کو اقبال نے "محاورہ مابین خدا و انسان" میں قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم الخ

نوٹ :۔ اس رباعی کے پڑھتے وقت اس حقیقت کو مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ اقبال نے لفظ "انباز" کو جس کے معنی شریک یا معاون یا رفیق کار کے ہیں اس کے حقیقی مفہوم پر محمول نہیں کیا ہے کیونکہ حقیقی معنی میں کوئی ہستی خدا کی شریک نہیں ہو سکتی۔ نہ وجود میں، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں یہ محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے جسے اقبال نے اس لیے اختیار کیا ہے

کہ اس سے مصرع میں بلا کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

ز من انجام و آغاز جویم — ہمہ رازِ جہاں را باز جویم
گر از روئے حقیقت پردہ گیرند — ہماں بوک و مگر را باز جویم

بنیادی تصور انسان، عقل کی مدد سے، کبھی اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ عقل اسے ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رکھے گی۔

مطلب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان، زندگی کے آغاز یا اس کے انجام یعنی اپنی ابتدا، یا انتہا کی تلاش میں سرگردان ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ حقیقتِ حال یہ نہیں ہے۔ بلکہ انسان چونکہ ایک رازِ سربستہ ہے اس لیے وہ عقل کی مدد سے، اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ یہ "من" ایسا راز ہے کہ اس کی تشریح میں ضخیم کتابیں لکھ دو پھر بھی راز ہی رہے گا۔ ؏

رازِ ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

جہاں راز کے دو معنی ہو سکتے ہیں:-

(۱) رازِ ہستی کی تلاش میں ہوں یعنی یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہستی کیوں ہے اور اس کا منشا کیا ہے؟

(۲) میں اپنی تلاش میں ہوں یعنی یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ "من" کیا ہے؟

چونکہ اس معاملہ میں، انسان نے عقل کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ اس لیے وہ کبھی اپنی تلاش میں کامیاب ہو نہیں سکتا۔ حد یہ ہے، کہ اگر اس پر حقیقت بے نقاب ہو جائے، تو بھی وہ شک و شبہ میں مبتلا رہے گا یعنی حقیقت آشکار ہو جانے کے بعد بھی عقل یہ وسوسہ پیدا کر دے گی کہ شاید جو کچھ دیکھا ہے، وہ فریبِ نظر ہو۔

واضح ہو کہ اس مصرع میں اقبال نے عقل کی فطرت، کو نہایت دلکش طریق پر واضح کیا ہے۔ عقل کا متبع کبھی یقین کی منزل میں داخل نہیں ہو

سکتا۔ دنیا میں آج تک کوئی ایسی عقلی دلیل مرتب نہیں ہو سکی ہے جس پر عقل ہی نے اعتراضات وارد نہ کر دیئے ہوں۔ عقل کا کام ہی یہ ہے کہ بناتی ہے اور مٹاتی رہے۔ اسی لیے اقبال نے یہ بات کہی :۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل ٭ بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

یقین تو صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے :۔

مقامِ عشق بے صدق و یقین نیست
یقین جز صحبتِ روح الامین نیست

نوٹ :۔ "برک" فارسی زبان میں تذبذب یا شک و شبہ کے معنوں میں مستعمل ہے اور اس لفظ کو عموماً "مگر" کے ساتھ بولتے ہیں۔ مثلاً فلاں شخص کارش را با بوک و مگر عقب انداختہ لیکن ابن یمین نے "کاش" کے ساتھ لکھا ہے :۔

تو ہم ابن یمین بریں می باش
مگذاراں عمر خود بہ بوک و بہ کاش

دلا نارائی پروانہ تا کے ٭ نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز ٭ طواف آتشِ بیگانہ تا کے

بنیادی تصور انسان کو دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا زیبا نہیں ہے۔

مطلب اے مخاطب! تو کب تک پروانہ کی طرح بے مقصد زندگی بسر کرتا رہے گا؟ اگر تو اپنی عقل سے کام لے، تو تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ جن باتوں کے لیے تو اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج سمجھتا ہے وہ خود تیرے اندر موجود ہیں۔ پروانہ کی زندگی اس کی نافہمی پر دلیل ہے۔ کہ وہ شمع کا طواف کرتا رہتا ہے۔ اگر تو بھی دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرے گا

تو تجھ میں اور پروانہ میں کیا فرق باقی رہے گا؟

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تو حصولِ عزت وجاہ کے لیے دوسروں کی غلامی کرتا ہے! نادان! اگر تو اپنی خودی کی تربیت کرے، تو تجھے دوسروں کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ پس تو شیوہ مردانہ اختیار کر۔ اور اپنے آپ کو اس آگ میں جلا، جو خود تیرے دل میں روشن ہے۔

"سوزِ خویشتن" سے جذبۂ عشق مراد ہے جو ہر انسان میں موجود ہے۔ اگر انسان اس کی صحیح طریق پر تربیت کرے، تو سارے عالم سے بے نیاز ہو جائے۔

اقبال نے اس نکتہ کو اپنی تمام تصانیف میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ اسرارِ خودی میں اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ایک مستقل باب باندھا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "خودی از سوال ضعیف می گردد" چنانچہ لکھتے ہیں:-

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے!
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:-

متاعِ زندگانی ام ہمیں یک شعلۂ عشقش
کہ جان و دلم چوں سوخت خود را کیمیا بینم

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے | تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ دردآشنائے | چو جوئے در کنارِ کوہسارے

بنیادی تصور مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان، اس جذبۂ عشق کی تربیت کرے جو فطرت نے اس کے دل میں ودیعت کیا ہے۔

مطلب اے مخاطب! تیری زندگی کا مقصد یہ ہے، کہ تو اپنی شخصیت (خودی) کو مستحکم کرے۔ تاکہ کوئی دشمن تجھ پر غلبہ حاصل نہ کر

سکے۔ جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی، تو اس میں " دلِ درد آشنا " اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے گا۔ اور تو ایک عالم کو اسی طرح فیض پہنچا سکے گا۔ جس طرح کوہسار میں ندی پوری وادی کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔

مقصدِ حیات تو دلِ درد آشنا ہی ہے —— ایسا دل جو مخلوق کی محبت سے لبریز ہو —— لیکن ایسا دل اُسی سینہ میں زندہ رہ سکتا ہے جو حصار کی طرح مضبوط ہو۔ اور یہ استحکام اس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب انسان اپنی شخصیت کو قلعہ کی طرح مستحکم کرے۔

جو شخص اپنی خودی کی تربیت نہیں کرتا۔ وہ انسان ہونے کے باوجود دراصل مشتِ خاک سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔

ز آب و گل خدا خوش پیکرے ساخت — ولے ساقی بآں آتش کہ دارد
جہانے از ارم زیباترے ساخت — ز خاکِ من جہانِ دیگرے ساخت

بنیادی تصور جہاں خودی، جہانِ آب و گل سے جُدا ہے۔ اُس کی اصل مادی نہیں بلکہ روحانی ہے۔

مطلب خدا نے یہ دنیا تو آب و گل (عناصر اربعہ) سے بنائی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ارم سے بھی زیادہ حسین اور دلکش ہے لیکن اُس نے میرا خمیر، عشق (آتش) سے تیار کیا ہے۔ اور اس خمیر سے یعنی میری خاک سے اس جہان کے علاوہ ایک اور جہان بنایا ہے جو دنیائے آب و گل سے بالکل مختلف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خودی اس عالم مادی سے ماورا ہے۔

اگر "ساقی" سے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات اور آتش سے قرآن مراد لی جائے تو رباعی کا مطلب یہ ہوگا کہ

خدا تعالیٰ نے یہ دنیا آب و گل سے بنائی اور بلاشبہ بہت دلکش بنائی لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی بدولت، بنی آدم کے اندر

ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپؐ نے بالکل نئی دنیا پیدا کر دی۔ چنانچہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں :-

مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید

قوم و آئین و حکومت آفرید!

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود

و لیکن گر نہ رنجی با تو گویم
صنم از آدمی پایندہ تر بود

بنیادی تصور انسان کی ناپائیداری۔

مطلب قیامت کے دن برہمن نے خدا سے کہا کہ انسان کا عرصۂ زندگی بہت مختصر تھا۔ "تابِ شرر" کنایہ ہے اقل قلیل مدت سے۔ لیکن اے خدا! اگر تو ناراض نہ ہو تو میں یہ عرض کروں کہ میری مخلوق تیری مخلوق سے زیادہ پائیدار تھی۔

اقبال نے یہ دلکش اسلوب اس لیے اختیار کیا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل پر انسان کی ناپائیداری کا نقش قائم ہو جائے۔

گذشتی تیز گام اے اخترِ صبح
مگر از خوابِ ما بیزار رفتی

من از ناآگہی گم کردہ راہم
تو بیدار آمدی بیدار رفتی

بنیادی تصور انسان کی غفلت شعاری۔

مطلب اخترِ صبح سے وہ مشہور ستارہ مراد ہے جو طلوعِ آفتاب سے پہلے نمودار ہوتا ہے اور صبح ہوتے ہی غروب ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اے اخترِ صبح! تو بہت تیزی کے ساتھ گذر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو ہمیں کوئی پیغام دینے آیا تھا۔ لیکن جب تو نے دیکھا۔ کہ ہم لوگ جاگنے کے وقت سو رہے ہیں تو تو ہم سے ناراض ہو گیا۔ اسی لیے بہت

جلد ہم سے جُدا ہو گیا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ میں نے (بنی آدم نے) اپنی غفلت کی وجہ سے اپنی راہ گم کر دی۔ میں سوتا رہا، اس لیے اپنا مقصدِ حیات حاصل نہ کر سکا۔ اور تو چونکہ بیدار تھا اس لیے کامیاب ہو گیا۔

اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! ستارے قوانینِ فطرت کی پابندی کرتے ہیں۔ اور اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انسان، قوانینِ فطرت سے آگاہی حاصل نہیں کرتا۔ اس لیے اپنی راہ گم کر دیتا ہے۔ یعنی مقصدِ حیات میں کامیاب نہیں ہوتا۔

تہی از ہائے و ہوے میخانہ بودے — گل ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق — اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

بنیادی تصوّر — دل کا طریق، خرد کے طریق سے جدا ہے۔ یعنی خرد کا طریق فرزانگی ہے۔ دل کا طریق دیوانگی (عشق) ہے۔

مطلب — اگر دل بھی، خرد کی طرح فرزانہ (پابندِ مسلکِ عقل) ہوتا تو ہمارے اندر عشق ہوتا، نہ اس کے ہنگامے ہوتے۔ یعنی یہ دنیا بالکل سرد، خاموش اور بے رونق ہوتی۔ بالفاظِ دگر، اگر دل جو مرکزِ عشق ہے۔ مرکزِ خرد بن جائے تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔

ترا اے تازہ پرواز آفریدند — سراپا لذتِ بال آزمائی
ہوس ما را گراں پرواز دارد — ترا ذوقِ پریدن پر کشائی

بنیادی تصوّر — عشق، انسان میں، ذوقِ پرواز پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ سراپا لذتِ پرواز ہے۔

مطلب — اے عشق! تجھے خدا نے سراپا لذتِ پرواز بنایا ہے۔ اس لیے تو ذوقِ پرواز کی وجہ سے بال آزما اور پر کشا ہے۔ یعنی

ہر وقت بلندی (ترقی) حاصل کرتا رہتا ہے۔ لیکن ہم گرفتار ہُوا و ہوس (زن، زر، زمین) ہیں۔ اس لیے کسی قسم کی رُوحانی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔

اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عاشق میں عشق کی بدولت ذوقِ پرواز پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت روحانی عروج حاصل کرتا رہتا ہے۔ اور کبھی اپنی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہوتا۔ لیکن ابوالہوس ہمیشہ مادیات میں گرفتار رہتا ہے۔ اسی لیے اس کے دل میں پرواز (روحانی عروج) کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

چہ لذت یا رب اندر ہست و بود است	دلِ ہر ذرہ در جوشِ نمود است
شگافد شاخ را چوں غنچہ گل	تبسم ریز از ذوقِ وجود است

بنیادی تصور ہر موجود میں جوشِ نمود پایا جاتا ہے۔

مطلب اے خدا! جب میں غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ تُو نے وجود میں بڑی لذت پنہاں کر دی ہے۔ اسی لیے ہر ذرہ میں جوشِ نمود (ظاہر ہونے کی خواہش) کارفرما ہے۔ جب غنچہ گل شاخ سے پھوٹتا ہے، تو ذوقِ وجود کے سبب سے شگفتہ (تبسم ریز) ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کا تبسم دراصل اس مسرت کا اظہار ہے جو اسے موجود ہونے کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔

شعراء پھول کے کھلنے کو تبسم سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اقبال نے تبسم سے یہ نکتہ پیدا کر دیا ہے کہ غنچہ، ذوقِ وجود کی بنا پر متبسم ہو جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر شئے میں ذوقِ وجود پایا جاتا ہے۔ اور یہی ذوقِ وجود اس میں جوشِ نمود پیدا کر دیتا ہے۔ اور اسی جوش کی بدولت وہ موجود ہو

جاتا ہے، اگر وجود میں لذت نہ ہوتی تو کوئی شئے موجود نہ ہوتی۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را
ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

بنیادی تصور مقصودِ حیات، سوز و ساز ہے نہ کہ طولِ حیات۔

مطلب پروانہ نے دنیا میں آنے سے پہلے خدا سے کہا کہ مجھے زندگی کی تب و تاب سے کچھ حصہ عطا فرما۔ یعنی میں دنیا میں عاشقانہ زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ اس لیے میں طولِ حیات (طویل زندگی) کا آرزومند نہیں ہوں۔ بلکہ یہ عرض کرتا ہوں کہ تو مجھے صرف ایک رات زندہ رکھ لیکن میری وہ رات تمامتر سوز و ساز (عاشقی) میں بسر ہو۔

نوٹ: "سوز و ساز" اقبال کی محبوب اور اسی لیے کثیر الاستعمال تراکیب میں سے ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس کو عاشقانہ زندگی کی مختلف کیفیات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے لیکن ان دونوں لفظوں کا بنیادی تصور یہ ہے:-

سوز = در غمِ جاناں سوختن = فراقِ یار میں تڑپتے رہنا۔
ساز = با غمِ جاناں ساختن = تڑپنے میں لذت محسوس کرنا۔

اقبال کی رائے میں عاشق کی زندگی انہی دو باتوں سے عبارت ہے۔ اور اور یہ زندگی اس قدر وقیع ہے، اس قدر قیمتی ہے کہ وہ اس کے بدلہ میں "شانِ خداوندی" بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

بات یہ ہے کہ یہ کیفیتِ سوز و گداز ہی وہ جوہر ہے جس سے انسان بنایا گیا ہے یعنی انسان سوز و ساز ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسی میں اس کی ہستی کا راز مضمر ہے۔ اس لیے اگر یہ کیفیت "درد و سوز" جو اس کی

ذاتیات ہے، اس کی ذات سے زائل یا منفک ہو جائے تو فنائے ذات لازم آجائے گی۔ کیونکہ منطق میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ذاتِ شئے اور ذاتیاتِ شئے میں کسی حاجل کا تخلل، ممتنع ہے۔

مسلمانان مرا حرفے است در دل   کہ روشن تر ز جان جبرئیل است

نہانش دارم از آزر نہاداں   کہ ایں سرے ز اسرار خلیل است

بنیادی تصور مومن کا مقصود صرف اللہ تعالےٰ ہے۔ کیوں کہ ماسوی اللہ قطعاً اور کلیتہً فانی ہے اور فانی سے دل لگانا سراسر نادانی ہے۔

مطلب چونکہ یہ مشکل ترین رباعیوں میں سے ہے۔ اس لیے مفہوم واضح کرنے سے پہلے الفاظ کی تشریح کرتا ہوں۔

(۱) "مسلمانان!" اس سے معلوم ہوا کہ اس رباعی کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ کیوں کہ غیر مسلم اس رمز کو جو اس رباعی میں پنہاں ہے۔ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جس طرح ایک اندھا رنگ کے۔ اور ایک بہرا آواز کے حسن کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

(۲) "حرفے است" اس سے معلوم ہوا کہ وہ رمز بہت ہی مختصر ہے۔ فلسفہ یا منطق کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جس کے بیان کے لیے ایک طومار درکار ہو پھر اس طومار کی شرح لکھی جائے اور پھر اس شرح پر حاشیے چڑھائے جائیں۔

ارباب بینش سے مخفی نہیں ہے کہ وہ "حرف" اس حقیقتِ کبریٰ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا:۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی شئے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ اور چونکہ موجود نہیں ہے اس لیے اس کو مقصود بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ راقم الحروف اپنے تجربہ کی بنا پر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ جب تک یہ نکتہ ذہن نشین نہ ہو، انسان دُنیا کو مقصودِ حیات بنانے سے باز نہیں آسکتا۔ جسے شک ہو تجربہ کرکے دیکھ لے۔

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ رُوئے شود ہر کہ درو غش باشد

(۳) "روشن تر ز جانِ جبرئیل" اس لیے کہا کہ

(ا) کائناتِ خلقت میں فرشتے، دیگر مخلوقات (مثلاً حیوان یا انسان) سے روشن تر ہیں۔ کیونکہ اُن کی تخلیق خالص نور سے ہوئی ہے۔

(ب) حضرت جبرئیلؑ تمام فرشتوں سے روشن تر ہیں۔ کیونکہ وہ حاملِ وحیِ الٰہی ہیں۔

(ج) لیکن حرفِ زیرِ بحث، ذاتِ الٰہی سے متعلق ہے۔ اس لیے جانِ جبرئیل سے بھی زیادہ روشن ہے۔

(۴) آذر نہاد سے وہ شخص مراد ہے۔ جس کی سرشت میں بت پرستی اس طرح راسخ ہو چکی ہے کہ وعظ و تبلیغ کا اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ آذر، حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام ہے۔ جو بُت پرست تھا۔ یہاں آذر سے خاص شخص مراد نہیں ہے بلکہ یہ لفظ بُت پرستی کا نمائندہ ہے۔

(۵) خلیلؑ۔ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے اور حضرت ابراہیمؑ ساری دنیا کے خدا پرستوں کے نمائندہ ہیں۔

اقبال یہاں ابراہیمؑ کے بجائے خلیلؑ کا لفظ لائے ہیں، یعنی علَم کے بجائے وصفِ خاص استعمال کیا ہے۔ اس میں مصلحت یہ ہے۔ وہ حرف حضرت ابراہیمؑ کی اسی صفتِ خاص کا مظہر ہے۔ اسی کی بدولت حضرتِ ابراہیمؑ کو بارگاہِ الٰہی سے "خلیل" کا لقب عطا ہوا۔

اب مطالب بیان کرتا ہوں:۔

لکھتے ہیں: اے مسلمان! میرے دل میں ایک نکتہ پوشیدہ ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے جانِ جبرئیل سے بھی زیادہ روشن ہے۔ جیسا کہ آذر [illegible] سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں [illegible] ہے براہیم [illegible] چاہتا

کیونکہ وہ حضرت ابراہیم خلیل کے اسرار میں سے ایک سر ہے۔

اس رباعی کی ساری دلکشی اس کے اسلوب بیان میں مضمر ہے کہ اقبال نے اپنے مافی الضمیر کو صاف لفظوں میں واضح نہیں کیا۔ لیکن اس اخفاء کے باوجود اس کی طرف ایسے انداز میں اشارہ کر دیا کہ اگر غور کیا جائے، تو وہ رمز آشکار ہو سکتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اقبال نے اس رباعی میں در پردہ اس حقیقتِ کبریٰ کا انکشاف کیا ہے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ پر یہی حقیقتِ کبریٰ اپنی پوری شدت کے ساتھ منکشف ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تو تھی کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یعنی جب نمرود نے ان کو آگ میں ڈالا تو اُن پر کسی قسم کا خوف یا اضطراب طاری نہیں ہوا بلکہ وہ خوشی خوشی اس آگ میں داخل ہو گئے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ انہیں اس بات پر کامل یقین تھا کہ نمرود یا اس کی آگ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اور یہ یقین ان کے اندر اس لیے پیدا ہوا کہ وہ مَا شَآءَ اللہُ۔ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس یقین نے ماسوی اللہ کی محبت ان کے دل سے بالکل نکال دی تھی اور اسی لیے وہ ماسوی المحبوب سے کلیتہً بے نیاز ہو گئے تھے۔ اسی شانِ بے نیازی نے ان کو وہ مقام عطا کر دیا۔ جس کی بنا پر ان کو خلیل کا لقب حاصل ہوا۔

لہٰذا سرِ ابراہیمی سے مراد ہے مقامِ خلۃ جو اُن کو اس لیے حاصل ہوا کہ انھوں نے غیر اللہ کی محبت اپنے دل سے نکال دی تھی، اور وہ غیر اللہ کی محبت اس لیے نکال سکے کہ ان کو اس بات پر کامل یقین حاصل ہو گیا تھا کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ۔

بات یہ ہے کہ جب ایک شخص کو اس بات پر کامل یقین حاصل ہو جائے کہ ماسوی اللہ موجود ہی نہیں تو اس سے محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مسلمان حقیقی معنی میں موحد بننا چاہتے ہیں، تو

(۱) حضرت ابراہیمؑ کے نقشِ قدم پر چلیں۔

(۲) یعنی غیر اللہ کی محبت دل سے نکال دیں۔

(۳) اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ یقین پیدا کریں کہ

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ

اس یقین کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان ہر وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتا ہے کہ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ

یعنی دنیا میں وہی واقع ہوگا، جو اللہ چاہے۔ اللہ کی مشیت کے خلاف ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی کچھ کرنا چاہیں، تو نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ جب تک اللہ کسی کو قوت عطا نہ کرے کوئی شخص کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ کسی میں کسی قسم کی قوّت، قدرت یا طاقت نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ کوئی حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں ہے۔ جب ہر شخص اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، تو قوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب کسی میں ذاتی طور پر قوت ہی نہیں، تو اس سے خوف کرنا چہ معنی دارد؟

پس یہی سرِ ابراہیمی ہے۔ یہی مقامِ خلّت ہے۔ اور یہی اسلام کی حقیقت ہے۔ یہی اقبال کا پیغام ہے۔

بہ کوشش دو سپاری اے دل اے دل — مرا تنہا گذاری اے دل اے دل

دمادم آرزو آفرینی — نگارے را نداری اے دل اے دل

بنیادی تصور دل ہر وقت آرزو آفرینی میں مشغول رہتا ہے۔

مطلب اقبال کا فلسفہ جس کو انہوں نے اسرارِ خودی میں واضح کیا ہے۔ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا تسلسل تخلیقِ مقاصد (آرزو آفرینی) پر موقوف ہے۔ اگر آرزو کا سلسلہ ختم ہو جائے تو انسان فنا ہو جائے گا۔

از تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اسی لیے اقبال بودھ دھرم، جین دھرم اور ان تمام مذاہب سے اصولی طور پر اختلاف کرتے ہیں، جو آرزو فنا کر دینے کی تلقین کرتے ہیں۔

بیشک نفسِ امارہ تمام خرابیوں (گناہوں) کی جڑ ہے۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس کو "کشتۂ شمشیرِ قرآن" یعنی مسلمان بناؤ۔ نہ یہ کہ اس کو فنا کر دو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

اسلام سے پہلے دنیا میں تمام مذاہب نے نفسِ امارہ سے نجات کی یہی صورت بیان کی کہ اسے فنا کر دو۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے یہ نکتہ بیان کیا کہ اسے مسلمان کر لو۔ یعنی آرزو کے سرچشمہ پر اپنا کنٹرول قائم کر لو۔ تاکہ آرزو تو پیدا ہو۔ لیکن وہ منشائے شریعت کے خلاف نہ ہو۔ اس کو ایک مثال سے واضح کر دوں:۔

ہر انسان میں فطری طور پر ایک جذبہ پایا جاتا ہے، جسے جنسی میلان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چونکہ یہ جذبہ ہر انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لیے دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکتی۔ انسان غیر فطری طریقوں سے اس کو برائے چندے دبا تو سکتا ہے۔ لیکن فنا نہیں کر سکتا۔

اسی جذبہ کی بدولت دنیا میں فحاشی (زناکاری) کا بازار گرم ہوا۔ جب حامیانِ مذہب و اخلاق نے یہ مذموم صورت حال مشاہدہ کی تو انہوں نے اس کا مداوا یہ تجویز کیا کہ منبعِ شر کو فنا کر دو۔ چنانچہ بدھ دھرم، جین دھرم، ہندو دھرم، ایسینزم (ESSENISM) ناسٹیزم (GNOSTICISM) اور ان کی دیکھا دیکھی کلیسیائی مسیحیت[1] نے بھی دنیا کو رہبانیت کی تعلیم

---

[1] مسیحیت، کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جسے حضرت مسیحؑ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس میں نہ تثلیث ہے، نہ تجسّم ہے۔ نہ کفارہ ہے اسی لیے قرآن حکیم اس کی تصدیق کرتا ہے۔

دی۔ یعنی

(ا) خواہشات کو فنا کردو۔

(ب) اس کی صورت یہ ہے کہ دُنیا ترک کردو۔

(ج) دنیا دراصل عورت کا دوسرا نام ہے۔

(د) اس لیے عورت سے تعلق قطع کردو۔

ان تمام مذاہب نے متفقہ طور پر اس مسلکِ رہبانیت کی اہمیت کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ دنیا کے لوگ راہبوں (مجرد مردوں اور عورتوں) کو نہایت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ ساری دنیا رہبانیت کے طلسم میں گرفتار تھی۔ اسلام کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا۔ اس دینِ حقہ نے گم کردہ راہ انسانیت کو بتایا کہ رہبانیت، خلافِ فطرت ہے۔ اس لیے محمود نہیں بلکہ مذموم ہے۔ قابلِ تحسین بات یہ نہیں کہ انسان اپنی آرزوؤں کو فنا کردے۔ (کیونکہ پھر انسانیت کے ارتقاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہےگی) بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں پر قابو حاصل کرے، یعنی آرزوؤں کو شریعتِ اسلامیہ کا پابند بنادے۔

اس ضروری تمہید کے بعد رباعی کا مطلب لکھتا ہوں:۔

کہتے ہیں کہ اے دل! تو ہر وقت کوئے جاناں کے تصور میں غرق رہتا ہے۔ تُو نے مجھ سے اپنا تعلق بالکل منقطع کرلیا ہے۔ تو ہر وقت نئی نئی آرزوئیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجھے آرزو آفرینی کے سوا اور

بقیہ حاشیہ، دوسری صورت وہ ہے جس کی تبلیغ پولوس نے کی۔ اس مسیحیت کا سنگِ بنیاد "عملِ صالح" نہیں ہے بلکہ "کفارہ" ہے۔ قرآن حکیم نے مسیحیت کی اسی صورت کی تردید کی ہے۔ کلیسائے روما نے اسی دُوسری صورت کو اپنا مدارعلیہ بنایا۔ اور پھر اپنی طرف سے بہت سے رسوم اور عقائد کا اس میں اضافہ کردیا۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ جسے شوق ہو، وہ ڈاکٹر ریشڈل کی عالمانہ تصنیف "کفارہ کا تصوّر" کا مطالعہ کرے، یہ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے ۱۲

کوئی کام ہی نہیں ہے۔

رہے در سینۂ انجم گشائی ولے از خویشتن ناآشنائی

یکے بر خود گشا چوں دانہ چشمے کہ از زیرِ زمیں نخلے برآئی

بنیادی تصور آفاق کے ساتھ ساتھ اَلنَّفْس (اپنی ذات) کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے انسان! تو دُور افتادہ ستاروں کے حالات دریافت کرتا رہتا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اپنی ذات (خودی) سے ناآشنا ہے!

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا

اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا! (ضربِ کلیم)

اگر تو اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے تو اسی طرح دنیا میں سربلندی حاصل کرے گا۔ جس طرح دانہ جب اپنے آپ سے واقف ہو جاتا ہے تو ترقی کر کے درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے یعنی اپنا مقصدِ حیات حاصل کر لیتا ہے۔

سحر در شاخسارِ بوستانے چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے

برآور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

بنیادی تصور ہر شخص کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اپنی استعدادوں کو دنیا میں ظاہر کرے۔ یعنی کسی شخص کے لیے جائز نہیں۔ کہ وہ بے عملی کی زندگی بسر کرے۔

مطلب صبح کے وقت ایک مرغِ نغمہ سرا نے مجھ سے کیسی دلکش بات کہی۔ کہ جو کچھ تیرے سینہ میں مخفی ہے — کارکنانِ قضا وقدر نے جو استعداد بھی تیرے اندر ودیعت کی ہے، اسے دنیا پر ظاہر

کروپ ہے ؟ کیوں ؟ اس لیے کہ فطرت نے کوئی شے بیکار تو پیدا ہی نہیں کی ہے ہر شے بظاہر بری ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل اس کائنات کے نظام میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ آہ و نالہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا سرود و نغمہ۔ اگر رنج و غم نہ ہو تو۔ راحت کی قدر کیسے ہو سکتی ہے ؟ لہذا سرود و نغمہ یا آہ و فغاں جو کچھ بھی تجھ میں پوشیدہ ہے۔ تو اُسے ظاہر کردے۔ تاکہ تو اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو سکے۔

تو ایک نکتہ سربستہ گویم ۔۔۔ اگر درسِ حیات از من بگیری

بمیری گر بہ تن جانے نداری ۔۔۔ و گر جانے بہ تن داری نمیری

بنیادی تصور خودی چوں پختہ گردد لازوال است

بالفاظِ دگر ؛۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

یعنی اگر خودی مستحکم ہو جائے تو انسان غیر فانی ہو سکتا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اگر تو مجھ سے درسِ حیات لینا چاہتا ہے تو میں تجھے ایک مخفی نکتہ بتاتا ہوں جس پر عمل کرنے سے حیاتِ ابدی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر تو اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرے گا تو موت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا۔ اور اگر تو اُسے مستحکم کرے گا تو پھر تو لازوال ہو جائے گا۔

اس رباعی کی دلکشی اس کے اندر بیان میں مضمر ہے۔ بظاہر اقبالؒ نے بڑی پیش پا افتادہ بات کہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب جسم میں جان نہ ہوگی تو آدمی مر جائے گا ؟ لیکن رباعی کا سارا مفہوم لفظِ جان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ جان سے اقبال کی مُراد وہ جان نہیں ہے۔ جس کے نکلنے سے آدمی مر جاتا ہے یا حیوان پر مُردہ کا اطلاق ہو جاتا ہے بلکہ یہاں "جان" سے وہ خودی مراد ہے جو پختہ ہو چکی ہو۔

یعنی اگر تیرے جسم میں ایسی خودی کارفرما ہے، جسے تو نے مستحکم کرلیا۔ ہے۔ تو پھر "ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است"۔ موت نفس ناطقہ کا تعلق بدن سے بیشک منقطع کردے گی۔ لیکن خود نفس ناطقہ اگر اسکی تربیت ہو چکی ہے، غیر فانی ہو جائے گا۔ یعنی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نوٹ:۔ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ صرف وہی نفوس (EGOS) موت کے بعد زندہ رہیں گے (ترقی کر سکیں گے)، جو موت کا زبردست جھٹکا (SHOCKS) برداشت کر سکیں گے۔ اور موت کا صدمہ وہی خودی برداشت کر سکے گی۔ جس میں برداشت کرنے کی طاقت ہوگی۔ اور یہ طاقت اسی خودی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کی تربیت اور پرورش اقبالی فلسفہ کے مطابق ہو چکی ہے۔ اس کی تفصیل اسرار خودی اور رموز بے خودی میں مندرج ہے۔۱۲

بہل افسانۂ آں پاچراغے | حدیث سوز او آواز کوشش است
من آں پروانہ را پروانہ دانم | کہ جانش سخت کوش شعلہ نوش است

بنیادی تصور اقبال کی نظر میں عاشق وہ ہے، جو سخت کوش بلکہ شعلہ نوش ہو۔

مطلب کہتے ہیں کہ مجھے اس پروانے (پاچراغ) کی داستان مت سناؤ جو اپنے آپ کو شمع کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے یعنی فنا ہو جاتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو اس پروانے کو پروانہ (حقیقی عاشق) سمجھتا ہوں، جو سخت کوش اور شعلہ نوش ہو۔

تبصرہ اس رباعی میں اقبال نے اپنا فلسفہ پیش کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ یہاں "پروانہ" سے انسان مراد ہے۔ اور انسان جب کوچۂ عشق میں قدم رکھتا ہے تو دو حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اس پر طاری ہو جاتی ہے۔
(۱) بعض لوگ جذبۂ عشق سے مغلوب ہو کر مجذوب (پاچراغ) ہو جاتے ہیں

وہ پھر اپنے ہوش میں نہیں آتے ۔ اسے حالت جذب کہتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوتی۔ عاشق پر یکساں حالت مستی طاری رہتی ہے۔

(ب) بعض لوگ اس جذبہ سے مغلوب نہیں ہوتے۔ بلکہ مسلسل رُوحانی ترقی کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ محبوب کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ یعنی اُن کی ہستی مظہر صفات باری تعالیٰ بن جاتی ہے۔ لیکن وہ بالکل نارمل (اعتدالی) زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسے حالت سلوک کہتے ہیں۔

وصل الی اللہ یعنی خدا تک پہنچنے کے یہ دو مشہور طریقے ہیں۔ لیکن اقبال جذب کے بجائے سلوک کے قائل (علمبردار) ہیں۔ ابتداءً جذب بھی مطلوب اور کارآمد ہوتا ہے۔ لیکن جب دل میں سوز و گداز کی مناسب حال کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو پھر عاشق جذب کی منزل سے نکل کر سلوک کی منزل میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ابتداء میں انجن کی حرکت کے لیے بھاپ اشد ضروری ہے۔ اس کے بغیر حرکت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ڈرائیور پہلے اپنی ساری توجہ بھاپ بنانے پر مبذول کرتا ہے۔ لیکن جب یہ چیز مناسب مقدار میں پیدا ہوجاتی ہے تو مزید تیاری بند کر دیتا ہے۔ کیونکہ مقصود بھاپ نہیں ہے بلکہ حرکت یعنی منزل تک پہنچنا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ مرتبہ کمال (شعلہ نوشی) حاصل کرنے کے لیے جذب اور سلوک دونوں ضروری ہیں۔ اسی لیے اقبال نے فقیر کی صفت بایں الفاظ بیان کی ہے:۔

قلب او را قوت از جذب و سلوک
پیش سلطان، نعرہ او، لاملوک

یعنی مومن کا قلب، جذب اور سلوک دونوں حالتوں سے تقویت حاصل کرتا ہے۔ لیکن جذب، مقصود حیات نہیں ہے۔ بلکہ سلوک، مقصود حیات ہے۔ اسی لیے اقبال نے یہ کہا کہ میں اس پروانہ (انسان) کو پروانہ (عاشق) سمجھتا ہوں جو خم کا خم چڑھا جائے۔ لیکن اس کا قدم نہ ڈگمگائے۔ بلکہ صوفیوں کی اصطلاح میں پورا سمندر پی جائے لیکن ہوش میں رہے۔ (یہاں "سمندر" سے انائے مطلق مراد ہے)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بروئے تعلیماتِ قرآنی، سلوک، مقصودِ حیات ہے کیونکہ اس میں سالک غیر محدود ترقی کر سکتا ہے۔ اسی لیے اقبال جذب پر سلوک کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس رباعی میں "سخت کوش" اور "شعلہ نوش" یہ دو لفظ بہت غور طلب ہیں، کیونکہ پورا سلوک انہی دو لفظوں میں بند ہے۔ بالفاظِ دگر، اسلامی تصوف کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلمان کو سخت کوش اور شعلہ نوش بناتا ہے۔

(۱) سخت کوش کا مطلب یہ ہے کہ سالک یا عاشق (مومن) ہر وقت جدوجہد میں مشغول رہتا ہے اور یہ اسلامی تصوف کی پہلی خصوصیت ہے جو اسے عجمی یا غیر اسلامی تصوف سے متمیز کرتی ہے۔ غیر اسلامی تصوف، انسان کو افسردہ مایوس، تن آسان، کاہل اور دوسروں کا دستِ نگر بناتا ہے۔ لیکن اسلامی تصوف جس کی تعلیم حضور سرکارِ نامدار آقائے دوجہاںؐ اور حضورؐ کے صحابہؓ نے دی۔ مسلمان کو سخت کوش (مجاہد) بناتا ہے۔ کیونکہ آیت قرآنی لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (انسان کو صرف وہی ملے گا۔ جس کے لیے وہ کوشش کرے،) ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتی ہے۔

(ب) شعلہ نوش سے مراد یہ ہے کہ پروانہ کی طرح فنا ہو جائے۔ بلکہ محبوب کی صفات کو آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کرے۔ یہاں تک کہ اس کی شخصیت سے محبوب کا رنگ جھلکنے لگے۔ یعنی بقول مرشدی و سیدی حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ۔

" او در من و من در وئے" والا معاملہ ہو جائے۔ اسی حالت کو اسلامی اصطلاح میں بقاء باللہ کہتے ہیں۔

یوں سمجھو کہ سالک پہلے نفس امارہ کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ اسی کو سخت کوشی کہتے ہیں، یعنی اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بناتا ہے۔ (یہی سخت کوشی ہے یہی جہاد اکبر ہے) اس کو اصطلاح میں مقام فنا فی اللہ کہتے ہیں۔

جب سالک فنا فی اللہ ہو جاتا ہے، تو اس میں خدائی صفات پیدا

ہو جاتی ہیں۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

اس کو اصطلاح میں مقام بقاء باللہ کہتے ہیں، یعنی وہ مقام ہے جس میں سالک خودی کے ساتھ نہیں بلکہ خدا کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

ہندو دھرم، جین دھرم، بودھ دھرم وغیرہ فنائے کل کی تعلیم دیتے ہیں، لیکن اسلام، فنا کے بجائے بقاء کا نصب العین پیش کرتا ہے (اور یہی اسلامی تصوف کا طغرائے امتیاز ہے) اور یہ نصب العین قرآن حکیم کی اس آیت سے مستنبط ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا
يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝

پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کا خواہشمند ہو، اُسے لازم ہے کہ نیک کام کرے (اتباع شریعت) اور اپنے رب کی اطاعت میں کسی کو شریک نہ کرے (غیر اللہ سے قطع نظر کرے)۔

اس آیت سے بدلالت النص ثابت ہے کہ مومن کا آئیڈیل لقاء (ملاقات) ہے) اور اس کے لیے اس کا باقی رہنا لازمی ہے۔ اگر وہ فنا ہو جائے، تو لقاء عقلاً ناممکن ہے۔ ملاقات کے لیے دونوں کا وجود شرط ہے۔

ترا از خویشتن بیگانہ سازد — من آں آبِ طربناکے ندارم
بیا زارم بجو دیگر متاعے — چو گل جز سینہ چاکے ندارم

بنیادی تصور اقبال نے خود فراموشی کے بجائے خود شناسی کا پیغام دیا ہے۔

مطلب آب طربناک کنایہ ہے شراب سے۔ اور شراب کنایہ ہے پیغام سے۔ بازار کنایہ ہے کلام یا تصانیف یا تعلیمات سے۔

سینۂ چاک کنایہ ہے طرزِ عاشقی یا عاشقانہ زندگی سے ۔

کہتے ہیں کہ میرے میخانہ میں وہ شراب نہیں ہے جو تجھے دیوانہ یا ازخود رفتہ بنا دے ۔ یعنی میں نے قوم کو فنا کا درس نہیں دیا ہے ۔ بلکہ اس کے برعکس زندگی کا پیغام دیا ہے ۔

میرے کلام میں از اول تا آخر عشق کا پیغام ہے اور عشق جیسا کہ ارباب عقل جانتے ہیں، انسان کو حیات ابدی عطا کر دیتا ہے ۔

زیاں بینی ز سیر بوستانم   اگر جانت شہید جستجو نیست
نسیم آیم بہست آمد ز گل   بہار من طلسم رنگ و بو نیست

بنیادی تصور اقبال کا پیغام حقیقت نما ہے ۔

مطلب اے مخاطب! اگر تجھ میں محبوب حقیقی سے ملنے یا حقیقت سے آگاہ ہونے کی تڑپ نہیں ہے تو تجھے میرے کلام کے مطالعہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ۔

میں نے اپنی تصانیف (تعلیمات) میں حقیقت واضح کر دی ہے یعنی دوسرے شعراء محض گل کا حال بیان کرتے ہیں لیکن میں نے اپنے کلام میں رنگ گل کے باطن تک کو آشکار کر دیا ہے ۔ اس لیے میرا کلام (بہار) محض لفاظی (طلسم رنگ و بو) نہیں ہے بلکہ حقیقت رس ہے اور اس لیے حقیقت نما ہے ۔

برون از ورطۂ بود و عدم شو   فزوں تر زیں جہان کیف و کم شو
خودی تعمیر کن در پیکر خویش   چو ابراہیم معمار حرم شو

بنیادی تصور مسلمان چونکہ حضرت ابراہیم ؑ کا متبع ہے اس لیے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہادی کی تقلید میں "کعبۃ اللہ" تعمیر کرے

مطلب: یہ رباعی اگرچہ آسان ہے۔ لیکن نفسِ مضمون کے اعتبار سے اقبال کی لاجواب رباعیوں میں سے ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس میں اپنے فلسفہ کو ایسے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے کہ کسی مسلمان کو اس سے اختلاف کی مجال نہیں ہو سکتی۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! بیشک تو طلسم (ورطہ) بود و عدم میں گرفتار ہے یعنی ایک زمانہ تھا جب تو نہیں تھا۔ فی الحال تو موجود ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تو نہیں ہوگا۔ چونکہ تیری ہستی ناپائیدار ہے، اس لیے اس پر ہستی (بود) اور نیستی (عدم) دونوں کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تو نظر آتا ہے۔ اس لیے تجھے موجود کہہ سکتے ہیں۔ لیکن تو معدوم ہو جائے گا، اس لیے تجھے معدوم بھی کہہ سکتے ہیں۔ پس تو وجود (بود) اور عدم کے طلسم (ورطہ) میں گرفتار ہے۔

لیکن تو اگر کوشش کرے تو اس بھنور سے نکل سکتا ہے، بلکہ اس "جہان کیف وکم" اس مادی دنیا سے بالاتر ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کے قوانین کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہے۔ وہ کس طرح؟

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب تو زبان سے اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں حضرت ابراہیم کی ملت میں ہوں یعنی ان کے دین پر ہوں تو پھر ان کی پیروی بھی تجھ پر لازم ہے۔

انہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے "حرم" تعمیر کیا پس تو بھی ان کی تقلید کر اور اپنے جسم میں "حرم" تعمیر کر۔ یعنی خودی کی تربیت کر تاکہ تیرا دل اس لائق ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس میں سکونت اختیار کر سکے۔ اور جب اللہ تعالیٰ تیرے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہو جائے گا۔ تو بلاشبہ تو غیر فانی ہو جائے گا۔ یعنی ورطہ بود و عدم سے نکل جائے گا۔ اور اس کائنات پر حکمراں ہو جائے گا۔ یعنی اس جہان کیف وکم سے فزوں تر ہو جائے گا۔

maablib.org

ز رفعانِ چمن نا آشنایم   بشاخِ آشیاں تنہا سرایم

اگر نازک دلی از من کراں گیر   کہ خونم می تراود از نوایم

بنیادی تصور اقبال نے قوم کو جہاد (جدال و قتال) کا پیغام دیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے مسلمان! میرا کلام یا میری شاعری خواب آور نہیں ہے۔ اس میں عیش و عشرت کا رنگ نہیں ہے۔ بلکہ میری شاعری قوم کے دوسرے شعراء سے بالکل مختلف ہے۔ یوں سمجھ کہ میں اپنے رنگ کے لحاظ سے بالکل منفرد ہوں۔ ؎

بشاخ آشیاں تنہا سرایم

اگر تو جد و جہد (جہاد) سے جی چراتا ہے۔ اگر تو میدانِ جنگ سے گھبراتا ہے، تو میرے کلام کا مطالعہ مت کر کیونکہ میں نے تو قوم کو سرفروشی کا پیغام دیا ہے۔ میرے اشعار سے تو میرے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ اور خون کی یہ بوندیں زبانِ حال سے قوم کو درسِ جہاد دے رہی ہیں۔

جہاں یارب چہ خوش ہنگامہ دارد   ہمہ را مستِ یک پیمانہ کردی

نگہ را با نگہ آمیز دادی   ولی از دل بہ دل بیگانہ کردی

بنیادی تصور دنیا میں ہر شخص کی باطنی کیفیات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔

تشریح الفاظ "مستِ یک پیمانہ" بہت بلیغ ترکیب ہے۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں:۔

(۱) سب نے ایک ہی شراب پی ہے۔ یعنی سب کی اصل ایک ہی ہے اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ

یعنی اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے

(ب) سب ایک ہی محبوب کے پرستار ہیں یعنی سب اسی کے طلبگار ہیں

دوسرے شعر میں تین لفظ غور طلب ہیں :۔

(۱) نگہ ۔ اقبال کے یہاں لفظِ نگاہ دو معنی میں مستعمل ہے۔ کبھی تو وہ اس کو دوسرے شعراء کی طرح اس کے عام مفہوم میں استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً

می شود پردۂ چشم پرکاہے گاہے

دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

یہاں لفظ نگاہ سے مجرد دیکھنا مراد ہے جو آنکھ کا فطری تقاضا ہے لیکن کبھی کبھی اقبال نگاہ سے ایسا دیکھنا مراد لیتے ہیں جس کی تہ میں کوئی مقصد پنہاں ہو ۔ مثلاً عبرت پذیری یا کسی شئے کا کسی خاص زاویہ سے مطالعہ کرنا ۔ مثلاً

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہٰ تو کیا حاصل ؛ دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس شعر میں نگاہ سے محض قوتِ بصارت مراد نہیں ہے بلکہ وہ نگاہ جو دل کے تابع ہو جس کی بدولت انسان اشیائے کائنات کو دیکھ کر عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے نگاہ کو محض دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی مجرد مشاہدۂ اشیاء۔

(ب) دل :۔ اقبال کے فلسفہ میں "دل" بہت اہم اور غور طلب اصطلاح ہے ۔ دراصل یہ تصوف کی بنیادی اصطلاحات میں سے ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صوفی شعراء مثلاً سنائیؒ، عطارؒ، رومیؒ، جامیؒ، عراقیؒ، اور بیدلؒ کے کلام میں ہر جگہ دل ہی نظر آتا ہے۔ کوئی غزل دل کے تذکرہ سے خالی نہیں ہے۔

اقبال چونکہ انہی بزرگوں کے مقلد اور خوشہ چین ہیں ۔ اس لیے وہ بھی "دل" کی فضیلت اور اہمیت کے معترف ہیں۔ چنانچہ زیر نظر رباعیات میں انہوں نے کم و بیش پچیس رباعیات دل ہی کی شان میں لکھی ہیں ۔

واضح ہو کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے دل جو بظاہر مضغۂ گوشت ہے جس کی قیمت موجودہ نرخ کے لحاظ سے ایک روپیہ سے زیادہ نہیں ہے، کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے ۔ بالفاظ دگر زبدۂ موجودات اور خلاصۂ کائنات ہے

یعنی جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب اس دل کے اندر موجود ہے۔ اس حرم صغیر میں عالم کبیر پنہاں ہے۔ اسی لیے انسان کی ساری ترقی اور اصلاح اسی دل کی اصلاح پر موقوف ہے۔ بلکہ انسان دراصل دل ہی کا دوسرا نام ہے۔ دل درمیان نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی لیے دانائے رموز حیات واقف اسرار کائنات، سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ جسد انسانی میں ایک مضغہ گوشت ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر وہ "صالح" ہو جائے تو انسان کلیتہً صالح ہو جائے گا۔ اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو انسان کلیتہً فاسد ہو جائے گا۔ آگاہ ہو جاؤ۔ کہ وہ مضغہ گوشت "قلب" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ارباب تصوف نے جو اسلام کے باطنی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہیں قلب کی اصلاح پر اپنی پوری ہمت مرکوز کر دی۔ اسی لیے متصوفانہ ادب میں دل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ صوفی اپنی تمام تر توجہ قلب کی صفائی پر مبذول کرتا ہے۔ کیونکہ دل جس قدر زیادہ مصفا ہو گا، اسی قدر زیادہ معرفت حاصل ہو گی۔ اسی لیے نبی کے فرائض چہارگانہ میں سے دوسرا فرض منصبی یہی تزکیہ قلب ہے۔ جب تک قلب کا تزکیہ، تصفیہ، اور تجلیہ نہ ہو مسلمان مومن نہیں بن سکتا۔ یعنی اس میں شانِ فقر پیدا نہیں ہو سکتی۔

دل اس قدر اہم اس لیے ہے کہ وہ مرکز عشق ہے (جس طرح دماغ مرکز عقل ہے) اور عشق وہ طاقت ہے، جو انسان کو خدا سے ملا سکتی ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدہ تصورات

ایک بات اور لکھ دوں۔ انسان اپنی کوتاہ بینی اور غلط فہمی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو اپنے سے باہر ڈھونڈتا رہتا ہے۔ حالانکہ وہ باہر نہیں ہے۔ بلکہ اندر ہے۔ یعنی عاشق کے دل میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:۔

حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

اسی حقیقت کو خلاق المعانی مرزا بیدل علیہ الرحمت نے یوں بیان کیا ہے

برون دل نتواں یافت ہر چہ خواہی یافت
کدام گنج کہ در خانہ خراب تو نیست

اسی لیے وہ ہمیں عالم دل کی سیر کا مشورہ دیتے ہیں:-

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ

(ج) جان:- جان سے یہاں انفرادی خودی یا ذاتی شخصیت مراد ہے۔

ان تین لفظوں میں منطقی ربط یہ ہے:-

۱۔ نگاہ، ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔ مادیات سے متعلق ہے۔

۲۔ دل، اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ روحانیات سے متعلق ہے۔

۳۔ جان، سب جانتے ہیں کہ دل اور نگاہ دونوں کا وجود اسی پر موقوف ہے۔

بہ الفاظ دگر، نگاہ اور دل، دونوں عرض ہیں، جان، جوہر ہے۔ جوہر نہ ہو، تو اعراض کا وجود متحقق نہیں ہو سکتا۔

مطلب کہتے ہیں کہ مولیٰ کریم! قربان جائیے تیری شان تخلیق کے! انسان کی کیا طاقت ہے کہ تیری صفت خلاقی کی باریکیوں کو سمجھ سکے!

جب میں اس حقیقت پر غور کرتا ہوں تو سراپا حیرت بن جاتا ہوں کہ تو نے اگرچہ تمام انسانوں کو ایک ہی پیمانہ سے مست و بیخود بنایا ہے۔ اس کے باوجود نگاہ سے نگاہ تو ملتی ہے۔ لیکن نہ دل سے دل ملتا ہے نہ جان سے جان ملتی ہے۔

پہلا اور آسان مطلب تو یہ ہے کہ

کس قدر عجیب بات ہے کہ شراب اور پیمانہ ایک ہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سب مست ہیں۔ لیکن سب کی مستی کی کیفیت جداگانہ ہے کوئی مست دوسرے مست سے نہیں ملتا۔

دوسرا اور عمیق تر مطلب یہ ہے کہ

اے خدا! ہیں سب تیرے ہی طلبگار، لیکن کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ مادیات میں اشتراک ہے۔ لیکن باطنی کیفیات میں اختلاف ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ

(۱) زید اور موہن دونوں گائے کو دیکھتے ہیں تو وہ دونوں یہی کہتے ہیں کہ ہم نے گائے دیکھی۔ اس معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن آگے چل کر دونوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

گائے کو دیکھ کر زید کے دل میں اس کے گوشت کو بطور غذا استعمال کرنے کی رغبت ہوتی ہے لیکن موہن کے دل میں اس کو دیکھ کر اس کی پرستش کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی دونوں نے ایک ہی چیز کو دیکھا لیکن دونوں کے اندر مختلف تاثرات پیدا ہوئے۔

اب اس سے اوپر چلیے تو جس طرح دل سے دل بیگانہ ہے، اسی طرح جان سے جان بیگانہ ہے۔ یعنی ہر فرد انسانیت میں اشتراک کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی ادنےٰ عاجز مسکین اور گمنام کیوں نہ ہو، یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی شخصیت کسی دوسرے کی شخصیت میں مدغم ہو جائے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:-

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سب اسی (ذات مطلق) کے جویا ہیں۔ یعنی سب کا مطمح نظر ایک ہی ہے۔ (نگاہ را بنگاہ آمیز دادی) لیکن اس کے باوجود ہر ایک کا طریق کار یا ہر ایک کی راہ جدا گانہ ہے۔ (دل از دل، جاں زجاں بیگانہ کردی)

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت | شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی | بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

بنیادی تصور تنازع للبقاء میں شرکت کے بغیر ابدی زندگی حاصل نہیں ہو سکتی۔

مطلب سکندر نے خضر سے کہا اور کیا خوب کہا کہ یہ دنیا درحقیقت عرصۂ جنگ ہے، یہاں ہر لحظہ اور ہر جگہ کشمکش حیات کا سلسلہ

جاری ہے۔ بالفاظِ دگر تنازع للبقاء اور بقائے اصلح یہ دونوں قانونِ حیات ہیں جو ہر جگہ کارفرما ہیں۔ لہٰذا تو بھی کائنات (بحروبر) کی اس جنگ (سوزوساز) میں بقدرِ طاقتِ خویش حصّہ لے۔

چونکہ تو اس جنگ میں حصّہ نہیں لے رہا ہے۔ اس لیے گمانِ غالب یہ ہے کہ تو فنا ہو جائے گا۔

اگر تو حیاتِ ابدی کا طالب ہے تو اس جنگ میں حصّہ لے اور اگر جدوجہد (جہاد) میں تجھ پر موت وارد ہو جائے گی۔ تو بلاشبہ تجھے حیات ابدی حاصل ہو جائے گی۔

یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے جسے انہوں نے ہر کتاب میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ یعنی اگر زندگی کی آرزو ہے، تو موت سے ہم آغوش ہو جاؤ۔ غدار نظام علی خاں نے اپنی جان بچائی، نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لیے مر گیا۔ ٹیپو سلطان نے میدانِ جنگ میں شہادت پائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔

آج نظام علی خاں کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ لیکن سلطان شہید کا نام سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ کیا خوب لکھا ہے اقبال نے :-

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

اکبر الہ آبادی نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :-

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اُسے جینا نہیں آیا

نوٹ :- اس تعلیم کا ماخذ حضرت عیسٰیؑ کا وہ قول ہے جسے کلیسا کی غیر فطری تعلیمات کی بناء پر عیسائی لوگ آج تک نہ سمجھ سکے۔

"جو زندگی کا طالب ہو اُسے چاہیے کہ اس سے دستبردار ہو جائے"
لیکن کلیسا نے "یسوع مسیح" کو مصلوب کر کے ان کی اُمّت کے دماغ سے جان دینے کا تصور محو کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ زندگی سے محروم ہو گیا۔"

سریر کیقباد، اکلیل جم خاک — کلیسا و بتستان و حرم خاک
ولیکن من ندانم گوہرم چیست — نگاہم برتر از گردوں، تنم خاک

بنیادی تصور ساری کائنات خاکی (مادی) ہے۔ لیکن خودی (گوہر) غیر مادی ہے۔

مطلب کیقباد کا تخت اور جمشید کا تاج دونوں مادی ہیں اور اس لیے فانی ہیں۔ کلیسا (گرجا) بتخانہ (صنم کدہ) اور حرم (مسجد) یہ بھی مٹی (خاک) ہی سے بنے ہیں اس لیے رُو بزوال ہیں۔ لیکن میرا گوہر (میری خودی) مادی نہیں ہے کیونکہ اگرچہ میرا جسم مادی ہے۔ لیکن میرا تخیل تو آسمانوں سے بھی بالاتر ہے۔

یہاں اقبال نے نگاہ کو تخیل کے معنی میں استعمال کیا ہے اور بنائے استدلال یہ ہے کہ اگر میری خودی بھی مادی ہوتی تو میرا تخیل، مادیات سے بالاتر (برتر از گردوں) نہیں ہو سکتا تھا۔

تخیل یا قوتِ متخیلہ خودی کی ایک صفت ہے۔ اور تخیل کی کارفرمائی پر غور کرنے سے واضح ہو سکتا ہے کہ وہ مادی نہیں ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ موصوف (خودی) بھی مادی نہیں ہے۔

تخیل کے غیر مادی ہونے پر دلیل یہ ہے کہ

(۱) مادی شے پر جو نقش قائم ہو جاتا ہے جب تک اُسے مٹا نہ دیا جائے دوسرا نقش اس جگہ قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن قوتِ متخیلہ میں بیک وقت ہزاروں بلکہ لاکھوں صورتیں منتقش ہیں۔ اور سب ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔

(۲) مادی اشیاء جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہوتی ہیں تو فاصلہ کے لحاظ سے وقت صرف ہوتا ہے لیکن خیال، زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ آپ کراچی میں بیٹھ کر عالمِ خیال میں دمشق اور قاہرہ کی سیر کر سکتے ہیں نیز ابھی آپ کابل میں بیٹھے ہوئے ہیں اگر چاہیں تو دوسرے لمحہ میں نیویارک جا سکتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ گوہرِ انسانی یعنی خودی غیر مادی ہے۔

اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند | دلِ صد پارۂ خوناب بارے
ز ابرِ نوبہاراں گریہ آموز | کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

بنیادی تصور اس رباعی کا بنیادی تصور اور مفہوم دونوں یکساں ہیں۔ یعنی اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! (مسلمان) اگر اللہ تعالیٰ تجھے محبت کرنے والا دِل عطا فرمائے تو تجھے لازم ہے کہ محبت کرنے والوں (عاشقوں) سے قوم کے غم میں جلنے اور سلگنے کا فن سیکھے، تاکہ تو اپنی قوم کی خدمت کرسکے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ افرادِ قوم میں محبت (دین کی خدمت کا جذبہ) پیدا کیا جائے۔

"ابرِ نوبہاراں" کنایہ ہے بزرگانِ دین سے جن کا مقصدِ حیات ابر کی طرح دُوسروں کو فیض پہنچانا ہوتا ہے۔

"گریہ آموختن" کنایہ ہے خدمتِ خلق کے جذبہ سے۔

"اشک" کنایہ ہے جدوجہد یا طریقِ عمل سے۔

"لالہ زار" کنایہ ہے ان نوجوانوں سے جنکے دل میں تبلیغِ اسلام کی تڑپ ہو۔

دمادم نقشہائے تازہ ریزد | بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است | بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

بنیادی تصور مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ اسے ہر وقت عروج حاصل کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ وہ اپنی موجودہ حالت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔

مطلب کہتے ہیں کہ زندگی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ صفحۂ کائنات پر ہر لحظہ نئے نئے نقوش بناتی رہتی ہے۔

جب یہ مسلم ہے تو اے مخاطب! اگر تیرا "امروز" یعنی حال وہی ہے جو تیرا "دوش" یعنی ماضی تھا تو بلاشبہ تو مُردہ ہے۔ زندہ نہیں ہے کیونکہ زندگی تو کبھی ایک صورت پر قانع یا مطمئن نہیں ہوسکتی۔ وہ تو ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔

اسی نکتہ کو اقبال نے ۱۹۳۶ء میں یوں بیان کیا :-

نشان یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں

اس رباعی میں انہوں نے فرد سے خطاب کیا ہے اور اس شعر میں قوموں کا نقشہ کھینچا ہے۔ مطلب دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ فرد ہو یا قوم دونوں کو ہر لحظہ اپنے اندر انقلاب پیدا کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ انقلاب زندگی کا قانون ہے۔ جہاں زندگی ہے، وہاں انقلاب بھی ہے۔ زندگی کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ ہر لحظہ منقلب ہوتی رہتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ تعلیم انقلاب، فلسفۂ اقبال کے ارکان اساسی میں سے ہے اور یہ تعلیم انہوں نے قرآن حکیم سے حاصل کی ہے جو اس دنیا میں انقلاب کا سب سے بڑا داعی ہے۔

اگر اس جگہ یہ سوال دل میں پیدا ہو کہ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان جو اس انقلاب آفریں کتاب کے "حافظ" ہیں، دُنیا میں سب سے زیادہ ساکن اور جامد ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

بدقسمتی سے پہلی صدی ہجری میں ملوکیت نے اپنی بقاء کے لیے ملائیت اور سرمایہ داری اور جاگیرداری اور پیر پرستی سے ساز باز کر کے، اس پیغام انقلاب کو "بیاض سلیمانی" میں تبدیل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اس کتاب میں شکوہِ خسروی کے بجائے "اسم اعظم" اور کائنات کے بجائے جنات کو مسخر کرنے کا طریقہ ڈھونڈنے لگے۔ بالفاظِ دگر اس کی آیات کو قوموں کی تقدیر سازی کے بجائے گنڈوں اور تعویزوں میں استعمال کرنے لگے۔

علماءِ سوء تو ان ظالم بادشاہوں کی شان میں قصیدے پڑھتے رہے۔ یعنی بر سرِ منبر انہیں "ظل اللہ" کہہ کر عوام کو دھوکہ دیتے رہے، اور صوفیائے سُوء ان کو حجرہ نشینی کا سبق پڑھاتے رہے۔ یعنی مزاج خانقاہی میں پختہ کرتے رہے اور جاگیردار، زمیندار اور سرمایہ داران کا خون چوستے رہے۔ تاکہ انقلاب کی آرزو پیدا ہی نہ ہو سکے، اور اگر وہ پیدا ہو تو فوراً مر جائے۔

دین و مروت کے خلاف اس سازش کبریٰ کا نتیجہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور جب تک مسلمانوں میں ملوکیت کی لعنت موجود رہیگی، اصلاح حال کی کوئی توقع نہیں ہے۔ کیونکہ

(۱) جب تک ملوکیت موجود ہے، ملائیت، پاپائیت، برہمنیت، شخصیت پرستی، آثار پرستی، پیر پرستی، زمینداری، جاگیرداری اور سرمایہ داری بھی موجود رہے گی۔

(۲) اور جب تک یہ برکات ارضی و سماوی موجود ہیں عامۃ الناس کبھی ہرگز انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ جب تک روسیوں نے زار بدکردار اور اس کے خاندان شاہی کے جملہ افراد کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا، ان کو ملوکیت اور پاپائیت سے نجات نہیں ملی۔

اقبال نے اس ساری داستان کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے:-

باقی نہ رہی تجھ میں وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد — قیامت ہا کنم در محفلِ خویش
چو خواہم صحبتِ خلوت گزینم — جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش

بنیادی تصور | جلوت اور خلوت، سالک (مومن) کی زندگی کی دو مختلف شانیں ہیں، اور دونوں اس کی روحانی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

مطلب | کہتے ہیں کہ فطرت نے ہر انسان کے دل میں ذوق نغمہ سرائی ودیعت کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اسلئے پیدا کیا ہے کہ وہ باطل سے برسر پیکار رہے۔ اور اُسے مغلوب کر کے دنیا والوں کو زندگی کا پیغام سناتے رہیں حقیقی نغمہ سرائی ہے، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال تک قرآن حکیم ہی کا نغمہ دنیا کو سنایا اور اس سے بڑھ کر وجد آور اور کیف انگیز نغمہ دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے۔

لہٰذا جب سالک (مومن یا مجاہد) عالم ناسوت یا خارجی دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔

"در محفل قیامت افگندن" کنایہ ہے انقلاب سے۔

تاریخ گواہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں نے دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ کیا کوئی شخص اس انقلاب کا انکار کر سکتا ہے جو مثلاً سیّدی و مولائی حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ نے ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان کے طول و عرض میں برپا کر دیا تھا۔

اور جب سالک عالم لاہوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات اس کے دل میں پوشیدہ ہے۔

مومن کے دل کی وسعت پر قبل ازیں اظہار خیال کر چکا ہوں کہ اس کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ اس لیے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

بنیادی تصور تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ جلوت اور خلوت، یہ مومن کی زندگی کی دو مختلف شانیں ہیں۔ چنانچہ حضور سرورِ کائنات کی زندگی اس حقیقت پر شاہد ہے۔ یعنی دن کے وقت آپ جہاد فرماتے تھے اور رات کے وقت آپ مراقبہ اور مجاہدہ فرماتے تھے لیکن ضمنی طور پر نکتہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ مومن کے قلب میں اس قدر وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ سارا جہان اس میں سما سکتا ہے۔

جگر مراد آبادی نے بھی اس مصرع میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے:۔

سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

چہ می پرسی میان سینہ دل چیست؟ | خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن | چو یک دم از تپش افتاد گل شد

بنیادی تصور | دل، ذوقِ تپش ہی کا دُوسرا نام ہے۔

کہتے ہیں کیا تو دل کی ماہیت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے؟

مطلب

سُن! جسے عرفِ عام میں 'دل' کہتے ہیں، وہ تو مضغۂ گوشت ہے۔ لیکن اربابِ معرفت کی تحقیق یہ ہے کہ جب عقل نے اپنے اندر سوز کی کیفیت پیدا کرلی، تو اس مجموعہ (خرد + سوز) کا نام دِل ہوگیا۔

اِس جگہ 'سوز' سے عشق مراد ہے۔ یعنی جب عقل نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ میں بذاتِ خود "حریم ناز" کا پردہ نہیں اُٹھا سکتا، تو اُس نے عشق کی غلامی اختیار کرلی۔ یعنی اپنے اندر سوز، پیدا کرلیا۔ عقل کی اسی ترقی یافتہ حالت کا دوسرا نام 'دل' ہے جو مرکزِ عشق ہے۔

اسی نکتہ کو اقبال نے دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے۔

عقل ہم عشق است واز ذوقِ نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ راآں جرأتِ رندانہ نیست

یعنی عقل بھی جویائے حقیقت ہے اور اس اعتبار سے وہ بھی عشق ہی کی ایک صورت ہے۔ عشق کی طرح وہ بھی "ذوقِ نظر" رکھتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اس میں جرأت نہیں ہے، اس لیے ساحل پر کھڑی رہتی ہے۔ منجدھار میں کُود پڑنے کی ہمت نہیں۔

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تو اقبال یہ کہتے ہیں کہ اگر انسانی عقل، اپنے اندر سوز و گداز کی کیفیت پیدا کرے۔ یعنی مسلکِ عشق اختیار کرے، تو اسی خرد اور سوز کے مجموعہ کو اربابِ بینش 'دل' سے تعبیر کردیتے ہیں۔

اب دوسرے شعر میں وہ دوسرا نکتہ بیان کرتے ہیں کہ دل پر دل کا اطلاق اسی وقت تک ہوسکتا ہے جب تک کہ اس میں "ذوقِ تپش" کارفرما ہے۔ (یعنی 'دل' دراصل ذوقِ تپش کا دوسرا نام ہے)۔

یہ ذوقِ تپش کیا ہے؟ تڑپنے کی لذت یعنی محبوبِ حقیقی سے ہم آغوش ہونے کی آرزو۔ بس یہی دل کی حقیقت ہے۔ اگرچہ دل، انتہائے مطلق سے ملاقات کی آرزو سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ہوجائے تو "گِل" ہوجائیگا۔ یعنی فنا ہوجائے گا۔

جس طرح جلنا آگ کا خاصہ ہے، بہنا پانی کا خاصہ ہے۔ اسی طرح تڑپنا دل کا خاصہ ہے۔ جس طرح ٹھنڈی آگ کا تصور نہیں ہو سکتا، اسی طرح ساکن دل کا تصور بھی ناممکن ہے۔

اِس شعر میں دل اور گِل کا تقابل ہے۔ اور گِل سے یہاں مٹی بھی مراد ہو سکتی ہے اور فنائے مطلق بھی۔ اور یہ دونوں معنی صحیح ہیں یعنی اگر دل سے ذوق تپش زائل ہو جائے تو وہ مٹی ہو جائے گا یعنی بے قیمت۔ دوسرے معنیٰ یہ کہ اگر دل تڑپنا چھوڑ دے تو فنا ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

عقل مع سوز = دِل = عشق = لاہوت = رُوح = ایمان

عقل بغیر سوز = گِل = ہوس = ناسوت = مادہ = کفر

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

نوٹ: صاحب دل (عاشق) عموماً شعر و سخن کا دلدادہ ہوتا ہے بلکہ اکثر اوقات عشق، انسان کو شاعر بنا دیتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دل اور شعر دونوں میں سوز کا رنگ موجود ہوتا ہے۔ یہ نقشہ ذیل کے نقشہ سے واضح ہو سکتا ہے:-

دل = خرد + سوز

شعر = حق + سوز

اگر ثبوت درکار ہو تو یہ شعر پڑھ لیجیے:-

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دِل گرفت

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد
نگاہ شوق در امید و بیم است
نمی‌گردد کہن افسانۂ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

بنیادی تصور محبوب حقیقی کے دیدار کی آرزو ہر انسان کے دل میں پوشیدہ ہے۔

مطلب عقل کا فیصلہ تو یہ ہے کہ کوئی انسان خدا کو آنکھوں کی مدد سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ قرآن حکیم خود یہی فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ کوئی آنکھ اسے نہیں پا سکتی، یعنی وہ آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا۔

لیکن عقل کی آنکھوں کے علاوہ انسان میں دل کی آنکھ بھی تو پائی جاتی ہے جسے اقبال نے یہاں "نگاہ شوق" سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ نگاہِ شوق اس کے دیدار سے مایوس نہیں ہے۔

پس یہی حالت اُمید و بیم، عقل اور عشق میں وجہ امتیاز بن جاتی ہے۔ عاقل مایوس ہے لیکن عاشق مایوس نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ عقل صاف لفظوں میں کہتی ہے کہ میں اسے نہیں دکھا سکتی۔ لیکن حضرتِ عشق یہ کہتے ہیں کہ آستانِ ناز پر سرِ نیاز مسلسل اور پیہم خم کرتے رہو۔ کسی نہ کسی دن تو دریائے رحمت جوش میں آہی جائے گا۔ بیشک اس نے یہ فرمایا ہے کہ "لَنْ تَرَانِیْ" یعنی تو مجھے نہیں دیکھ سکتا لیکن یہ تو نہیں کہا کہ

میں بھی اپنا جمال تجھے نہیں دکھا سکتا

بالفاظِ دگر عشق انسان سے یہ کہتا ہے کہ اگر تو جذبِ صادق پیدا کرے تو حریمِ ناز کا پردہ خود بخود اُٹھ جائے گا۔

چونکہ عشق، انسان کی حوصلہ افزائی کرتا رہتا ہے، اور آرزوئے دید ہر دل میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس لیے افسانۂ طور ہر وقت تازہ ہوتا رہتا ہے۔ یعنی ہر وقت تجلیات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور دیکھنے والے ہر وقت اسے دیکھتے رہتے ہیں۔

ہم نے در پردہ تجھے پردہ نشین دیکھ لیا
تو جہاں جاکے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا

گنشت و مسجد و بتخانہ و دیر — جز ایں مشت گلے پیدا نکردی
ز حکم غیر نتواں جز بدل بست — تو اے غافل دلے پیدا نکردی

بنیادی تصور عشق (دل) انسان کو غیر اللہ کی غلامی سے رہائی عطا کر سکتا ہے۔

مطلب کنشت، بابلی زبان کا لفظ ہے۔ یعنی ستارہ پرستوں کا معبد لیکن رفتہ رفتہ غیر مسلموں کے معبد (گرجا، بت خانہ، مندر یا آتشکدہ) کے لیے استعمال ہونے لگا۔

کہتے ہیں کہ اے انسان! تو نے اپنی ساری توجہ چونے اور پتھر کی عمارتوں کے بنانے میں صرف کر دی۔ اور ان عمارتوں (گرجا، مسجد، بت خانہ اور آتشکدہ) میں خدا کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔

افسوس تو نے "مشتِ گل" کے علاوہ اور کچھ پیدا نہ کیا۔ اے نادان! جو کچھ تو نے پیدا کیا ہے، اس میں تو غیر اللہ کی حکومت ہے۔ اس لیے اس جگہ اللہ کہاں اور کیسے مل سکتا ہے؟

گرجے میں پادری کا حکم نافذ ہے، مسجد میں ملّا کا۔ بت خانہ میں پنڈت کا اور آتشکدہ میں موبد کا۔ لہٰذا تو ان عمارتوں میں سے جس کسی میں بھی جائے گا۔ تجھے غیر اللہ کی اطاعت کرنی پڑے گی، ورنہ وہاں سے نکالا جائے گا۔

یوں تو سب "خدا کا گھر" کہلاتے ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ

(۱) کوئی غیر مسلم، مسجد میں نہیں جا سکتا۔

(۲) کوئی غیر مسیحی "پاک شراکت" میں شریک ہونے کے لیے گرجے میں نہیں جا سکتا۔

(۳) کوئی غیر مجوسی آتشکدہ میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ کراچی کے تمام آتشکدوں کے دروازوں پر لکھا ہوا ہے۔

"مخصوص برائے پارسیان زرتشتی"

(۴) کوئی غیر ہندو کسی مندر میں نہیں جا سکتا۔

کیوں؟ اس لیے کہ ان مٹی کی عمارتوں میں اللہ کے بجائے غیر اللہ کی

حکومت ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو غیراللہ کی غلامی سے نجات کا طالب ہے تو اس کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ تو مسلکِ عشق اختیار کرلے۔ یعنی دل پیدا کرلے۔ ؏

زحکم غیر نتواں جز بدل رُست

صرف عشق ہی انسان کو غیراللہ کی غلامی سے رہائی عطا کرسکتا ہے۔ عاشق نہ پادری کا محتاج ہوتا ہے، نہ پنڈت کا۔ نہ مُلّا کا دستِ نگر ہوتا ہے نہ موبد کا۔ ؏

بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

نہ پیوستم دریں بستانسرا دل | ز بندِ ایں و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمے چند | گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم

بنیادی تصوّر

عاشق دوسروں کو فیض پہنچانے کے لیے جیتا ہے۔ یعنی ؏ طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

مطلب

اقبال نے اپنی ذات کے پردہ میں عاشق کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق دُنیا سے دل نہیں لگاتا کیونکہ یہ بات مسلکِ عشق کے خلاف ہے نیز وہ علائقِ دنیوی سے بالکل آزاد ہوتا ہے۔

"این و آں" سے مناصبِ عالیہ، عہدے، خطابات، جاگیریں اور کارخانے مراد ہیں۔ جن کے لیے انسان اپنی خودی کو ہلاک کردیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ عاشق دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسے بادِ صبح باغ میں تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے، اور پھولوں کو تر و تازگی عطا کرکے واپس چلی جاتی ہے۔ اسی طرح عاشق کا مقصدِ حیات، دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہتا ہے، دوسروں کی خدمت کرتا رہتا ہے۔

بجو باز آوردم رندِ کہن را | مئے برنا کہ من در جام کردم
کہ ایں مے از مغانِ نو چشیں | ز چشمِ مستِ ساقی وام کردم

بنیادی تصوّر مَیں نے دُنیا کو عشق کا پیغام دیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ وہ پیغام جو مَیں نے دنیا کو دیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہائی غفلت شعار (رندِ کہن) کو بھی معرفتِ نفس عطا کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے یہ شراب میخانہ انگوروں سے حاصل نہیں کی ہے۔ بلکہ خود ساقی کی نگاہ سے مستعار لی ہے۔ یعنی اس باب میں، میں نے پرانے زمانہ کے بزرگوں کی تقلید کی ہے۔

نوٹ:۔ اس رباعی کا چوتھا مصرع عراقی کے مطلع سے مقتبس ہے۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند

یہ غزل غایت شہرت کی بنا پر محتاجِ تعارف نہیں ہے۔

سفالم را مئے او جامِ جم کرد | درونِ قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانہ ریخت | خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

بنیادی تصوّر دنیا میں عشق ہی وہ طاقت ہے جس کی بدولت انسان صحیح معنی میں موحد بن سکتا ہے۔

مطلب عشقِ الٰہی نے میری شخصیت کو منوّر کر دیا۔ اس کی بدولت میری آنکھ جہاں بین بن گئی۔ ہر چند میں قطرہ ہوں۔ لیکن عشق کی بدولت مجھ میں محبوب (یم) کے خواص پیدا ہو گئے۔

اگرچہ عقل نے رفتہ رفتہ میرے دماغ کو بتخانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ یعنی اس نے عہدہ، خطاب، اقتدار، جاگیر، عورت، دولت، باغات، فیکٹری اور زمین کو میری نظروں میں اس قدر دلکش اور محبوب بنا دیا تھا۔ کہ میں

ان میں سے ہر ایک کو اپنا مقصودِ حیات قرار دے چکا تھا۔ بالفاظِ دگر ان اصنام کی پرستش میں مشغول تھا۔ لیکن عشق نے میرے دماغ کو ان تمام بتوں کی آلائش سے پاک کر دیا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان عشق اختیار نہ کرے، موحد نہیں بن سکتا۔ کیونکہ صرف عشق ہی میں یہ طاقت ہے کہ وہ دماغ کے بُت خانہ کو حرم میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یعنی انسان کے دل میں دنیا کے بجائے اللہ تعالےٰ کی محبت پیدا کر سکتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے اقبال نے:-

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق!
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

خرد زنجیریِ امروز و دوش است ۔۔۔ پرستارِ بتانِ چشم و گوش است
صنم در آستیں پوشیدہ دارد ۔۔۔ برہمن زادہ زنار پوش است

بنیادی تصور
عقل (خرد) چونکہ محدود اور ناقص ہے۔ اس لیے لائقِ اعتماد نہیں ہے۔

مطلب
کہتے ہیں کہ عقل زمان و مکان کی قید میں ہے۔ اور حواس خمسہ خصوصاً سمع و بصر کی محتاج ہے۔ ان کی وساطت سے جو معلومات اُسے حاصل ہوتی ہیں، انہی پر کاربند ہو جاتی ہے اور چونکہ حواس غلطی کرتے رہتے ہیں، اس لیے عقل بھی اغلاط کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور آئے دن اپنے فیصلوں کی خود ہی تردید کرتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہذا جویائے حقیقت کو لازم ہے کہ اس کو رہنما نہ بنائے۔

تبصرہ
اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں عقل کی عاجزی اور بیچارگی کو مختلف پہلوؤں سے واضح کیا ہے۔ اسی کتاب میں لکھتے ہیں:-

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

چونکہ عقل، انسان کو حقیقت تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے اقبال نے ہمیں اس کے بجائے عشق کی پیروی کا درس دیا ہے۔

اگر کسی کو اس بات میں شک ہو، تو اُسے لازم ہے کہ فلسفہ کی گذشتہ ڈھائی ہزار سال کی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ عقل کی درماندگی اور عاجزی اس پر واضح ہو جائے گی۔ عقل کی پیروی کا نتیجہ ہمیشہ حیرانی اور سرگشتگی ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے اس حقیقت کو باین طور پر واضح کیا ہے :۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

خرد اندر سر ہر کس نہادند — تمیز چون و چگون از خاک ما خاست
ولے این نرگس بے چون نہادند — ضمیر خاک ما ذوق بیچگون است

بنیادی تصور انسان کی حقیقت (ضمیر) غیر مادی (بیچگون) ہے۔

مطلب خدا نے ہر شخص کو عقل عطا فرمائی ہے اور اس کی بدولت ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ انسان کا جسم تو مادی ہے لیکن اس جسم کی اصل مادی نہیں ہے۔ یعنی خودی یا انسان کی حقیقت جسم اور جسمانیت سے پاک ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مادہ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ بھی رُوح ہی کی ایک کثیف شکل ہے۔ ضرب کلیم میں اقبال نے اس حقیقت کو باین طور واضح کیا ہے :۔

ارتباط حرف و معنی، اختلاط جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی پیراہن سے ہے

اسی نکتہ کو انھوں نے الہ آباد کے مشہور خطبۂ صدارت میں یوں بیان کیا ہے :۔

"اسلام دوئی پسند نہیں ہے، اس لیے وہ رُوح اور مادہ کی تقسیم کا حامی نہیں ہے۔ اس کے نزدیک روح اور مادہ دو مستقل بالذات ہستیاں نہیں ہیں۔ بلکہ مادہ بھی روح ہی کی ایک شکل ہے۔ جو زمان اور مکان کی قید میں ظاہر ہو رہی ہے۔"

اسی نکتہ کو گلشن رازِ جدید میں یوں واضح کیا ہے:-

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا دیدن حرام است

یعنی آپ تن و جان کو سہولت کی خاطر دو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان کو دو مستقل وجود سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ مادہ کا کوئی مستقل بالذات وجود ہی نہیں ہے۔

تصوف کا یہ نکتہ سائنس کی روشنی میں بالکل صحیح ثابت ہو چکا ہے جدید تحقیقات کی رُو سے مادہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کائنات میں دراصل توانائی (ENERGY) کارفرما ہے۔ اور "توانائی" غیر مادی ہے۔ سائنسدانوں نے مادہ کی تحلیل کی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مادہ دراصل توانائی کی ایک کثیف شکل ہے۔

تصوف بھی یہی کہتا ہے کہ ساری کائنات، حق تعالیٰ کی تجلیات کا پرتو ہے۔ سائنس اسی تجلی کو توانائی سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے غالب نے:-

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور | کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن | خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

بنیادی تصور | خدا کی تلاش کے بجائے اپنی تلاش کر، کیونکہ جسے خودی مل گئی، اُسے خدا مل گیا۔

مطلب اے انسان! تو خدا کو کائنات میں اس لیے تلاش کر رہا ہے کہ تو اپنی خودی سے ناواقف ہے۔ ارے نادان! وہ تجھ سے باہر کہیں نہیں ہے بلکہ تیرے اندر ہی پوشیدہ ہے۔ وہ تجھ سے اس قدر قریب ہے کہ تیری جان بھی تجھ سے اس قدر قریب نہیں ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

پس تو خدا کی تلاش مت کر۔ اپنی تلاش کر۔ اگر تو اپنے آپ کو ڈھونڈے گا تو خدا بھی مل جائے گا۔ اگر تو اپنی معرفت حاصل کرے گا۔ تو تجھے خدا کی معرفت بھی حاصل ہو جائے گی۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

دگر از شنکر و منصور کم گوئے
خدا را ہم براہ خویشتن جوئے

اقبال نے اس رباعی کے چوتھے مصرع میں یہ بات کہی ہے کہ خدا بھی آدمی کو تلاش کر رہا ہے۔ اس مصرع کے دو مطلب ہیں۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ اقبال نے اس بات کے پردہ میں ہمیں اپنی جستجو پر آمادہ کیا ہے یعنی اے مخاطب! انسان کی تلاش کر، یہ اس قدر اہم بات ہے کہ خدا خود آدم (انسان) کی تلاش کر رہا ہے۔ یعنی اپنی معرفت حاصل کر۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان خدا سے ملنے کا آرزو مند ہے۔ اسی طرح خدا، انسان سے ملنے کا آرزو مند ہے کیونکہ خدا (انائے مطلق) انسان (انائے مقید) میں اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے۔ انسان وہ آئینہ ہے۔ جس میں "عکس رخ یار" نظر آتا ہے۔

اقبال نے تصوف کے اس اہم نکتہ کو زبور عجم میں ایک غزل میں تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے۔

اس جگہ صرف مطلع اور مقطع لکھتا ہوں:۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو است

درخاکدانِ ما گہر زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ سچ ہے کہ وہ نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے، لیکن ہم نہ ہوتے، تو وہ ہوتا تو ضرور، مگر اسے جانتا کون؟ بالفاظِ دگر ہم نہ ہوتے تو اس کی صفات کی جلوہ گری کیسے ہوتی!

اگر یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ بدیں تقدیر، خدا اپنی صفات کے ظہور کے لیے غیر کا محتاج ثابت ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اگر مستقل بالذات ہستی ہوتا، تو غیریت کا اثبات ہو سکتا تھا لیکن وہ تو اسی کی صفات کا ظل اور اسی کی تجلیات کا پرتو ہے۔ انسان کی ذاتی تو کوئی ہستی اور اس کا مستقل تو کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس لیے غیریت یا کثرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مرزا بیدل نے اس رباعی میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:۔

عالم ہمہ یک جلوۂ ذاتِ احد است
ایں سحابہ ہیولیٰ نہ صورت جسد است
کثرت، آثارِ چشم او کردن ماست
ایں صفر چو محو شد ہماں یک عدد است

مجو جبریل وا ز من پیاشت | مرا آں پیکر نوری خداوند
و لے آب و تب ما خاکیاں بیں | بنوری ذوقِ مہجوری خداوند

بنیادی تصور فرشتے سوز و گداز سے محروم ہیں:۔

مطلب کہتے ہیں کہ فرشتوں سے کہہ دو کہ بیشک اللہ تعالےٰ نے ہمیں "پیکرِ نوری" عطا نہیں کیا ہے۔ یعنی ہماری تخلیق نور سے نہیں ہوئی ہے۔ لیکن تم "ذوقِ مہجوری" سے محروم ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح فرشتوں کو انسان پر جزوی فضیلت حاصل ہے کہ وہ معصوم ہیں اسی طرح

انسان کو فرشتوں پر یہ تفوق حاصل ہے کہ اُس کے اندر اللہ تعالے نے اپنی محبت کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے۔ پس بحیثیت مجموعی انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ حافظ نے کیا خوب لکھا ہے :-

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

ہمائے علم تا افتد بدامت | یقیں کم کن گرفتار شکے باش
عمل خواہی یقینے را بچنے زن | یکے جوئے ویکے بیں ویکے باش

بنیادی تصور علم، شک سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن عمل کے لیے یقین لازمی ہے۔

مطلب اے طالب! اگر تو علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو دوسروں کی تقلید مت کر، یعنی کسی فلسفی کے قول پر یقین مت کر۔ بلکہ ان کے مزعومات کو شک کی نگاہ سے دیکھ، یعنی ان کے اقوال پر اعتراض کر۔ اور بطور خود تحقیق کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو مسائل کائنات پر اپنی ذاتی رائے قائم کر سکے گا۔ اور یہاں علم سے اقبال کی یہی مُراد ہے۔

لیکن اگر تو عمل کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی اگر تو عالم کے بجائے مجاہد بننا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے اندر یقین کی کیفیت پیدا کر جو شک کی ضد ہے، اور اس کا طریق یہ ہے کہ ایک ہی کو ڈھونڈ اور ایک ہی کو دیکھ، اور خود اپنے اندر وحدت کا رنگ پیدا کرے۔ یعنی حقیقی معنوں میں موحد بن جا۔

موحد کی شان یہ ہوتی ہے کہ

(۱) وہ خدائے واحد کا طلبگار (پرستار) ہوتا ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

(۲) وہ ساری کائنات میں خدائے واحد کی کارفرمائی اور اسی کی جلوہ گری دیکھتا ہے۔ غیر اللہ کو موثر فی الوجود نہیں مانتا۔

(۳) وہ خدائے واحد کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے۔ اور اس وحدتِ مقصد کی بدولت خود اس کی زندگی میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔

خرد بر چہرۂ تو پردہ ہا بافت — نگاہِ تشنۂ دیدار دارم
در افتد ہر زماں با شیوۂ شوق — چہ آشوبِ گسستگی در جان دارم!

بنیادی تصور عقل کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عشق سے برسرِ جنگ رہتی ہے۔

مطلب اے خدا! میری عقل ہر وقت تیری ہستی کے خلاف دلائل مرتب کرتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری نگاہ "تشنۂ دیدار" ہے۔ یعنی میری عقل نے مجھے ذوقِ یقین (ایمان) سے محروم کر دیا۔

میری عقل ہر وقت میرے جذبۂ عشق (شوق) سے برسرِ جنگ رہتی ہے۔ دل یہ کہتا ہے کہ تو موجود ہے۔ لیکن عقل دل کے فیصلہ کو غلط قرار دیتی ہے۔ اے خدا! میں اس عقل کے ہاتھوں بڑے عذاب (ذہنی کشمکش) میں مبتلا ہوں۔

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

تبصرہ اس رباعی میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عقل کی مدد سے کوئی شخص خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ عقل واجب الوجود کا اثبات کرنے کے لیے چند دلائل مرتب کرتی ہے۔ لیکن ان تمام دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی صانعِ عالم ہونا چاہیے۔ لیکن خود عقل ہی اس پر یہ اعتراض وارد کرتی ہے کہ

(۱) صانعِ عالم اور خالقِ عالم میں بہت فرق ہے۔ اور عقل خالقِ عالم کا اثبات نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ نیستی سے ہستی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے خدا اگر ہے تو صانعِ عالم ہے نہ کہ خالقِ عالم۔

(۲) اس صانعِ عالم سے، جس کی پوزیشن ایک نجار سے زیادہ نہیں ہے ایک سے زیادہ فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ صانعِ عالم، عقلِ اول

کو صادر کر کے معطل ہو گیا۔ اب وہی عقل یہ کہتی ہے کہ ایسے صانع عالم کو تسلیم کرنے سے بھی کیا حاصل!

(۳) سب سے بڑا عقلی اعتراض یہ ہے کہ "ہونا چاہیئے" اور "در حقیقت موجود ہے"، ان دو باتوں میں بہت فرق ہے۔ عقل اس خلیج کو کسی طرح نہیں پاٹ سکتی جو "چاہیئے" اور "ہے" کے درمیان حائل ہے۔ نہ خدا حواس خمسہ سے محسوس ہو سکتا ہے، اور نہ عقل اس کی ہستی کا اثبات کر سکتی ہے۔

اس پر مستزاد یہ ہے کہ یہی عقل جو خدا کی ہستی پر چند دلائل مرتب کرتی ہے اس کے نہ ہونے پر صدہا اعتراضات وارد کرتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:-

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اس موضوع پر کانٹ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقید عقل خالص" میں مفصل بحث کی ہے۔ اور اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عقل مجرد، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی، اگرچہ اس نے اپنی دوسری تصنیف "تنقید عقل عملی" میں خدا کی ہستی کا اثبات کیا ہے۔ لیکن "چاہیئے" کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یعنی عقل خالص کا تقاضا یہ ہے، کہ خدا نہیں ہے۔ لیکن عقل عملی کا تقاضا یہ ہے کہ خدا ہونا چاہیئے۔ اس پر جو عقلی اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ میں قبل ازیں لکھ چکا ہوں کہ "خدا ہونا چاہیئے" اور "خدا فی الحقیقت موجود ہے"۔ ان دو باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسی لیے اقبال نے ہمیں عقل کے بجائے عشق کی پیروی کا درس دیا ہے۔ اور اس شعر میں عقل اور عشق کے فرق کو بیان کیا ہے:-

بو علی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ ز بیمش زرد مانند زریری
بخود باز آ خودی را پختہ تر گیر اگر گیری پس از مردن نمیری

بنیادی تصور ؏ خودی چوں پختہ شد، از مرگ پاک است

مطلب اے مخاطب! تو موت کے تصور سے لرزاں ہے، اور اس کے خوف سے تیرا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو اپنی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ اگر تو اپنی خودی کی تربیت پر اپنی توجہ مرکوز کرے (بخود باز آمدن) اور اس تربیت کی بدولت اسے پختہ (مستحکم) کرے، تو یقین رکھ کہ تو مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گا۔

یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے، اس کو انہوں نے ہر کتاب میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ ضرب کلیم میں لکھتے ہیں :۔

ہو اگر خود نگر و خود گیر خودی !!
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

ز پیوند تن و جانم چہ پرسی بدام چند و چوں ماہی سلیم
دم آشفتہ ام در پیچ و تابم چو آوازِ خوشش نے خویش نوایم

بنیادی تصور جان (خودی) در اصل انائے مطلق (خدا) کا پرتو ہے۔ لیکن تن (جسم) سے پیوند یا رابطہ کی وجہ سے اسکے مقید نظر آتی ہے۔

مطلب اقبال نے اس مشکل رباعی میں انسان کی اصل یا حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی اپنے دل کا مطلب استعاروں کے پردوں میں پوشیدہ کر دیا ہے۔

شریعت کیوں گریباں گیر ہے ذوقِ تکلم کی !
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

اس لیے میں پہلے استعاروں کے ان پردوں کو ہٹاتا ہوں - پھر مطلب بیان کروں گا -

(۱) دم - وہ پھونک ہے جو بانسری میں مارتے ہیں - لیکن دم کا تعلق تنِ (جسم) سے نہیں ہوتا بلکہ نے نواز سے ہوتا ہے - تنِ تو محض ایک رابطہ ہے - دم سے مراد ہے ذات باری کی تجلی یا اس کا پرتو -

(۲) دم آشفتہ - دم تن نواز سے جدا ہو گیا ہے، اور جدائی کا لازمی نتیجہ آشفتگی (اضطراب) ہوتا ہے - (آشفتگی جمعیت کی ضد ہے اور جمعیت وصل سے پیدا ہوتی ہے)

انسان دراصل "دم آشفتہ" ہے - بس یہی اس کی حقیقت ہے، یعنی وہ دم ہے لیکن آشفتہ ہے - اور آشفتگی کا باعث، اصل سے جدائی ہے -

(۳) آغوشِ تنِ - جسم یا تعینات جسمی کے وہ پردے جن کو ہٹا دیا جائے تو وہی نے نواز (انائے مطلق) باقی رہ جاتا ہے :-

پردے کو تعین کے در دل سے ہٹا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

(۴) نوا - انائے مقید - یعنی وہی دم آشفتہ جب بانسری سے نکلتا ہے تو پیوند تن کے سبب سے نوا (انائے مقید) بن جاتا ہے -

رباعی کا مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! تو مجھ سے تن (جسم) اور جان (روح) کے پیوند (رابطہ) کو سمجھنا چاہتا ہے - سُن! خودی چونکہ جوہر نوری ہے، اس لیے مادہ (چند و چوں) کے دام میں محصور نہیں ہو سکتی اس تصریح کے بعد اب میں تجھے اس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں :-

دراصل جان کا تن سے کوئی پیوند نہیں ہے کیونکہ پیوند تو ہمیشہ ہم جنس چیزوں میں ممکن ہو سکتا ہے - ایک درخت کی شاخ کا دوسرے درخت کی شاخ سے پیوند لگ سکتا ہے، اور لگاتے ہیں لیکن آج تک کسی نے آم کی شاخ کا سنگ مرمر سے پیوند نہیں لگایا -

جب کوئی پیوند نہیں ہے تو پھر ہے کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خودی تو دراصل "دم آشفتہ" ہے - یعنی انائے مطلق کا پرتو ہے - لیکن یہ دم چونکہ

نَے سے نکلتا ہے، اس لیے نوا نظر آتا ہے۔ یعنی یہ جسم انائے مطلق کے ظہور کے لیے محض ایک واسطہ ہے۔ جس طرح دم کا تعلق دراصل نَے نواز سے ہوتا ہے (دم نَے نواز کے باطن سے نکلتا ہے) نَے تو محض ایک واسطہ ہے۔ جس میں ہو کر وہ دم متعین ہوتا ہے۔ اور اس تعین کی بنا پر وہ "دم" (پرتوئے انائے مطلق) نوا (انائے مقید) بن جاتا ہے یا نظر آتا ہے۔

اب میں قرآن کی تین آیاتِ ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(ا) وَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ٥ (۱۵ : ۲۹)

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کیا۔ کہ جب میں اُسے درست کر لوں" یعنی جب آدم کے کالب کو مکمل کر لوں، اور اس کے اندر اپنی رُوح میں سے کچھ حصہ پھونک دوں، تو تم سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا۔

صوفیا نے نَے اور دم کی اصطلاح اسی آیت سے مستنبط کی ہے۔ کیونکہ اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہے کہ خدا نے آدم کے جسم خاکی (نَے) میں اپنی رُوح میں سے کچھ (دم) پھونکا ہے۔

(ب) كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵-۲۶، ۲۷)

جس قدر مخلوقات زمین پر ہیں، سب فنا ہونے والی ہیں۔ اور انجامکار (ایک دن وہ آئے گا جب) صرف تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی۔ اور وہ ذات بزرگی، جلال اور اکرام کی مالک ہے۔

اس آیت شریفہ سے یہ ثابت ہوا کہ مخلوقات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کسی کا وجود مستقل بالذات نہیں ہے، یہ سب کسی کے سہارے سے قائم ہیں، جب وہ ذاتِ پاک، تعینات کے پردے ہٹا دے گی تو بس وہی باقی رہ جائے گی۔

(ج) اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ٥ (۲ : ۱۵۶)

بیشک ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور انجام کار اسی کی طرف لوٹ

جائیں گے۔ اس آیت شریفہ سے ثابت ہوا کہ ہماری اصل خاکی نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلق نَے نواز سے ہے۔ ہمارا "دم" اسی کی نَے نوازی کا کرشمہ ہے۔ اور انجامکار یہ نوا اپنی اصل کی طرف رجوع کرے گی جو اُس ذات مطلق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں اتنی صراحت اور کردوں کہ دم (انائے مقید) بہرحال اور بہر صورت "دم" ہی رہے گا۔ نَے نواز (انائے مطلق) نہیں بن سکتا۔

اسی نکتہ کو صاحب دل مرزا بیدل نے یوں بیان کیا ہے:-

بچہ ممکن است رود داغ بندگی ز جبیں
زمین فلک شود و آدمی خدا نشود

یعنی نا ممکن ہے کہ انسان سے صفت افتقار (احتیاج کی شان) زائل ہو جائے۔ یہ محتاجی یعنی اپنے وجود کے لیے واجب کا محتاج ہونا۔ تو اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ممکن ہے کہ زمین آسمان ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ آدمی خدا ہو جائے۔ اس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ ذی ظِلّ اور ظِلّ میں ہمیشہ فرق قائم رہے گا۔

(۱) خدا، ذی ظِلّ ہے۔

(۲) انسان، اُس کا ظِلّ ہے۔

اس لیے خدا اور انسان میں ہمیشہ امتیاز باقی رہے گا۔

یہی وہ نکتہ ہے کہ جسے دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مفکر یعنی حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ نے یوں بیان کیا ہے:-

وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی والربُّ ربٌّ وَاِنْ تنزّل۔

بندہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے، بندہ ہی رہے گا۔ خدا نہیں بن سکتا۔ (اور) خدا خواہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ کرے، خدا ہی رہے گا بندہ نہیں بن سکتا۔

مرا فرمود پیرے نکتہ دانے | ہر امروز تو از فردا پیامے است
دل از خوبانِ بے پروا نگہ دار | کہ در کیشِ جز بادہ داران حرام است

بنیادی تصور دل چونکہ حریم ایزدی ہے۔ اس لیے اسمیں تصورِ غیر کو جگہ دینا گناہِ عظیم (حرام) بلکہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔

مطلب مجھے ایک عارف کامل نے یہ نکتہ سمجھایا، کہ تیرا ہر امروز (آج) فردا (مستقبل) کا آئینہ دار (پیام بر) ہے۔ یعنی اگر تو آج کوئی قدم غلط اُٹھائے گا، تو کل کو اس کا خمیازہ بھگتنا لازمی ہے۔ بالفاظِ دگر تیری آئندہ زندگی برباد ہو جائے گی۔

لہٰذا اگر تو اپنی آئندہ زندگی کو سنوارنا چاہتا ہے تو غیر اللہ (خوبانِ بے پرواہ) سے دل مت لگا۔ ان کے خیال کو اپنے دل میں جگہ مت دے کیونکہ دل تو اللہ کا گھر ہے، اس میں غیر اللہ (زن، زر، زمین) کا گذر کیسے اور کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ اگر تو اس کے حریم کو غیر اللہ کے حوالہ کر دے گا تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ

اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے بندو! مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرو لیکن اگر کوئی شخص اس کو چھوڑ کر غیر سے محبت کرنے لگے تو بلاشبہ وہ مشرک ہے اور مشرک کی بخشش کبھی ہرگز نہیں ہوگی۔

اس رباعی میں "خوبانِ بے پروا" کی ترکیب بڑی دلکش ہے۔ اقبال نے 'بے پروا' کی قید لگا کر ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ عورتیں (خوبانِ عالم) عاشق کے خلوص کی قدر نہیں کرتیں۔ بلکہ اس کی جانب سے بے پروائی کا اظہار کرتی ہیں۔ چونکہ ان کا زاویۂ نگاہ سراسر مادی ہوتا ہے۔ اس لیے عاشق کے اظہارِ تمنا سے ان کی خود بینی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن دولت کو دیکھ کر بلا تامل سپر انداز ہو جاتی ہیں۔ حسرت موہانی

نے کیا خوب لکھا ہے :-

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

ز رازی معنی قرآں چہ پرسی — ضمیر ما بآیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد دل بسوزد — ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است

بنیادی تصور انسان کا ضمیر، قرآن حکیم کے حقائق کا سب سے بڑا مفسر ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ رازی یعنی مفسروں سے قرآن کے معنی مت پوچھ کیونکہ تمہارا ضمیر، اس باب میں بہترین رہنما ہے۔

مثلاً قرآن حکیم نے تمہاری بصیرت افروزی کے لیے نمرود اور خلیل ؑ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نمرود، عقل کا نمائندہ ہے اور عقل ہمیشہ خدا کا انکار کرتی ہے۔ اور خلیل ؑ عشق کے نمائندہ ہیں۔ اور عشق ہمیشہ خدا کی ہستی کا اقرار (اثبات) کرتا ہے۔ اور اس لیے دونوں میں ہمیشہ جنگ رہتی ہے۔ اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، یہ جنگ بھی قائم رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی ؐ سے شرارِ بولہبی!

نمرود نے آگ جلائی، حضرت ابراہیم ؑ بے خطر اس آگ میں کود پڑے بس ہر زمانہ میں یہی ہوتا ہے کہ منکرین خدا، عاشقان خدا کو آزار پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور وہ اسے برداشت کرتے رہتے ہیں، عقل، آگ روشن کرتی ہے، عشق اس میں جلتا ہے۔ بس یہی واقعہ نمرود و خلیل کی صحیح تفسیر ہے۔ اور اس کے لیے کتب تفاسیر کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص اپنے ضمیر میں غور کر کے اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ خرد کا کام ہی

یہ ہے کہ وہ عشق سے ہمیشہ برسرِ جنگ رہے۔

من از بود و نبود خود خموشم | اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادہ از کیست | کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

بنیادی تصور شعورِ ذات، خارج سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا سرچشمہ خود انسان کا ضمیر ہے۔

مطلب میں اپنے موجود ہونے یا نہ ہونے سے متعلق کوئی بات نہیں کہنی چاہتا۔ کیونکہ اگر میں یہ کہوں کہ "میں موجود ہوں" تو یہ بات خود پرستی پر دلالت کرے گی۔ اور خود پرستی مذموم ہے۔ لیکن اس کو کیا کروں کہ میرے ضمیر کی گہرائی سے یہ آواز نکل رہی ہے کہ میں موجود ہوں اور یہ آواز بالکل صاف اور واضح ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خودی کا اثبات کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص کا دل اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ میں موجود ہوں، اگر کسی کو اپنے وجود میں شک، ہو تو وہ اپنے دل (ضمیر) سے دریافت کرے۔

ز من با شاعرِ رنگیں بیاں گوے | چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود را می گدازی زاں تپش خویش | نہ شامِ دردمندے بر فروزی

بنیادی تصور معیارِ شاعری یہ ہے کہ اس سے اپنی اصلاح بھی ہو اور دوسروں کی بھی۔

مطلب میں شاعروں سے یہ بات کہنی چاہتا ہوں کہ اگر ان کا کلام حقیقت سے بیگانہ ہے تو ایسی شاعری سے ان کو یا ان کی قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اگر وہ لالہ کی طرح جل رہے ہیں، تو ایسے جلنے سے کیا حاصل؟ لالہ اپنی

آگ سے نہ اپنے آپ کو جلا سکتا ہے نہ کسی دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے کیونکہ اس کی آتش حقیقی نہیں ہے بلکہ مجازی ہے۔ اسی طرح اگر شاعر اپنے کلام سے نہ اپنی اصلاح کر سکے نہ اپنی قوم کی، تو ایسی شاعری یکسر تضیعِ اوقات کا موجب ہے۔

ز خوب و زشت تو ناآشنایم | عیار بخشش کردہ سود و زیاں را
دریں محفل زمن تنہا تریست | بچشم دیگرے بینم جہاں را

بنیادی تصور بھلائی اور برائی کا معیار، شریعت، ہے نہ کہ مادی منفعت اور نقصان یا سود و زیاں۔

مطلب اے مخاطب! تو نے نفع اور نقصان کو خوب و زشت کا معیار قرار دیا ہے۔ یعنی تیرے نزدیک جس چیز سے فائدہ حاصل ہو وہ اچھی ہے، اور جس چیز سے نقصان پہنچے وہ بری ہے۔ لیکن میں تیرے اس معیار سے متفق نہیں ہوں۔

میں اس دنیا (محفل) میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں اس دنیا کو اور اس کے معاملات کو کسی دوسرے کی یعنی شریعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میری نگاہ میں خوب (نیکی) وہ ہے جسے شریعت خوب قرار دے، خواہ اس سے مالی فائدہ حاصل ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح زشت (بدی) وہ ہے جسے شریعتِ اسلامیہ زشت قرار دے، خواہ اس سے کتنا ہی دنیاوی فائدہ کیوں نہ حاصل ہو سکے۔

تو اے شیخِ حرم شاید ندانی | جہانِ عشق را ہم محشرے ہست
گناہ و نامہ و میزاں ندارد | نہ او را مسلمے نے کافرے ہست

بنیادی تصور عاشق کی زندگی، اور اس کی دنیا، عامۃ الناس کی زندگی اور ان کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

مطلب ظاہر پرستوں سے خطاب کرتے ہیں کہ شاید آپ حضرات کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ عام انسانوں کی طرح اگرچہ عاشقوں کا حشر بھی ہوگا۔ لیکن ان کے محشر میں نہ گناہ و ثواب کا ذکر ہوگا۔ نہ نامۂ اعمال کسی کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور نہ میزان قائم ہوگی، نہ وزن اعمال ہوگا۔ اور نہ وہاں کافر اور مسلم کا امتیاز ہوگا۔

اقبال دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حساب کتاب، گناہ و ثواب، نامۂ اعمال وزن اعمال اور میزان یہ سب معاملات ان کے ساتھ کئے جائیں گے جنہوں نے جنت کے لالچ میں شریعت کی پابندی کی ہے۔ لیکن جنہوں نے جنت کے بجائے خود خالقِ جنت کو اپنا مقصود بنایا ہے یعنی جو لوگ عاشقانِ الٰہی ہیں، ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ ہوگی۔ اور جب باز پرس نہیں ہوگی تو وزن اعمال اور میزان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترازو ان کے لیے قائم ہوگی جنہوں نے گن گن کر نمازیں پڑھیں اور گن گن کر زکوٰۃ کی رقم ادا کی۔ لیکن جنہوں نے ساری زندگی نمازمیں بسر کی، اور ساری دولت خدا کی راہ میں خرچ کردی (جس طرح صدیق اکبرؓ نے کیا) ان سے نہ باز پرس ہوگی، نہ حساب کتاب ہوگا۔

اقبال نے اسی حقیقت کو اس بلیغ شعر میں واضح کیا ہے:-

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

چو حباب از خود نگیرد قطرۂ آب　　میان صد گہر یکدانہ گردد
بہ بزم ہمنوایاں آنچناں زی　　کہ گلشن بر تو خلوت خانہ گردد

بنیادی تصور فرد کو لازم ہے کہ اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادیت (خودی) کی تکمیل بھی کرے۔

مطلب اقبال نے اس رباعی میں موتی کی مثال دیکر یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ جس طرح پانی کا وہ قطرہ جو اپنی خودی کی حفاظت کرتا ہے سینکڑوں موتیوں میں سب سے زیادہ چمکدار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ فرد جو جماعت میں رہ کر اپنی خودی کی حفاظت اسی کرتا ہے، ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد میں نمایاں شخصیت کا مالک بن سکتا ہے۔

اس لیے انسان کو لازم ہے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کرے کہ جماعت (گلشن) اس کے حق میں خلوت خانہ بن جائے۔ یعنی جلوت میں رہنے کے باوجود اپنی خودی کی تربیت کرتا رہے تاکہ "گوہر یک دانہ" بن سکے۔

گہر یک دانہ اس موتی کو کہتے ہیں جو جسامت اور آب و تاب میں سب پر فائق ہو۔ ؎

گہر ہیں آب ور کے تمام یک دانہ

اسی مضمون کو اقبال نے ایک شعر میں یوں باندھا ہے:۔

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است

اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

من اے دانشوراں در پیچ و تابم
خرد را از ہمیں مستی محال است

چساں در مشت خاکے تن زند دل
کہ دل در مشت خاک از ایں خیال است!

بنیادی تصور خرد کی بیچارگی کا اثبات کیا ہے کہ عقل اس بات کا جواب نہیں دے سکتی کہ تن مشتِ خاک ہے۔ اس میں دل کس طرح اور کیونکر کارفرما ہو گیا؟

مطلب عقلائے دہر سے خطاب کرتے ہیں کہ تم ہر معاملہ میں عقل کو اپنا رہنما بناتے ہو، یہ تو بتاؤ کہ اس مشتِ خاک میں جسے تن کہتے ہیں، دل کس طرح سما سکا جو اس مشتِ خاک سے کوئی نسبت یا رابطہ نہیں رکھتا؛ یہ مشتِ خاک تو خیال سے بالکل عاری ہے اور دل مرکزِ خیالات

ہے۔ پس اگر تم سے ہو سکے تو اس گتھی کو سلجھاؤ کہ یہ دو متضاد خواص رکھنے والی چیزیں (جسم اور دل) ایک جگہ کیسے جمع ہو گئیں۔

مادہ کا جس طرح چاہو تجزیہ کرو۔ اس کے اجزاء میں کوئی ایسی شئے نہیں جسے خیال سے تعبیر کر سکیں، اور نفس ناطقہ (دل) غیر مادی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آنِ واحد میں متعدد تصورات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب ایک دوسرے سے متمیز ہوتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے۔ کہ غیر مادی شئے مادہ کے ساتھ کیسے جمع ہو گئی؟ بالفاظِ دگر، مادہ میں حیات کیسے رونما ہو گئی؟

مرشد رومیؒ نے اس سوال کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست

از کجا می آید ایں آواز دوست

اگرچہ اقبال نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیونکہ یہاں ان کا مقصد سوال ہے نہ کہ جواب، لیکن دوسرے مصرع میں جواب کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس سوال کا جواب عقل کی مدد سے تو نہیں مل سکتا۔ لیکن عشق اس کا جواب دے سکتا ہے:۔ ؎

ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست

میاں آبزم بساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

بنیادی تصور ابدی زندگی صرف جدوجہد سے حاصل ہو سکتی ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ زندگی کی کشمکش سے گریز مت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خودی ضعیف ہو جائے گی اور ضعفِ خودی کا نتیجہ موت ہے۔ اگر حیاتِ جاوداں کی آرزو ہے، تو تنازع للبقاء میں بقدرِ استطاعت حصہ لو تاکہ خودی مستحکم ہو سکے۔ اسی نکتہ کو دوسرے طریق سے یوں سمجھایا ہے:۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

سراپا معنیٔ سربستہ ام من — نگاہِ حرف بافاں برنتابم
نہ مختارم توان گفتن نہ مجبور — کہ خاکِ زندہ ام در انقلابم

بنیادی تصوّر انسان نہ مختارِ مطلق ہے نہ مجبورِ محض ہے بلکہ ہر لحظہ منقلب ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ انسان کی ہستی ایک معمہ ہے جس کو کوئی منطق حل نہیں کر سکتی۔ نہ اسے مختار کہہ سکتے ہیں نہ مجبور بلکہ وہ ایک صاحبِ ارادہ (زندہ) ہستی ہے جو ہر وقت اپنے ارادہ سے اپنے اندر انقلاب پیدا کرتی رہتی ہے۔

تبصرہ اس مشکل رباعی میں اقبال نے جبر و اختیار کا مسئلہ اپنے فلسفہ کی روشنی میں سمجھایا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ انسان نہ تو خدا کی طرح مختارِ مطلق ہے اور نہ جمادات و نباتات کی طرح مجبورِ محض ہے بلکہ خدا نے اسے محدود دائرہ میں اتنا اختیار عطا فرمایا ہے کہ وہ اگر ہمت سے کام لے تو جبر کی زنجیروں کو توڑ کر بڑی حد تک اپنے اندر شانِ اختیار پیدا کر سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے

(۱) اپنی خداداد قوتِ ارادی سے کام لے۔ اسی کو اصطلاحِ تصوف میں ہمت یا عزم کہتے ہیں۔ اور انسان کی ساری روحانی ترقیات کی بنیاد یہی ہمت ہے۔

(۲) ہمت سے کام لے کر ضبطِ نفس کرے۔ یعنی نفسِ امارہ کو مغلوب کرے اس کو تصوف کی اصطلاح میں مجاہدہ کہتے ہیں اور اس کے بغیر کوئی شخص منازلِ سلوک طے نہیں کر سکتا۔

(۳) نفسِ امارہ کو مغلوب کرنے کے بعد اتباعِ رسول کرے اور اتباعِ رسول کے لیے عشقِ رسول شرط ہے۔

(۴) اتباعِ رسولؐ دراصل اتباعِ شریعت ہے اور اتباعِ شریعت اطاعتِ الٰہی کا دوسرا نام ہے۔

(۵) انسان جس قدر اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے گا۔ اسی قدر اس کے اندر اختیار کا رنگ پیدا ہوگا۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں :۔

در اطاعت کوشش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

(۶) اس کی تشریح یہ ہے کہ انسان جس قدر اطاعت کرے گا۔ اسی قدر اس کے اندر صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا ہوگا۔ لیکن اطاعتِ کاملہ، فقر کے بغیر ناممکن ہے :۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

(۷) سب جانتے ہیں کہ خدا مختارِ مطلق ہے۔ اور اختیار مطلق، جبر کی ضد ہے۔ اس لیے جیسا کہ میں نے پہلے واضح کیا ہے، انسان کے اندر جبر کا ازالہ ہوتا جائے گا۔ اور شانِ اختیار، نمایاں ہوتی جائے گی۔

(۸) جب سالک فنا فی الرسولؐ ہو جانے کی بدولت فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچ جائے گا۔ تو اس میں مختاری کی شان اس قدر نمایاں ہو جائے گی۔ کہ شانِ جبر برائے نام باقی رہ جائے گی۔ اسی حقیقت کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے :۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ او شق می شود

میں نے ان سطور میں اقبال کا فلسفہ نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اب میں لفظِ انقلاب کی تشریح اور کروں گا۔

کہ خاک زندہ ام در انقلابم

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انقلاب کے باب میں انسان کو اس قدر اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی قوت ارادی سے جیسا انقلاب اپنے حق میں پسند کرے برپا کر سکتا ہے چنانچہ یہ آیت اس اختیار پر نص صریح ہے :-

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فجور (بدی) اور تقویٰ (نیکی) دونوں صورتوں کا الہام عطا فرما دیا ہے۔ یعنی اسے یہ اختیار عطا فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرے ۔اس لیے جس نے اپنی قوت ارادی سے کام لیکر اپنے نفس (اپنی خودی) کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔ اور جس نے اپنی خودی کی صلاحیتوں کو ملیامیٹ کر دیا وہ ناکام (برباد) ہو گیا۔

پس ہر شخص اپنے اختیار سے کام لے کر ہر وقت اپنی خودی پر انقلاب وارد کرتا رہتا ہے، اور اس انقلاب کی دو ہی صورتیں ہیں۔

(۱) یا تو وہ اپنے ارادہ سے اطاعت کی بدولت اپنی صفت اختیار میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ یعنی روحانیت میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مولائی صفات بن جاتا ہے۔

(۲) یا وہ اپنے ارادہ سے نافرمانی کی بدولت صفتِ جبر میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ یعنی روحانیت کو مٹاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شیطان صفات بن جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو کوئی انسان ان دو حالتوں سے باہر نہیں ہے یا وہ ترقی کرتا رہتا ہے یا تنزل۔ نفس کی مخالفت اور خدا کی اطاعت کرتا ہے تو اس میں مختاری کا رنگ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ اور نفس کی اطاعت اور خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو اس میں مجبوری کی شان نمایاں ہوتی جاتی ہے۔

یہ وجہ ہے کہ اقبال نے انسان کی زندگی کو انقلاب سے تعبیر کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تعبیر بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ نقل اور عقل دونوں اس کی مؤید ہیں۔

مگو از مدعائے زندگانی ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست

من از ذوقِ سفر آنگونہ مستم کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

بنیادی تصور

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

مطلب

کہتے ہیں کہ مجھ سے زندگی کا مدعا مت پوچھو۔ یہ سوال اس بات کی دلیل ہے کہ تم زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی، ذوقِ سفر کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ذوقِ سفر ہی اس کی حقیقت ہے :- ؏

حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اسی حقیقت کو دوسری جگہ یوں واضح کیا ہے :-

زندگی جز لذتِ پرواز نیست
آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

ساقی نامہ میں اسی نکتہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زندگی کا مدعا اور مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان ہر وقت روحانی منازل عالیہ طے کرتا رہے۔ جب ایک مقام (منزل) حاصل کرے، تو اس سے بلند تر مقام کے حصول میں کوشاں ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی، حرکت کا نام ہے۔ اگر سالک کسی مقام پر رک جائے، یعنی اس مقام کو اپنی منزلِ مقصود سمجھ لے، تو سکون پیدا ہو جائے گا۔ اور سکون موت ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سالک کسی منزل کو بھی اپنی منزل قرار نہیں دے سکتا۔ اب پڑھو اس مصرع کو :- ؏

کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

نوٹ :- اقبال کا فلسفۂ حیات اس آیت شریفہ سے ماخوذ ہے :-

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

لیکن جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد اعمالِ صالحہ کو شعارِ زندگی بنا لیا ان کے لیے وہ اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اس آیت شریفہ سے ثابت ہوا کہ اجر کی انتہا نہیں ہے۔ اسلئے ترقی کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یعنی زندگی، ذوقِ پرواز (ترقی) کا دوسرا نام ہے۔

از ... من گہر پارۂ سنگ — ز فیضِ آفتابے آگہر شد

و ہر سنگ اے بندۂ زر — کہ زد از گوشۂ چشمے قیمتے شد

بنیادی تصور انسان کی نگاہ، اشیائے کائنات کی قدر و قیمت کا معیار ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ الماس، زمرد، لعل، یاقوت، نیلم وغیرہ یہ کیا ہیں! محض پارہ ہائے سنگ ہیں۔ چونکہ انسان ان کے حصول کی آرزو کرتا ہے، اس لیے اس آرزو کی بدولت یہ پتھر "جواہرات" بن جاتے ہیں۔ اور بازار میں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان کی آرزو اپنے دل سے نکال دے، تو یہی جواہرات معاً بے قیمت ہو جائیں گے — بالفاظِ دگر، یہ جواہرات بذاتِ خود کچھ نہیں ہیں۔ انسان کی نگاہ نے ان کو جواہرات بنا دیا۔

اس بات سے اقبال نے یہ نکتہ مستنبط کیا ہے کہ جب حقیقتِ حال یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی قدر و قیمت انسان کے گوشۂ چشمِ التفات پر موقوف ہے (جسے وہ قیمتی قرار دے، وہ قیمتی ہو جاتی ہے) تو اسے لازم ہے کہ زر و جواہر کی پرستش سے احتراز کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسان سونے (زر) کے لیے اپنا ضمیر فروخت کر دیتا ہے حالانکہ سونا محض اس لیے قیمتی ہو گیا ہے کہ انسان اُسے قیمتی سمجھتا ہے۔ ورنہ جہاں تک مفید اور کارآمد ہونے کا سوال ہے، لوہا سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔

دل ما آشنا بیگانہ خو بود — نگاہش بے قرار جستجو بود

چو دید او را پرید از سینۂ من — بدستم کرد دست آموز او بود

بنیادی تصور عاشق کا دل، ہر وقت معشوق کی جستجو کرتا رہتا ہے۔

مطلب اس رباعی میں اقبال نے، عاشق کی نفسیاتی کیفیت شاعرانہ انداز میں بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اپنے دل کو اپنا سمجھتا تھا۔ لیکن وہ بڑا بیوفا نکلا۔ چونکہ وہ معشوق کی تلاش میں بے قرار رہتا تھا۔ اس لیے جب اُس نے اُسے دیکھا تو فوراً میرے سینہ سے نکل کر اُس کے پاس چلا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دل میرا نہیں تھا۔ بلکہ اس کا دست آموز تھا۔

نوٹ :۔ دست آموز اس شکاری پرند کو کہتے ہیں جسے باز دار سدھا لیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں شکار پر چھوڑ دیتے ہیں اور جب اشارہ کرتے ہیں تو وہ فوراً واپس آکر ہاتھ پر بیٹھ جاتا ہے۔

تبصرہ اس رباعی میں جو نکتہ مضمر ہے وہ یہ ہے کہ دل کی اصل، مادی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ قبل ازیں بیان کر چکے ہیں، وہ عالم بالا کی چیز ہے۔ اس کا مصدر یا منبع سالمات مادی نہیں بلکہ صفات ایزدی ہے۔ لہذا جس دل کو اللہ تعالیٰ کی "دید" میسر آجاتی ہے، وہ دنیا اور مافیہا سے یکسر بے گانہ ہو جاتا ہے۔

اسی لیے اقبال نے پہلے مصرع میں دل کو "بیگانہ خو" کہا ہے۔ اور اس میں شک بھی کیا ہے۔ کہ دل، مادیات سے بیگانہ ہے۔ تیسرے مصرع میں "سینۂ من" سے علائقِ دنیوی مراد ہیں چوتھے مصرع میں "دست آموز" سے مراد یہ ہے کہ دل (انائے مقید) میں محبوب حقیقی (انائے مطلق) سے ملنے کا بے پناہ جذبہ پوشیدہ ہے۔ اسی حقیقت کو مُرشد رومیؒ نے یوں واضح کیا ہے :۔

ہر کسے کو دور ماند از وصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش

بپرس از عشق و از نیرنگیِ عشق — بہر رنگے کہ خواہی سر برآرد
درونِ سینہ بیش از نقطہ نیست — چو آید بر زباں پایاں ندارد

بنیادی تصور | عشق کی کیفیات اور واردات بے پایاں (غیر محدود) ہیں۔

مطلب | اے مخاطب! کوئی شخص عشق اور اس کی نیرنگیوں یعنی گوناں گوں کیفیات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ عشق دراصل ایک غیر محدود حقیقت ہے تو اپنے ذہن میں جس کیفیت (رنگ) کا تصور بھی کرے، عشق اسی رنگ میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ (سر برآرد)

اگر اس کی مثال درکار ہو، تو اس بات پر غور کرو کہ جب تک عشق دل میں پوشیدہ ہے۔ وہ ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے۔ (نقطہ سے تصور مراد ہے) لیکن جب اس کی تشریح کرنے لگتے ہیں، تو یہ داستان ختم ہونے میں نہیں آتی۔

تبصرہ | یہاں عشق سے وہ جذبہ مراد نہیں ہے، جو گیہوں کی روٹی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے نہ ملنے سے فنا ہو جاتا ہے۔ بلکہ وہ جذبۂ نمود و نمائش مراد ہے جو ذاتِ احدیت کے دل میں موجزن ہوا۔ جس کی بدولت اس ذاتِ بیرنگ نے اپنے آپ کو غیر محدود اور لا متناہی صورتوں میں دیکھا اور اب تک دیکھ رہی ہے۔

جب تک یہ جذبہ (عشق) ذاتِ بحت کے سینہ میں تھا، تو بلاشبہ ایک نقطہ سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ حسنِ مطلق، خود نمائی پر راغب ہوا تو اتنی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ کہ کوئی شخص ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

بات یہ ہے کہ ذات اگرچہ بیرنگ ہے لیکن اس کی صفتِ علم بے پایاں ہے۔ اس لئے مظاہرِ کائنات بھی غیر محدود ہیں۔ اور اسی لیے ان میں نیرنگی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اقبال نے پہلے مصرع میں "نیرنگیِ عشق" سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مشو اے غنچۂ نورستہ دلگیر		ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی
لب جو، بزم گل، مرغ چمن، سیر		صبا، شبنم، نوائے صبحگاہی

بنیادی تصور انسان کو چاہیئے کہ زندگی کے تاریک پہلو کے بجائے اس کے روشن پہلو پر نظر رکھے، تاکہ زندگی میں تلخی کے بجائے شادمانی کا رنگ پیدا ہو سکے۔

مطلب اے انسان (غنچۂ نورستہ) تو اس کائنات (بستاں سرا) سے اور کیا چاہتا ہے؟ دیکھ! یہاں زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے کس قدر وافر سامان موجود ہے! نہر کا کنارہ، گلوں کی محفل، بلبل، صبا، شبنم اور پرندوں کے چہچہے!

اقبال نے دوسرے شعر میں غنچہ کی رعایت سے باغ کے لوازم کا بیان کیا ہے۔ لیکن اگر ناظرین چاہیں تو ان کی تاویل بھی کر سکتے ہیں:-
لب جو سے، مناظر فطرت۔ بزم گل سے، کلب لائف یا دوستوں کی محفل مرغ چمن سیر سے، زنان مصر۔ صبا سے، دنیوی علوم۔ شبنم سے برکات سماوی اور نوائے صبحگاہی سے جذبۂ عشق مراد ہو سکتا ہے۔
اقبال نے نوائے صبحگاہی کو سب سے آخر میں رکھا ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ قیمتی شے ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں:-

عطارؔ ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو، غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

مرا روزے گل افسردہ گفت		نمود ما چو پرواز شرار است
دلم بر محنت نقش آفریں سوخت		کہ نقش کلک او ناپایدار است

بنیادی تصور اشیائے کائنات کا وجود محض عارضی ہے۔

مطلب مجھ سے ایک دن ایک مرجھائے ہوئے پھول نے یہ بات کہی کہ ہماری ہستی محض چند روزہ ہے بلکہ اس سے بھی کم ہے۔

یہ بات سن کر میرا دل "نقش آفریں" کی محنت پر افسوس کرنے لگا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویریں سب کی سب ناپائیدار یعنی فانی ہیں۔

اقبال کا مقصد اس رباعی سے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ دنیا میں ہر شئے فانی ہے۔ اس لیے اشیائے کائنات سے دل لگانا سراسر نادانی ہے۔

جہانِ ما کہ پایانے ندارد   چو ماہی در یمِ ایام غرق است

یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی   یمِ ایام در یک جام غرق است

بنیادی تصور قلبِ مومن، کائنات سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

مطلب یہ ساری کائنات، اسیرِ حلقۂ زماں ہے۔ اور خود زماں کی حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبِ مومن میں محصور ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ قلبِ مومن کی وسعت کے سامنے اس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

تبصرہ چونکہ اس موضوع پر قبل ازیں اظہارِ خیال کر چکا ہوں، اس لیے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں اس قدر صراحت کافی ہے کہ:-

(۱) کائنات کا دارومدار حرکت پر ہے۔

(۲) زمانہ مقدارِ حرکت ہے۔

(۳) اس لیے کائنات، زمانہ کے سمندر میں غرق ہے۔

(۴) لیکن خود زمانہ کا سمندر، قلبِ مومن میں غرق ہے۔

(۵) اس لیے قلبِ مومن کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

(۶) اسی لیے اقبال اور دوسرے عرفاء کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کے لیے عالمِ دل کی سیر بالکل کافی ہے، کیونکہ ساری کائنات دل میں پوشیدہ ہے۔

کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبرؔ درسِ حکمت کو
میں اسپنسرؔ سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا   (اکبرؔ)

گر بجود سازو کسے سیر و سفر در کار نیست

ایں کہ ہر سو می رویم از خویش رم داریم ما ! (بیدل)

برنگان چمن ہم داستانم — زبانِ غنچہ ہائے بے زبانم

چو میرم با صبا خاکم بیامیز — کہ جز طوفِ گلاں کارے ندانم

بنیادی تصوّر عاشق مرنے کے بعد بھی اپنے معشوق سے جدائی نہیں چاہتا۔

مطلب کارکنان قضا و قدر سے خطاب کرتے ہیں۔ چونکہ میں بلبلوں اور قمریوں کا ہمنشین ہوں اور پھولوں کی صفت بیان کرتا رہتا ہوں۔ (غنچہ کو شعراء بے زبان باندھتے ہیں) اس لیے جب میں مرجاؤں، تو میری خاک کو صبا میں شامل کر دینا، تاکہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح گلوں کا طواف کرسکوں جس طرح زندگی میں کرتا رہا ہوں۔

نماید آنچہ ہست ایں وادیٔ گل — درونِ لالہ آتش یا دخاں چیست؟

بچشم ما چمن یک رنگ زار است — نمی دانم بچشم بلبلاں چیست؟

بنیادی تصوّر ہر شخص کائنات کو اپنے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق نظریہ قائم کرتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص کا نظریہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔

مطلب اس فلسفیانہ رباعی میں اقبال نے استفہام کے پردہ میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ اے مخاطب! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہی حقیقت شے ہے؟ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں تو غلطی پر ہے۔

بلاشبہ یہ وادیٔ گل، یہ چمن ہماری نگاہ میں مختلف اقسام کے رنگوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن بلبلوں سے تو دریافت کر، کیا وہ بھی چمن کو ہماری طرح

"موجِ رنگ" ہی سمجھتی ہیں؟

تبصرہ اقبال نے اس دلکش رباعی میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ یہ کائنات سراسر اعتباری ہے۔ بقول خواجہ میر دردؒ:۔

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

جو شخص بصارت سے محروم ہے، اس کی دنیا رنگ سے معریٰ ہے اور جو شخص سماعت سے محروم ہے، اس کی دُنیا میں آواز یا موسیقی کا کہیں کوئی نشان نہیں ہے۔ لہٰذا اندھے کی دُنیا بہرے کی دُنیا سے مختلف ہے اور جو شخص سمع و بصر دونوں رکھتا ہے، اس کی دُنیا ان دونوں کی دُنیا سے مختلف ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیسا شعور ویسا احساس، اور جیسا احساس ویسا ہی نظریۂ کائنات۔

تو خورشیدی من سیارۂ تو — سراپا نورم از نظارۂ تو
ز آغوشت تو دور و ناتمامم — تو قرآنی من سیپارۂ تو

بنیادی تصور انائے مقید (خودی) کا وجود، انائے مطلق (خدا) کے وجود پر موقوف ہے۔ کیونکہ خودی، خدا کا خلق ہے۔ اور خلق اپنے وجود میں ذی خلق کا محتاج ہوتا ہے۔

مطلب مطلب تو بنیادی تصور کے ضمن میں واضح ہوگیا۔ مزید توضیح کے لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اے خدا! جس طرح اجرامِ فلکی (ثوابت و سیار) اپنے وجود کے لیے آفتاب کے محتاج ہیں، اسی طرح میں تیرا محتاج ہوں۔ اور جس طرح تمام اجرامِ فلکی آفتاب سے مستفید ہوتے ہیں، اسی طرح میں تجھ سے کسبِ نور کرتا ہوں۔

دوسرے شعر میں اپنے مسلک کو صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ میں تجھ سے جدا ہوں، اس لیے ناقص ہوں، ناتمام ہوں، محدود ہوں اور محتاج ہوں۔ میرے اندر یہ تمام عیوب اس لیے نظر آتے ہیں کہ تجھ سے دور ہوگیا

ہوں۔ دراصل تجھ میں اور مجھ میں وہی نسبت ہے جو قرآن اور سیپارہ میں ہے۔ محدود ہوجانے کی وجہ سے سیپارہ پر قرآن کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن اربابِ نظر جانتے ہیں کہ سیپارہ بھی قرآن ہی کا جزء ہے۔ بالفاظِ دگر قرآن تو نہیں ہے لیکن قرآن سے جدا بھی نہیں ہے۔

ہم نے حد بندی قائم کردی تو پارہ، اصل سے جدا نظر آنے لگا۔ اور انہی حد بندیوں کی بنا پر تیس پارے موجود ہوگئے۔ لیکن اگر اس عارضی اور فرضی تقسیم سے قطع نظر کریں تو سیپارے غائب ہوجائیں گے اور صرف قرآن باقی رہ جائے گا۔ اسی طرح تعینات سے قطع نظر کرلیں تو کائنات غائب ہوجائے گی، صرف خدا باقی رہ جائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کا جسے اصطلاح میں ماسوی اللہ کہتے ہیں۔ کوئی ذاتی یا مستقل یا حقیقی وجود نہیں ہے، یہ محض ظل ہے۔ اللہ تعالےٰ کی صفات کا۔ اقبال نے اس حقیقت کو اپنی ہر تصنیف میں واضح کیا ہے۔ اس جگہ صرف ایک شعر درج کرتا ہوں:-

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
بکنارہ برافگندی دُرِ آبدارِ خود را

خیال او درون دیدہ خوشتر
طلسمِ تیشہ زدہ جہاں کاہیدہ خوشتر
مرا اے ہمدمے این نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

بنیادی تصور ع زمنزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

مطلب لطفِ عاشقی اسی میں ہے کہ محبوب کا وصال حاصل نہ ہو، بلکہ اس کے بجائے اس کا خیال ہمیشہ دل میں جاگزیں رہے۔ نیز محبت کی آگ تیز ہوتی رہے اور جان پگھلتی رہے۔ ع

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

مجھے ایک عاشق نے یہ نکتہ سمجھایا کہ عاشق کی نگاہ میں منزل سے جادۂ پیچیدہ زیادہ خوش آئند ہے۔ کیونکہ منزل پر پہنچ کر سارا لطف ختم ہوجائے گا۔

اسی بات کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے :-

زنیل آسماں بگذر زہجوئے کہکشاں بگذر
زمنزل دل بمیر دگرچہ باشد منزل ماہے

دماغم کافر زنار دار است ... بتاں را بندہ و پروردگار است
دلم را ایں یکے نالد از غم عشق ... ترا با دین و آئینم چہ کار است

بنیادی تصور انسانی شخصیت میں سب سے زیادہ قیمتی شئے دل ہے، نہ کہ دماغ۔

مطلب اے مخاطب! اگر تو کسی شخص کی بزرگی یا قیمت کا اندازہ کرنا چاہتا ہے، تو اس کے دماغ کو مت دیکھ بلکہ اس کے دل کو دیکھ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے دماغ میں سینکڑوں بت پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جن کی وہ رات دن پوجا کرتا رہتا ہے۔ اور چونکہ وہ بت اسی کے تراشیدہ ہوتے ہیں، (بت سے آرزو مراد ہے) اس لیے وہ بلاشبہ ان بتوں کا بندہ بھی ہوتا ہے، اور خالق بھی۔

چوتھا مصرع اس رباعی کی جان ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی قیمت کا فیصلہ دین یا آئین کو دیکھ کر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص بظاہر مسلمان ہو۔ لیکن اس کے دماغ میں بتخانہ پوشیدہ ہو۔ اندریں صورت حقیقت کے اعتبار سے اس میں اور ایک کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن اگر اس کے دل میں خدا کی محبت جلوہ گر ہے۔ تو اس کا دماغ بھی مسلمان ہوگا۔ یعنی وہ شخص حقیقی معنی میں مسلمان ہوگا۔ اسی نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے :-

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام کا حقیقی مقام دل ہے نہ کہ دماغ :-

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صنوبر بندہ و آزاد وا داد | فروغ روئے گل از باد وا داد
حریمش آفتاب و ماہ و انجم | دل آدم در نکشادہ وا داد

بنیادی تصور ساری کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے، جسے خالق کائنات نے یہ اختیار دیا ہے کہ اپنے دل کا دروازہ اپنے خالق کے لیے کھولے یا نہ کھولے۔

مطلب اے مخاطب! صنوبر کو دیکھ! وہ قانون نمو کی پابندی کر رہا ہے، جو اس کی بندگی کی دلیل ہے۔ لیکن اسی پابندی کا ثمرہ یہ ہے کہ وہ خزاں کی دستبرد سے آزاد ہے۔ (شعراء صنوبر کو آزاد باندھتے ہیں)

گلوں کو دیکھ! اسی کے فیضان کی بدولت ان میں یہ دلکشی پیدا ہوتی ہے اسی طرح آفتاب، ماہتاب اور ستارے سب اس کے نافذ کردہ قوانین کی پابندی کر رہے ہیں۔ غرضکہ ساری کائنات مجبور محض ہے اسلئے وہ ہر شے کی خود رہنمائی کر رہا ہے یعنی براہ راست متصرف ہے۔

لیکن دل آدم ہی ساری کائنات میں ایک ایسی ہستی ہے، جو "در نکشادہ" کی مصداق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم سے یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا دل، دراصل میرا گھر ہے۔ لیکن جب تک تو اپنی مرضی سے اس کا دروازہ میرے لیے نہیں کھولے گا۔ میں اس میں داخل نہیں ہوں گا۔

واضح ہو کہ خدا خالق ہونے کے اعتبار سے ہر شے میں متصرف ہو سکتا ہے لیکن اس کی مشیت یہ ہے کہ وہ انسان کا امتحان کرے، اس لیے اس نے آدم کو اختیار کی نعمت عطا فرمائی۔ تاکہ آدم بجا طور پر مستحق ثواب یا مستوجب عذاب ہو سکے۔

اس لیے جو انسان اپنے دل کا دروازہ اپنی مرضی سے خدا کیلئے نہیں کھولتا خدا بھی اس میں داخل نہیں ہوتا۔ یعنی جو شخص اس سے ملنے کی آرزو، اور اس کے مطابق جدوجہد نہیں کرتا، خدا بھی اُسے اپنا جلوہ نہیں دکھاتا۔

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود　　خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود

ولیکن چوں بخود نگریستم من　　کرانِ بیکراں در من نہاں بود

بنیادی تصوّر دل کی دنیا غیر محدود ہے۔

مطلب اگرچہ ہر ستارہ بجائے خود ایک جہان ہے۔ اور ستارے شمار میں نہیں آ سکتے۔ اس کے باوجود عقل اس کائنات کے محدود ہونے کا حکم لگاتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کائنات اپنی وسعت کے باوجود محدود ہے۔ لیکن جب میں نے اپنے دل کی دنیا پر نگاہ کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ غیر محدود ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مادی دنیا محدود ہے لیکن خودی غیر محدود ہے۔

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر　　تہ ایں گنبد گرداں رہے ہست

اگر باور نداری خیز و دریاب　　کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست

بنیادی تصوّر جو شخص جدوجہد کرتا ہے، وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے

مطلب اے مخاطب! یہ سراسر تیری نادانی ہے کہ تو جدوجہد ترک کرتا نہیں اور کہتا ہے کہ میری تقدیر ہی میں کامیابی نہیں تھی۔ میں تجھے یہ بتاتا ہوں کہ دنیا میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر تجھے یقین نہ ہو تو جدوجہد پر کمربستہ ہو جا۔ جب تو ایسا کرے گا۔ یعنی جب تو تقدیر کی زنجیر سے اپنے پاؤں کو آزاد کرے گا۔ تو تجھے معلوم ہو گا کہ ترقی کا میدان تیرے سامنے کھلا ہوا ہے۔

نوٹ: اس رباعی کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

اور جو لوگ ہم سے ملنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں ہم یقیناً ان کو اپنے ملنے کی راہیں دکھا دیتے ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو لوگ تقدیر پر بھروسہ کر کے جدوجہد سے

کنارہ کش ہو جاتے ہیں، وہ دراصل تقدیر کا مفہوم ہی نہیں سمجھتے ۔ بیشک تقدیر الٰہی برحق ہے ۔ لیکن یہ بھی تو الٰہی کی تقدیر ہے ۔ کہ کامیابی کے لیے جدوجہد شرط ہے ۔

دل من در طلسم خود اسیر است | جہاں از پرتو او تاب گیر است
مپرس از صبح و شام من کہ آفتابے | بہ پیش روزگار من پیر است

بنیادی تصور انائے مقید (خودی) اپنی اصل کے لحاظ سے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے ۔

مطلب کہتے ہیں کہ اگرچہ میرا دل (انائے مقید) اس طلسم میں اسیر ہے جو اس نے خود اپنے چاروں طرف سے باندھ لیا ہے ۔ لیکن یہ سارا جہان اسی کے نور سے مستنیر ہے ۔ یعنی اگر خودی نہ ہوتی ، تو اس کائنات کا تحقق نہیں ہو سکتا تھا ۔

بظاہر خودی طلسم روزگار میں اسیر ہے (اسی لیے اُسے انائے مقید کہتے ہیں) لیکن وہ اپنی اصل کے لحاظ سے مادی نہیں ہے ، بلکہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے ۔ یہ آفتاب جو لاکھوں برس سے چمک رہا ہے ، خودی کے مقابلہ میں کل یا پرسوں کی بات ہے ۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ عالم اگرچہ اپنی تفصیل کے لحاظ سے حادث ہے ۔ لیکن اس کا اصل منشا لم یزل اور لایزال ہے ۔ بالفاظِ دگر انائے مقید کا اصل منشا قدیم ہے ۔ انائے مقید کیا ہے ؟ درحقیقت وہ انائے مطلق (ذاتِ باری) کا مظہر ہے ، اس لیے اس نسبت کے لحاظ سے وہ بھی قدیم ہے ۔

نوٹ :- اقبال کہنا تو یہی چاہتے ہیں جو میں نے صاف لفظوں میں لکھدیا لیکن وہ مصلحت بیں ہیں ، اس لیے اپنا حقیقی مفہوم استعاروں کے پردہ میں پوشیدہ کر دیتے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے خود اس شعر میں اس بات کا اعتراف کیا ہے ۔

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلّم کی !
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

نوا در سازِ جاں از زخمۂ تو | چساں در جانی و از جاں برونی؟
چو عکسے باتو سوزم بے تو میرم | تو اے بیچون من بے من چگونی؟

بنیادی تصور اس رباعی میں اقبال نے "ہمہ با اوست" کا نظریہ پیش کیا ہے۔

مطلب مطلب بیان کرنے سے پہلے نظریۂ "ہمہ با اوست" کی مختصر تشریح درج کرتا ہوں۔ واضح ہو کر مخلوقات کے وجود کے باب میں تین نظریات ہیں۔

(۱) ہمہ از وست۔ اس نظریہ کی رُو سے مخلوقات (موجودات) اعراض تو نہیں ہیں لیکن ثبوتی واسطہ سے موجود بالعرض ہیں یعنی بخلاف اعراض انکا وجود حقیقی ہے لیکن خانہ زاد نہیں ہے۔ بلکہ حق تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ اور اسی بنا پر تمام موجودات (ممکنات) حق تعالیٰ سے منفصل (جدا) ہیں۔ یہ متکلمین اور علمائے ظاہر کا مذہب ہے۔

(۲) ہمہ با اوست۔ اس نظریہ کی رُو سے تمام ممکنات اعراض ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہیں۔ بالفاظِ دگر بذاتِ خود قائم نہیں ہیں۔ حق تعالیٰ ان کے لیے بمنزلہ جوہر ہے اور اربابِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ عرض کا قیام جوہر پر موقوف ہے جیسے سفیدی یا سیاہی بذاتِ خود موجود نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ کسی دوسری شے میں ہو کر پائی جائے گی۔ یہ مسلک بعض حکما کا ہے۔

(۳) ہمہ اوست۔ اس نظریہ کی دو تعبیریں ہیں۔

(۱) وحدتِ شہود:- حق تعالیٰ موجود حقیقی ہے۔ ممکنات کا وجود ظلی ہے۔ لیکن وہمی نہیں ہے۔ ہر شے مظہر ذاتِ حق ہے۔ یعنی تعالیٰ مرئی فی الکل ہے یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مسلک ہے۔

(ب) وحدتِ وجود:- حق تعالیٰ موجود حقیقی ہے۔ ممکنات کا وجود وہمی ہے جیسے حلقۂ آتشیں (دائرہ) جو شعلۂ جوالہ سے پیدا ہوتا ہے۔ نظر تو آتا ہے

لیکن خارج میں موجود نہیں ہے۔ یہ شیخ اکبرؒ اور بیدل کا مسلک ہے۔
چنانچہ بیدل کہتا ہے:۔

صورت وہمی یہ ہستی متہم داریم ما
چوں حباب آئینہ برطاق عدم داریم ما

اس مختصر تشریح کے بعد اب رباعی کا مطلب لکھتا ہوں:۔
کہتے ہیں کہ اے خدا! جس طرح ساز، سازندہ کا محتاج ہے۔ اسی طرح میں اپنے وجود کے لیے تیرا محتاج ہوں۔ مضراب کے بغیر ساز میں سے نغمہ نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح خدا کے بغیر انسان بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ ہم قبل ازیں صراحت کر چکے ہیں کہ ہمہ از اوست، کی رُو سے تمام ممکنات حق تعالےٰ کے ساتھ قائم ہیں۔

اے خدا! عقل حیران ہے یعنی اس راز کو نہیں سمجھ سکتی کہ تو مجھ میں ہے بھی (ورنہ میں زندہ نہیں رہ سکتا) اور نہیں بھی، کیونکہ میں بندہ ہوں، خدا نہیں ہوں۔ علاوہ بریں اگر تو مجھ میں ہے، تو تو محدود ہو جائے گا، اور یہ محال ہے۔
نوٹ:۔ قرآن حکیم نے اس آیت میں اسی راز کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ

ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
مرشد رومیؒ نے اسی نکتہ کو یُوں واضح کیا ہے:۔

اتصال بے تکیّف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

اے خدا! میں بمنزلہ چراغ ہوں لیکن میری روشنی کا منبع تُو ہے۔ اگر تُو نہ ہوتا، تو میں بھی نہ ہوتا۔ یعنی میں اپنے وجود میں تیرا محتاج ہوں۔ اسی خیال کو اقبال نے یُوں ادا کیا ہے:۔

بے تو از خوابِ عدم چشم کشودن نتوان
بے تو بودن نتوان با تو نبودن نتوان

اے خدا! یہ تو سچ ہے کہ میں تیرے بغیر موجود نہیں ہو سکتا اور نہ تیرے بغیر میرا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میرے بغیر تیرا وجود

کیسے متحقق ہو سکتا ہے!

اقبال نے جو سوال اس رباعی میں کیا ہے اس کا جواب گلشن راز جدید میں بایں الفاظ دیا ہے:۔

اگر مائیم گرداں جام ساقی است ٭ بہ بزمش گرمیٔ ہنگامہ باقی است
مرا دل سوخت بر تنہائی او ٭ کنم سامان بزم آرائی او
مثال دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہ دارم خودی را

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہمارے لیے خدا کا وجود ضروری ہے کیونکہ اگر وہ نہ ہوتا، تو ہم کہاں سے آتے؛ اسی طرح ہمارا وجود خدا کی صفاتِ کاملہ کے اظہار کے لیے ضروری ہے۔ مثلاً خدا رب ہے۔ لیکن اگر مربوب نہ ہو تو صفتِ ربوبیت کا اظہار کس طرح ہوگا؟ مذکورہ بالا اشعار میں اقبال نے میخانہ کی مثال دے کر اپنا مطلب واضح کیا ہے۔ کہ خدا ساقی ہے یہ کائنات میخانہ ہے۔ اور ہم مے فروش ہیں۔ اگر ہم نہ ہوں تو وہ پلائے گا کسے؟ ؎

تیرے میخانہ کی رونق ہے ہمارے دم سے

بات یہ ہے کہ خدا حسن مطلق ہے۔ اور حسن کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی اس کا دیکھنے والا بھی ہو۔ عاشق نہ ہو تو معشوق کو معشوق کون کہے؟ خلاق المعانی مرزا بیدل نے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:۔

رنگہا دارد بہارِ عالم بیرنگِ عشق
حسن اگر خواہد دوئی آئینہ ہم داریم ما

اسی خیال کو اقبال نے شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:۔

ما از خدا گم شدہ ایم او بہ جستجو است
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو است

یعنی اگر ہم اس سے محبت کرتے ہیں، تو وہ بھی ہم سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک گز بڑھتا ہوں۔

آخر میں اس شبہ کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہمارا وجود خدا کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح خدا کا وجود ہمارے لیے، تو خدا ہمارا محتاج ہو جائے گا۔ اور احتیاج منافیٔ شان وجوب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا وجود اس کے لیے اسی طرح ضروری نہیں ہے جس طرح اس کا وجود ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) اللہ تعالیٰ صمد ہے۔ چنانچہ اَللّٰهُ الصَّمَدُ اس پر نص صریح ہے۔ لہذا نظریۂ زیر بحث کو اس نص صریح کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔

(۲) اللہ تعالیٰ چونکہ صمد ہے اس لیے وہ مستقل بالغیر نہیں ہے۔ لیکن بندہ مخلوق ہے اس لیے وہ مستقل بالغیر ہے۔ یہ ہے خالق اور مخلوق میں وہ امتیاز جو ہمیشہ اور ہر حال میں قائم رہے گا اور ہر پہلو سے ثابت رہے گا۔

(۳) خدا کا وجود ہمارے لیے اس اعتبار سے ضروری ہے کہ ہم قائم بالذات نہیں ہیں۔ اور اعراض کا قیام بدون جوہر محال ہے۔

(۴) ہمارا وجود خدا کے لیے اس اعتبار سے ہرگز ضروری نہیں ہے کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔ اور اس لیے اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہیں ہے۔

یہ جو ہم نے لکھا ہے کہ ہم نہ ہوں تو وہ پلائے گا کسے ؟ یہ محض شاعرانہ انداز بیان ہے۔ جو ہم نے اس حقیقت کے اظہار کے لیے اختیار کیا ہے کہ حق تعالیٰ چونکہ ہم سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے اس نے بعض امور محض اپنی بے پایاں شفقت کی وجہ سے اپنے لیے لازم فرمائے ہیں چنانچہ وہ خود فرماتا ہے۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶ : ۱۲)

واجب قرار دیا ہے اس نے اپنی ذات پر رحمت کو۔ یعنی اس نے محض اپنی مرضی سے، بندوں پر مہربانی کرنا اپنے لیے ضروری قرار دے لیا ہے ورنہ کوئی ہستی اسے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ ہماری طرح عاجز نہیں ہے کہ اس پر کوئی قادر ہو سکے یا کسی کا زور چل سکے یا کوئی اُسے مجبور کر سکے۔ اگر وہ چاہتا

تو کسی کو پیدا نہ کرتا۔ بالفاظِ دگر نہ وہ ہمارا محتاج ہے اور نہ اسے ہماری ضرورت ہے۔ لیکن اس نے جو کچھ کیا، اپنی رحمت کی بناء پر کیا۔ اگر وہ ہم سے محبت کرتا ہے یا ہمیں تلاش کر رہا ہے تو یہ اس کی بے پناہ رحمت اور شفقت کا تقاضا ہے نہ یہ کہ وہ ہمارا محتاج ہے۔ وہ تو اپنی ذات کے لحاظ سے غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ ہے۔ احتیاج (فقر) اس کی ذات سے اسی طرح خارج ہے جس طرح نور تاریکی سے۔

اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا وجود اس کے لیے ضروری ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ہم نہ ہوں تو اس کی ذات میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی، ہرگز نہیں۔ اگر ساری کائنات فنا ہو جائے تو بھی اس کی ذات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی رحمت کی بناء پر ہم سے محبت کرتا ہے نہ اس بناء پر کہ اگر وہ ہم سے محبت نہیں کرے گا تو اس میں کوئی عیب پیدا ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس کا وجود ہمارے لیے اس اعتبار سے ضروری ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہم زندہ ہی نہیں رہ سکتے اور ہمارا وجود اس کے لیے اس لحاظ سے ضروری ہے کہ اس نے رحمت کو اپنے اوپر خود اپنی مرضی سے لازم کر لیا ہے۔ اور اگر مرحوم نہ ہو تو رحمت کس پر ہوگی؟

نفس آشفتہ موجے از یم اوست — نے ما نغمہ از دم اوست
لب جوئے چو سبزہ بر دمیدیم — رگ ما ریشۂ ما از نم اوست

بنیادی تصور | گذشتہ رباعی کے مضمون کو واضح کیا ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ اے خدا! ہماری روح کوئی قائم بالذات شئے نہیں ہے اس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ وہ تیرے ہی سمندر کی ایک موج ہے۔ جو اصل سے ملنے کیلئے بے قرار (آشفتہ) ہے ع

دم آشفتہ ام در پیچ و تابم

ہماری ہستی (لَے) اور ہمارا عمل (نغمہ) یہ سب تیری جلوہ گری ہے یعنی

تیری ہی صنعت تخلیق کا کرشمہ ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو نہ نے ہوتی نہ نغمہ ہوتا۔ نہ ہم ہوتے نہ ہماری سرگرمیاں ہوتیں۔

دوسرے مصرع میں لفظ "دم" غور طلب ہے اور اس کی تشریح قبل ازیں رباعی ۵۱ میں کر چکا ہوں۔ یعنی انسان خدا تو نہیں ہے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہے۔

اقبال نے اسی خیال کو دوسرے شعر میں باندازِ دگر پیش کیا ہے۔ "رگِ ما ریشۂ ما" سے ہمارا وجود مراد ہے اور "نم" سے پرتو صفات باری مراد ہے۔ یعنی ہمارے وجود میں وہی جاری و ساری ہے۔ اور اس لیے ہماری ہستی مظہر ذات حق ہے۔ ہم کیا ہیں؟ اسی کی صفات کا پرتو ہیں صاف لفظوں میں یوں سمجھو کر کائنات کے پردہ میں وہی جلوہ گر ہے۔

اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن حکیم کی اس آیت سے مستنبط ہے :-

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ

اس آیت شریفہ پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی حقیقت اس کے سوا اور کیا بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اس کائنات کا نور ہے یعنی یہ نور ایزدی ہی تو ہے جو متشکل ہو کر کائنات بن گیا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے یہ فرمایا کہ

ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ۔

یعنی وہی ہر شے کی ابتدا ہے اور وہی ہر شے کی انتہا ہے، وہی ہر شے کا ظاہر ہے اور وہی ہر شے کا باطن ہے۔ ؎

اشیاء ہیں سب مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

جب صورت حال یہ ہے کہ ظاہر بھی وہی ہے باطن بھی وہی ہے۔ یعنی وہی وہ ہے تو بیدل نے اگر یہ کہا تو کیا غلط کہا :-

بہ تحقیقش چہ پردازم کہ آن نیرنگ دانشہا
دلیل وحدت خویش است ہر جا در نقاب من

ترا دردی کہ در سینہ بپیچید | جہانِ رنگ و بو را آفریدی
مگر از نیش بیتابم چہ رنجی | کہ خود ایں ہائے و ہو را آفریدی

بنیادی تصور وحدت شہود کا نظریہ پیش کیا ہے۔

مطلب اقبال نے اس رباعی میں "ہمہ اوست" کی وہ تعبیر پیش کی ہے جسے اصطلاح میں وحدت شہود کہتے ہیں۔ اور اس کا مفہوم نہایت مختصر لفظوں میں قبل ازیں پیش کر چکا ہوں۔ اقبال نے چونکہ اس مضمون کو نظم میں بیان کیا ہے۔ اس لیے شاعرانہ انداز اختیار کیا ہے، چنانچہ "دردی" کی ترکیب اس پر شاہد ہے اور یہی ترکیب اس رباعی کی جان ہے اس کی فلسفیانہ تعبیر یہ ہے کہ :-

"كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ"

یعنی حق تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا میں پہچانا جاؤں، اس لیے میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔

مطلب یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے صرف حق تعالیٰ موجود تھا اور کوئی شے موجود نہ تھی۔ یعنی وہ تنہا تھا۔ اسے یہ تنہائی پسند نہ آئی۔ کیونکہ وہ حسن مطلق ہے۔ اور حسن کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی اس کا دیکھنے والا ہو۔ اس احساس تنہائی (دردی) نے محبوب حقیقی کو اس بات پر مائل کیا کہ کائنات (جہان رنگ و بو) پیدا کرے۔ اور آدم کو اس کا سردار بنائے اور اس میں اپنی محبت کا جذبہ پوشیدہ کر دے تاکہ وہ اس سے محبت کر سکے اور اس طرح حسن کا تقاضا پورا ہو سکے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد دوسرے شعر میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے تو خود ہی مجھے اپنی محبت میں گرفتار کیا ہے۔ پس اگر میں اب تیرے فراق میں آہ و فغاں کرتا ہوں تو تو مجھ سے خفا کیوں ہوتا ہے!

اقبال نے اسی مضمون کو ایک جگہ یوں بھی بیان کیا ہے :-

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

عراقی نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے :-

چو خود کردند راز خویشتن فاش ⁂ عراقی را چرا بدنام کردند؟

بیدل نے اس نظریہ کو اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے۔ میں اربابِ ذوق کی دلچسپی کے لیے چند اشعار درج کرتا ہوں :-

دراں خلوت کہ دور از بیش و کم بود ⁂ نگاہ و جلوہ در خواب عدم بود

چو شد حسن حقیقت جلوہ اندیش ⁂ محمدؐ دید در آئینہ خویش

ز آغوش احد یک میم جوشید ⁂ کہ بیرنگی لباس رنگ پوشید

چہ واجب دانشاد سر جوش نورش ⁂ چہ ممکن دردِ مینائے ظہورش

ظہورش غازہ تقیید آفاق ⁂ بطونش بے نیازی ہائے اطلاق

خم ہستی کہ امکاں نام دارد

زجوشش او مئے در جام دارد

میں ان اشعار گہر بار کی شرح تو اپنی مجوزہ تصنیف "اقبال اور تصوف" میں مناسب موقع پر لکھوں گا، اس جگہ صرف اتنی صراحت کروں گا۔ جس سے اس رباعی کا پہلا مصرع واضح ہو جائے۔

بیدل فرماتے ہیں کہ ظہور کائنات سے پہلے، خلوت ہی خلوت تھی۔ یعنی حسن حقیقی بالکل تنہا تھا۔ اس کے دل میں اپنا جلوہ دیکھنے کا خیال پیدا ہوا یعنی "دردیکی در سینہ پیچیدہ" اس لیے اس نے اپنی ذات پر نظر کی تو اس نے سرکار دو عالم کو اپنے آئینہ میں دیکھا۔ یعنی اس نظر سے حقیقتِ محمدی اس کی ذات کے آئینہ میں جلوہ گر ہو گئی۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں تعین اول کہتے ہیں اور اسی کی بدولت یہ کائنات ظہور پذیر ہوئی۔ یعنی بیرنگی نے لباس رنگ پہن لیا۔

علامہ محمود شبستری نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :-

ز احمد تا احد یک میم فرق است ⁂ ہمہ عالم دراں یک میم غرق است

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی　　کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی　　تلاشِ خود کنی جز او نیابی

بنیادی تصور وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے۔

مطلب اس رباعی میں اقبال نے ہمہ اوست کی وہ تعبیر پیش کی ہے جس کے علمبردار شیخ اکبرؒ ہیں اور فارسی لٹریچر میں بیدل سے بڑھ کر کسی نے اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اقبال نے گلشن راز جدید میں کئی مقامات پر بیدل ہی کا انداز بیان اختیار کیا ہے جس کی تفصیل ناظرین کو زبور عجم کی شرح میں مل سکے گی۔ میں نے اس نظریہ کی وضاحت شرح اسرار خودی کے مقدمہ میں کر دی ہے۔ اس لیے یہاں اس کا اعادہ نہیں کروں گا۔ جو حضرات تفصیل کے شائق ہوں وہ شرح اسرار خودی کا مطالعہ کر لیں یہاں صرف اسقدر لکھنا کافی ہے کہ اس رباعی میں اقبال نے بے کم و کاست شیخ اکبرؒ کا نظریہ پیش کیا ہے۔ پہلی تین رباعیوں میں انھوں نے اسی بات کو دبی زبان سے کہا ہے لیکن یہاں اس راز کو فاش کر دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اے انسان تو کسے تلاش کر رہا ہے؟ اور اس کی تلاش میں اس قدر سرگرداں و پریشان کیوں ہے! جسے تو ڈھونڈ رہا ہے وہ تو ظاہر (پیدا) ہے، در اصل تو پوشیدہ (زیر نقاب) ہے۔ اس لیے اگر تلاش کرتا ہے۔ تو اپنے کو تلاش کر۔

جسے تو تلاش کر رہا ہے وہ تو "ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" کا مصداق ہے جو کچھ تو اپنے چاروں طرف دیکھ رہا ہے، وہی تو ہے۔ اس کے سوا دوسرا موجود ہی کہاں ہے! حق تعالیٰ ہی تو اس کائنات کا نور ہے۔ ہر شئے اسی کا ظہور ہو رہا ہے اگر تو اسے تلاش کرے گا تو انجام کار تجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو ہی ہے۔ جسے تو ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر تو اپنے آپ کو تلاش کرے گا۔ تو آخر الامر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ تو خود وہی ہے جسے تو تلاش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ساری کائنات میں دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے بقول مرشدی حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ۔

دو عالم میں نہیں موجود و مشہود!
بجز ذات و صفات افعال و آثار

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تو وہی ہے اور وہ تو ہی ہے اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے اور جب کوئی موجود نہیں ہے تو دوئی کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ یہ عالم تو موہوم ہے۔ یعنی مشہود تو ہے مگر موجود نہیں ہے۔ بیدل فرماتے ہیں:۔

عالمے بر وہم پیچیدہ است مانند حباب
جز ہوا بخود سرے در زیر ایں دستار ہا

وَلَہٗ

با حرف میالائے زبان خود را | در دست سخن مدہ عنانِ خود را
از موج تواں شنیدن اسرار محیط | در کام اگر کشد زبانِ خود را

نوٹ:۔ اقبال نے ان چاروں رباعیوں میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کو پڑھ کر ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ وہ ہمہ اوست کے قائل ہیں بحث صرف اس بات میں ہو سکتی ہے کہ وہ اسکی کونسی تعبیر سے متفق ہیں۔ اس کی تفصیل تو "اقبال اور تصوف" میں درج کروں گا یہاں اتنا لکھنا کافی ہے کہ فلسفی خواہ مشرقی ہو یا مغربی جس قدر پختہ اور حقیقت شناس ہوتا جائے گا اسی قدر وحدت الوجود کی طرف مائل ہوتا جائے گا۔ پس اقبال اگر ہمہ اوست کے معترف ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن | مسلماں زادہ ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست | عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

بنیادی تصور | اسلام نے نسب (ذات پات) کے عقیدہ کو مٹا دیا۔

مطلب | اے مسلمان! نسب پر وہ لوگ فخر کیا کرتے ہیں جو نادان ہوتے ہیں۔ تو اسلام کا فرزند ہے۔ اس لیے نسب پر فخر کرنا چھوڑ دے بلکہ نسبی مفاخرت کا تصور بھی اپنے دماغ سے نکال دے۔ اسلام دنیا میں رنگ، خون، نسب، ذات، خاندان، قبیلہ غرضکہ ہر قسم کے نسلی امتیازات کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان اپنے نسب پر فخر کرتا ہے۔ تو تجھے لازم ہے کہ تو اس سے اپنا تعلق قطع کرے۔ خواہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو۔

نوٹ:۔ مولانا جامیؒ نے اس نکتہ کو بڑے دلکش انداز میں سمجھایا ہے:۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اے جامی! جب تو نے اسلام اختیار کر لیا تو نسب پر فخر کرنا چھوڑ دے کیونکہ اسلام میں کسی انسان کی عظمت کا معیار یہ نہیں کہ وہ فلاں شخص کا بیٹا ہے بلکہ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔

اے مسلمانو! تم میں سب سے زیادہ معزز اور مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

بنیادی تصور | اسلام نے قومیت (وطنیت) کے عقیدہ کو مٹا دیا۔

مطلب | ہم مسلمان نہ افغانی ہیں نہ ترکی ہیں نہ تاتاری ہیں، بلکہ ہم سب دین اسلام کے پیرو ہیں۔ اس لیے ہماری قومیت ایک ہی ہے۔ یعنی اسلام۔ ہم کسی قسم کے امتیاز کو (خواہ وہ قومی ہو یا نسلی ہو یا وطنی ہو) برداشت نہیں کر سکتے بلکہ یہ تمام امتیازات ہمارے لیے حرام ہیں۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی دین (نو بہار) کے پیرو ہیں۔

نہاں در سینۂ ما عالمے ہست بخاکِ ما دلے در دل غمے ہست
از آں صہبا کہ جانِ ما برافروخت ہنوز اندر سبوئے ما نمے ہست

بنیادی تصور عشق حقیقی انسان کو حیات ابدی عطا کر دیتا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ ہمارے سینہ میں ایک عالم پوشیدہ ہے۔ کیونکہ ہمارے سینہ میں دل ہے اور اس دل میں جذبۂ محبت موجزن ہے۔ اور جس دل میں محبت موجزن ہوتی ہے۔ اس میں ساری کائنات سما جاتی ہے۔ (اس کی وضاحت پہلے کر چکا ہوں)

جس شراب (عشق) نے ہماری جان کو جلا کر خاک کر دیا۔ اس شراب کی نمی (اثرِ عشق) ہنوز ہمارے سینہ (سبو) میں جلوہ گر ہے یعنی عشق کی یہ کرشمہ سازی عقل کی رسائی سے بالاتر ہے کہ عشق اگرچہ عاشق کو جلا کر فنا کر دیتا ہے۔ لیکن فنا ہو جانے کے باوجود عاشق کے دل میں عشق کی چنگاری سلگتی رہتی ہے مطلب یہ ہے کہ عشق حقیقی انسان کو پہلے فنا کر دیتا ہے۔ پھر اسے دوبارہ زندگی عطا فرماتا ہے۔ یعنی عاشق فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جاتا ہے اسی زندگی کو اقبال "حیات دوام" سے تعبیر کرتے ہیں:-

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

چونکہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ کا سارا کاروبار عشق ہی پر مبنی ہے۔ اس لیے راقم الحروف یہ کار کے روحانی پیشواؤں نے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے۔ بخوفِ طوالت مرشدی حضرت نیازبے نیاز شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کا صرف ایک شعر ذیل درج کرتا ہوں تاکہ یہ شرح اس شعر کی برکت سے بارگاہِ اہلِ دل میں مقبولیت کا درجہ حاصل کر سکے۔

سر و سامانِ وجودم شررِ عشق بسوخت
زیرِ خاکسترِ من سوزِ نہانم باقی است

دلِ من اے دلِ من اے دلِ من یمِ من کشتیِ من ساحلِ من
چو شبنم بر سرِ خارم چکیدی و یا چوں غنچہ رستی از گلِ من

بنیادی تصور دل (خودی) مادی شئے نہیں ہے بلکہ لطیفہ روحانی ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے دل! تو ہی میرا سمندر ہے، تو ہی میری کشتی ہے۔ اور تو ہی میرا ساحل ہے۔

اقبال نے پہلے مصرع میں لفظ دل تین مرتبہ استعمال کیا ہے اس تکرار کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ فن بلاغت میں تکرار، تاکید کا فائدہ دیتی ہے، تاکہ سامع کے ذہن میں موضوع کی اہمیت جاگزیں ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں اقبال نے دل کی تین حیثیات بیان کی ہیں:-

(۱) اس لحاظ سے کہ سالک دل میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ اسے 'یم' سے تعبیر کیا ہے۔

ع غوطہ در دل زن کہ بینی راز حق!
ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

(۲) اس اعتبار سے کہ سالک دل ہی کی مدد سے غوطہ زن ہوتا ہے، اسے کشتی سے تعبیر کیا ہے۔

ع خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
ع زلکم غیر نتواں جز بہ دل رست

(۳) اس حیثیت سے کہ دل ہی سالک کی منزل مقصود ہے۔ اسے ساحل سے تعبیر کیا ہے۔

ع اگر دم رفت دل باقی است غم نیست
ع فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

دوسرے شعر میں سوال کے پردہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ غنچہ کی طرح مٹی سے نہیں اگا۔ بلکہ شبنم کی طرح عالم بالا سے آیا ہے یعنی سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ جوہر نوری ہے جسم اور جسمانیات سے ماورا ہے۔

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست — زباں لرزد کہ معنی پیچ دار است
بروں از شاخ بینی خار با گل — درون دانہ گل پیدا نہ خار است

بنیادی تصور انائے مطلق چونکہ بسیط ہے اور بسیط میں امتیازات کا پایا جانا محال عقلی ہے۔ اس لیے انائے مطلق جملہ امتیازات سے پاک ہے یہ امتیازات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب انائے مطلق مظاہر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

مطلب رباعی کا مطلب تو بنیادی تصور میں واضح ہو گیا۔ لیکن ناظرین کی سہولت کے لیے مزید تشریح بایں الفاظ ہو سکتی ہے کہ:۔

درخت کے اندر، نہ خار (زشت) ہے، نہ گل (نکو) ہے۔ یہ خار اور گل کا امتیاز، درخت کی شاخ سے باہر نظر آتا ہے۔ اسی طرح ذات مطلق میں نہ زشتی ہے نہ نکوئی۔ یہ تمام امتیازات اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب وہ ذات مطلق تعینات کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً بجلی میں بذاتِ خود کوئی امتیاز نہیں وہ صرف بجلی ہے۔ لیکن جب وہی بجلی کسی بلب میں مقید ہو جاتی ہے تو کمرے کو منور کر دیتی ہے اور آرمیچر میں جلوہ گر ہوتی ہے تو ہوا دینے لگتی ہے اور موٹر میں آتی ہے تو مشین چلانے لگتی ہے۔ وقس علی ہذا۔ اسی طرح وہی انائے مطلق کہیں گل نظر آتا ہے کہیں خار۔ خود اس میں نظر کرو تو اس میں کوئی امتیاز نہیں، لیکن اس کے مظاہر کو دیکھو، تو ان میں امتیاز نظر آتا ہے۔ یعنی بطون ذات، امتیازات سے پاک ہے، لیکن ظہور ذات، امتیازات پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال یہ کہتے ہیں:۔

تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

کسے کو درد پنہانے ندارد — تنے دارد ولے جانے ندارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن — تب و تابے کہ پایانے ندارد

بنیادی تصور حیات دوام کی آرزو ہو تو مسلک عشق اختیار کر لو۔

مطلب جو شخص عشق حقیقی سے نا آشنا ہے وہ دنیا میں حیوانات کی طرح زندگی بسر کرتا ہے دوسرے مصرع میں "جان" سے خودی مراد ہے۔ مناطقہ کی رائے میں جو شے انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہے۔ وہ نطق ہے۔ اسی لیے وہ انسان کی منطقی تعریف "حیوان ناطق" سے کرتے ہیں لیکن اقبال کی رائے میں "عشق" مابہ الامتیاز ہے۔ یعنی وہ اس انسان کو بھی جو عشق سے بیگانہ ہے، حیوان ہی کے خانہ میں رکھتے ہیں۔

اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اے انسان! اگر تو زندہ ہونا چاہتا ہے۔ تو وہ سوز و گداز پیدا کر جو کبھی ختم نہ ہو سکے۔ اور ارباب علم سے مخفی نہیں ہے کہ اس قسم کا سوز و گداز صرف عشق حقیقی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ عشق مجازی تو ہمیشہ عارضی ہوتا ہے، وہ اسی وقت تک باقی رہتا ہے۔ جب تک عارض جاناں پر سرخی باقی رہتی ہے۔ ادھر رخسار زرد ہوئے ادھر عشق رخصت ہوا۔ مرشد رومیؒ نے اسی حقیقت کو اس شعر میں واضح کیا ہے ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
درین دریا چو موج بیقرارم اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

بنیادی تصور خودی کی زندگی (بقا) بر خود پیچیدن پر موقوف ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ مجھ سے یہ مت پوچھو کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور کون ہوں؟ بالفاظ دگر میری اصل یا ماہیت کیا ہے؟ کیونکہ ان دونوں سوالوں کا جواب عقل کی دسترس سے باہر ہے ؎

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اس لیے میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ "یقین" انسانی خودی کی زندگی کس بات پر موقوف ہے! یعنی یہ تو نہیں معلوم ہو سکتا ہم کہاں سے آئے ہیں اور کیا ہیں! لیکن یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی حیات کا تسلسل کیسے قائم رکھیں، بالفاظِ دگر زندہ کیسے رہیں؟

دوسرے مصرع میں اسی سوال کا جواب دیا ہے اور اس جواب ہی میں ان کا سارا فلسفہ پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ خودی کی زندگی "بخود پیچیدن" پر منحصر ہے۔ اگر خودی اس پیچیدن سے بے گانہ ہو جائے۔ یعنی اگر یہ حالت زائل ہو جائے تو فنا ہو جائے گی۔

واضح ہو کہ بخود یا برخود پیچیدن کی اصطلاح اقبال نے حضرت بیدلؒ سے مستعار لی ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں:-

کے معنی بجہد فہمیدہ باشد۔
کہ چوں موج برخویش پیچیدہ باشد

اقبال نے اس رباعی میں بخود پیچیدہ کی، دریا اور موج یہ تین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ بیدل کے مذکورہ بالا شعر میں حسن اتفاق سے یہ تینوں لفظ جمع ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تصوف کی اصطلاح میں خودی کو موج سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

بخود پیچیدن سے اقبال کی مراد ہے:-

(۱) خودی کا اپنی قوت سے ابھرنا یعنی نشوونما حاصل کرنا۔
(۲) خودی کا اپنی نمود کے لیے جدوجہد کرنا۔
(۳) خودی کا اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔
(۴) یہ خودی کی وہ حالت جسے اقبال نے کھچاؤ (TENSION) سے تعبیر کیا ہے۔
(۵) وہ جوشِ باطن جس کی بدولت، خودی ترقی کرتی ہے۔ یہی جوشِ نمو اس کی زندگی کا راز ہے۔ انگریزی میں اس مفہوم کو (SELF UNFOLDMENT) یا (SELF DEVOLOPMENT) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقبال نے خود پیچیدن کے علاوہ بدیگرے پیچیدن کی اصطلاح بھی

استعمال کی ہے۔ مثلاً

فقر کارِ خویش را سنجیدن است

پر دو حرف لا الہ پیچیدن است

اس کی تشریح انشاء اللہ "پس چہ باید کرد" کی شرح میں ہدیہ ناظرین کروں گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خودی کی زندگی اسی پیچیدن یعنی ذوقِ نمود، اور ابھرنے کی قوت پر موقوف ہے۔ اس کی مثال درکار ہو تو موج کو دیکھ لو۔ اگر موج ابھرنا (پیچیدن) چھوڑ دے تو فنا ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کا وجود ہی ابھرنے پر موقوف ہے۔ چنانچہ جب اس سے ابھرنے کی صفت زائل ہو جاتی ہے تو وہ سمندر میں مل کر فنا ہو جاتی ہے۔ (یہ ہمارا عام مشاہدہ ہے)

بچشمی جلوہ و زیرِ نقابی — نگاہِ شوقِ ما را بر نتابی

ولی در خونِ ما چوں مستیٔ مے — زہے بیگانہ خوئی، دیریابی

بنیادی تصور حق تعالیٰ ہر شی میں جاری و ساری ہونے کے باوجود، عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ وہ ہر جگہ ہے لیکن کہیں نہیں ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے خدا! عقل حیران ہے کہ تو ہر شے میں جلوہ گر ہے۔ اس کے باوجود زیرِ نقاب ہے، کہیں نظر نہیں آتا۔ تو اس قدر نازک مزاج (لطیف) ہے کہ ہماری نگاہِ شوق کی تاب نہیں لا سکتا۔

اے خدا تو ہمارے خون میں اسی طرح جاری و ساری ہے۔ جس طرح مستی شراب میں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس قدر قرب کے باوجود تو ہم سے اس قدر دور ہے! اور اگر کوئی تجھ سے ملنا چاہے تو اسے بہت جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔

نوٹ:۔ اس رباعی کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ـ

ہم انسان کے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس آیت شریفہ کی رُو سے جس کا مفہوم بالکل واضح ہے، خدا انسان سے کس قدر قریب ہے! یعنی اس کی جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود ہی انسان کی جان ہے یعنی انسان اس کی تجلی کا عکس ہے۔ اگر اس کی صفتِ قیومیت و ربوبیت کی تجلی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصہ کے لیے بھی رک جائے تو کائنات فنا ہو جائے گی۔ جس طرح ہاتھ کی حرکت رک جائے تو وہ دائرہ جو شعلۂ جوالہ کی گردش سے پیدا ہو جاتا ہے فوراً معدوم ہو جاتا ہے۔

دل از منزل تہی کن پا بہ رہ دار
نگہ را پاک مثل مہر و مہ دار
متاعِ عقل و دیں با دیگراں بخش
غمِ عشق ار بدست افتد نگہ دار

بنیادی تصور
غم عشق ہی مقصدِ حیات ہے۔

مطلب
اے مخاطب! منزل کا خیال دل سے نکال دے۔ کیونکہ منزل کا نتیجہ سکون ہے اور سکون کا ثمرہ موت ہے۔

پا براہ دار، یعنی ہر وقت سفر کے لیے آمادہ رہ!

لیکن یہ آمادگی، اس بات پر موقوف ہے کہ تو اپنی نگاہ کو شمس و قمر کی طرح مادیات (علائق دینوی) سے پاک رکھے۔ اگر تو عورت کے دام میں گرفتار ہو گیا۔ اور دنیا عورت ہی کا دوسرا نام ہے، تو سفر کا تصور تیرے دماغ سے یکسر خارج ہو جائے گا۔ سفر سے یہاں روحانی عروج مراد ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ عورت کی محبت میں گرفتار ہو کر روحانی عروج تو بڑی بات ہے۔ انسان جدوجہد اور حرب و ضرب سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انٹونی ANTONY اور باز بہادر کی زندگی اس حقیقت پر شاہد ہے۔

جس طرح مسلسل عروج کا جذبہ پاکیٔ نگاہ پر موقوف ہے اسی طرح پاکیٔ نگاہ عشق پر منحصر ہے۔ اس لیے اقبال ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ عقل و دین کے بجائے "غم عشق" حاصل کرو۔

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما   بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں   دگر آدم بنا کن از گِلِ ما

بنیادی تصور نئی زندگی عشق ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ عشق، انسانی دل یا انسان کی حقیقت ہے۔ جس طرح گرمی کو آگ سے جدا نہیں کر سکتے، اسی طرح عشق کو دل سے جدا نہیں کر سکتے یا بالفاظِ دگر اقبال کے یہاں دل، عشق ہی کا دوسرا نام ہے:-

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

عشق ہی کشت ہے اور عشق ہی حاصل ہے۔ یعنی عشق ہی مقصدِ حیات ہے۔ دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق میں فوق الفطرت طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو دوسری یعنی نئی زندگی عطا کر سکتا ہے۔ اور یہ نعمتِ عظمیٰ انسان کو عشق کے سوا اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

نوٹ:- جنابِ مسیحؑ کی تعلیمات میں سے جو تعلیم مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہی نئی زندگی کی تعلیم ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لیے دوبارہ پیدا ہونا شرطِ اولین ہے۔ اور اربابِ بینش جانتے ہیں کہ انسان صرف عشق کی بدولت دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی جنابِ موصوف نے دنیا کو عشق کا پیغام دیا تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے کلیسا کا جس نے یہ پاکیزہ پیغام پیروانِ مسیح کے دل و دماغ سے یکسر محو کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیائے مسیحیت میں دو آدمی بھی ہمیں ایسے نظر نہیں آتے جو دوبارہ پیدا ہوئے ہوں۔ شاید اسی لیے نطشہ نے یہ لکھا ہے کہ "دنیا میں دینِ عیسوی کا صرف ایک ہی پیرو پیدا ہوا۔ لیکن اس کو دنیا والوں نے مصلوب کر دیا۔"

منصور کو ہوا لب گویا، پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

سخن در دو غم آوردہ درد و غم | مرا این نالہ ہائے دمبدم بہ
سکندر را ز عیش من خبر نیست | نوائے دلکشے از ملک جم بہ

بنیادی تصور | عاشقانہ زندگی، سلطنت سے افضل ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ عاشقانہ کلام کے مطالعہ سے یا عاشقوں کی صحبت میں بیٹھنے سے ذوق عاشقی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ذوق (درد و غم) بہرحال انسان کے حق میں بہتر ہے۔

بادشاہوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ عاشق کی زندگی ان کی زندگی سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کو اپنی سلطنت کے زوال کا خطرہ دامنگیر رہتا ہے لیکن عاشق کو ہر حال میں جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے۔ دراصل عاشقانہ زندگی حکمرانی یا شاہانہ زندگی سے بہتر ہے کیونکہ بادشاہ انسانوں کے جسم پر حکومت کرتے ہیں۔ لیکن عاشق انسانوں کے دل پر حکومت کرتا ہے۔

کوئی عاشق آج تک کسی بادشاہ کے دروازہ پر نہیں گیا۔ لیکن تمام بادشاہ ہر زمانہ میں ہر ملک میں، عاشقوں کے دروازہ پر دست بستہ حاضر ہوتے رہے ہیں۔

نوٹ:۔ ان دو باتوں سے ثابت ہوا کہ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے کئی بادشاہوں کا زوال دیکھا ہے۔ واقعی بات یہی ہے کہ عاشقان الٰہی کے سامنے ان بادشاہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ز من بر مرگ پیوستن سلامم | نہ از وابستگان شہریارم
مرا اے ہمنشیں دولت ہمیں بس | چو کوہم سینہ از سیلم برآرم

بنیادی تصور عاشق بادشاہوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

مطلب مرکب ختلی سے اعلیٰ نسل کا گھوڑا مراد ہے۔ جو ختلان ماوراء النہر میں پیدا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ نہ میرے پاس دولت ہے نہ ثروت اور نہ میں کسی بادشاہ کا مصاحب یا مقرب ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری نگاہ میں دولت، ثروت، منصب، جاگیر اور خطابات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ میرے لیے یہی دولت کافی ہے کہ جب میں رات کی تنہائی میں فکر سخن (سینہ کاوی) کرتا ہوں تو نہایت بلند پایہ اور بیش قیمت اشعار (لعل) موزوں کر لیتا ہوں۔

کمالِ زندگی خواہی، بیاموز — کشادن چشم و جز بر خود نہ بستن

فرو بردن جہاں را چوں دمِ آب — طلسمِ زیر و بالا درشکستن

بنیادی تصور کمال زندگی، تربیت و استحکام خودی پر موقوف ہے۔

مطلب اے مخاطب! اگر تو کمال زندگی کا آرزومند ہے تو زن، زر اور زمین سے قطع تعلق کرے اور اپنی تمام تر توجہ (چشم) اپنی خودی کی تربیت پر مبذول کر دے۔

کشادن چشم کنایہ ہے اس بات سے کہ دنیا اس لائق نہیں کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس کی تمام دل فریبیاں (زن، زر، زمین) عارضی اور فانی ہیں۔

"جز بر خود نہ بستن" سے مراد ہے اپنی توجہ اپنی خودی کی تربیت پر مبذول کر دینا۔

اس پروگرام پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو اس کائنات پر حکمران ہو جائیگا۔ یعنی اگر انسان اپنی توجہ دنیا حاصل کرنے پر مبذول کرے گا تو خدا تو یوں نہیں ملے گا کہ اسے مقصود نہیں بنایا۔ اور دنیا یوں نہیں ملے گی کہ اس عیارہ کی فطرت یہ ہے کہ جو اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس سے دور بھاگتی ہے

اور جو اس پر لات مار دیتا ہے اس کے پیچھے پیچھے پھرتی ہے۔ بادشاہی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ بڑے بڑے باجبروت بادشاہ اس کے حصول کی آرزو اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔

لیکن اگر تو اس کے بجائے خودی (خدا) کو اپنا مقصودِ حیات بنائے گا تو خدا اس لیے مل جائے گا کہ تو نے اسے مقصود بنایا۔ اور دنیا اس لیے مل جائے گی کہ یہ اللہ والوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔

فرو برد جہاں را چوں دمِ آب

مردِ مومن (عاشق) ساری کائنات کو اپنے دل میں اس طرح جذب کر لیتا ہے۔ جس طرح ہم پانی کا گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیتے ہیں۔

اس مصرع کا ترجمہ یہ ہے:۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ زمان و مکان پر حکمران ہو جاتا ہے۔

مہر و ماہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

تو می‌گوئی کہ آدم خاک زاد است | امیرِ عالمِ کون و فساد است
ولے فطرت ز اعجازِ نگاہش | بنائے بحر بر جوئے نہاد است

بنیادی تصور اگر آدم نہ ہوتا تو یہ کائنات بے مقصد ہو جاتی۔

مطلب کہتے ہیں کہ یہ تو سچ ہے کہ آدم، خاک زاد ہے۔ اور اس لیے تمام مخلوقات کی طرح وہ بھی قوانینِ فطرت کا پابند ہے۔ لیکن اس کی عظمتِ شان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ فطرت نے اس کائنات کی بنیاد اسی کی ذات پر رکھی ہے۔

بحر سے کائنات اور جو سے ذاتِ آدم مراد ہے۔ بحر کی وسعت، اور

بے پایاں کے مقابلہ میں بظاہر زندگی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن فطرت کا یہ معجزہ غور طلب ہے کہ اس نے بحر کی بنیاد ندی پر رکھی ہے۔

انسان کو عالمِ صغیر (جُز) اور کائنات کو عالمِ کبیر (بحر) کہتے ہیں۔ فطرت کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے عالمِ کبیر کو عالمِ صغیر پر مبنی کیا ہے۔ یعنی اگر انسان نہ ہوتا تو اس کائنات کا وجود متحقق نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کائنات انسان ہی کے احساسات کی پیداوار ہے۔ مثلاً اگر انسان میں حواسِ خمسہ نہ ہوتے تو رنگ، روشنی، خوشبو، بدبو، موسیقی، مصوری، تلخی، شیرینی، نرمی، سختی، طول، عرض، نزدیکی، دوری، پستی اور بلندی کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا تھا، اور اربابِ علم جانتے ہیں کہ کائنات انہی چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کائنات کا وجود آدم کے وجود پر منحصر ہے اگر آدم نہ ہوتا تو کائنات کی تخلیق ہی بے مقصد ہو جاتی۔ آدم نہ ہوتا تو یہ کون کہتا کہ یہ کائنات موجود ہے۔

دلِ بیباک را ضرغام رنگ است دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است

اگر بیمے نداری بحر صحراست اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

بنیادی تصور

خوف قاطعِ حیات ہے۔ اس لیے دُنیا میں کامیابی وہی شخص حاصل کر سکتا ہے۔ جو بے خوف ہو۔

مطلب

بہادر آدمی کی نگاہ میں شیر بھی بکری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن بزدل انسان آہو کو بھی چیتے کی طرح خوفناک سمجھتا ہے۔ بیخوف انسان کے لیے سمندر بھی صحرا ہے۔ لیکن ڈرپوک آدمی کے لیے ہر موج میں نہنگ پوشیدہ ہے۔

ندانم بادہ ام یا ساغرم من گہر در دامنم یا گوہرم من

نشان بینم چو دل دیدہ بستم کہ جانم دیگر است دیگرم من

بنیادی تصوّر خودی اور چیز ہے اور روح حیوانی اور چیز ہے۔ بالفاظِ دگر نفس ناطقہ، آمد و شد انفاس کا نام نہیں ہے۔

مطلب بادہ سے روح، ساغر سے جسم، گہر در دامن سے مجموعۂ روح و جسم گوہر سے روح، جان سے روح حیوانی اور من سے خودی مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ میں اس بحث کا فیصلہ تو نہیں کر سکتا کہ میں روح ہوں یا جسم ہوں یا ان دونوں کا مجموعہ ہوں۔ لیکن جب میں اپنے باطن میں غور کرتا ہوں تو یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو جاتی ہے کہ روح حیوانی (جان) اور چیز ہے اور خودی (من) اور چیز ہے۔ کیونکہ روح حیوانی پر موت وارد ہوتی ہے۔ لیکن خودی موت کی گرفت سے آزاد ہے۔

نوٹ:۔ صرف وہی خودی موت کی گرفت سے آزاد ہے جو پختہ ہو چکی ہو۔ ع

خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

تو گوئی طائرے زیر دام است　　پریدن بر پر و بالش حرام است
ز تن برجستہ تر شد سعی جیش　　فسان خنجرے از نیام است

بنیادی تصوّر انائے مقید (انسانی خودی) کی ذات کا تقاضا یہی ہے کہ وہ جسم کی قید میں رہ کر ترقی کرے۔

مطلب طائر سے انائے مقید (خودی) اور زیر دام سے قید جسمانی اور پریدن سے رہائی اور فسان خنجر سے ارتقائے خودی اور نیام سے جسم مادی مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ اگرچہ خودی زمان و مکان کی قید میں ہے۔ اور جب تک انسان جامۂ انسانیت میں ہے وہ مادیات سے بالاتر نہیں ہو سکتا یعنی حوائج بشری یعنی خورد و نوش، لباس، خواب وغیرہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

لیکن خودی کی مخفی صلاحتیں، اسی قید کی بدولت بروئے کار آتی ہیں۔ یعنی خودی اگر مقید نہ ہوتی تو وہ آزاد ہونے کے لیے جد و جہد بھی نہ کرتی اور جب

یہ نہ ہوتا تو اس کا ارتقا بھی نہ ہوتا۔

کہتے ہیں کہ خودی کے لیے یہ قید جسم بہت مبارک اور مفید ہے۔ یہ تو اس کے حق میں وہی حکم رکھتی ہے جو فساں خنجر کے حق میں رکھتی ہے۔ خودی کی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول پر غالب آئے اور جب وہ غالب آنے (مسخر کرنے) کی کوشش کرتی ہے تو اسی کوشش سے اس کی ذات کا جوہر نمایاں ہوتا ہے۔

چساں زاید تپش از دل ما؟ چساں سوزد چراغ منزل ما؟
بچشم ما کری بیند و چینا؟ چساں گنجیند دل اندر گل ما؟

بنیادی تصور انسانی عقل اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی کہ دل جو غیر مادی ہے، جسم میں جو مادی ہے کیسے سما گیا۔ یا اس سے کس طرح مربوط ہو گیا؟ یا واضح تر لفظوں میں یوں سمجھو کہ مادہ میں حیات کیسے نمودار ہو گئی؟ یا سر جیمس جینز کے الفاظ میں، کائنات کی ساخت اور اس کی ابتدائی حالت، حیات کے لیے قطعاً ساز گار نہیں تھی اس لیے عقل حیران ہے کہ غیر موافق ماحول میں حیات کیسے اور کہاں سے نمودار ہو گئی؟

مطلب اس رباعی میں اقبال مقام حیرت سے گفتگو کرتے ہیں۔ یعنی جس قدر سوالات انہوں نے اس رباعی میں درج کئے ہیں وہ ہر صاحب عقل کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن عقل ان میں سے کسی کا بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی۔ اقبال نے ان سوالات کے پردہ میں انسانی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اور ضمناً عقل کی عاجزی اور بیچارگی کا اثبات کیا ہے۔

سوالات کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ پڑھنے والے کے دل میں جواب معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہو اور وہ ان رباعیات کو غور سے پڑھے۔ اور جب وہ ایسا کرے گا تو جواب انہی رباعیات میں مل جائے گا۔ کہ عقل انسانی

کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ اگر کسی کو حقیقت سے آگاہی مطلوب ہو تو اسے مسلک عشق اختیار کر لینا چاہیئے۔

کہتے ہیں کہ میری عقل ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتی:۔

(۱) دل میں محبوب حقیقی سے ملنے کی تمنا کیسے پیدا ہوتی ہے؟ انسان نے خدا کو نہ دیکھا نہ بھالا۔ اس کے باوجود اس کے دل میں عشق الٰہی کا جذبہ کارفرما ہے! اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟

(۲) یہ ہمارا دل رچراغ منزل) کس طرح اور کیوں اس کی محبت میں جل رہا ہے؟ اس نے اسے کب دیکھا؟ اگر نہیں دیکھا تو بے دیکھے کیسے فریفتہ ہو گیا؟

(۳) آنکھ تو سفیدی، سیاہی، رطوبت، شرائین، عضلات اور اسی قبیل کے مادی عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس میں دیکھنے کی قوت کہاں سے آگئی؟ اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ آنکھ بذاتِ خود نہیں دیکھ سکتی، وہ تو آلۂ بصارت ہے۔ نہ کہ مبصر۔ وہ تو کوئی اور ہی ہے جو دیکھتا ہے، تو وہ کوئی اور کون ہے؟

نوٹ:۔ نفسیات کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات سے واقف ہے، کہ دنیا کا کوئی ماہر نفسیات یا سائنسدان اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ انسان صرف سالمات مادی کے امتزاج کا نتیجہ ہے تو اس کا دماغ جو بھورے رنگ کے مادہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، آنکھوں کی فراہم کردہ اطلاعات کو کیسے سمجھ جاتا ہے، یعنی احساسات، تاثرات اور اطلاعات کو سمجھنے کا کام کون انجام دیتا ہے؟ اور کیسے انجام دیتا ہے؟

(۴) سب سے بڑا یعنی سب سے حیران کن سوال یہ ہے، کہ دل جو غیر مادی ہے۔ اس جسم میں جو مادی ہے، کیسے اور کیونکر سما سکا؟

نوٹ:۔ اقبال نے ان سوالات کا جواب نہیں لکھا۔ لیکن میں ناظرین کی سہولت کی خاطر اس طرف اشارہ کئے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جب سالک کو معرفت نفس حاصل ہو جاتی ہے، اور اس کے لیے صحبت مرشد درکار ہے نہ کہ یورپ کی ڈگری، تو اس پر یہ

حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات اس کی یکتائی کا جلوہ ہے ۔ ہر شئے میں وہ ہی جلوہ گر ہے ، وہی ناظر ہے وہی منظور ، وہی موسیٰ ہے وہی طور ،

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں (غالب)

چو در جنت خرامیدم پس از مرگ
بچشم ایں زمین و آسماں بود
شکے با جانِ حیرانم در آویخت
جہاں بود آں کہ تصویرِ جہاں بود

بنیادی تصور یہ دنیا اور اس کی زندگی ، اس دنیا اور اس کی زندگی کی نقل ہے جو ہمیں آخرت میں نصیب ہوگی ۔

مطلب مطلب بنیادی تصور ہی میں واضح ہو گیا ۔ یعنی جب مرنے کے بعد میں جنت میں گیا تو میرے دماغ میں دنیاوی زندگی کا تصور موجود تھا ۔ چنانچہ جب میں نے دنیاوی زندگی کا جنتی زندگی سے موازنہ کیا تو میرے دل میں یہ شک پیدا ہوا کہ دنیا میں جو زندگی میں نے بسر کی تھی وہ زندگی تھی یا زندگی کی تصویر (نقل)

یعنی حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد جنت کی زندگی سے شروع ہوگی اس رباعی کا مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے ؛۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ (۲۹ : ۶۴)

بیشک دار آخرت کی زندگی ہی حقیقی معنی میں زندگی ہے ۔ یہ دنیاوی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے ؛۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (۵۷ : ۲۰)

جان لو کہ بلاشبہ دنیا کی زندگی کھیل تماشا اور بے سود چیز ہے ۔ یعنی اس لائق نہیں ہے کہ مومن اسے اپنا مقصود بنائے ۔

جہانِ ما کہ جز انگارہ نیست
اسیرِ انقلابِ صبح و شام است

ز سوہانِ قضا ہموار گردد
ہنوز ایں پیکرِ گِل ناتمام است

بنیادی تصور | کائنات تکمیل کی طرف حرکت کر رہی ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ ہماری یہ دنیا نقشِ ناتمام (انگارہ) ہے۔ اسی لیے اسیرِ انقلاب ہے۔ اس میں رات دن تبدیلیاں رُونما ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ دنیا پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ چونکہ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے۔ اس لیے فطرت اسے ہر لحظہ بہتر بنانے میں مصروف ہے۔ "سوہان" ریتی (FILE) کو کہتے ہیں۔ جس کی مدد سے لوہار چیزوں کو درست کرتا ہے۔ قضا سے مشیت ایزدی مراد ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس تصور کو اپنی تصنیف "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں بہت وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی خیال کو بالِ جبریل میں یوں قلمبند کیا ہے:۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات ایک ترقی پذیر وحدت ہے۔ اگرچہ اس میں نقائص پائے جاتے ہیں۔ لیکن فطرت آہستہ آہستہ انھیں دور کر رہی ہے ۱۲

چساں اے آفتابِ آسماں گرد
بایں دوری بچشمِ من درآئی

بجانم وصل از خاکِ ایں بعد
تو اے محرومِ گل آنکہ برآئی

بنیادی تصور | انائے مطلق اس کائنات میں ہر جگہ موجود ہے اور ہر شئے میں جلوہ گر ہے۔

مطلب آفتاب آسمان گرد، کنایہ ہے ذاتِ مطلق سے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا میں حیران ہوں کہ اگرچہ تو مادیات سے ورا الورا ہے۔ لیکن اس بُعد کے باوجود میرے دل میں جلوہ گر ہے!

اے خدا تو اس خاکدان سے منفصل (دور) ہے اس کے باوجود ہر مادی شئے سے واصل ہے۔ میری عقل حیران ہے کہ آخر تو ہے کہاں؟

نوٹ:- اقبال نے اس قبیل کی رباعیوں میں ذاتِ مطلق کے منفصل اور متصل ہونے کے مسئلہ کو شاعرانہ انداز میں واضح کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ذات (بطون) کے لحاظ سے تو، ذاتِ مطلق، اس کائنات سے ورا الورا ہے لیکن صفات (ظہور) کے اعتبار سے ہر شئے سے واصل ہے یعنی ہر شئے میں اسکا جلوہ ہے۔

قرآن حکیم نے ان دونوں پہلوؤں کو واجب التسلیم قرار دیا ہے۔

(۱) نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد سے ثابت ہے کہ خدا بندوں سے متصل ہے۔

(۲) لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَار اور لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ سے واضح ہے کہ خدا کائنات سے منفصل ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دست تو کار نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

بنیادی تصور ندرت آفرینی اور جدت طرازی انسان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو خودی کبھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

مطلب کہتے ہیں کہ خودی کا کمال اس میں ہے کہ انسان اپنا راستہ خود بنائے۔ دوسروں کی تقلید سے حتی الوسع اجتناب کرے بات یہ ہے کہ تقلید سے خودی مردہ ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر قدرت نے تحقیق تلاش اور اختراع کا جو مادہ ودیعت کیا ہے وہ تقلید کی بدولت فنا

ہو جاتا ہے اور انجام کار وہ قوم جو تقلید کی خوگر ہو جاتی ہے، جدّتِ طراز اقوام کی غلام بن جاتی ہے۔ مثال درکار ہو تو ہندوستان، پاکستان، افغانستان، ایران، عراق، مصر، شام، ترکی، شرق اردن لبنان، حجاز اور مراقش کے مسلمانوں کی مبارک زندگیوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

اقبال کہتے ہیں کہ جو قوم دوسروں کی تقلید کرتی ہے۔ وہ عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اور ارباب علم جانتے ہیں کہ غلامی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ہے۔

اگر تو کوئی کارنامہ انجام دے گا تو اگر وہ گناہ ہوگا تو بھی خدا معاف کر دے گا۔ یہ شاعرانہ انداز بیان ہے۔ کہ گناہ میں بھی اگر ندرت ہوگی، تو وہ ثواب بن جائے گا۔ مطلب اس سے اقبال کا یہ ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر ندرت آفرینی کی اہمیت واضح ہو جائے۔

بمنزل رہرو دل در نسازد — بتاب آتش بگل در نسازد

نہ پنداری کہ در تنگی است دامت — کہ ایں دریا بساحل در نسازد

بنیادی تصور عاشق (مومن) کی زندگی منزل (سکون) سے آشنا نہیں ہوتی۔ وہ تو ہر وقت جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔

مطلب عاشق (رہرو دل) منزل (قیام یا سکون) سے موافقت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ مسلک عشق کے خلاف ہے۔ ع

ز منزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

دوسرا مصرع پہلے مصرع کی تشریح ہے یعنی منزل کا تصور مادیات میں ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص عورت یا دولت کا آرزومند ہوتا ہے جب یہ چیزیں اس کو مل جاتی ہیں تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو گیا۔ اور اس کی جدوجہد ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن عاشق کی جدوجہد کبھی ختم نہیں ہوتی کیونکہ

اس کا مطمع نظر مادی نہیں ہوتا۔

اے مخاطب! تو یہ مت سمجھ کر "دل" جسم میں آرام کر رہا ہے۔ یعنی ساکن ہے۔ دل وہ دریا ہے جس کا کوئی ساحل نہیں ہے۔ یا وہ ساحل سے موافقت نہیں کر سکتا۔ یعنی مومن کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

بیا با شاہد فطرت نظر باز   چرا در گوشۂ خلوت گزینی
ترا حق داد چشم پاک بینے   کہ از نورش نگاہے آفرینی

بنیادی تصور انسان کا فرض منصبی یہ ہے کہ کائنات کا مطالعہ کرکے جسے اصطلاح میں "سیرِ آفاق" کہتے ہیں۔ خالق کائنات کا عرفان حاصل کرے۔

مطلب اے مخاطب! خلوت میں کیوں پوشیدہ ہے؟ باہر نکل اور فطرت کا مطالعہ کر۔

اللہ تعالیٰ نے تجھے چشم پاک بیں اس لیے عطا فرمائی ہے کہ تو اس کے نور سے اپنے اندر عرفانِ حقیقت (نگاہ) پیدا کرے۔ یعنی جب تو کائنات کا مطالعہ کرے گا۔ تو تجھے یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ کائنات خود بخود عالم وجود میں نہیں آئی، ضرور اسے کسی علیم و حکیم و قدیر ہستی نے بنایا ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست زمعرفت کردگار

میان آب و گل خلوت گزیدم   ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم   جہاں را جز بچشم خود ندیدم

بنیادی تصور مومن کائنات کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کی نگاہ قرآن حکیم کے نور سے منور ہوتی ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اگرچہ میں دنیا میں رہتا ہوں۔ لیکن مادیات سے دل نہیں لگاتا۔ یعنی دنیا کو مقصود حیات نہیں بناتا۔

نیز افلاطون اور فارابی یعنی اشراقی اور مشائی دونوں فلسفیانہ مذاہب سے بے تعلق ہوں۔ ان میں سے کسی پر اعتماد نہیں رکھتا کیونکہ فلسفہ خواہ افلاطون کا ہو یا ارسطو کا۔ حقیقت تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بجائے میں کائنات کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور میری نگاہ قرآن حکیم کے مطالعہ سے پیدا ہوئی ہے۔

ز آغاز خودی کس را خبر نیست
خودی در حلقۂ شام و سحر نیست

ز خضر این نکتۂ نادر شنیدم
کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست

بنیادی تصور اپنی اصل یا اپنے منشاء کے اعتبار سے انائے مقید بھی انائے مطلق کی طرح قدیم ہے۔

مطلب کوئی شخص نہیں جانتا کہ خودی (انائے مقید) کا آغاز کب ہوا لیکن یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ خودی زمانہ کی قید سے آزاد ہے

خضر نے مجھے یہ نکتہ سمجھایا کہ سمندر اپنی موج سے زیادہ پرانا نہیں ہے یعنی موج بھی اسی وقت سے ہے جب سے سمندر ہے۔

رباعی ۵۵ میں اقبال نے اسی مضمون کو پردے میں بیان کیا ہے کہ آفتاب کا وجود، میرے وجود کے مقابلہ میں، کل کی بات ہے۔ یعنی خودی تخلیق کائنات سے بھی پہلے عالم وجود میں آئی تھی۔ لیکن اس رباعی میں انہوں نے اس بات کو واضح تر لفظوں میں بیان کیا ہے، کہ خودی اگرچہ حادث بالذات ہے۔ لیکن قدیم بالزمان ہے یعنی ذات کے اعتبار سے تو حادث ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو خودی بھی نہ ہوتی۔ لیکن زمانہ کے اعتبار سے قدیم ہے۔ یعنی جب سے خدا (سمندر) ہے۔ اسی وقت سے خودی (موج) بھی ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدا ازلی (قدیم) ہے۔ اس لیے خودی بھی

ازلی (قدیم) ہے۔

اب میں اس کو واضح ترین الفاظ میں بیان کرتا ہوں:۔

بات یہ ہے کہ خودی کا کوئی ذاتی مستقل وجود تو ہے نہیں، وہ پرتو ہے حسن مطلق (حق تعالیٰ) کی صفات کی تجلی کا۔ یہ تجلیات ازلی ہیں۔ اس لیے پرتو (خودی) بھی ازلی ہے۔

نوٹ:۔ اس قسم کی رباعیات کا مطالعہ کرتے وقت رباعی ۳ کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے جس میں اقبال نے وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ کیونکہ ان کا مطلب اسی نظریہ کی روشنی میں واضح ہو سکتا ہے۔

اس رباعی کو پڑھ کر اگر کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اقبال نے خدا کے علاوہ خودی کو بھی قدیم قرار دے دیا ہے اور یہ تو شرک ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے علاوہ دوسرا موجود ہی کہاں ہے جو شرک لازم آئے؟ وحدت وجود کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ "دوئی" ناممکن ہے یعنی وجود واحد در حقیقت واحد۔ یعنی وحدت ہی وحدت ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو رباعی ۱۸) یہی وجود واحد مختلف اشکال میں ظاہر ہو رہا ہے۔

بیدلؔ نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں واضح کیا ہے:۔

محیط جلوہ موج خیز است از سراب من\
ز شبنم آب در آئینہ دارد آفتاب من\
بہ تحقیقش چہ پردازم کہ آن نیرنگ دانش ہا\
دلیل وحدت خویش است ہر جا در نقاب من

یعنی خودی کے پردے میں ہر جگہ وہی جلوہ فرما ہے۔ اور یہی اس کی وحدت پر دلیل ہے۔ اب رہا یہ عالم تو وہ سراسر موہوم ہے۔

ہیچ ندیدیم ازیں ہستیٔ موہوم!\
بیدلؔ بخیالت چہ مصور شدہ باشد

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب — حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ می روید ولیکن — نگاہش بر شعاع آفتاب است

بنیادی تصوّر رمز حیات یعنی زندگی کی حقیقت، مادی نہیں ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اگر زندگی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہو تو غنچہ کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ اس کے نشوونما پر غور کرنے سے حقیقت واضح ہو جائے گی۔

غنچہ، جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ خاک تیرہ و تاریک سے اگتا ہے لیکن اس کی زندگی (بالیدگی، شگفتگی، رنگ، خوشبو) آفتاب کی شعاعوں پر موقوف ہے۔ یعنی زندگی عالم بالا سے آتی ہے۔

فروغ او بہ بزم و باغ و راغ است — گل از صہبائے او روشن ایاغ است
شب کس در جہاں تاریک نگذاشت — کہ در ہر دل ز داغ او چراغ است

بنیادی تصوّر کائنات کی ہر شے میں وہی جلوہ گر ہے۔

مطلب وحدت الوجود کے نظریہ کو مد نظر رکھا جائے تو رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے۔ کہتے ہیں کہ باغ اور صحرا دونوں جگہ اسی کا جلوہ ہے۔ اشیائے کائنات مظہر ذات وصفات ہیں۔

ع ہرچہ بینی بدانکہ مظہر اوست

پھول اس کی محبت کی شراب سے مست ہیں یعنی دنیا میں جس قدر حسین اشیا پائی جاتی ہیں، ان کا حسن اور دلکشی اس کی جلوہ گری پر موقوف ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس ذات پاک نے کسی کو اپنے فیض سے محروم نہیں رکھا۔ اس نے اپنی محبت کا چراغ ہر شخص کے دل میں روشن کر دیا ہے۔ انسان جس قدر اس سے محبت کرے گا۔ اسی قدر وہ اس سے محبت کریگا۔ جس قدر اس کی طرف بڑھے گا اسی قدر وہ اس کو اپنی طرف کھینچے گا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو صرف دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲ : ۱۵۲)

یعنی اے لوگو! میں نے تو تمہیں اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھا۔ یعنی اپنے رسولؐ کی وساطت سے ساری نعمات تمہیں عطا کر دیں۔ پس تم مجھے یاد کرو، تو میں تمہیں یاد کروں گا۔ یعنی اگر تم مجھ سے محبت کرو گے تو میں بھی تم سے محبت کروں گا۔

نوٹ :۔ اہل دل جانتے ہیں کہ محبت کا سارا لطف اس بات پر موقوف ہے کہ محبوب بھی محب کی طرح ملاقات کا آرزو مند ہو۔

الفت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہو بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

ز خاک برگستاں غنچہ رست کہ خواب از چشم او شبنم فروشست
خودی از بے خودی آمد پدیدار جہاں را یافت آغوشی و بجست

بنیادی تصوّر خودی مقصود کائنات ہے۔ بالفاظ دگر کائنات اسی کی خاطر پیدا کی گئی ہے۔

مطلب اس رباعی میں برگستان سے کائنات، غنچہ سے انسان، شبنم سے فیضان سماوی (وحی الہٰی)، اور بیخودی سے عالم مادی مراد ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ انسان، مٹی سے پیدا ہوا ہے لیکن وحی الہٰی نے اس کو صحیح شعور ذات عطا کر دیا جس کی روشنی میں یہ حقیقت اس پر منکشف ہو گئی کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض، یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ خودی، بیخودی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی خودی وہ غیر مادی جوہر ہے (جس کی حقیقت قبل ازیں واضح ہو چکی ہے)، لیکن وہ جسم مادی کی قید میں ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ جب یہ انائے مقید اس کائنات میں ظاہر ہوا (انائے مقید کا مطلب ہی یہ ہے کہ خودی، بیخودی

یعنی مادی جسم سے ظاہر ہوئی تو کائنات کی تخلیق کا مقصد پورا ہو گیا۔ یعنی حق تعالےٰ نے یہ کائنات پیدا ہی اس لیے کی ہے کہ آدم بحیثیت نائب خدا اس پر حکومت کرے۔

جہاں کو خو نہ رود تنگ ہے — بجے آرزو جست و ہے
بہ آغوش عدم دیدہ بودیت — گرفت اندر دل آدم پناہ ہے

بنیادی تصور! کائنات کا وجود، دل آدم پر موقوف ہے یعنی اگر آدم کا وجود نہ ہوتا تو کائنات کا وجود متحقق نہیں ہو سکتا تھا۔

مطلب کہتے ہیں کہ یہ جہاں رنگ و بو، از خود موجود ہونے کی صلاحیت (دستگاہ) نہیں رکھتا تھا۔ لیکن موجود ہونے کا آرزومند ضرور تھا۔ یہ آرزو اُسے عدم سے وجود میں توے آئی۔ لیکن خود اس میں قائم رہنے کی استعداد نہیں تھی (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) اس لیے اپنی بقا کے لیے آدم کے دل میں پناہ گزیں ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ کائنات اپنے قیام کے لیے آدم کی محتاج ہے مثلاً آنکھ نہ ہو تو رنگ کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا۔ کان نہ ہو تو آواز اور موسیقی کا سمجھنے والا کون ہے؟ ناک نہ ہو تو خوشبو، بدبو کا احساس کون کرے گا؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر انسان نہ ہو تو کائنات کا وجود بیکار محض ہے۔

دل من رازدان جسم و جاں است — نہ پنداری اجل بر من گراں است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم — ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

بنیادی تصور خودی غیر فانی ہے۔ ع خودی چوں پختہ گردد و زوال است

مطلب دل من سے خودی مراد ہے اور خودی رازدانِ جسم و جان ہے۔ یعنی خودی اس حقیقت سے واقف ہے کہ جان مادی نہیں

ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ وہ جسم سے ایسا رابطہ رکھتی ہے جو فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ مقصد اس تصریح سے مسلک مادیت کی تردید ہے جس کی رو سے "جان" اجزائے جسمانی کی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ بذاتِ خود اس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ کوئی وجود ہے۔

کہتے ہیں کہ جب حقیقت یہ ہے کہ میں غیر فانی ہوں تو اگر یہ جہاں میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے یعنی اگر میں اس خاکداں سے رخصت ہو جاؤں تو مجھے کوئی غم نہ ہوگا۔ کیونکہ میرے ضمیر میں صدہا جہاں پوشیدہ ہیں۔ یعنی میری خودی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ سینکڑوں (لاتعداد) جہانوں سے گذر سکتی ہے۔ اسی نکتہ کو ساقی نامہ میں یوں بیان کیا ہے :-

تری آگ اس خاکداں سے نہیں ؎ جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود ؎ کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار ؎ کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

گل رنگیں ہمی در مشکلے ہست ؎ گرفتار طلسم محفلے ہست
زبان برگ او گویا نگردد ؎ ولے در سینۂ چاکش دلے ہست

بنیادی تصوّر گل (عالم نباتات) بھی ہماری (عالم حیوانات) کی طرح ہستی باری تعالیٰ پر دلیل ہے۔ اگر اس دلیل کو لفظوں میں بیان کرنے کی قوت نہیں حاصل ہے نہ اس کو۔

مطلب کہتے ہیں کہ یہ پھول بھی میری طرح مشکل میں ہے۔ وہ مشکل یہ ہے کہ ہم دونوں زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہیں۔ خدا نے اس کو اپنی ہستی پر دلیل بنایا ہے۔ یعنی اسے دل عطا کیا ہے لیکن اسے زبان عطا نہیں کی۔

یہی حال انسان کا ہے کہ وہ لفظوں سے واجب تعالیٰ کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتا۔ اور اس عدم قابلیت کا سبب یہ ہے کہ وہ گرفتار

عالم محفل ہے۔ یعنی مقید اور محدود ہے اور خدا غیر مقید اور غیر محدود ہے۔

ذہن میں جو گھر گیا لاانتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا (اکبرالہ آبادی)

مگر انسان کا دل گواہی دیتا ہے۔ جس طرح گل کا دل (وجود) شاہد ہے کہ میرا بنانے والا ضرور موجود ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو میں کیسے موجود ہو جاتا؟

تمہاری بحثوں سے میرے شبہے خدا کی ہستی میں کم نہ ہوتے
مگر یہ بات آگئی سمجھ میں خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے (اکبر)

اب پڑھیے اس مصرع کو:۔

گلِ رعنا، چوں من در مشکلے ہست

مزاجِ لالۂ خود رو شناسم بشاخ اندر گلاں را بو شناسم
ازاں دارد مرا مرغِ چمن دوست مقامِ نغمہ ہائے او شناسم

بنیادی تصوّر اگر کسی کو اس بات کی آرزو ہو کہ دنیا کے لوگ اسے دوست رکھیں یعنی اس سے محبت کریں، تو اُسے لازم ہے کہ وہ اس حقیقت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھے کہ تمام بنی آدم میری ہی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اس لیے ان کا مقام کسی طرح مجھ سے فروتر نہیں ہے۔

مطلب جو مطلب لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ تو یہ ہے کہ میں لالۂ خودرو کا مزاج پہچانتا ہوں۔ گلوں کی خوشبو شاخ کے اندر سونگھ سکتا ہوں۔ اور بلبل مجھے اس لیے دوست رکھتی ہے کہ میں اس کی نغمہ سرائی کی علّت سے واقف ہوں۔ مراد ان تصریحات سے یہ ہے کہ میں کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہوں کہ وہ کچھ نہیں ہے مگر اس ذاتِ پاک کی جلوہ گری ہے۔ وہ لالہ کے داغ میں پوشیدہ ہے وہی گلوں میں خوشبو بن کر مہک رہا ہے۔ وہی بلبل کو نغمہ سرائی پر اکسا رہا

ہے۔ بلکہ وہی نغمہ کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اس مفہوم کے اعتبار سے اس رباعی کا بنیادی تصور، وحدت الوجود ہے۔ لیکن میں نے اس عقیدہ کے منطقی نتیجہ کو بنیادی تصور قرار دیا ہے کیونکہ اس کو مدِ نظر رکھنے سے ہماری زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہو سکتا ہے۔

اگر انسان سب لوگوں کو مساوی المرتبہ تسلیم کرے اور وحدۃ الوجود کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ مساوات نسل انسانی ہے، تو میں ناظرین کو یقین دلاتا ہوں کہ یہی دنیا جو جہنم کدہ بنی ہوئی ہے۔ راحت کدہ میں تبدیل ہو جائے لیکن جب تک مادیت موجود ہے یہ دنیا جہنم کدہ ہی رہے گی۔

جہاں یک نغمہ زار آرزوے | بم و زیرش ز تار آرزوے
بچشمم ہر چہ ہست و بود و باشد | دمے از روزگار آرزوے

بنیادی تصوّر خالق کائنات نے کائنات کے ذرہ ذرہ میں نمود اور ظہور کا جوش ودیعت کر دیا ہے۔

مطالب اس رباعی کے دو مطالب ہو سکتے ہیں پہلا مطلب تو وہ ہے جس کی طرف میں نے بنیادی تصور میں اشارہ کر دیا ہے یعنی کائنات کی ہر شئے میں ظہور کی آرزو پائی جاتی ہے اور یہی INWARD URGE یعنی باطنی تحریک ہر شئے کو عالم وجود میں لاتی ہے۔ اگر دانہ میں جوشِ نمود (ELAN VITAL) نہ ہوتا تو وہ کبھی ہرگز زمین سے باہر نہ نکل سکتا بلکہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا۔ یہ ظہور کی آرزو (جوشِ نمود) ہی تو ہے جو اسے نمایاں کر دیتی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بنی آدم کی زندگی، آرزو، پر موقوف ہے۔ اگر انسان میں آرزو نہ ہو تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر کسی وجہ سے رہ بھی گیا ہو تو اس میں اور حیوانات میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

پہلے مفہوم کے اعتبار سے آرزو سے مطلق آرزوئے ظہور مراد ہے

اور دوسرے مفہوم کے لحاظ سے آرزو سے مختص (مقید) آرزو مراد ہوگی، جو ہر شخص کے میلان طبع پر موقوف ہے۔ مثلاً کسی کو علم حاصل کرنے کی آرزو ہے۔ کسی کو دولت۔ کسی کو حکومت اور کسی کو عورت۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست (حافظ)

دلِ من بے قرار آرزوئے — درونِ سینۂ من ہائے و ہوئے
سخن اے ہمنشیں از من چہ خواہی — کہ من با خویش دارم گفتگوئے

بنیادی تصوّر اس رباعی کا مطلب اس کے بنیادی تصور ہی میں پوشیدہ ہے۔ یعنی رباعی بجائے خود اس قدر سلیس ہے کہ شرح کی حاجت ہی نہیں ہے۔ دراصل اقبال اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق کو دنیا اور علائق دنیوی دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اس کی توجہ مادی دنیا کے بجائے دل کی دنیا کی طرف مبذول کر دیتا ہے اور جب عاشق دل کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو اُسے دلجمعی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ یہ نعمت مادی دنیا سے حاصل نہیں ہو سکتی (کیونکہ اس میں ہے نہیں)، اس لیے عاشق دنیا والوں سے گفتگو (تعلقات) ترک کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا والوں سے گفتگو (تعلقات) کا نتیجہ، پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جسے شک ہو، تجربہ کر کے دیکھ لے۔ راقم الحروف نے تو گذشتہ چالیس سال میں کسی دنیادار کو مطمئن نہیں دیکھا۔

بنیادی تصور تو یہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔ لیکن شعر کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ اے ہمنشیں میں اپنا حال تجھے کیا سناؤں اور کیونکر سناؤں؟ مجھے دل سے باتیں کرنے سے فرصت ہی نہیں ہے۔ میں تو اپنے دل سے باتیں کرنے میں مصروف ہوں، تجھ سے بات کروں تو کیسے؟ قاعدہ ہے کہ عاشق عالم تصور میں اپنے محبوب سے باتیں کرتا رہتا

ہے، اسی کو عرفِ عام میں یا شاعری کی زبان میں "دل سے باتیں کرنا" کہتے ہیں۔

دوام ما ز سوز ناتمام است | چو ماہی جز تپش ما را حرام است
بو ساحل کہ در آغوش ساحل | تپیدن یک دم و مرگ دوام است

بنیادی تصور | ابدی زندگی (دوام) سوزِ ناتمام پر موقوف ہے۔

مطلب | یہ پیامِ مشرق کی مشہور رباعیوں میں سے ہے کیونکہ اس میں اقبال نے اپنا فلسفۂ حیات نہایت آسان الفاظ اور دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔

اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر کسی کو حیاتِ دوام (ابدی زندگی) کی آرزو ہو تو اسے لازم ہے کہ عشق اختیار کرے۔ عشق کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عاشق کو غیر فانی کر دیتا ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ

(۱) عاشق کی فطرت ہے کہ وہ معشوق کی صورت اور سیرت یعنی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہتا ہے۔

(۲) اقبال ہمیں جس ہستی کو معشوق (آئیڈیل) بنانے کا مشورہ دیتے ہیں وہ حق تعالیٰ ہیں۔

(۳) حق تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کی طرح غیر محدود اور لامتناہی ہیں۔

(۴) اسلئے عاشق کی زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں آسکتا۔ جب وہ اس کی تمام صفات اپنے اندر پیدا کر سکے۔

(۵) اس لیے وہ ہمیشہ یعنی ابد تک اسی کوشش میں مصروف رہے گا۔

(۶) اسی کو دوسرے لفظوں میں حیاتِ ابدی کہتے ہیں۔

اقبال کی تائید میں سب سے پہلے حق تعالیٰ کا ارشاد پیش کرتا ہوں:-

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

یعنی جو لوگ ایمان لانے کے بعد اعمالِ صالح کو شعارِ زندگی بنا لیں گے (اور مومن کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اشد ہوتا ہے)

تو ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مومن کو حیات ابدی عطا کی جائے گی۔ کیونکہ اگر وہ فنا ہو جائے تو اجر کی عطا کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور یہ ناممکن ہے۔

اس کے بعد حقائق قرآنی کے سب سے بڑے عارف اور علوم آسمانی کے سب سے بڑے ماہر اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے فلسفی شیخ اکبر رح سیدنا محی الدین ابن عربی کا قول پیش کرتا ہوں :-

وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی۔

اور بندہ تو ہمیشہ بندہ ہی رہے گا، خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے چونکہ بندہ کبھی خدا نہیں بن سکتا۔ اس لیے بندہ کی جدوجہد بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

بالفاظ دگر، منزل مقصود خدا ہے۔ لیکن وہ کبھی محدود میں سما نہیں سکتا۔ اس لیے منزل مقصود بھی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے سفر بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مسافر بھی کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اقبال نے سفر کو مقصد قرار دے دیا ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

بیدل نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :-

چہ ممکن است رود داغ بندگی زجبیں
زمین فلک شود و آدمی خدا نہ شود

آدمی کبھی خدائی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن عشق اُسے ہر وقت معشوق کو آغوش میں لینے پر اکساتا رہے گا۔ اس لیے عاشق ابد تک اسی کوشش میں مصروف رہے گا۔

ہیگل نے اسی نکتہ کو یوں واضح کیا ہے :-

آئیڈیل (حق تعالیٰ) ہر لحظہ قابلِ حصول نظر آتا ہے۔ لیکن حاصل کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کا سارا لطف اسی کوشش میں مضمر ہے وصال کو تو وہ موت کا مترادف قرار دیتے ہیں۔

تو زشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام ؟ سوختنِ ناتمام

نوٹ: اقبال نے اگرچہ اس مسئلہ کی طرف اپنی تمام تصانیف میں اشارہ کیا ہے لیکن "گلشن راز جدید" میں انھوں نے اس کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انشاء اللہ اس کی شرح میں اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ لکھوں گا۔

مرنج از برہمن اے واعظِ شہر
گر از ما سجدۂ پیشِ بتاں خواست
خدائے ما کہ خود صورت گری کرد
بتے را سجدہ از قدسیاں خواست

بنیادی تصور اس رباعی کا مضمون اقبال کی شوخیٔ فکر پر دال ہے۔

مطلب اس رباعی کا مطلب بالکل واضح ہے اور بات بھی معمولی ہے ساری دلکشی اس کے اسلوب بیان میں پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اے واعظ! اگر برہمن ہم سے یہ کہتا ہے کہ بتوں کو سجدہ کرو تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ خدا نے بھی تو مٹی کی ایک صورت بنا کر فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اسے سجدہ کرو۔

تیسرے مصرع میں "صورت گری" کی ترکیب قابلِ داد ہے کہ مطلب تو اس کا بت گری یا صنم تراشی ہی ہے۔ لیکن یہ الفاظ پایۂ ادب سے گرے ہوئے ہیں۔

نجیباں گرچہ صد پیماں گسستند
مقیمِ خدمتِ یزداں نشستند
چساں افرشتہ دیواں گردید
ہنوز آدم بفتراکے نہ بستند

بنیادی تصور فلسفی کی رسائی بارگاہِ الٰہی تک نہیں ہو سکتی، بقول اکبر

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

مطلب پیکر شکستن، کنایہ ہے نظریات کی تردید سے۔ سومنات پرورِ بتا، کنایہ ہے مظاہر پرستی سے گرفتن کنایہ ہے معرفت ذاتِ باری سے، اور بعض اک بستن، کنایہ ہے معرفت نفس انسانی سے۔

کہتے ہیں کہ اگرچہ حکماء نے بہت سے قدیم نظریات کو باطل ثابت کر دیا ہے لیکن مظاہر پرستی کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکے۔ یہ لوگ خدا کی حقیقت سے کیا آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جب ابھی تک اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے۔

جہاں را دید از مشتِ گلِ من — بیا ساقی بگیر از حاصلِ من
نظر کردی و در منزل دو دست — دمے گم شو بجز در دلِ من

بنیادی تصور اگر خدا سے ملنے کی آرزو ہے تو اسے خارج میں تلاش کرنے کے بجائے دل میں تلاش کرو۔

مطلب اے مخاطب! میرے کلام میں حقائق و معارف کی بہت سی دنیائیں آباد ہیں۔ میں تجھے ان سے استفادہ کی دعوت دیتا ہوں۔

تو محبوبِ حقیقی سے ملنے کے لیے جس راہ پر گامزن ہے وہ غلط ہے اس طریق سے تو اس سے کبھی نہیں مل سکے گا۔ تھوڑی دیر کے لیے میرے دل کی دنیا میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ بالفاظِ دگر اپنے آپ کو اپنے دل کی دنیا میں گم کر دے، یعنی عالمِ محویت طاری کرے۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں!
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

ہزاراں سال با فطرت نشستم ... بہ او پیوستم و از خود گسستم
ولیکن سرگذشتم ایں سہ حرف است ... تراشیدم، پرستیدم، شکستم

بنیادی تصور | عقل پرستی سے اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

مطلب | کہتے ہیں کہ انسان ہزاروں سال سے اس کائنات کے مطالعہ میں منہمک ہے۔ اور اپنی خودی سے غافل ہو کر اس نے اپنی تمامتر توجہ عناصرِ فطرت پر مبذول کر دی ہے۔ لیکن ان طویل مدت کے مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ تین لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) انسان نے ہر دور میں کچھ نظریات وضع کئے۔

(۲) ان کو صحیح سمجھ کر ان کی پیروی (پرستش) کی۔

(۳) انجام کار ان کی غلطی آشکار ہو گئی تو انہیں مردود قرار دے دیا یعنی اپنے بنائے ہوئے بتوں کو خود ہی پاش پاش کر دیا۔

اقبال نے اس مصرع میں گذشتہ ۲½ ہزار سال کی فلسفیانہ جد و جہد کی تاریخ کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اس نکتہ کو بایں الفاظ واضح کیا ہے:-

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

بہ پہنائے ازل پر می کشودم ... ز بندِ آب و گل بیگانہ بودم
بچشمِ تو بہائے من بلند است ... کہ آوردی بہ بازارِ وجودم

بنیادی تصور | مجد و شرفِ آدم کا اظہار مقصود ہے۔

مطلب | اے خدا! تخلیق کائنات سے پہلے انسان، ازل کی وسعتوں میں پرواز کر رہا تھا۔ اور جسم و جسمانیات کی قید سے بالکل آزاد تھا۔ لیکن تیری نگاہ میں اس کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اس لیے تو نے اسے خلعتِ وجود عنایت کر کے اس دنیا میں بھیجدیا۔ تاکہ وہ تیرے نائب کی حیثیت سے اس

دنیا پر حکومت کر سکے۔

اس رباعی کا مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے :-

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ

جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنیوالا ہوں۔

درونم جلوۂ افکار ایں چیست؟ — بدن بایں ہمہ اسرار ایں چیست؟

بفرمائے حکیم نکتہ پرداز — بدن آسودہ و جاں بیقرار ایں چیست؟

بنیادی تصوّر اس حیرانی کا اظہار مقصود ہے، جو بدن (جسم) اور جان (روح) کے ارتباط و اختلاط کو دیکھ کر قدرتی طور پر وارد حال ہوتی ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ میں سخت حیران ہوں کہ میری باطنی دنیا (ذہن) تو افکار سے معمور ہے اور میری خارجی دنیا (کائنات) اسرار سے لبریز ہے۔ میں سائنسدانوں سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکا کہ ایک آسودہ یعنی جامد شے (بدن) ایک بیتاب یعنی متحرک شے (روح) سے وابستہ ہو گئی؟ بالفاظِ دگر ان غیر جنس چیزوں میں یہ ربط کیسے پیدا ہو گیا؟

کیا یہ حیران کن بات نہیں ہے کہ جسم تو ساکن ہے لیکن افکار جو اسی جسم کے اندر ہی مقید ہونے کے باوجود آزاد ہیں؟ یعنی ہر وقت متحرک ہیں اور جہاں چاہیں جا سکتے ہیں؟

اسی حیرانی کو مرشد رومیؒ نے بایں الفاظ واضح کیا ہے :-

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست

از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟

بخود نازم گدائے بے نیازم — ہم امروزم اگر نازم نہ نازم

ترا از غمزۂ ترکش نیازم — سکندر فطرتم آئینہ سازم

بنیادی تصوّر | اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عشق کا پیغام دیا ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ میں اپنے مرتبہ اور مقام سے آگاہ ہوں کہ حق تعالیٰ نے مجھے علم و حکمت سے بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے اور یہ صداقت مجھ پر آشکار فرمائی ہے کہ زندگی کا راز عشق میں پوشیدہ ہے۔

اس لیے میں دنیاوی حشمت سے بے نیاز ہوگیا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ دنیا اور مافیہا دونوں فانی ہیں۔ بلکہ اس کے بجائے اپنی خودی کی بلندی پر ناز کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عشق کی بدولت عطا فرمائی ہے جس کو زوال نہیں ہو سکتا۔ اسی عشق کی بدولت میں تڑپ رہا ہوں، جل رہا ہوں، پگھل رہا ہوں اور انہی کیفیاتِ عاشق کا اظہار نے نوازی (شاعری) سے کر رہا ہوں۔

اے مخاطب! میں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے تجھے عشق کا پیغام دیا ہے۔ یہ عشق، تیرے دل کو منور کردے گا۔ یعنی تیرا دل آئینہ بن جائے گا۔ ایسا آئینہ جس میں ساری دنیا کا حال گھر بیٹھے نظر آسکے گا۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ میں بھی سکندرِ وقت ہوں۔

نوٹ:۔ چوتھے مصرع میں اقبال نے آئینہ کی رعایت سے اپنی ذات کو سکندر سے تشبیہ دی ہے۔ جس سے بڑی شاعرانہ خوبی پیدا ہوگئی ہے۔

اگر آگاہی از کیف و کم خویش
یمے تعمیر کن از شبنم خویش

دلا دریوزۂ مہتاب تا کے!
شب خود را برافروز از دم خویش

بنیادی تصوّر | تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

مطلب اے مخاطب! حق تعالیٰ نے تیری خودی میں غیر محدود ترقی کی صلاحیت پوشیدہ کر دی ہے۔ اگر تو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو اس میں شک نہیں ہے کہ تو اپنی خودی (شبنم) کو کائنات گیر (یم) بنا سکتا ہے۔

جب حقیقتِ حال یہ ہے تو میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اپنی خودی کو مستحکم کرے، تاکہ غیروں کے سہارے سے بے نیاز ہو جائے۔

چہ غم داری حیاتِ دل ز دم نیست — کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست

تو اے کم فطرت اندیشۂ مرگ — اگر دم رفت دل را آفتے نیست

بنیادی تصور دل (روح) غیر فانی (جاودانی) اس لیے مسلمان کو موت سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیے۔

مطلب اے مخاطب! تو غمگین کیوں ہے؟ دل کی زندگی، سانس کے آنے جانے پر موقوف نہیں ہے۔ کیونکہ دل، حلقۂ بود و عدم میں محصور نہیں ہے۔ یعنی دل نہ مادی ہے نہ مادہ کی قید میں گرفتار ہے، اس لیے موت کا ہاتھ اس تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ سانسوں کا یہ سلسلہ بے شک ایک دن ختم ہو جائے گا۔ (اسی کا نام موت ہے)، لیکن دل تو فنا سے بالاتر ہے۔ اور یہ ایک حقیقتِ ابدی ہے۔

تو اے دل آتشینی در کلامم — ز تشریفِ خمارش خوش خرامم

درونِ سینہ ام ہاشمی ازیں ادراکا — می از دست تو در اندیشہ نیم

بنیادی تصور اقبال نے اس رباعی میں فطرت انسانی کی ترجمانی کی ہے یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں کبھی

دکبھی یہ وسوسہ ضرور گذرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مرنے کے بعد انسان زندگی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔

مطلب | کہتے ہیں کہ اے دل! جب تک تو میرے سینہ میں ہے یعنی جب تک میرے اندر عشق الٰہی کا جذبہ کار فرما ہے اس وقت تک میری شخصیت (کلیم) میری نگاہوں میں بادشاہوں کی شان و شوکت (تشریف شہاں) سے بھی خوشتر اور بالاتر ہے۔

لیکن مجھے کبھی کبھی یہ اندیشہ ضرور لاحق حال ہو جاتا ہے کہ جسے میں غیر فانی سمجھتا ہوں، کہیں وہ فانی نہ ہو جائے۔

بمن گو صوفیان باصفا را — خدا جویان معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم — کہ با نور خودی بیند خدا را

بنیادی تصور | اقبال کی رائے میں وہ مردِ خود آگاہ (خود پرست) قابلِ تحسین ہے۔ جو اپنی خودی کے نور سے خدا کو دیکھ سکے۔

مطلب | یہ اقبال کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ ہے، ان کا نظامِ افکار اسی محور پر گردش کرتا ہے: ؎

خدا را ہم براہِ خویشتن جوئے

صوفیان باصفا عموماً خدا کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ لیکن اقبال کا مسلک یہ ہے کہ خودی کو روحانی ترقی کا نقطۂ آغاز بناؤ۔ اور اس کو اس قدر مجلّیٰ کرو کہ اس میں خدا کا جلوہ نظر آسکے۔

چوتھے مصرع کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قابلِ تحسین وہ سالک ہے جو اس حقیقت کو دیکھ سکے کہ موج اور دریا کی طرح اصل کے لحاظ سے خودی اور خدا میں کوئی فرق نہیں ہے۔

چو نرگس این چمن نادیدہ مگذر ۔۔۔ چو بو در غنچہ پیچیدہ مگذر
ترا حق دیدۂ روشن ترے داد ۔۔۔ خرد بیدار و دل خوابیدہ مگذر

بنیادی تصوّر | مشاہدۂ فطرت اور مطالعۂ کائنات کی دعوت دی ہے۔

مطلب | اے مخاطب! نرگس کی طرح زندگی مت بسر کر کہ وہ آنکھ رکھنے کے باوجود اشیائے کائنات کے نظارہ سے لطف اندوز نہیں ہوتی، اور نہ خوشبو کی طرح غنچہ میں پوشیدہ رہ کر زندگی بسر کر۔ بلکہ حق تعالےٰ نے تجھے مشاہدہ اور مطالعہ کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اس لیے اس طرح زندگی مت بسر کر کہ عقل تو بیدار رہے، اور دل غافل رہے۔ یعنی اے مخاطب! اپنے دل کی آنکھیں کھول، اور مطالعۂ فطرت سے اپنے یقین کو پختہ تر کر۔ اگر تو صحیفۂ کائنات، کا مطالعہ کرے، تو تجھے نظر آ سکتا ہے کہ یہ کائنات خود بخود عالمِ وجود میں نہیں آئی۔ کیونکہ آ نہیں سکتی۔ مادہ بذاتہٖ جامد بے شعور ہے۔ اس میں حرکت اور شعور خود بخود پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی نکتہ کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:۔

اک امر ہیں پوچھتا ہے ان سے ضرور ÷ منکر ہیں رُوح کے جو یہ اہلِ غرور
پیدا ہوا مادہ میں کیونکر یہ شعور ÷ ہے عقل و خرد کا تم کو دعویٰ ایکھو

تراشیدم صنم بر صورت خویش ۔۔۔ بشکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود برون رفتن محال است ۔۔۔ بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

بنیادی تصوّر | انسان، جب تک معرفت سے بیگانہ ہے، خدا پرستی کے پردہ میں خود پرستی کرتا رہتا ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ جو لوگ دیدار کی لذت اور یقین کی نعمت سے محروم ہیں۔ یعنی جو لوگ محض عقل کی بنا پر خدا کی ہستی کو تسلیم کرتے ہیں، وہ خدا کا تصور اپنے ذہن رنگ کی پرواز کے مطابق ہی قائم کرتے ہیں۔

ہر وہ شخص جو وحیِ الٰہی کی پیروی نہیں کرتا، خدا کو اپنے خیال کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ جیسا وہ خود ہوتا ہے، ویسا ہی اس کا خدا ہوتا ہے، یعنی ہر انسان خواہ کسی رنگ میں بھی ہو، خود پرست ہی ہوتا ہے۔

اقبال نے اس رباعی میں جس صداقت کو واضح کیا ہے، وہ ہر زمانہ میں ہر عقلمند کی نگاہ میں مسلّم رہی ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے مجبور ہے کہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کرے۔ اور مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے کہ ہر قوم کا تصورِ باری تعالیٰ اُس قوم کی ذہنیت کا آئینہ دار رہا ہے۔

بیدل نے اس صداقت کو اپنے کلام میں متعدد بار مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے ایک شعر درج کرتا ہوں:-

ہر کس اینجا از مقام و حالِ خود گوید خبر
از زبانم حرفِ او گر بشنوی باور مکن

بہ شبنم غنچۂ نورستہ ئی گفت — نگاہِ ما چمن زاداں رسا نیست
دراں پہنا کہ صد خورشید دارد — فراز و پست و بالا ہست یا نیست؟

بنیادی تصور پستی اور بلندی، دوری اور نزدیکی، تحت و فوق یہ سب اضافی امور ہیں۔

مطلب ایک دن ایک کلی نے شبنم سے کہا کہ ہم دنیا والوں کی عقل تو بہت ناقص اور نارسا ہے۔ تو چونکہ عالمِ بالا سے آتی ہے۔ اِس لیے میرا خیال ہے کہ تجھے ضرور معلوم ہوگا کہ کیا اُس عالم (لامکاں) میں بھی پست و بالا کا امتیاز موجود ہے؟

اقبال نے اس سوال کے پردہ میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ پستی اور بلندی، یہ تمام امور اضافی بلکہ اعتباری ہیں۔ اگر وہاں کے لوگوں کی زندگی ہماری طرح حواسِ خمسہ سے وابستہ نہیں ہے، تو بلاشبہ وہ لوگ ہماری زندگی سے بالکل مختلف قسم کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ پستی اور بلندی کا تصور مکان میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لامکاں میں یہ تصورات ممکن ہی نہیں ہیں۔

زمیں از رازدانِ آسماں گیر
مکاں را شیوہ از لامکاں گیر
چو ہر ذرہ سوئے منزل رواں است
نشاں از رازِ یکتائش گیر

بنیادی تصور مکان کا وجود لامکان پر، اور حادث کا وجود قدیم کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ پستی (زمین) کا وجود اس بات کی دلیل ہے۔ کہ بلندی (آسمان) بھی موجود ہے۔ اور مکان کا وجود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ لامکان بھی موجود ہے۔ اسی طرح عاجز اور جاہل انسان کا وجود اس صداقت کی دلیل ہے کہ ایک۔ قدیر و علیم ہستی (خدا) بھی موجود ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک عاجز اور جاہل انسان جو ایک تتلی کا بازو یا مچھر کی ٹانگ بھی نہیں بنا سکتا وہ اپنے آپ کو کس طرح موجود کر سکتا ہے! ضرور کوئی قادرِ مطلق اور حکیم ہستی موجود ہے جس نے اُسے پیدا کیا ہے۔

دوسرے شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:-

پہلا مطلب یہ ہے کہ ہر ذرہ اس کی ہستی پر گواہی دے رہا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے۔ عشقِ الٰہی کا جذبہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ یہ جذبہ ہی تو باعثِ ایجادِ عالم ہے۔

درد و عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابن آدم سرّے از اسرارِ عشق

ضمیرِ کن فکاں غیر از تو کس نیست
نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست
بپہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

بنیادی تصوّر

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

مطلب

اے انسان! اپنے مرتبہ اور مقام سے آگاہی حاصل کر! اس کائنات میں تیرے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنی رُوح پھونکی ہو۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل "کُن" کا مخاطب صرف تُو ہے۔ نیز اس بے نشان (حق تعالیٰ) کی ہستی کا ثبوت اگر مل سکتا ہے، تو صرف تیری ذات سے۔ کیونکہ تیرے سوا اور کوئی حیوان، ناطق نہیں ہے۔ یعنی صرف تو ہی ہے، جو یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا موجود ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کائنات میں تجھ سے برتر اور بالاتر کوئی ہستی نہیں ہے، تو تُو ہی زُبدۂ موجودات اور اشرف المخلوقات ہے۔ تو اس دُنیا میں بے باکانہ زندگی بسر کر۔ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے مت ڈر۔ یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ سورج، یہ چاند، یہ تو سب تیرے خادم ہیں، یہ سب تیری خدمت گذاری کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔

چوتھے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات تو اپنے وجود میں تیری محتاج ہے۔ یعنی اگر تو اس کا تحقق نہ کرے، تو متحقق نہیں ہو سکتی۔ اگر تُو نہ ہو تو اس کی ہستی کا اثبات کون کرے گا! جب اس کی ہستی محض اعتباری ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کائنات میں تیرے سوا اور کوئی ہستی موجود ہی نہیں ہے۔

وجود کوہسار و دشت و در ہیچ
جہاں فانی، خودی باقی، دگر ہیچ

زمیں خاک درمیخانۂ ما — فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و ساز ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

بنیادی تصوّر | یہ کائنات، خودی کی پہلی منزل ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ یہ زمین ہمارا مستقر حقیقی نہیں ہے۔ ہماری جائے قرار تو میخانہ ہے یعنی عالم لاہوت۔ اور اس کے مقابلہ میں اس زمین کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اقبال نے اس کی ہیچ مائیگی کو "خاک در" سے تعبیر کیا ہے۔ ہر عقلمند جانتا ہے کہ خاکِ در کو مکان سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔

اور یہ آسمان! تو اس کی گردش کی مدت (ہماری ہستی کے مقابلہ میں) ایسی ہے یعنی اتنی مختصر ہے جیسے میخانہ میں ہماری ایک نشست۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہماری عاشقانہ زندگی (حدیثِ سوز و ساز) ازلی اور ابدی ہے۔ اور یہ زمین و آسمان تو کل پیدا ہوئے ہیں۔ بس ہماری ہستی کے مقابلہ میں اُنکی ہستی ایسی ہے۔ جیسے کسی افسانہ کا دیباچہ۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ حیاتِ ارضی، خودی کی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ اس بات کو اقبال نے یوں کہا ہے:۔

خودی کی ہے یہ منزلِ اوّلین ؎ مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت ؎ خراجِ شہر و گنجِ کان و یم رفت

امم را از شہاں پایندہ تر داں ؎ نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت؟

بنیادی تصور قوموں کی زندگی، افراد کی زندگی سے بہت زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔

مطلب اپنے زمانہ میں سکندر سے بڑا کوئی فاتح نہیں گذرا لیکن آج نہ وہ زندہ ہے اور نہ کہیں اس کی فتوحات کا تذکرہ ہے اور نہ کہیں اس کے خزانوں کا نشان باقی ہے! حقیقت یہ ہے کہ بادشاہوں کے مقابلہ میں قومیں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں۔ دیکھو! جمشید کا کہیں پتہ نہیں ہے لیکن ایران بدستور دنیا میں موجود ہے۔

ربودی دل ز چاکِ سینۂ من — بغارت بردۂ گنجینۂ من

متاعِ آرزویم با کہ دادی — چہ کردی با غمِ دیرینۂ من؟

بنیادی تصور عاشق کی نگاہ میں "غم دیرینہ" سب سے زیادہ قیمتی شے ہے یعنی عاشق کبھی بھی غم عشق سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

مطلب یہ رباعی تو چنداں مشکل نہیں ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبال نے حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل یعنی سنجیدگی اور شوخی دونوں کو بڑے دلکش انداز میں جمع کر دیا ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعہ سے وہ چیز پیدا ہو گئی ہے جسے جدت یا ندرتِ خیال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

محبوب حقیقی سے خطاب کرتے ہیں کہ حضور! میں نے مانا کہ آپ نے ایک جھلک دکھا کر میرا دل لے لیا۔ اور دل میں ایک خزانہ مخفی تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی لٹ گیا۔

وہ خزانہ (متاع آرزو) میری نگاہ میں، دل سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور آپ کے کام کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ معشوقوں کو رنج و غم سے کیا سروکار؟ اس لیے میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ وہ میری متاع آرزو آپ نے کس کے حوالہ کر دی؟

اگرچہ اقبال نے اس کا جواب نہیں دیا۔ لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس کا جواب، سوال ہی میں پوشیدہ ہے یعنی وہ غم دیرینہ پھر مجھی کو واپس دے دیا۔ بالفاظ دگر، عاشق صادق کبھی بھی غم عشق سے رہائی نہیں پا سکتا معشوق زیادہ سے زیادہ اسے دل سے محروم کر سکتا ہے لیکن "متاع آرزو" سے محروم نہیں کر سکتا۔

اس رباعی کی ساری خوبی اس کے انداز بیان میں مضمر ہے کہ معشوق نے عاشق کا دل لے لیا۔ لیکن غم عشق واپس کرنا پڑا کیونکہ وہ اس کے کام کی چیز نہیں ہے! لیکن غم عشق دل سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جب غم عشق واپس کیا، تو دل بھی واپس کرنا پڑا کیونکہ غم عشق دل کے علاوہ اور کسی جگہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

زویشِ من جہانِ رنگ و بو رفت ‏ زمین و آسمان و چار سو رفت
تو رستی اے دل از ہنگامۂ ما؟ ‏ و یا از خلوت آبادِ تو او رفت؟

بنیادی تصور | کائنات کی رونق غمِ جاناں کی بدولت ہے۔

مطلب | یہ کیا ہوا کہ ساری کائنات میری نظروں میں ہیچ ہو گئی؟ اے دل! تو اُس (محبوب) کی محفل سے باہر نکل آیا۔ یا وہ تیرے دل کی خلوت سے نکل کر چلا گیا؟ ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات ضرور واقع ہوئی ہے۔ ورنہ یہ کائنات میری نگاہ میں بے رونق کیوں ہو گئی؟ اس کی دلکشی کہاں چلی گئی؟

مطلب یہ ہے کہ کائنات کی رونق محبوب یا اس کے عشق کے دم سے وابستہ ہے۔ اگر عاشق کے دل سے اس کا تصور مٹ جائے، تو ساری کائنات بیکار یعنی بے معنی اور بے مقصد ہو جائے۔

غم گیا، رونقِ حیات گئی
دل گیا، ساری کائنات گئی

مرا از پردۂ ساز آگہی نیست ‏ ولے دانم نوائے زندگی چیست
سرودِ انجمن بر شناساں ‏ گل از ہر پیرہن پرسد کہ ایں کیست؟

بنیادی تصور | اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے انسانوں کو زندگی کا پیغام دیا ہے۔

مطلب | پردہ ساز کنایہ ہے حقیقتِ کائنات سے۔

نوائے زندگی کنایہ ہے اُن اصولوں سے جن پر عمل کرنے سے انسان مقصدِ حیات حاصل کر سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ کائنات کیا ہے؟ مادی ہے یا غیر مادی؟ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ حادث ہے یا قدیم؟ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں، کہ انسان اس دُنیا میں کامیابی سے کس طرح ہمکنار

ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میرے پیغام (نغمہ) کو سُن کر دنیا کے لوگ (گل، عقلا و حکمار (مُرغِ چمن) سے دریافت کر رہے ہیں کہ دُنیا (باغ) میں یہ کون نغمہ سرا ہے، جو ہم فانی افراد کو ابدیت کا پیغام سُنا رہا ہے۔

نوا مستانہ در محفل زدم من — شرارِ زندگی بر گل زدم من

دل از نورِ خرد کردم ضیا گیر — خرد را بر عیارِ دل زدم من

بنیادی تصوّر انسان کی روحانی ترقی کے لیے خرد اور دل دونوں ضروری ہیں۔

مطلب میں نے کائنات (محفل) کو عشق کا پیغام دیا ہے۔ گویا مٹی کے پُتلوں میں رُوح پھونک دی یا مُردوں کو زندہ کر دیا۔ مجھ میں یہ طاقت کیسے پیدا ہوئی؟ اس کی تشریح دوسرے شعر میں ہے:۔

کہتے ہیں کہ پہلے تو میں نے عقل کی روشنی سے دل کو منور کیا۔ پھر عقل کو دل کی کسوٹی پر جانچا۔ اس پروگرام پر عمل کرنے سے مجھ میں یہ طاقت پیدا ہو گئی کہ ع

شرارِ زندگی بر گل زدم من

چونکہ اس پروگرام میں اقبال کا بنیادی فلسفہ مضمر ہے اس لیے اس کی تشریح ضروری ہے۔

فقرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اس لیے دی ہے، کہ وہ بُرے بھلے میں امتیاز کر سکے، پس اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اس عقل خداداد کی مدد سے تمام مذاہب و ادیانِ عالم کا مطالعہ کیا اور سب کی تعلیمات کو عقل کی روشنی میں دیکھا بھالا۔ یعنی عقل کی کسوٹی پر پرکھا، تو اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جسے عقل نے قبول کیا۔ یعنی عقل کی بدولت

اسلام کی صداقت اور حقانیت مجھ پر واضح ہو گئی اور میں نے اسلام کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔

جب میں نے قرآن کو عقل کی روشنی میں اپنا ہادی اور پیشوا تسلیم کر لیا، تو اب عقل ہی کا یہ تقاضا تھا کہ میں اپنی عقل کو قرآن (دل) کے تابع کر دوں، اور جب انسان اپنی عقل کو قرآن کا غلام بنا دیتا ہے۔ تو وہ حقیقی معنی میں مومن بن جاتا ہے۔ اور مومن میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مردوں (دلوں) کو زندہ کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کے لیے عقل ذاتی اور وحی آسمانی دونوں ضروری ہیں۔ جس طرح دیکھنے کے لیے قوتِ بصر اور روشنی دونوں ضروری ہیں اور مومن کا دل، خرد کے لیے بمنزلۂ عیار ہے۔

گمان مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست
نگاہ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

عجم از نغمہائے من جواں شد | ز سودایم متاعش گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت | ز آوازِ درایم کارواں شد

بنیادی تصور اقبال نے اپنا مقام واضح کیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ میری شاعری (پیغام) نے تمام اسلامی ممالک (عجم) کو زندہ کر دیا۔ اور اس کی بدولت اقوامِ عالم میں انھیں عزت حاصل ہو گئی۔

میری شاعری کے دور سے پہلے، مسلمان انبوہ یا ہجوم کی طرح تھے جو راستہ سے بھٹک گیا ہو، لیکن میرے پیغام نے انھیں کارواں کی شکل میں منظم کر دیا۔ یعنی سب کی منزلِ مقصود ایک ہو گئی۔

عجم از نغمه‌ام آتش بجان است — صدای من درای کاروان است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی — که ره خوابیده و محمل گران است

بنیادی تصور | سابقہ رباعی کے مضمون کو واضح کیا ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ عجمی ممالک میں میرے کلام کی بدولت عام بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ میری شاعری ان ممالک کے باشندوں کے لیے ترقی کا پیغام ہے۔ چونکہ میری قوم خواب غفلت میں گرفتار ہے۔ اس لیے میں پوری قوت کے ساتھ اسے بیداری کا پیام دے رہا ہوں۔

زجان بے قرار آتش گشادم — دلے در سینۂ مشرق نهادم
گل او شعله زار از نالۂ من — چو برق اندر نهاد او فتادم

بنیادی تصور | وہی ہے جو پچھلی دو رباعیوں میں پایا جاتا ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ میری شاعری نے اہل مشرق کو بیدار کر دیا ہے اور ان کے سینوں میں ترقی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان اقوام کا خون سرد ہو چکا تھا۔ لیکن میں نے اپنے پیغام سے ان کے دلوں میں حرارت پیدا کر دی ہے۔

مرا مثل نسیم آواره کردند — دلم مانند گل صد پاره کردند
نگاهم را که پیدا مس نجوید — شهید لذت نظاره کردند

بنیادی تصور | فطرت نے میرے دل میں محبت کا جذبہ ودیعت کر دیا ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ جذبۂ عشق میری سرشت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مثل نسیم وارفتہ ہوں، اور مجھے کسی پہلو قرار نہیں ہے۔ اور میرا دل جدائی کے صدموں سے مثل گل پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ میری نگاہ کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس کائنات (پیدا) کو بھی نہیں دیکھ سکتی ہے، یعنی انسان حواس کی مدد سے اشیائے کائنات کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن عشق

کا کمال تو دیکھو کہ مجھے شہیدِ لذتِ نظارہ بنا دیا۔ یعنی کارکنانِ قضاء و قدر نے انسان ضعیف البنیان کے دل میں حسنِ مطلق کے دیدار کی آرزو ودیعت کردی ہے۔

اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انسان تو اس قدر ضعیف ہے کہ جن چیزوں کو آنکھوں سے دیکھتا ہے، ان کی حقیقت بھی نہیں سمجھ سکتا، تو حسن مطلق کا جلوہ کیا دیکھ سکتا ہے، جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے؟

لیکن یہ آرزو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خود حسن مطلق نے اس کے اندر یہ آرزو ودیعت کردی ہے۔

خرد کرپاس را زربفتہ سازد کمالش سنگ را آئینہ سازد
نوائے شاعر جادو نگارے ز نیش زندگی نوشینہ سازد

بنیادی تصوّر حکمت (خرد) اور عشق (نوائے شاعر) کا موازنہ کیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ عقل کا کمال یہ ہے کہ وہ سُوتی کپڑے کو زربفت میں تبدیل کردے۔ یا پتھر کو صیقل کی بدولت آئینہ بنادے۔ لیکن شاعر کی نوا زندگی کی تلخی کو شیرینی میں تبدیل کرسکتی ہے۔ اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ تبدیلِ صورت ممکن ہے لیکن قلبِ ماہیت بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے مطلب یہ ہے۔ حقیقی شاعر کے کلام میں وہ تاثیر ہے کہ ناممکن ممکن ہوجاتا ہے لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعری، فلسفہ اور سائنس دونوں سے افضل ہے۔

ز شاخِ آرزو برخوردہ ام من بہ رازِ زندگی پے بردہ ام من
بپرس از باغباں اے نکتہ انداز کہ پیغامِ بہار آوردہ ام من

بنیادی تصوّر عقل پرستوں کو متنبہ کیا ہے۔

مطلب

شاعر نے اس رباعی میں باغ کا تلازمہ باندھا ہے اور اس کے پردہ میں اپنا ما فی الضمیر بیان کیا ہے۔

شاخِ آرزو، کنایہ ہے مسلکِ عشق سے۔ باغبان، کنایہ ہے سرکار ابد قرار صلے اللہ علیہ وسلم سے۔ ناوک انداز کنایہ ہے منکرِ مسلک عشق سے۔ پیغامِ بہار کنایہ ہے پیغامِ عشق سے جس کا نتیجہ ملت کی سربلندی ہے۔

کہتے ہیں کہ مسلک عشق اختیار کرنے سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ زندگی کا راز اسی مسلک پر عامل ہونے میں مضمر ہے۔ یعنی انسان صرف اسی مسلک پر گامزن ہو کر زندگی کے مقصد سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی قوم کو اسی مسلک پر عامل ہونے کی تلقین کی ہے۔

اس کے بعد عقل پرستوں سے خطاب کرتے ہیں کہ تم مجھ پر اعتراضات کے تیر مت چلاؤ۔ بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس کرو میں نے آپ ہی کی تعلیم قوم کے سامنے پیش کی ہے۔ اور یہ تعلیم قوم کی سربلندی کی ضامن ہے۔

خیالم گل از فردوس چیند — چو مضمونِ غریبے آفریند

دلم در سینہ می لرزد چو برگے — کہ بروے قطرۂ شبنم نشیند

بنیادی تصور

افکار عقلی، لائق اعتماد نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان میں غلطی کا امکان موجود ہوتا ہے۔

مطلب

کہتے ہیں کہ میری قوت متخیلہ جو اتنی بلند ہے کہ آسمان سے تارے توڑ کر لاتی ہے، جب کبھی کوئی نادر مضمون (اچھوتا خیال) پیدا کرتی ہے، تو میرا دل اس پھول کی پتی کی طرح کانپنے لگتا ہے، جس پر شبنم کا کوئی قطرہ گر پڑے۔

مطلب یہ ہے کہ میرا دل اس خیال سے کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں یہ عقلی نکتہ (مضمون غریب) تعلیمات قرآنی یا مسلک عشق کے خلاف نہ ہو۔

بعجم بحریست ناپیدا کنارے — کہ در وے گوہر الماس رنگ است
ولیکن من نہ رانم کشتی خویش — بدریائے کہ موجش بے نہنگ است

بنیادی تصور عجم میں فلسفہ تو ہے، لیکن جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم و تلقین نہیں ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ عجم نے دُنیا کو اس قدر مدارس فکر عطا کئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا (عجم بحر ناپیدا کنار ہے) اور ان مختلف فلسفیانہ مدارس سے ہم کو بہت سے علمی نکات (گوہر) حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں نے ان تمام فلسفیانہ مدارسِ فکر کا مطالعہ کیا۔ لیکن ان میں سے کسی میں بھی خودی کی تربیت کا سامان نہیں ہے۔ موتی تو ملتے ہیں، لیکن نہنگ نہیں ملتے۔ یعنی عجمی فلسفہ انسان کے اندر دشمن سے مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا نہیں کر سکتا

اس لیے میں نے اس سمندر میں اپنی کشتی نہیں چلائی۔ یعنی فلسفیانہ طریق اختیار نہیں کیا۔

اقبال کا فلسفۂ زندگی یہ ہے :- ع

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی

نگو کار جہاں نا استوار است — ہر آن ما ابد را پردہ دار است
بگیر امروز را محکم کہ فردا — ہنوز اندر ضمیرِ روزگار است

بنیادی تصور حال کی اہمیت واضح کی ہے۔

مطلب اس رباعی کی خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے پہلے شعر میں ایک فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے۔ اور دوسرے شعر میں اس نکتہ سے عملی سبق مستنبط کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ نظام کائنات (کار جہاں) غیر مستحکم یا متزلزل (نا استوار) ہے۔ بلکہ ہمارا ہر آن (لمحہ) ابد سے ہمکنار ہے یعنی ابدیت کا علمبردار ہے۔ کیونکہ ابدیت دراصل ایک آن ہی کے سیلان و استمرار کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے تم ماضی اور مستقبل کا خیال دل سے نکال دو۔

امروز یعنی آن حاضر کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے آؤ، اور اسے اپنی ترقی کی بنیاد بنالو۔ ماضی تو گذر چکا۔ وہ تو واپس نہیں آ سکتا۔ یعنی اس پر اب تمہیں کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ اور فردا ابھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے وہ ابھی تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ پس حال کو غنیمت سمجھو اور جو کچھ کرنا ہے، وہ فوراً کر ڈالو۔ ماضی پر کفِ افسوس ملنا یا مستقبل کی امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا کارِ عقلمنداں نیست، اگر تم موجودہ آن (حاضر) کو اپنے قابو میں لا سکو، تو زمانہ تمہارے قابو میں آجائے گا۔ کیونکہ زمانہ آن ہی کی حرکتِ مستمرہ کا دوسرا نام ہے۔

من نمی گویم زیاں کن یا بفکرِ سود باش
اے زفرصت بیخبر در ہر چہ باشی زود باش

نوٹ:۔ اقبال نے اس رباعی میں امام رازی کا نظریۂ زمان پیش کیا ہے، ان کی رائے میں درحقیقت حاضر یا حال ہی موجود ہے۔ اگر حال موجود نہ ہو تو نہ ماضی کا تحقق ہو سکتا ہے نہ مستقبل کا کیونکہ ماضی دراصل وہ ہے جو کبھی حال تھا۔ اور مستقبل وہ ہے، جو کبھی حال ہو جائے گا۔ پس جسے زمانہ کہتے ہیں، وہ دراصل حال ہی ہے اگر حال نہ ہو تو ماضی اور مستقبل دونوں کا تصور نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زمانہ دراصل حال یعنی آن مستمر ہے۔

بیدل نے بھی اپنے کلام میں حال (امروز) کی اہمیت واضح کی ہے بخوفِ طوالت صرف دو شعروں پر اکتفا کرتا ہوں:۔

غبار ماضی و مستقبل از حال تو می خیزد!
در امروز است گم، گر واشگافی دی و فردا را

بر فریبِ نسیہ نقدِ خرمی با باختیم!
ساغر امروز ما بدستی فردا شکست

یعنی انسان کی غفلت شعاری ملاحظہ ہو کہ وہ فردا کی امید پر "امروز" کو

بھی ہاتھ سے گنوا دیتا ہے۔ اور پھر جب وہ امروز، ماضی ہو جاتا ہے، تو کفِ افسوس ملتا رہتا ہے۔

اقبال نے اسی مضمون کو اپنی رباعی میں پیش کیا ہے۔

رمیدی از خداوندانِ افرنگ ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی ز سنگِ راہ مولائے تراشی

بنیادی تصور مسلمانوں کی غیر اسلامی ذہنیت پر تبصرہ کیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے مسلمان! یہ تو سچ ہے کہ تو اپنے مغربی آقاؤں سے سخت متنفر ہے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے۔ کہ تو قبروں کو سجدہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔

دونوں مصرعوں میں ربط یہ ہے کہ تو خداوندانِ افرنگ کے خلاف اس لیے آمادۂ بغاوت ہے کہ تو غیر اللہ کی اطاعت کو اسلامی تعلیمات کے خلاف سمجھتا ہے۔ لیکن قبروں کو سجدہ کرنا بھی تو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس فعل سے بھی اجتناب کرنا چاہیئے۔

لالائی کی ترکیب اقبال کی ایجاد کردہ ہے اور اس سے ہندوانی ذہنیت مراد ہے۔ اور ارباب علم جانتے ہیں کہ ہندی مسلمان کے اندر یہ ذہنیت اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ اب مواعیظِ حسنہ اور خطباتِ جمعہ سے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! ہندوؤں کی معاشرت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تجھ میں انسان پرستی (لالائی) اس درجہ راسخ ہو گئی۔ کہ سنگِ راہ (قبور) کو اپنا معبود (مولا) بنا لینے میں تجھے کوئی تامل نہیں ہوتا۔

قبائے زندگانی چاک تا کے؟ چو موراں آشیاں در خاک تا کے؟
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے؟

بنیادی تصور مسلمان کو خودداری کا درس دیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے انسان! تو کب تک ایسی ذلیل زندگی بسر کرتا رہے گا؟ اور چیونٹی کی طرح زمین کے اندر کب تک اپنا گھر بناتا رہے گا؟ چیونٹی کے بجائے شاہین کی زندگی اختیار کر یعنی مادیات سے بالاتر ہو جا۔

اقبال کے یہاں شاہین پرندہ نہیں ہے بلکہ بلندیٔ نگاہ، رفعتِ تخیل، غلبہ و شوکت، خودداری، اعتماد علی النفس، اور دیگر اعلیٰ اخلاقی صفات کا نمائندہ ہے۔

میانِ لالہ و گل آشیاں گیر
ز مرغِ نغمہ خواں درسِ فغاں گیر
اگر از ناتوانی گشتہ پیر
نصیبے از شبابِ ایں جہاں گیر

بنیادی تصور ہمت اور حوصلہ کا درس دیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ اے انسان! زندگی رو رو کر کاٹنے کی چیز نہیں ہے اپنے زاویۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا کر اور زندگی کی مسرتوں سے اپنا حصہ پورا پورا وصول کر! اس کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلکِ عشق اختیار کر (درسِ فغاں)

اگر تو ناتوانی کی وجہ سے اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کر رہا ہے تو اس دنیا کے شباب سے کچھ حصہ حاصل کرلے۔ یعنی جدوجہد کر۔ اس سے زندگی (طاقت) پیدا ہو گی۔

جب طاقت پیدا ہو جائے تو اس دنیا کو مسخر کر۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر پیری کا احساس تجھے عمل سے باز رکھتا ہے، تو دنیا کو دیکھ! یہ لاکھوں برس سے موجود ہے، لیکن ابھی تک بوڑھی نہیں ہوئی لہٰذا تو اس سے سبق لے، اور اپنے اندر طاقت (شباب) پیدا کر۔

بجانِ من کہ جاں نقشِ تن انگیخت ہوائے جلوہ ایں گِل را دو تو کرد
ہزاراں شیوہ دارد جانِ بیتاب بدن گرد چو با یک شیوہ خو کرد

بنیادی تصور جسمِ مادی (تن) بھی، رُوح (جان) ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے، یعنی مادہ کی اصل روح ہے۔

مطلب اس رباعی میں اقبال نے اپنا مسلک مجمل انداز میں بیان کیا ہے جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جسم مادی (تن)، رُوح (جان) کی ظاہری شکل کا نام ہے۔ یعنی کائنات میں صرف ایک ہی حقیقت کارفرما ہے، اور وہ روح ہے، اس کو فلسفہ کی اصطلاح میں مسلکِ تصوریت کہتے ہیں۔

اس کی ضد، مسلکِ مادیت ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں بلاشبہ ایک ہی حقیقت موجود ہے۔ لیکن وہ رُوح نہیں بلکہ مادہ ہے اور رُوح اسی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

انیسویں صدی میں مسلکِ مادیت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ لیکن بیسویں صدی اس کے زوال کا پیغام لے کر آئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ افلاطون کے زمانہ سے لے کر، تا ایں دم۔ یعنی برگسان تک بہت سے حکمار نے زبردست عقلی دلائل سے مادیت کا ابطال کیا۔ لیکن عقلی دلائل سے مخالف گروہ کا مونہہ بند نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فلسفہ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ دونوں گروہ دو ہزار سال سے اپنے اپنے دعاوی کو عقلی دلائل ہی سے ثابت کرتے چلے آرہے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کے عقلی دلائل کا رد، عقلی دلائل ہی سے کرتا چلا آرہا ہے۔

لیکن بیسویں صدی میں فلسفہ کو سائنس کی تائید حاصل ہو گئی، اور سائنس اپنے دعاوی کو عقلی دلائل کے بجائے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کرتا ہے، اور تجربہ ومشاہدہ میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!
گر دلیلت باید، ازوے رو متاب

طبیعاتِ جدیدہ (فزکس) نے ہمارے زمانہ میں تجربہ اور مشاہدہ کی

رُو سے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ کہ مادہ کی اصل توانائی (ENERGY) ہے۔ اور توانائی غیر مادی ہے۔ یعنی مادہ کی اصل غیر مادی ہے سائنس کے اس انکشاف نے مسلکِ مادیّت پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ اب وہ جانبر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ برگساں کا یہ نظریہ اب عام طور سے مسلّم ہے کہ مادہ، زندگی کی فعلیت کا نتیجہ ہے۔ یعنی حیات کے گوناگوں مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ اس کا کوئی ذاتی وجود نہیں ہے۔

نوٹ:۔ چونکہ فلسفہ سے یقین پیدا نہیں ہو سکتا، اس لیے حضرات صوفیائے کرام نے مسلکِ عقل کے بجائے مسلکِ عشق کی تلقین کی ہے۔ کیونکہ یہ مسلک، سائنس کی طرح تجربہ اور مشاہدہ کا علمبردار ہے، جس سے یقین کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ جس طرح سائنس میں "پریکٹیکل" کے ذریعہ سے مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہیں اسی طرح تصوف میں بھی سارا زور پریکٹیکل ہی پر دیا جاتا ہے۔ جسے اصطلاح میں مراقبہ اور مجاہدہ کہتے ہیں۔ سائنس میں ظاہری آنکھوں سے تجربہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ تصوّف میں باطنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی سائنس اور تصوف دونوں کی بنیاد مشاہدہ ہی پر ہے۔ چنانچہ تصوف میں عقلی دلیل کے بجائے مشاہدہ کو حجت قرار دیا گیا ہے۔ ؏

گفت حجت چیست؟ گفتم روئے دوست

اب رباعی کا مطلب مختصر لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جان کی بدولت مادہ موجود ہوا ہے۔ یعنی جان اصل ہے، مادہ اس کی فرع ہے۔ بات یہ ہے کہ جان (روح) ظہور چاہتی تھی۔ جلوہ کی آرزو نے اس میں دو گونہ کیفیت (شان) پیدا کر دی۔ یعنی گل و رو کی طرح جان کے بھی دو پہلو ہیں۔ باطنی پہلو سے دیکھو تو غیر مادی ہے۔ ظاہری پہلو پر نظر کرو، تو مادی ہے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہماری جان جو اپنی اصل کے لحاظ سے ہر وقت

متحرک ہے، بیتاب ہے، ہزاروں انداز رکھتی ہے۔ اس کی ایک خاص انداز پر استقامت کا نام بدن ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جان اور تن ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

چنانچہ گلشنِ رازِ جدید میں لکھتے ہیں :-

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا دیدن حرام است

بگوشم آمد از خاکِ مزارے
کہ در زیرِ زمیں ہم می تواں زیست
نفس دارد ولیکن جاں ندارد
کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست

بنیادی تصور غلامی، موت سے بھی بدتر ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ ایک قبر سے میرے کانوں میں یہ آواز آئی کہ آدمی اگر غلام نہ ہو تو مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے لیکن جو شخص کسی کا غلام ہو، محکومِ غیر ہو، وہ زندہ بھی ہو تو مُردہ ہے۔ بات یہ ہے کہ سانس لینا زندگی کی دلیل نہیں ہے۔ سانس تو حیوانات بھی لیتے ہیں۔ زندگی درحقیقت احرّیتِ نفس کا نام ہے، نہ کہ آمد و شدِ انفاس کا۔ اس لیے جو شخص محکومِ غیر ہے۔ وہ سانس تو لے رہا ہے لیکن زندگی (جان) سے محروم ہے۔

شنو از من ایں مشتِ غبارے
پریشاں جلوہ ہا پارہ ہائے
چو فطرت می تراشد پیکرے را
تمامش می کند در روزگارے

بنیادی تصور مسلکِ رجائیت کی تلقین کی ہے۔

مطلب اقبال کا مسلک یہ ہے کہ یہ کائنات ہر لحظہ بہتری اور کمال کی طرف قدم اُٹھا رہی ہے۔ اس کو انگریزی زبان میں

LORISM-۔ کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ہمیں بایں الفاظ پیغام دیتے ہیں کہ انسان کے مستقبل سے مایوس مت ہو۔ یہ سچ ہے کہ وہ ضعیف ہے، اپنے ماحول پر قدرت نہیں رکھتا، اور فانی ہے۔ لیکن فطرت نے اسے بے کار پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اُسے تدریجی طور پر کمال کی طرف لے جا رہی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مرتبہ تک پہنچنے میں اُسے ابھی کافی عرصہ درکار ہے۔

جہانِ رنگ و بو فہمیدنی ہست | درین وادی بسے گل چیدنی ہست
ولے چشم از درونِ خود نبندی | کہ در جانِ تو چیزے دیدنی ہست

بنیادی تصور آفاق کے ساتھ ساتھ انفس کا مطالعہ بھی لازمی ہے۔

مطلب بے شک یہ کائنات اِس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اور یہ مطالعہ بہر صورت بہت نفع بخش ثابت ہوگا۔ لیکن تجھ کو اپنی باطنی زندگی کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ تیرے اندر بھی ایک شئے ہے، جو بلا شبہ قابلِ دید ہے۔

نوٹ:۔ اگرچہ اقبال نے اس کی صراحت نہیں کی۔ لیکن اہلِ دل جانتے ہیں کہ وہ شئے دِل ہے۔

بیدلؔ نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں:۔

زسیرِ عالمِ دل غافلیم ورنہ حباب
بہ اگر بجگریاں فرو برد، دریاست

تو گوئی راز من ہستم نہانیست | جہانِ آب و گل را انتہا نیست
ہنوز این راز بر من ناکشود است | کہ چشمم را نگہ جز دیدنی نیست

بنیادی تصوّر مادہ پرستی کا ابطال کیا ہے۔

مطلب مادہ پرست سے خطاب کرتے ہیں کہ تو یہ کہتا ہے، کہ میں موجود ہوں، خدا موجود نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ یہ کائنات ازلی اور ابدی ہے۔ اس لیے مجھے خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن میں تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ تو یہ بات ابھی تک ثابت نہیں کر سکا کہ جو کچھ نظر آتا ہے، یہ واقعی موجود ہے۔ اِس لیے پہلے تو یہ ثابت کر، کہ کائنات ازلی ہے۔ اس کے بعد تو یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا موجود نہیں ہے۔

میری رائے میں تو یہ کائنات موجود ہی نہیں ہے۔ یعنی اس کا وجود محض اعتباری ہے۔ اور جو شئے اعتباری ہوتی ہے۔ وہ درحقیقت موجود نہیں ہوتی۔ اور اس کے اعتباری ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ جو کچھ نظر آتا ہے، اس کا وجود، دیکھنے والے پر موقوف ہے۔ اگر کوئی دیکھنے والا نہ ہو، تو اس کائنات کا وجود ثابت کیسے ہوگا؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمیں صرف محسوسات کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اور محسوسات کا علم ہمارے حواسِ خمسہ پر موقوف ہے۔ پس اگر حواسِ خمسہ نہ ہوں، تو محسوسات معدوم ہو جائیں گے۔ اور یہ کائنات محسوسات ہی سے عبارت ہے۔ اس لیے کائنات معدوم ہو جائے گی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ کائنات کا وجود محض اعتباری ہے۔ اور جس شئے کا وجود اعتبارِ معتبر پر موقوف ہو، اُسے کوئی عقلمند درحقیقت موجود نہیں کہہ سکتا۔

بسا عالم خالی از شرع کباب است　　نہ در جام مے آئینہ آب است

غزالی من خورد برگ گیاہے　　و لے غزالی او مشک ناب است

بنیادی تصور اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ نہ تو میرے دسترخوان پر مرغِ مُسلّم چنا جاتا ہے، اور نہ کھانے کے بعد شغلِ مینا و جام ہوتا ہے۔ بلکہ میری زندگی اُس ہرن سے مشابہ ہے۔ جو گھاس کھاتا ہے۔ لیکن اُس کی طبیعت برگِ گیاہ کو مشکِ ناب میں تبدیل کر دیتی ہے یعنی میں سادہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ لیکن فطرت نے مجھے فکرِ رسا عطا فرمائی ہے۔ اس لیے نانِ جویں کھاتا ہوں۔ مگر میرے اشعار موتیوں سے بھی زیادہ آبدار ہیں۔

مطلب یہ ہے، کہ ذہن کی رسائی اور فکر کی بلندی یا سیرت کی پاکیزگی کو لذائذِ دنیوی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اور حضرت علیؓ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے تو یہ بات بھی ثابت ہو سکتی ہے کہ جسمانی طاقت بھی مرغن غذاؤں پر موقوف نہیں ہے

رگِ مسلم ز سوزِ من تپید است ز چشمش اشکِ بیتابانہ چکید است
ہنوز از محشرِ جانم نداند جہاں را با نگاہِ من ندید است

بنیادی تصور اگر مسلمان، اس کائنات کو اقبال کی نگاہ سے دیکھے تو اس کے دل میں بھی محشر برپا ہو سکتا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ میرے کلام نے مسلمان کے دل کو گرما دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس پر کبھی کبھی رقت کا عالم بھی طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے کائنات کو میری نظر سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہ ابھی تک اُس محشر سے آگاہ نہیں ہو سکتا ہے۔ جو میری جان میں برپا ہے۔

یعنی ابھی تک مسلمان نے میرے پیغام کو نہیں سمجھا ہے۔ (صرف میرے اشعار پڑھ پڑھ کر جھومتے رہے ہیں) اگر وہ اسے سمجھ جائیں، تو یہ حقیقت ان پر منکشف ہو جائے کہ یہ دُنیا جس پر وہ مٹے ہوئے ہیں

ہیں "دھوکر کی ٹوٹی" ہے۔ اس لیے مسلمان کا مقصود نہیں بن سکتی۔ بلکہ اس کا مقصود حق تعالے ہے۔ جو "الحی القیوم" ہے۔ اور جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں گے، تو اس کی محبت اُن کے دلوں میں وہی محشر برپا کر دے گی، جو میرے دل میں برپا ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے یہ بات ۱۹۲۳ء میں کہی تھی لیکن آج ۱۹۵۲ء میں بھی مسلمانوں پر حرف بحرف صادق آ سکتی ہے۔ اور میرا قیاس ہے کہ ابھی ۱۹۹۲ء تک اسی طرح صادق آتی رہے گی۔ بشرطیکہ اس وقت تک مسلمان صفحۂ ہستی پر باقی رہ گئے۔"

بحرف اندر نگنجد لامکاں را ۔۔۔ درون خود نگر ایں نکتہ پیداست

بہ تن جاں آنچناں اندر نشیند ۔۔۔ کز آں ربطے نہ اینجا نے آنجاست

بنیادی تصور جان و تن کے رابطہ باہمی پر غور کرنے سے لامکاں کی ماہیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ ہم لامکاں کی حقیقت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے کیونکہ انسانی عقل، زمان و مکان کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ لامکاں کا تصور نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی باطنی حالت (زندگی) کا بغور مطالعہ کرے جسے اصطلاح میں مراقبہ کہتے ہیں تو لامکاں کا مفہوم اس پر واضح ہو سکتا ہے۔

غور کرو! کوئی شخص اس بات سے منکر نہیں ہو سکتا کہ جان (رُوح) تن کے اندر ہے۔ یعنی دونوں میں مظروف (جان) اور ظرف (تن) کا علاقہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مظروف کا مقام متعین ہو سکتا ہے۔ لیکن کوئی شخص رُوح کا مقام متعین نہیں کر سکتا۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ رُوح جسم میں فلاں مقام پر موجود ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود جسم کے اندر ہی ہے۔ باہر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ رُوح میں لامکانیت کی شان پائی جاتی ہے۔

بہر دل عشق رنگِ تازہ بر کرد — گہے با سنگ گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشمِ تر داد — مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

بنیادی تصور عشق کی تجلیات، ہر شخص میں مختلف النوع کیفیات پیدا کرتی ہیں۔

مطلب کہتے ہیں کہ عشق کی تجلیات یکساں نہیں بلکہ گوناگوں ہیں۔ اور ہر شخص کے دل میں ان کی بدولت مختلف قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

چنانچہ دوسرے شعر میں اس کی مثال دیتے ہیں کہ بعض لوگ عشق میں دیوانے (از خود رفتہ) ہو جاتے ہیں اور گلیوں میں روتے پھرتے ہیں۔

ع آوارہ و مجنونے رسوا سرِ بازارے

اور بعض لوگ اسی عشق کی بدولت عارف ہو جاتے ہیں۔

نوٹ: بات یہ ہے کہ عشق تو ایک ہی ہے، لیکن انسانوں میں استعداد کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، اس لیے نتائج بھی مختلف مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً آفتاب کی شعاع ایک ہی ہے۔ لیکن پھلوں پر پڑتی ہے۔ تو انہیں پکا دیتی ہے۔ پھولوں پر پڑتی ہے تو انہیں مرجھا دیتی ہے اسی طرح عشق، جذباتی ٹائپ کے آدمی کو مجذوب اور عقلی ٹائپ کے آدمی کو سالک بنا دیتا ہے۔ ۱۲

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی — تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم — از آں پس ہندی و تورانیم من

بنیادی تصور انسان کا طغرائے امتیاز اس کی انسانیت ہے نہ کہ وطنی یا نسبی امتیازات۔

مطلب انسان سے خطاب کرتے ہیں کہ تو ابھی تک مادی علائق میں گرفتار ہے۔ یعنی تیری ذہنیت ابھی تک پست ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تو اپنے وطن کو مفاخرت کی بنیاد بناتا ہے۔ حالانکہ کسی آدمی کا رومی یا افغانی ہونا، اس کے لیے کسی طرح بھی باعثِ فخر

نہیں ہو سکتا۔

آدمی کی عزت تو اس کی آدمیت پر موقوف ہے نہ کہ اس کی ذات یا نسل یا زبان یا قوم پر۔

اے انسان! پہلے انسان بن، اس کے بعد وطن کے تصور کو دل میں جگہ دے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اگر ہر شخص وطن کے بجائے اپنے آپ کو آدم سے منسوب کرنے لگے، تو نسلی، قومی اور وطنی امتیازات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ بنی آدم کی نصف سے زیادہ مصیبتوں کا سرچشمہ یہی وطنیت اور قومیت کا نظریہ ہے۔

مرا ذوقِ سخن خونِ جگر کرد
غبارِ راہ را مشتِ شرر کرد
بگفتارِ محبت لب کشودم
بیاں ایں راز را پوشیدہ تر کرد

بنیادی تصور رازِ محبت، لفظوں سے ادا نہیں ہو سکتا۔

مطلب کہتے ہیں کہ اگرچہ وارداتِ عاشقی نے میرا جگر خون کر دیا لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ اس ذوقِ سخن نے (جو نتیجہ ہے عشق کا) غبارِ راہ کو مشتِ شرر میں تبدیل کر دیا۔ یعنی مجھے سراپا آتش بنا دیا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ لفظوں کے ذریعہ سے عشق و عاشقی کی حقیقت واضح کروں۔ لیکن افسوس ہے کہ الفاظ نے اس راز کو اور بھی پوشیدہ کر دیا۔

اقبال کنایۃً یہ چاہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے اپنی شاعری میں وارداتِ عاشقی حتی الامکان بیان کر دیئے ہیں۔ لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ عشق، قال نہیں ہے بلکہ حال ہے۔ اور دنیا کا کوئی شاعر یا خطیب حال کو قال کے ذریعہ سے ادا نہیں کر سکتا۔ جس طرح کوئی شخص مٹھاس کی کیفیت نحاس کو لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

گریز آخر ز عقل ذو فنوں کرد دلِ خود کام را از عشق خوں کرد
ز اقبال آں فلک پیما چہ پرسی حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد

بنیادی تصور جب فلسفی پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو وہ مسلکِ عقل کے بجائے مذہبِ عشق اختیار کر لیتا ہے۔

مطلب یہ آخری رباعی ہے، اس لیے اقبال نے اس عظیم الشان انقلاب کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو قرآن حکیم کے مطالعہ کے بعد ان کی باطنی زندگی میں رونما ہوا۔

انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز فلسفہ سے کیا ہے۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۰ء تک وہ دن رات اس کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ ؎

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

لیکن ۱۹۱۱ء سے انھوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ تحقیقی رنگ سے شروع کیا، تو اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ ؎

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اس لیے ۱۹۱۸ء سے انھوں نے مذہبِ عشق اختیار کر لیا۔ اور تا دمِ وفات اسی مسلک پر گامزن رہے۔

ان حقائق کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس رباعی کو پڑھو، تو پہلے مصرع میں لفظِ "آخر" کا مفہوم واضح ہو سکتا ہے ؏

گریز آخر ز عقل ذو فنوں کرد

یعنی مَیں نے مدتوں فلسفہ کے سمندر میں غوطہ زنی کی، لیکن جب گوہرِ مقصود ہاتھ نہ لگا، تو آخر کار اس سمندر سے باہر نکل آیا۔ یعنی مسلکِ عقل ترک کر دیا۔ اور مذہبِ عشق اختیار کر لیا۔

دوسرے شعر میں اسی بات کو شوخی اور ظرافت کے رنگ میں بیان کیا ہے

کہ اقبال فلک پیما کا کیا حال پوچھتے ہو؟ اچھا خاصا فلسفی تھا۔ لیکن کچھ ایسی افتاد پڑی کہ دیوانہ ہوگیا!

نوٹ :۔ راقم الحروف اپنے محدود مطالعہ کی بنا پر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ دُنیا میں جتنے نامور فلسفی گذرے ہیں۔ جب انھوں نے تعصب سے خالی ہو کر مسئلہ کی حقیقت پر غور کیا، تو اسی نتیجہ پر پہنچے کہ

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ

چنانچہ متقدمین میں امام غزالیؒ کی زندگی اس بات کی صداقت پر روشن دلیل ہے۔ انھوں نے دس بارہ سال تک دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں فلسفہ کا درس دیا۔ لیکن انجام کار یہ حقیقت ان پر آشکار ہو گئی کہ فلسفہ خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا انھوں نے وحدت الوجود کے دامن میں پناہ لی۔

متاخرین میں حضرت مولٰنا عبد العلی الملقب بہ بحر العلومؒ، خاتم الحکماء حضرت مولٰنا فضل حق خیر آبادیؒ۔ حضرت مولٰنا عبد الحق صاحب خیر آبادی حضرت مولٰنا حکیم سید برکات احمد صاحب ٹونکی۔ اور حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیریؒ کے اسمائے گرامی بطور شہادت پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سب حضرات فلسفہ، منطق اور کلام میں ید طولٰے رکھتے تھے۔ لیکن سب کے سب وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اسی لیے راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ فلسفی جس قدر فلسفہ میں کمال حاصل کرے گا۔ اُسی قدر وحدت الوجود کی طرف مائل ہوگا۔ بیدل نے کیا خوب کہا ہے :۔

آں ذات کہ جملہ اوست بے کم و بیش
در تحقیقش بے غلطہاست بہ پیش
یعنی ز معیتش کسے واقف نیست
او با خویش است و خلق گوید باخویش

حصّہ دوم

افکار

تمہید اس حصّہ میں ۵۱ مختلف نظمیں ہیں۔ ان میں کوئی منطقی ربط یا ترتیب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت جو خیال دل میں آیا اُسے نظم کا جامہ پہنا دیا۔ لیکن ایک بات ان سب نظموں میں بطور قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہر نظم سے شاعر نے کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور پیدا کیا ہے۔

بعض نظمیں بہت آسان ہیں لیکن بعض بہت مشکل ہیں۔ مثلاً "ہلالِ عید" اور "کرمکِ شب تاب" نسبتاً آسان ہیں۔ اور "نوائے وقت" اور "تسخیرِ فطرت" بہت دشوار ہیں۔

بعض نظمیں "بانگِ درا" کی نظموں سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً سرود انجم، شبنم، طیارہ اور قطرۂ آب۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بانگ درا کی ان نظموں اور اس کتاب کی ان نظموں کا زمانۂ تصنیف ایک ہی ہے، یعنی از ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۲ء

ان نظموں کا اگر "ضربِ کلیم" کی نظموں سے موازنہ کیا جائے تو اقبال کا ذہنی ارتقاء صاف طور سے نظر آسکتا ہے۔ جوں جوں ان کی فکر بلند ہوتی گئی، مناظرِ قدرت کے بجائے زندگی اور کائنات کے اہم مسائل ان کی فکر کا موضوع بنتے چلے گئے۔

پیامِ مشرق کی ان نظموں کا تجزیہ کیا جائے، تو حسب ذیل عنوانات قائم کئے جا سکتے ہیں:۔

بہاریہ نظمیں۔ تمثیلی نظمیں۔ فلسفیانہ نظمیں۔ طنزیہ نظمیں۔ اور سبق آموز نظمیں۔

گلِ نخستین

جستند ہمہ نفسے در چمن ما بہ بینم — بہاری رسید ز من گلِ نخستینم
چو آب جو ہمہ خود بینیش ز نغمہ رہ نم — بایں بہانہ گرہ نغمہ کہ جبینم
جہاں ز خط زندگی گشتہ است — نوشتہ بہ پیامے بہ برگ رنگینم
وفا بہ دوش نگاہم بہ عبرت امروز — شہید جلوۂ فردا و تازہ آئینم

ز شیون گل رسد بر قبای گل بستم
ولی گرہ شدہ ماندہ ز برگ نسرینم

تمہید یہ ایک آسان نظم ہے اور اس کا عنوان ہے "موسم بہار کا پہلا پھول" شاعر نے پھول کو ایک صاحبِ شعور ہستی قرار دیا ہے (اس صنعتِ بدیع کو انگریزی میں (PERSONIFICATION) کہتے ہیں) اس لیے وہ زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ

مطلب میں موسم بہار کا پہلا پھول ہوں۔ اور میرا ظہور اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ موسم بہار آگیا۔ لیکن مجھے تنہائی کا احساس بہت تکلیف دے رہا ہے۔ اس لیے میں نہر میں اپنے عکس کو بار بار دیکھ رہا ہوں۔ تاکہ اس احساس کی شدت میں کچھ کمی واقع ہو جائے۔

کارکنانِ قضا و قدر نے زندگی بخش قلم سے میری خوبصورت پتیوں پر اہلِ عالم کو یہ پیغام لکھ کر بھیجا ہے کہ بہار آگئی۔ یعنی میرا وجود بہار کی آمد آمد کا اعلان کر رہا ہے۔

میری زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ میں گذشتہ دور کی رنگینیوں کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ اور زمانۂ حال کی بے ثباتی سے عبرت حاصل

کرتا ہوں۔ دنیا میں کسی شے کو ثبات نہیں ہے، اور آئندہ واقعات وحالات کا منتظر ہوں دیکھیں کل کیا ہوتا ہے، اور دُنیا میں نئے آئین موسم بہار کا علمبردار ہوں۔

چونکہ میں مٹی سے آگا ہوں، اس لیے پھول کی شکل میں ظاہر ہوا ہوں ورنہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ مجھ میں اور خورشید، پروین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی اصل کے لحاظ سے تمام اشیائے کائنات میں وحدت پائی جاتی ہے۔

نوٹ:۔ آخری شعر میں اقبال نے اپنے مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے کہ گلِ بہار ہو یا اخترِ فلک، دونوں میں ایک ہی حقیقت جلوہ گر ہے دونوں ایک ہی ہستی کے مظاہر ہیں۔ یعنی وہی ذاتِ واحد (حق تعالیٰ) کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر ہے:۔

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گر سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

دعا

اے کہ از خمخانۂ فطرت بجامم ریختی — زآتشِ صہبا بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز از گرمیِ فریاد من — شعلۂ بیباک گرداں خاکِ سینائے مرا
چوں حباب از غبارِ تن [illegible]
تا کجا [illegible] صحرائے مرا

تمہید یہ ایک فلسفیانہ اور بلند پایہ نظم ہے۔ جس میں شاعر نے مادیات اور دنیاوی لوازمات سے بالاتر ہو کر، مقصدِ ہستی کے حصول کی دُعا کی ہے۔ انسان عام طور سے جو دعا مانگتا ہے، وہ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اے خدا! مجھے دنیا میں عزت، دولت، حکومت اور مرنے کے بعد جنت عطا کر! لیکن اقبال یہ کہتے ہیں کہ

(۱) اے خدا! تو نے اپنے فضل وکرم سے میرے قلب (جام) کو عشق سے معمور کر دیا ہے۔ اس عشق (صہبا) کی آگ میں میری شخصیت

(مینا) کو جلا کر خاکستر کر دے) یعنی میرے قلب کو غیر اللہ کی محبت سے یکسر خالی کر دے۔

(۲) میری گرمیٔ فریاد کو عشق کے لیے سرمایہ بنا دے، یعنی میری عاشقانہ زندگی کی بدولت عشقِ حقیقی کا صحیح مقام اور اس کی قدر و منزلت دُنیا والوں کی نگاہ میں واضح کر دے۔ نیز اس عشق کی تاثیر سے میری ہستی (خاکِ سینا) کو باطل کے حق میں سراپا آتش بنا دے۔

نوٹ:۔ اسی لیے اقبال نے مسلمانوں کو شعلہ بننے کی تلقین کی ہے:۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا؟ کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

(۳) اے خدا! میں چاہتا ہوں کہ میری وفات کے بعد میرے مزار کی خاک سے گُل لالہ پیدا ہوں۔ تاکہ اس طرح میرا داغِ جگر (نشانِ عشق) دُنیا میں از سرِ نو جلوہ گر ہو سکے۔ اور زبانِ حال سے دُنیا والوں کو عشق کا پیغام دے سکے۔

ہلالِ عید

تو اے ز جیبِ شفق دمیدہ اے ہلالِ عید
از صد نگہ براہِ تو دامے نہادہ اند

بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

مفہوم

ہلالِ عید سے خطاب کیا ہے۔ کہ تُو ہماری مشتاق نگاہوں سے بچ کر کہاں جا سکتا ہے! چند آدمی دیکھنے والے ہوں، تو ممکن ہے کہ تُو انہیں نظر نہ آسکے۔ لیکن تجھے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ اس لیے تُو پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

اے ہلال! تُو اس بات سے آزردہ مت ہو کہ تیرا وجود بہت مختصر اور منحنی ہے۔ تُو اپنی حقیقت پر غور کر! کارکنانِ قضا و قدر نے تجھ میں ترقی کر کے بدرِ کامل بن جانے کی صلاحیت پوشیدہ کر دی ہے۔ بظاہر تو ہلال نظر آتا ہے، لیکن تیرے سینہ میں "ماہِ تمام" پوشیدہ ہے۔

نوٹ:- یہ مضمون حضرتِ انسان پر بھی صادق آسکتا ہے۔ بایں طور کہ اگر کوئی شخص "تہی دامن" ہو، تو اسے اس بات سے آزردہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ ترقی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ کارکنانِ قضا و قدر نے ہر انسان میں "ماہِ تمام" یعنی مردِ کامل بننے کی استعداد مخفی کردی ہے۔

تسخیرِ فطرت

(۱) میلادِ آدم

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بیخبر از خویش بہ آغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

(۲) انکارِ ابلیس

نوریِ ناداں نیم، سجدہ بہ آدم برم — او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات — من بہ دو صرصرم، من بہ غوِ تندرم

رابطۂ سالمات، ضابطۂ امّہات — سوزم و سازندہ ام، آتشِ مینا گرم
ساختۂ خویش را درشکنم ریز ریز — تا ز غبارِ کہن پیکرِ نو آورم
از دمِ من بودہ جسم، جہانِ شکل ناپذیر — نقش گرِ روزگار، تاب و تبِ جوہرم
پیکرِ انجم ز تو، گردشِ انجم ز من — جاں بہ جہاں اندرم، زندگیِ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی، شور بہ جاں من دہم — تو بہ سکوں رہ زنی، من بہ تپش رہبرم
من ز تنک مایگاں گدیہ نکردم سجود — قاہرِ بے دوزخم، داورِ بے محشرم
آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوشِ تو، پیر شود در برم

(۳) اغوائے آدم

زندگیِ سوز و ساز، بہ ز سکونِ دوام — فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام
ہیچ نیاید ز تو غیرِ سجودِ نیاز — خیز چو سروِ بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاطِ نگاہ — گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام

زشت و نکو زادۂ وہمِ خداوندِ تست — لذتِ کردار گیر، گام بنہ، جوئے کام
خیز کہ بنمایمت مملکتِ تازہ ئی — چشمِ جہاں بیں گشا، بہرِ تماشا خرام

قطرۂ بے مایۂ گوہرِ تابندہ شو — از سرِ گردوں بیفت، گیرہ بہ دریا مقام
تیغِ درخشندہ ئی، جانِ جہانے بگیر — جوہرِ خود وانما، آئے بروں از نیام
بالِ شاہیں کشا، خونِ تذرواں بریز — مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

تو نشناسی ہنوز، شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

تمہید یہ بہت دلچسپ اور معنی خیز نظم ہے، جس میں اقبال نے انسان کی پیدائش کا مقصد واضح کیا ہے جو ان کی رائے میں تسخیرِ فطرت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ عنوانِ نظم سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اگرچہ انھوں نے قصۂ آدم کی طرف مختلف نظموں میں اشارے کئے ہیں۔ لیکن خطبات میں اس موضوع کو بالوضاحت بیان کیا ہے۔ اس لیے ذیل میں اُس تفصیل کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں۔ تاکہ اس نظم کا مفہوم بآسانی ذہن نشین ہو سکے۔

(۱) قرآن حکیم نے بھی ہبوطِ آدم کی داستان بیان فرمائی ہے۔ لیکن اس کی قلب ماہیت کچھ اس انداز سے کی کہ اس کا مفہوم ہی یکسر بدل گیا۔

(۲) اس قسم کے افسانوں سے قرآن حکیم کا مقصد شاذونادر ہی تاریخی ہوتا ہے، بلکہ وہ ان کو ایک فلسفیانہ یا اخلاقی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے سانپ اور پسلی کا افسانہ حذف کر دیا ہے۔

(۳) قرآن حکیم نے جہاں انسان کی پیدائش کا ذکر کیا ہے، وہاں اس کے لیے بشر یا انسان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آدم کا لفظ ... "خلیفۃ اللہ" کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، بلکہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔

(۴) قرآن حکیم کی رو سے الارض (زمین) انسان کی مستقل قرارگاہ یا قیام گاہ ہے۔ اس میں انسان کے گذارے کا سامان ہے۔

(۵) جس جنّت سے آدم کو نکالا گیا وہ وراء الحواس جنّت نہیں ہے، جو نکوکاروں کا دائمی مستقر ہے۔ کیونکہ اس جنّت سے کسی کو نکالا نہیں جائے گا۔ اور نہ وہاں کسی سے نافرمانی سرزد ہوگی۔

(۶) قصّۂ آدم میں جس جنّت کا مذکور ہے، اُس سے انسان کی وہ ابتدائی حالت مُراد ہے جبکہ وہ فکرِ معاش سے بے نیاز تھا، اور اس کی زندگی "تنے غم زردنے غم کالا" کی مصداق تھی۔

(۷) خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہبوطِ آدم کی قرآنی داستان کو اس کرۂ ارضی پر انسان کے ظہورِ اوّلین سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں انسان کے جبلّی خواہشات کی ابتدائی حالت سے ترقی کر کے صاحبِ شعور و صاحبِ اختیار ہستی کے مرتبہ تک پہنچ جانے کا نقشہ قائم ہو جائے۔ ایسی ہستی جو شک اور نافرمانی دونوں باتوں کی مرتکب ہو سکتی ہے۔

(۸) قرآنِ حکیم کی رُو سے یہ دُنیا "بلاخانہ" نہیں ہے۔ جہاں "ہر عاقل و فرزانہ" کسی گناہ کے سبب سے پامالی کی مصیبت میں گرفتار ہو۔

(۹) چونکہ انسان کا سب سے پہلا فعلِ نافرمانی، اس کے ارادہ اور اختیار کا سب سے پہلا مظہر تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، آدم کے پہلے گناہ کو معاف کر دیا۔

(۱۰) قرآن کی رُو سے نیکی کا ظہور و صدور صرف ایک صاحبِ اختیار ہستی سے ہو سکتا ہے، جو نافرمانی پر بھی قادر ہو۔ وہ شخص جسے اپنے افعال پر کوئی قدرت ہی حاصل نہ ہو، اعمالِ صالحہ (نیک کام) کیسے بجا لا سکتا ہے؟ نکوکاری کے لیے اختیار (حریتِ فکر و عمل) شرطِ اوّلین ہے۔

(خطبات مدراس ص۲۸ تا ۸۱ ملخصاً)

ان تصریحات پر مفصل تنقید کا تو یہ موقع نہیں ہے۔ صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اقبال کا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آدم کو ارادہ اور اختیار دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ تاکہ وہ ان کی بدولت اس کائنات کو مسخر کر کے مرتبۂ نیابتِ الٰہیہ پر فائز ہو سکے۔ اور یہی اس کی پیدائش کا مقصد ہے۔ چنانچہ حسب ذیل آیت اس پر شاہد ہے:۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ۔ (۲ : ۳۰)

اللہ تعالےٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (آدم کو) اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں۔

اگر ناظرین اس نظم کو پڑھتے وقت ان تصریحات کو مدِّ نظر رکھیں گے تو اس کے مطالب بخوبی واضح ہو سکیں گے۔

اس نظم میں پانچ بند ہیں۔

پہلے بند میں اقبال نے آدم کی شخصیت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

دوسرے بند میں ابلیس کے انکار کی وجوہ اور اس کی شخصیت کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

تیسرے بند میں اغوائے آدم کی داستان رمزیہ انداز میں قلمبند کی ہے۔

چوتھے بند میں اُس انقلاب کی تصویر کھینچی ہے جو بہشت سے نکلنے کے بعد آدم کی زندگی میں پیدا ہوا۔

پانچویں بند میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تسخیر کائنات کے لیے اس لغزش (غلطی) کا صدور ضروری تھا اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آدم کی اس غلطی کو معاف کر دیا۔

نوٹ:۔ قرآن مجید نے آدم کی اس لغزش کو "نسیان" سے تعبیر کیا ہے:۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ
نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۔ (۲۰ : ۱۱۵)

اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے، پھر وہ اس بات کو بھول گیا۔ اور نہ پائی ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی اور ہدایت عطا کی۔

پہلا بند

ولادتِ آدم

اس بند کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جب حیات، ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی (جمادات، نباتات اور حیوانات کے عالم سے گذر کر) انسان کی شکل میں ظاہر ہوئی (جسے اقبال نے میلادِ آدم سے تعبیر کیا ہے) تو کائنات میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ :-

(۱) ظہورِ آدم سے پہلے کائنات میں کوئی ہستی خالقِ کائنات سے محبت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن انسان میں نصب العین کے حصول کی آرزو پائی جاتی ہے۔ اسی آرزو کو اقبال نے عشق سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو انسان کو حیوانات سے متمیز کرتا ہے اس کو مختلف علوم میں مختلف اصطلاحی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً نطق، شعورِ ذات، آرزو، عشق وغیرہ پہلے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان عاشق (خونیں جگر) اور مدرکِ جمال (صاحب نظر) ہے۔

(۲) ظہورِ آدم سے پہلے کائنات میں کوئی ہستی صاحبِ عقل و شعور اور صاحبِ ارادہ صاحبِ اختیار نہیں تھی۔ لیکن انسان اگرچہ اسی جہانِ مجبور کی خاک سے پیدا ہوا ہے، تاہم وہ مجبور ہونے کے ساتھ ساتھ مختار بھی ہے۔ اور اسی صفتِ اختیار کی بدولت وہ اپنی خودی کو مستحکم کر سکتا ہے۔ یعنی خودگر ہے۔ اجتماعی شان پیدا کرتے

کی غرض سے اپنے اوپر قیود وارد کر سکتا ہے۔ یعنی خودشکن ہے اور اپنی معرفت حاصل کر کے روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ یعنی خودنگر ہے۔

(۳) انسان میں یہ صلاحیت پوشیدہ ہے کہ اگر وہ اپنی خودی کو مستحکم کر کے نیابتِ الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہو جائے تو کائنات کے علاوہ عالمِ ملکوت کے مخفی اسرار کو بھی آشکار کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبال نے شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ

حذر اے پردگیاں! پردہ درے پیدا شد

(۴) ظہورِ آدم سے پہلے کسی ہستی میں "آرزو" کارفرما نہیں تھی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ آرزو موقوف ہے شعورِ ذات پر، اور یہ دولت انسان کے علاوہ اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔

جب انسان پیدا ہوا، تو آرزو جو آغوشِ حیات میں خفتہ تھی بیدار ہو گئی۔ یعنی انسان ہی اس کائنات میں وہ ہستی ہے، جس میں کسی نصب العین کو حاصل کرنے کی آرزو پائی جاتی ہے۔ اقبال نے نہایت بجا طور پر آرزو کی کارفرمائی کو "پیدائشِ جہانِ دیگر" سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ آرزو (انسان) کے ظہور سے پہلے دنیا میں تہذیب و تمدن کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ نہ زراعت تھی نہ صنعت و حرفت نہ باغبانی نہ کاشتکاری، نہ تعمیر نہ عمارت، نہ خاندان نہ قبیلہ، نہ صلح نہ جنگ۔ نہ آلات نہ ظروف۔ نہ ساز نہ سامان۔ یہ رونق، یہ حرکت یہ ترقی۔ یہ تمدن۔ یہ شہر۔ یہ باغات۔ یہ سب آرزو (ترقی کی خواہش) ہی کے تو مختلف کرشمے ہیں۔

(۵) ظہورِ آدم سے پہلے زندگی سراسر مادی تھی اور مادیات ہی میں صابر تھی۔ آدم ہی کے دم قدم کے بدولت زندگی خاک سے ابھر کر افلاک تک پہنچی، مادیات کے دائرہ سے نکل کر روحانیات کے عالم میں داخل ہوئی مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جو روح، بقائے روح، حیات بعد الموت، عالمِ مثل

اور عالمِ لاہوت کا تصور کر سکتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آدم

خونین جگر (عاشق) ہے، قدردانِ حُسن اور مُبصرِ جمال ہے، مجبور ہونے کے ساتھ ساتھ مختار بھی ہے۔ اپنی خودی کی تربیت کر کے نیابتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ کائنات کے مخفی اسرار کو آشکار کر سکتا ہے۔ فرشتوں سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کر سکتا ہے۔ بلکہ اس جگہ پہنچ سکتا ہے، جہاں فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ آدم کی اسی خصوصیتِ کُبریٰ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:-

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
پہنچا اُس جا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

انکارِ ابلیس

جب حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو ابلیس نے انکار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وجہ دریافت کی، تو اُس نے کہا کہ میں کوئی بھولا بھالا (معصوم) فرشتہ تو نہیں ہوں کہ محض تیرے حکم کی بناء پر آدم کو سجدہ کروں۔ آخر مجھ میں بھی تو عقل ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدم کو سجدہ نہ کروں۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں آدم سے افضل و برتر ہوں اور اس پر دلیل یہ ہے کہ تو نے مجھے آگ سے، اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ [1]

---

[1] قرآن حکیم نے ابلیس کے اس منطقی استدلال کو یوں بیان فرمایا ہے:-

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ۝ (۷ : ۱۲)

اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا۔ جب میں نے تجھے سجدہ کا حکم دیا، تو تجھے

نوٹ:۔ ابلیس کے جواب سے ثابت ہوا کہ اُس نے اپنی پیدائش کو اپنی بزرگی یا برتری کی دلیل قرار دیا۔ یعنی اُس نے یہ نہیں کہا کہ میں بلحاظِ اعمالِ صالحہ (تقویٰ) آدم سے افضل ہوں۔ (جو کہ برتری کا صحیح معیار ہے) بلکہ بلحاظِ پیدائش اس سے افضل ہوں۔ بالفاظِ دیگر ابلیس دُنیا میں نسلی تفرق اور برتری کے تصور کا بانی ہے۔ آج ساری دُنیا نسل اور اس کے منطقی نتائج یعنی رنگ، خون، ذات پات، قوم قبیلہ اور وطن کے تعصبات میں گرفتار ہے اور اسی لیے ایک قوم دُوسری قوم سے برسرِ پیکار ہے۔ اسی کا دُوسرا اور صحیح نام ابلیسیت ہے۔ مثلاً آج ہندوستان میں ملازمت یا بزرگی کا معیار، علم و دانش یا تقویٰ نہیں ہے، بلکہ سعادتِ پیدائش یعنی نسلی امتیاز ہے۔ اسی کی بنیاد پر ہر صوبہ کا "کوٹا" مقرر ہے۔ مثلاً بنگالی ۲۰ فی صدی۔ پنجابی ۱۰ فی صدی۔ راجپوت ۱۰ فی صدی۔ اچھوت ۱۰ فی صدی، مدراسی ۲۰ فی صدی وغیرہ وغیرہ۔

اسی لیے اقبال نے آج سے چالیس سال پہلے ہندی مسلمان کو متنبہ کر دیا تھا۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دُنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہ گذر

بنائے افضلیت واضح کر دینے کے بعد اب ابلیس اپنی شخصیت کی خصوصیات بیان کرتا ہے، چنانچہ کہتا ہے کہ:۔

(۲) میرے ہی سوز کی بدولت اس کائنات میں یہ زندگی اور حرکت نظر

کس چیز نے تعمیل حکم سے باز رکھا؟ ابلیس نے جواب دیا کہ میری عقل نے مجھے بتایا کہ میں آدم سے افضل ہوں (دلیل یہ ہے کہ) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔ ۱۲

آتی ہے۔ میں ہی طوفانِ باد کو ۵۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے حرکت دیتا ہوں۔ اور میں ہی بجلی کی کڑک میں کارفرما ہوں۔

نوٹ:۔ اس شعر میں "سوز" سے سوزِ عشق مراد نہیں ہے۔ بلکہ ابلیسی فطرت جو سراپا آتش ہے۔۱۲

(۳) میری ہی بدولت ذراتِ مادی میں رابطہ اور عناصر اربعہ میں ضبط پایا جاتا ہے۔ یہ رابطہ اور ضابطہ میرے ہی دم سے قائم ہے۔ اگرچہ میں اپنی ذات کے اعتبار سے سراپا سوز (آتش) ہوں۔ لیکن کائنات میں "ساز" (ہم آہنگی) کی کیفیت بھی میں ہی پیدا کرتا ہوں نیز میں آتشِ مینا گر یعنی مقوّم کائنات ہوں۔

(۴) میری ہی بدولت کائنات میں کون و فساد کا سلسلہ جاری ہے۔ میں پرانی صورتوں کو مٹا کر ان کی جگہ نئی صورتیں پیدا کرتا رہتا ہوں۔

(۵) میرے ہی دریا کی روانی کا یہ نتیجہ ہے کہ آسمان گردشِ پیہم میں مصروف ہے۔ میری ذات، نقش گرِ کائنات ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس شعر میں ابلیس کو دریا اور چرخ کو موجۂ رلمرا سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اوّل الذکر مصدرِ حرکت ہے۔

(۶) ستاروں کا پیکر تیری وجہ سے ہے (یعنی تُو نے انھیں پیدا کیا ہے۔) مگر ان میں حرکت میری وجہ سے ہے۔ میں اس کائنات کی زندگی ہوں۔ بایں معنی کہ اگر میں نہ ہوں تو یہ کائنات معدوم تو نہیں ہو گی لیکن ساکن اور جامد ہو کر رہ جائے گی۔

(۷) اگر تو جسم میں روح پیدا کرتا ہے، تو میں اس روح میں گرمی اور ہنگامہ کی شان پیدا کرتا ہوں۔ اگر تو انسان میں حرکت پیدا کرتا ہے، تو میں اس کے اندر ولولہ اور جوشش و خروش پیدا کرتا ہوں۔

(۸) میرے مقابلہ میں آدم بہت پست فطرت ہے، اسی لیے اس نے فرشتوں (تنگ مایگان) کے سجدہ کی آرزو کی۔ لیکن میں ایسی ادنیٰ حرکات سے بہت بالاتر ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تیری صفات کا حامل

ہوں۔ مثلاً میں بھی تیری طرح قاہر ہوں، فرق یہ ہے کہ میں نے کوئی دوزخ نہیں بنائی اور میں بھی تیری طرح داور ہوں، یہ دوسری بات ہے کہ محشر برپا نہیں کروں گا۔ یعنی مجھ میں بھی ایک حد تک قہاری اور داوری کی صفات پائی جاتی ہیں۔

(۹) بلا شبہ تو نے آدم کو پیدا کیا ہے یعنی اس کا خالق تو ہی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ تیری قدرت کا یہ شاہکار میری نظر میں تو بالکل نہیں جچتا۔ اس کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے جو باعتبارِ اصل، ذلیل ہے اور اسی لیے وہ کوتاہ بین اور کم علم بلکہ جاہل ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہے اب وہ اپنی زندگی میرے حکم کے مطابق بسر کرے گا یعنی اس کو پیدا تو نے کیا ہے لیکن اس پر حکومت میں کروں گا!

نوٹ:۔ یہ گفتگو جس میں گستاخی اور بے ادبی کا رنگ نمایاں ہے ابلیس کی سیرت سے مطابقت کلی رکھتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ابلیس ہی کے دم سے یا اس کی کارفرمائی سے قائم ہے۔ بظاہر یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ ابلیس شہوت اور غضب کا مظہر ہے۔ اور انسان اگرچہ "طرفہ معجون" ہونے کی وجہ سے فرشتوں کی بعض صفات کا بھی حامل ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی زیادہ تر شہوت اور غضب ہی کے زیرِ اثر بسر کرتا ہے۔ یہ دونوں صفات ہر وقت کارفرما رہتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ صفات معطل ہو جائیں تو کچھ مدت کے بعد یہ حسین دنیا زندگی سے یکسر معریٰ ہو جائے گی۔ بلکہ بقولِ مومن "خوابِ عدم" میں چلی جائے گی۔

تیسرا بند

اغوائے آدم

ابلیس نے آدم سے کہا کہ

(۱) تو جنت میں راحت اور آرام (سکونِ دوام) کی زندگی بسر کر رہا ہے، بظاہر یہ زندگی بہت دلکش ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی زندگی جس میں انسان کبھی مخالف حالات کا مقابلہ کرے، کبھی موافق حالات کو خوش آمدید کہے۔ کبھی ناکامی سے دوچار ہو جائے۔ اور کبھی کامیابی سے ہمکنار ہو جائے، یعنی کبھی سوز (رنج) کی کیفیت طاری ہو۔ کبھی ساز (راحت) کی۔ یہ جدوجہد کی زندگی، جنتی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ مثلاً ایک فاختہ جال میں پھنس گئی۔ اگر وہ جال میں سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرے تو یقیناً کامیاب (شاہین) ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ ساکن پڑی رہے تو اس کی موت میں کوئی شک نہیں ہے۔ یعنی جدوجہد کرنے سے کمزور (فاختہ) طاقتور (شاہین) ہو جاتا ہے۔

(۲) تو رات دن نمازیں پڑھتا رہتا ہے، لیکن ان سجدوں سے تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اُٹھ اور سرگرم عمل ہو جا۔

(۳) چونکہ تجھے کوثر اور تسنیم بغیر مشقت حاصل ہو گئی ہیں، اس لیے تو عمل کی مسرت سے بیگانہ اور ناآشنا ہے۔ لہٰذا میں تجھ کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ حقیقی سرور اُس شراب سے حاصل ہوتا ہے جو ایک انسان اپنی قوّتِ بازو سے تیار کرے۔ وہ شراب جو تو انگور کی بیل سے خود کشید کرے گا، جنت کی شرابوں سے کہیں زیادہ کیف آور ہوگی۔

(۴) نیکی اور بدی کے یہ تصورات جو تیرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، یہ سب تیرے وہم کی پیداوار ہیں۔ تو اس بحث میں بالکل مت پڑ کہ فلاں کام اچھا ہے، فلاں کام بُرا ہے۔ بس تو عمل پر کمر باندھ لے! قدم اٹھا اور مقصد حاصل کر۔

(۵) اگر تو میرے مشورہ پر عمل کرے تو میں تجھ کو ایک نئی دُنیا سے روشناس کر سکتا ہوں اور میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ اس دنیا میں داخل ہو جانے کے بعد تیری زندگی میں ایک انقلاب عظیم رُونما ہو جائے گا۔

(۶) تو اس وقت ایک قطرۂ بے مایہ ہے۔ لیکن اگر تو کوشش کرے، تو بلاشبہ گوہر تابندہ بن سکتا ہے۔

(۷) تیرے اندر کائنات کو مسخر کرنے کی طاقت پوشیدہ ہے، لہٰذا تو جدوجہد کر اور اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا۔

(۸) تو شاہین ہے، اس لیے اس کنج عافیت سے باہر نکل اور دنیا پر حکومت کر۔ یاد رکھ باز کے لیے گوشہ نشینی بالآخر پیام موت بن جاتی ہے۔

(۹) تو ابھی تک اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہے کہ وصال کے بعد عشق ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر عشق ختم ہو جائے تو پھر عاشق (انسان) کی بقا کی کون سی صورت ممکن ہو سکتی ہے؟ اگر تو حیاتِ ابدی کا آرزومند ہے، تو اس کا طریق صرف یہ ہے کہ ہمیشہ جدوجہد میں مشغول رہ۔

نوٹ:۔ اس جگہ یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے کہ ابلیس کا کام تو بہکانا اور ورغلانا ہے۔ پھر اس نے آدم پر اس صداقتِ عظمیٰ کو کیوں اور کیسے آشکار کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ راستگوئی کے بغیر ابلیس اپنے مقصد (اغوا) میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس نے آدم کو بہکانے کے لیے فلسفیانہ قسم کا سچ بول دیا۔

چوتھا بند

تمہید | جب آدم نے ابلیس کا مشورہ قبول کر لیا، بالفاظِ دگر جب وہ بہشتی زندگی سے نکل کر دنیاوی یعنی سوز و ساز کی زندگی میں داخل ہو گیا،

تو اس کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ۔ وہی انقلاب جس کی پیشگوئی ابلیس نے کی تھی ۔ لہٰذا اس بند میں آدم ان تجربوں کا بیان کرتا ہے جو اسے اس نئی زندگی میں حاصل ہوئے ۔

ابلیس نے آدم سے کہا تھا کہ سوز و ساز کی زندگی ، سکون و دوام سے بہتر ہے ۔ چونکہ ابلیس کے تمام مشوروں کا بنیادی تصور اسی نکتہ میں مضمر ہے ۔ یعنی انقلاب کا دار و مدار ، زندگی سوز و ساز پر ہے ۔ اس لیے آدم نے اپنا سب سے پہلا تأثر یہی بیان کیا ہے کہ

ع چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن

یعنی بلاشبہ سوز و ساز کی زندگی نہایت دلکش ہے ۔ بلکہ زندگی کا سارا لطف اسی سوز و ساز میں پنہاں ہے ۔

واضح ہو کہ اقبال نے "سوز و ساز" کی ترکیب اپنی تمام تصانیف میں استعمال کی ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ان کی بڑی محبوب ترکیب ہے ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں لطفِ زندگی سوز و ساز پر موقوف ہے ۔ ذیل میں ان دونوں لفظوں کی تشریح لکھتا ہوں ۔

سوز (سوختن) کے معنی ہیں حرارت ، حمیت ، محبت ، اشتیاق اور ذہنی اضطراب وغیرہ ۔

ساز (ساختن) کے معنی ہیں ہم آہنگی ، موافقت ، مطابقت اور کسی بات یا معاملہ میں رضامندی کا اظہار وغیرہ ۔

سوز و ساز کے معنی ہیں کسی شدید جذبہ مثلاً رنج یا محبت سے متأثر یا مغلوب ہو جانا ، اصطلاحی معنی ہیں عاشقانہ زندگی ۔ اور اقبال نے اس ترکیب کو عموماً اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے ۔ اقبال چونکہ مسلکِ عشق کے علمبردار ہیں اور عاشقانہ زندگی انہی دو حالتوں کے مجموعہ کا نام ہے اسی لیے ان کے یہاں یہ ترکیب عام ہے اس کی تشریح یہ ہے ۔ کہ عاشق اپنے محبوب کے فراق میں جلتا ہے ۔ سُلگتا ہے ۔ ذہنی اضطراب میں مبتلا رہتا ہے ، اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرتا ہے ۔ یعنی ہر وقت اس کی جستجو کرتا ہے اور یہ جستجو

اُسے ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ "سوز" ان تمام کیفیات کا مظہر ہے۔

عاشق چونکہ ہر وقت جستجو میں سرگرم رہتا ہے، اس لیے اس سلسلہ میں جو حالات اور واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور جو مصائب اس پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور جو پریشانیاں لاحق حال ہوتی رہتی ہیں وہ بخوشی اور برضائے خود، ان تمام حالات و حادثات سے موافقت اور مطابقت کرتا رہتا ہے۔ "ساز" اس کے اس رجحانِ طبع کا مظہر ہے۔

یہ مسلّم ہے، کہ عاشق کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اس کی زندگی ختم ہو جائے گی (شوق میرد زوصل) لہٰذا اس کی ساری زندگی، سوز و سازہی میں بسر ہوتی ہے۔ اور اسی میں لطفِ زندگی مضمر ہے یہی حیاتِ دوام ہے۔

اس تشریح کے بعد اب اس بند کا مطلب بیان کرتا ہوں:۔

آدم کہتا ہے کہ سوز و ساز کی زندگی کتنی دلکش اور مفید ہے، کہ اس کی بدولت انسان

(۱) ساری کائنات (دلِ کوہ و دشت) کو متاثر کر سکتا ہے۔ اور تمام اشیائے کائنات سے حسبِ استطاعت فوائد حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) پابندِ قوانین فطرت اور مجبور ہونے کے باوجود، فوق العادت کارنامے دکھا سکتا ہے (قفس کنایہ ہے مجبوری سے) مثلاً ہوائی جہازوں اور دیگر آلاتِ ہیئت و نجوم اور ایجادات و اختراعات کے ذریعہ سے زمان و مکان پر حکمران ہو سکتا ہے۔

(۳) بلکہ عشقِ حقیقی (گداز پنہاں) اور اتباعِ شریعت (نیاز پیدا) کی بدولت معرفتِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ جو اس کی غایتِ تخلیق ہے اقبال نے اس کو "نظرے بحریم ناز" سے تعبیر کیا ہے۔

یعنی تصوف کے نکتہ کو شاعری کی زبان میں ادا کیا ہے پیامِ مشرق از اوّل تا آخر اس اسلوبِ بیان سے معمور ہے۔ لیکن میں بخوفِ

طوالت ہر جگہ اس بات کی صراحت نہیں کر سکتا اور نہ اس کی شاعرانہ خوبیوں کو واضح کر سکتا ہوں۔

(۴) کبھی تو ساری کائنات میں وحدت کا رنگ دیکھتا ہے یعنی اسے کثرت میں وحدت نظر آتی ہے اور کبھی وہ مختلف اشیاء میں امتیاز کرتا ہے یعنی وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھتا ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ جب انسان دنیا کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس کا خالق اللہ تعالیٰ ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے تو اُسے ہر شئے میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور جب وہ اسی دُنیا کو طالبِ حق (سائنسدان) کی حیثیت سے دیکھتا ہے تو وہ قدرتی طور پر خار و گل میں امتیاز کرتا ہے۔

(۵) زندگی سوز و ساز کے ثمرات بیان کرنے کے بعد آدم اس صداقت کا اعتراف کرتا ہے کہ اگرچہ میں حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں لیکن ہنوز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ اقبالؒ نے اسی بات کو سوزِ ناتمام سے تعبیر کیا ہے۔

چونکہ میں شیدِ جستجو ہوں، یعنی حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یقین کے بجائے گمان (شک) کا طریق اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اُس یقین کو جو مجھے جنّتی زندگی میں حاصل تھا، اِس دُنیا کے شک پر قربان کرتا ہوں۔

یہاں "یقین" سے انسانی ذہنیت کی وہ ابتدائی حالت مراد ہے جب اس میں تحقیق (جستجو) کا مادہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نکتہ کو اقبالؒ نے پیامِ مشرق کی ایک رباعی کے پہلے شعر میں بایں انداز بیان کیا ہے۔

ہمائے علم تا افتد بدامت
یقین کم کن گرفتارِ شکے باش

یعنی جو شخص علم حاصل کرنے کا خواہشمند ہو، اسے لازم ہے کہ یقین کے بجائے شک کا طریق اختیار کرے۔ اقبالؒ کا نظریہ یہ ہے کہ علم شک

سے پیدا ہوتا ہے۔ اور عمل، یقین سے۔

آخری بند

(۵) صبحِ قیامت

(آدم در حضورِ باری)

اے کہ ز خورشیدِ تو کوکبِ جاں مستنیر — از دمِ اُو ساختی شمعِ جہاں ضمیر
زیست ہنرہائے من بر کے تب و تاب — تیشۂ من آورد از جگرِ خارہ شیر
زہرہ گرفتارِ من، ماہ پرستارِ من — عقلِ کلاں کارِ من بہرِ جہاں دار و گیر
من بہ زمیں در شدم، من بہ فلک بر شدم — بستۂ جادوئے من ذرہ و مہرِ منیر
گرچہ فسونش مرا بُرد ز راہِ صواب — از غلطم در گذر، عذرِ گناہم پذیر
رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم — جز بہ کمندِ نیاز ناز نگردد اسیر
تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز — بستنِ زنّارِ او بود مرا ناگزیر

عقل بہ دام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

تمہید اس بند میں اقبال نے تمثیلی انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگر آدم سے یہ لغزش سرزد نہ ہوتی، تو وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ کبھی بھی اس کائنات کو مسخر نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل اس نے نافرمانی کے پردہ میں اپنی قوتِ اختیار کو استعمال کیا اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے قصور کو معاف کر دیا۔

فی الجملہ جب آدم کو یہ احساس ہوا کہ مَیں نے نافرمانی کی ہے تو اُس نے بایں الفاظ معذرت پیش کی کہ اے خدا! میں بصد خلوص تیری عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تو نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عقل و فہم کی روشنی عطا فرمائی، جس کی بدولت میں نے اس تیرہ و تار کائنات کو منور کر دیا۔ اور اسی عقل کی بدولت میں نے اس دُنیا کا دامن ایجادات اور اختراعات کے موتیوں سے بھر دیا۔ مَیں نے کوہ و دشت و صحرا، ریگستان و برفستان و دریا، عناصرِ اربعہ اور شمس و قمر غرضکہ ساری کائنات کو اپنا خادم بنا لیا۔ آج میری عقل

کلاں کار (ماہر فن، نکتہ شناش، چابک دست) اس ساری کائنات پر حکمران ہے۔ میں نے زمین کے اندر سے پوشیدہ خزانے باہر نکالے (لعل و گوہر بلکہ پیٹرول جس پر موجودہ تہذیب کا دارومدار ہے) میں نے رصدگاہیں تعمیر کیں، اجرام فلکی کے اسرار دریافت کئے۔ روشنی کی رفتار ناپی، بلکہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا۔ آج ذرہ سے لے کر مہر منیر تک ہر شئے میرے زیر نگیں ہے۔

اے خدا! میں معترف ہوں کہ ابلیس کے افسوں (نافرمانی کے داعیہ) نے مجھے صحیح راستہ سے ہٹا دیا۔ اس لیے میں تجھ سے معافی کا طلبگار ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر میں اس کا کہنا نہ مانتا (اپنی قوتِ ارادی اور اختیار سے کام نہ لیتا) تو یہ کائنات مسخر نہیں ہو سکتی تھی جب تک میں اس کائنات (ناز) کو حاصل (مسخر) کرنے کے لیے اپنی قوتِ ارادی اور اختیار (نیاز) سے کام نہ لیتا۔ اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اے خدا! جب تک عاشق شیوۂ نیازمندی اختیار نہ کرے معشوق کس طرح رام (اسیر) ہو سکتا ہے؛ چونکہ میں کائنات (بتِ سنگین) کو مسخر کرنا چاہتا تھا، اس لیے مصلحتاً میں نے ابلیس کی بات مان لی۔

نوٹ: "بستنِ زنارِ او" کنایہ ہے ابلیس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے۔

آخری شعر میں اقبال نے اس نظم کا خلاصہ بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے اور یہ وہ جوہر گراں مایہ ہے کہ اس کی بدولت انسان نے فطرتِ چالاک (کائنات) کو مسخر کر لیا۔ یعنی آج ابلیس (اہرمنِ شعلہ زاد) آدم کے سامنے سربسجود ہے۔

بوئے گل

حورے بکنجِ گلشنِ جنت تپید و گفت — مارا کسے ز آنسوئے گردوں خبر نداد
ناید بفہمِ من سحر و شام و روز و شب — عقلم بہ پیچ و تاب کہ گویند مرد و زاد
گردید موجِ نکہتے و از شاخِ گل دمید — پا در جہانِ عالمِ فردا و دی نہاد
وا کرد چشمِ غنچہ و شد و زد تبسمے — گل گشت و برگ برگ شد و بر زمیں فتاد

آں نازنیں کہ بند ز پایش کشادہ اند
آہے است یادگار کہ او ہم سراو داد

تمہید یہ ایک دلکش تخیلی نظم ہے جس میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ پھول میں خوشبو کہاں سے آئی۔

مطلب ایک دن جنت میں ایک حُور کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آج تک کسی نے مجھے دنیا کی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا۔ میں سُنتی ہوں کہ دُنیا ایسی جگہ ہے جہاں صبح و شام بھی ہوتی ہے اور رات اور دن بھی ہوتا ہے۔ نہ میں تبدیلیٔ اوقات کو سمجھ سکتی ہوں۔ اور نہ یہ بات میری عقل میں آتی ہے کہ وہاں لوگ پیدا ہوتے ہیں، پھر مر جاتے ہیں۔ جنت میں تو نہ کوئی پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے اور نہ یہاں کبھی دن ہوتا ہے نہ رات ہوتی ہے۔ لہٰذا میں خود دُنیا میں جاؤں تو معلوم ہو کہ یہ دن اور رات کیا ہے۔ اور مرنا جینا کسے کہتے ہیں!

یہ سوچ کر وہ حُور خوشبو بن گئی اور دنیا میں آکر شاخِ گل میں پنہاں ہوگئی۔ وہاں سے وہ غنچہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ بعد ازاں پھول بن گئی۔ شگفتہ ہوئی اور پھر پتیوں کی شکل میں زمین پر گر پڑی، جب قید ہستی سے آزاد ہوئی، تو بوقتِ رخصت اس نے ایک آہ اپنے سینہ سے کھینچی، یہ اس کی آہ ہے جسے ہم لوگ خوشبو کہتے ہیں۔

مطلب اس نظم کا یہ ہے کہ شاعر کی نگاہ میں خوشبو ایک لطیف آسمانی جوہر ہے جو مادہ سے پاک ہے۔

نوائے وقت

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم
در من نگری، ہیچم، در خود نگری، جانم
در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم
من دردم و درمانم، من عیشِ فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری، مشتے ز غبارِ من
ہنگامۂ افرنگی، یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ او، از نقش و نگارِ من
خونِ جگرِ مرداں، سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم، من روضۂ رضوانم

آسودہ و سیارم، ایں طرفہ تماشا بیں
در بادۂ امروزم، کیفیتِ فردا بیں
پنہاں بہ ضمیرِ من، صد عالمِ رعنا بیں
صد کوکبِ غلطاں بیں، صد گنبدِ خضرا بیں
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم

تقدیر فسونِ من، تدبیر فسونِ تو
تو عاشقِ لیلائی، من دشتِ جنونِ تو
چوں روحِ رواں پاکم، از چند و چگونِ تو
تو رازِ درونِ من، من رازِ درونِ تو
از جانِ تو پیدایم، در جانِ تو پنہانم

من رہرو و تو منزل، من مزرع و تو حاصل
تو سازِ صد آہنگی، تو گرمیِ ایں محفل
آوارۂ آب و گل، دریاب مقامِ دل
گنجیدہ بہ جامے بیں، ایں قلزمِ بے ساحل
از موجِ بلندِ تو، سر بر زدہ طوفانم

تمہید اقبال نے اس موضوع (ماہیتِ زمان) پر اسرارِ خودی کے علاوہ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنے خطباتِ مدراس میں اظہارِ خیالات کیا ہے۔ نظمِ زیرِ نظر کو سمجھنے کے لیے ان تمام تصانیف اور خصوصاً خطباتِ مدراس کا مطالعہ لازمی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ خطبات کے بعد اس نظم میں اقبال نے اس مسئلہ پر اپنے خیالات کو بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

میں نے اسرارِ خودی کی شرح میں زمان کے بارہ میں قدما اور متاخرین حکما اور اقبال کے نظریات کو اختصاراً بیان کر دیا ہے۔ جن اصحاب کو اس مسئلہ سے دلچسپی ہو، وہ اس شرح کے صفحات از صفحہ ۴۷۸ تا صفحہ ۴۸۰ کا بغور مطالعہ کر لیں۔ میں اس جگہ زمان پر صرف اقبال کے افکار کا خلاصہ لکھے دیتا ہوں۔ تفصیل کے لیے خطباتِ مدراس صـ ۴۴ تا ۶۵ و صـ ۶۹ تا ۷۳ و صـ ۱۲۶ تا ۱۳۱ کا مطالعہ کر لیں۔

واضح ہو کہ اقبال نے اپنی تصانیف میں زمان (وقت) کے تین مختلف مفہوم بیان کئے ہیں:۔

(۱) پہلا مفہوم یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے اعتبار سے زمان و مکان بلکہ ساری کائنات میں کسی شئے کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ چنانچہ ضربِ کلیم میں لکھتے ہیں ؎

خودی ہو تو ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لآ اِلٰہَ اِلاّ اللہ

(۲) زمان کا دوسرا مفہوم وہ ہے جسے اقبال زمانِ مسلسل (SERIAL TIME) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ زمانہ جسے ہم ماضی، حال اور استقبال میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی کو عرفِ عام میں وقت کہتے ہیں۔ اقبال کی رائے میں یہ زمان، غیر حقیقی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس تعبیر سے کسی جگہ کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔ یعنی ان کو زمانہ کے اس مفہوم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اقبال کی رائے میں زمان کے اس مفہوم کا تعلق ہماری خودی کے اُس پہلو سے ہے جسے وہ مؤثر خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ گلشنِ رازِ جدید میں لکھتے ہیں ؎

خودو در لامکاں طرحِ مکاں بست ٭ چو زنارے زماں را بر میاں بست
زماں را در ضمیر خود ندیدم ! ٭ مہ و سال و شب و روز آفریدم

(۳) زماں کا تیسرا مفہوم وہ ہے جسے وہ حقیقی زماں سے تعبیر کرتے ہیں جس کا تعلق مؤثر خودی کے بجائے قدر آفریں خودی سے ہے۔ یہ وہ زماں ہے جو خارج میں موجود نہیں ہے بلکہ ہمارے ضمیر میں پوشیدہ ہے جیسا کہ اس مصرع سے ہویدا ہے:۔

زماں را در ضمیر خود ندیدم

حقیقی زماں، مرورِ محض ہے۔ جس میں نہ دن ہے نہ رات، چنانچہ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں:۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانہ کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:-

(ا) حقیقی زمان، جس کا احساس ہمیں اپنے تجربات شعوری کے تجربہ سے ہوتا ہے، آنات (لمحات) کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا عضوی کل (ORGANIC WHOLE) ہے جس میں ماضی حال سے اور حال مستقبل سے منقطع نہیں ہوتا۔

(ب) اسی زمانِ خالص (DURATION) کو قرآنِ حکیم نے تقدیرِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے (ذٰلک تقدیر العزیز الحکیم)

(ج) زمان بحیثیت تقدیر، صورت گر اشیائے کائنات ہے۔

(د) حقیقی زمان میں زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تخلیقی فاعلیت کا اظہار کریں۔

(ہ) زمانِ حقیقی، دراصل انائے مطلق کی شئونِ متکثرہ میں سے ایک شان ہے، جس کا زمانِ مسلسل (شب و روز) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اقبال نے اس نظم میں زمان سے بہت سی خدائی صفات منسوب کر دی ہیں۔ بلکہ ایک جگہ اسے "پیراہنِ یزدان" سے بھی تعبیر کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک زمانِ حقیقی دراصل استمرارِ شئونِ باری تعالٰے کا دوسرا نام ہے۔ یعنی خدا ہر وقت اور ہر آن جلوہ گری میں مصروف ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کی اس آیت سے ثابت ہے:-

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ - (۵۵: ۲۹)

اقبال کے نزدیک "زمان" انہی شئون کے استمرار (ظہورِ مسلسل) کا دوسرا نام ہے

اقبال کے اس تصور کا ماخذ وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ زمانہ، خدا کی تخلیقی فاعلیت کا دوسرا نام ہے

یُؤْذِیْنِی ابْنُ اٰدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ " یعنی اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ جب انسان دہر (زمان یا وقت) کو بُرا کہتا ہے۔ تو وہ مجھے ایذا دیتا ہے، کیونکہ دہر میں ہی ہوں۔ یعنی جسے تم زمانہ کہتے ہو، وہ میری ہی ایک صفت یا شان ہے۔ زمانہ کے پردہ میں مَیں ہی فاعل اور مؤثر ہوں۔

اس نظم میں وقت (زمان یا دہر) انسان سے خطاب کر رہا ہے کہ میں استمرار شؤنِ باری تعالےٰ کا دوسرا نام ہوں۔ اس لیے

(۱) خورشید اور انجم یعنی ساری کائنات میرے قبضۂ قدرت اور وسعت تصرف میں ہے۔ یعنی میں ساری کائنات پر حکمران ہوں۔

اگر تو میری حقیقت پر غور کرے گا، تو تجھے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ مَیں بذاتِ خود، تیرے حواس کی دسترس سے بالاتر ہوں۔ لیکن اگر تو اپنی حقیقت پر غور کرے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میں تیری زندگی ہوں تو میرے ہی دم سے زندہ ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس آیت کی طرف :۔ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ - اور میں نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا۔ (۱۵ : ۲۹)

چونکہ دہر (وقت) کو حدیث میں خدا نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔ اس لیے دہر کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ انسان سے یہ کہہ سکے کہ میں ہی تیری زندگی ہوں۔

نوٹ :۔ اقبال نے اسرار خودی میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ زمانہ زندگی ہے، اور زندگی زمانہ ہے۔

زندگی دہر است و دہر از زندگی است
"لاتسبوا الدہر" فرمان نبی است

مَیں ہی درد ہوں، مَیں ہی درماں ہوں، مَیں ہی رنج ہوں، مَیں ہی راحت ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ مَیں ہی مارتا ہوں، مَیں ہی جلاتا ہوں۔ مَیں ہی زندگی ہوں، مَیں ہی موت ہوں۔

(۲) چنگیز، تیمور، اور افرنگ کے ہنگامے میرے ہی پیدا کردہ ہیں۔ انسان

اور جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے، یہ سب میری ہی کارفرمائی ہے۔ بہادروں کا خونِ جگر (میدانِ جنگ) میری رونق کا باعث ہوتا ہے، میں ہی دوزخ ہوں، میں ہی جنت ہوں۔

(۳) میں صفاتِ متضادہ کا حامل ہوں۔ مجھ میں آسودگی (سکون) بھی ہے اور حرکت بھی ہے یعنی میں ہی خالقِ حرکت و سکون ہوں حرکت اور سکون زمانہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زمانہ، خدا کی جلوہ گری (تخلیق فاعلیت) کا دوسرا نام ہے۔ میرے امروز میں مستقبل کا نقشہ نظر آسکتا ہے یعنی خدا کے لیے، ماضی، حال اور مستقبل تینوں یکساں ہیں۔ میرے ضمیر میں صدہا جہان پوشیدہ ہیں میں انسان اور یزدان دونوں کے لیے بمنزلۂ لباس ہوں یعنی خدا کی خدائی کا اظہار میری ہی وساطت سے ہوتا ہے اور انسان بھی زمان و مکان ہی کی قید میں رہ کر روحانی ترقی کرتا ہے۔

(۴) جسے تو تقدیر کہتا ہے، وہ میرے ہی ایک مخصوص فعل کا دوسرا نام ہے (اس میں اشارہ ہے اس آیت کی طرف:-
(فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا) بالفاظِ دگر میں نے اپنی ایک صفت کا نام تقدیر رکھ دیا ہے۔ یہ تقدیر میرا فعل ہے اور تدبیر، یہ تیرا فعل ہے۔ اور چونکہ میری تقدیر تیری تدبیر پر ہمیشہ غالب رہتی ہے، اس لیے تو ہمیشہ تقدیر (الٰہی) کے سامنے سربسجود رہتا ہے اگر مثال درکار ہو تو امیر امان اللہ خاں اور رضا شاہ پہلوی کی زندگی کا مطالعہ کر لیا جائے، تو حق تعالےٰ (لیلیٰ) کا عاشق ہے اور میں تیرے لیے بمنزلہ میدان (دشت) ہوں۔ جس میں تو حصولِ محبوب کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

میں تیری روح کی طرح تیرے وضع کردہ مقولات منطقی (چند و چگوں) کی حد سے بالاتر ہوں۔ یعنی عقل انسانی، زمانِ حقیقی کا ادراک نہیں کر

سکتی۔ تو میری حقیقت (رازِ درون) ہے۔ اور میں تیری اصلیت ہوں، لہٰذا ثابت ہوا کہ زمان کی حقیقت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے، جو اپنی حقیقت (خودی) سے آگاہ ہو۔ اور جو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اپنے خدا کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔ (لہٰذا خدا، خودی اور زمانہ تینوں ایک ہی حقیقت کے تین مختلف پہلو ہیں)۔

اے انسان! میں تجھ ہی سے ظاہر ہوتا ہوں یعنی تجھ ہی سے میرا وجود متحقق ہوتا ہے۔ اور میں تجھ ہی میں پوشیدہ ہوں۔ پس اگر تُو میری حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، تو اپنی معرفت حاصل کر۔

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

(۵) اے انسان! حقیقتِ حال یہ ہے کہ میں رہرو ہوں اور تو منزل ہے، یعنی تو جو کچھ کرتا ہے یہ دراصل میری ہی تخلیقی فاعلیت ہے جو تیرے واسطے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تو میری منزل مقصود ہے یعنی میں تجھے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کے لیے جلوہ گری میں مصروف ہوں، اگر مجھ کو مزرع سے تشبیہ دی جائے تو تیری ذات اُس مزرع کا حاصل (ثمرہ) ہے۔ یعنی تیری ذات میری جلوہ گری (فاعلیت) کا مقصود ہے۔

اگر مجھے سازِ صد آہنگ سے تشبیہ دی جائے تو تیری ذات گرمیٔ محفل کی مصداق ہے۔ یعنی میں اسی لیے ہر قسم کی فاعلیت میں مصروف ہوں کہ تو مرتبۂ کمال کو پہنچ سکے۔ جس طرح ساز کا مقصد یہ ہے کہ سامع پر حالتِ وجد طاری ہو جائے۔ اسی طرح میرے وجود کا مقصد یہ ہے کہ تو گرمیٔ محفل بن جائے یعنی تسخیرِ کائنات میں مشغول ہو جائے۔

اے انسان! افسوس ہے کہ تو اس عالمِ مادی میں گرفتار ہے (آوارۂ آب و گل) حالانکہ تیرا فرضِ منصبی یہ ہے کہ تو اپنے وطن (دل) کی طرف متوجہ ہو۔ اور اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچائے کیونکہ تیرا دل (جام) اس قدر وسیع ہے کہ یہ ساری کائنات (قلزمِ بے ساحل) اس میں

سما سکتی ہے۔ یاد رکھ! میرا وجود (طوفان) تیری ہی جد و جہد و موجِ بلند سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر تو اپنی خودی کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچائے گا، تو میرا وجود تجھ پر آشکار نہیں ہو سکے گا۔

فصلِ بہار

۱

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنم ہزار
طوطی و دراج و سار
بر طرفِ جویبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

۲

خیز کہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید
بادِ بہاراں وزید
مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسنِ گلِ تازہ چید
عشق غمِ نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید

۳

بلبلکاں در صفیر، صلصلکاں در خروش
خونِ چمن گرم جوش
اے کہ نشینی خموش
در شکن آئینِ ہوش
بادۂ سنجیدہ نوش
نغمہ سرا گل بپوش
بلبلکاں در صفیر، صلصلکاں در خروش

۴

حجرہ نشینی گذار، گوشۂ صحرا گزیں

بر لبِ جوئے نشیں
آبِ رواں را ببیں
نرگسِ ناز آفریں
لختِ دل افروز بیں
بوسہ زنش بر جبیں
بہو نشینی کنار، گوشۂ صحرا گزیں

۵

دیدۂ معنی گشا، اے ز عیاں بے خبر
لالہ کمر در کمر
نیزۂ آتش بہ بر
نی بکشش بر جگر
شبنم اشک سحر
در شفق انجم نگر
دیدۂ معنی گشا، اے ز عیاں بے خبر

۶

خاکِ چمن وانمود، رازِ دلِ کائنات
بود و نبود صفات
جلوہ گریہائے ذات
آنچہ تو دانی حیات
آنچہ تو خوانی ممات
ہیچ ندارد ثبات
خاکِ چمن وانمود، رازِ دلِ کائنات

تمہید یہ ایک دلکش بہاریہ نظم ہے جس میں شاعری اور موسیقی دونوں ملی ہوئی ہیں۔ شاعر نے لفظوں کے ذریعہ سے موسمِ بہار کی تصویر کھینچی ہے اور انسانوں کو مطالعہ فطرت کی دعوت دی ہے۔

پہلا بند اے مخاطب! میں تجھے مژدۂ بہار سناتا ہوں۔ دیکھ! صحرا اور کوہستان میں ہر طرف بہار کا سماں چھایا ہوا ہے۔ بلبل (ہزار)، طوطی، تیتر اور مرغ سیاہ (سار[1]) بہار کی خوشی میں گا نا گا رہے ہیں۔ اور نہروں کے کنارے کنارے مختلف اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ اے مخاطب! ان دلکش قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے

---

[1] سار بمعنی مرغ سیاہ رنگ، خوش آواز کہ خالہائے سفید دارد (غیاث)

کے لیے نگاہ پیدا کر۔

دوسرا بند باغ اور صحرا ہر جگہ پھول کھلے ہوئے ہیں، بادِ بہاری چل رہی ہے۔ پرندے گا رہے ہیں۔ گُل لالہ پر مستی کا عالم طاری ہے۔ دیکتا یہ ہے دلکشی اور شادابی سے حسینانِ چمن نے اپنی دلکشی اور آرائش میں اضافہ کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے مرغانِ چمن کے جذبات میں ہیجان برپا ہو گیا ہے۔

تیسرا بند بلبل نغمہ سرا ہے۔ فاختہ مُصلصل اسرگرم نوا ہے۔ سارے چمن پر مستی کا عالم چھایا ہوا ہے۔ اے مخاطب! کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ایسے دلفریب موسم میں بھی تو خاموش اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُٹھ! سنجیدگی کے دائرہ سے باہر نکل! مستوں کی جماعت میں شامل ہو کر معرفت کی شراب پی۔ یعنی کائنات کا مطالعہ کر تاکہ تیرے اندر خالقِ کائنات کی ہستی پر ایمان پیدا ہو۔ باغ میں چل! نغمہ سرائی کر! پھولوں سے لطف اندوز ہو!

چوتھا بند اے مخاطب! حجرے سے باہر نکل! مناظرِ فطرت کا مشاہدہ کر! صحرا میں قیام کر! نہر کے کنارے بیٹھ کر آبِ رواں کا نظارہ کر! دیکھ! نرگس دلنواز، جو موسمِ بہار کی جان ہے، جھک کر اس کی پیشانی کو چوم رہی ہے۔

پانچواں بند اے مخاطب! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تو اپنے ماحول رعیاں) سے بیگانہ ہے! ظاہری آنکھوں کے علاوہ دل کی آنکھیں بھی کھول! تاکہ تو فطرت کی جلوہ گری سے لطف اندوز ہو سکے۔ دیکھ تو سہی! لالہ کے پھول کس کثرت سے کھلے ہوئے ہیں (کمر دیکتا یہ ہے قربت اور کثرت سے) اور سب سرخ رنگ کی صدری پہنے ہوئے ہیں اور اُن پر شبنم ٹپک رہی ہے، جو دراصل اشکِ سحر ہے۔ گُلِ لالہ کی سرخ پتیوں پر شبنم کے قطرے ایسے چمک رہے ہیں، جیسے شفق میں ستارے۔

چھٹا بند اس بند میں شاعری کے ساتھ ساتھ فلسفۂ وحدت الوجود کا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ اور شاعری اور فلسفہ کا امتزاج کلامِ اقبال کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے کہتے ہیں کہ باغ کی مٹی نے رنگا رنگ پھول اُگا کر کائنات کے باطن کو آشکار کر دیا۔ یعنی موسمِ بہار میں وہ تمام خوبیاں عیاں ہو جاتی ہیں، جو خاکِ چمن میں پوشیدہ ہیں۔

اے مخاطب! صفاتِ الٰہی کی یہ پیہم بادہ گری یعنی تجلیاتِ باری کا یہ مسلسل ظہور (بود) اور انہی تجلیات کا استتار یعنی کچھ عرصہ کے لیے رک جانا (نبود) یہ کیا ہے؟ یہ سب ذات (حق تعالیٰ) کی جلوہ گری ہے اور اسی کا دوسرا نام حیات، اور ممات ہے۔ یعنی جب ذاتِ حق اپنی کے علاوہ اور کوئی شئے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔ صفات کی جلوہ گری کرتی ہے، تو زندگی رُونما ہو جاتی ہے (اسی کا نام حیات ہے) اور جب ذات کی یہ جلوہ ریزیاں (تجلیات) رُک جاتی ہیں، تو موت وارد ہو جاتی ہے (اسی کا نام ممات ہے)۔ وگرنہ جسے انسان اپنی نادانی کی بنا پر حیات و ممات سمجھتا ہے، اس کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے۔ ظہورِ تجلیات، حیات ہے۔ استتارِ تجلیات، ممات ہے۔

نوٹ:۔ انسان اپنی کوتاہ فہمی اور غلط بینی کی وجہ سے واسطہ کو فاعل حقیقی سمجھتا ہے، حالانکہ ذاتِ مطلق کے علاوہ اور کوئی فاعل حقیقی نہیں ہے (لافاعلَ فی الحقیقۃِ اِلَّا اللّٰہ) مثلاً جب زید مرتا ہے تو انسان یہ کہتا ہے کہ اسے بخار آیا تھا اس لیے مر گیا۔ یا بکر کے گولی لگ گئی اس لیے مر گیا۔ یعنی بخار یا گولی کو فاعل سمجھتا ہے، حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ زید و بکر کی موت کا باعث یہ ہے کہ صفتِ قیومیت کی تجلی رُک گئی۔ جس طرح فلمی ریل کی تجلی رُک جاتی ہے، تو پردۂ فلمی پر کچھ باقی نہیں رہتا۔ ۱۲

حیاتِ جاوید

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتواں زیست — قبائے زندگیش از دمِ صبا چاک است
اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوے و مگیر — دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است
بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

تمہید اقبال نے اس نظم میں ابدی زندگی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنے دل کی آرزو یعنی کسی نصب العین کو حاصل کرنے کی آرزو سے آباد کرو۔ اس موضوع پر انہوں نے اسرارِ خودی میں بہت تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیالات کیا ہے ایک شعر ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

مطلب کہتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ پیرِ مغاں، جس قدر شراب اُسے
(۱) کشید کرنی تھی، وہ سب کشید کر چکا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ انگور کی بیل میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں اقسام کی شرابیں پوشیدہ ہیں۔ جن کا مزہ تم نے ابھی تک نہیں چکھا۔ یعنی تم یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تخلیق سے فارغ ہو چکا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں تمہاری زندگی (تاک) میں ابھی بہت سی منزلیں (بادہ) ایسی پوشیدہ ہیں، جن سے تم بالکل آشنا نہیں ہو۔ بالفاظِ دگر تم یہ مت سمجھو کہ موت تمہاری زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔ نہیں تم مر کر پھر زندہ ہو گے۔ اور اگر تم کوشش کرو، تو حیاتِ ابدی حاصل کر سکتے ہو۔

(۲) بیشک یہ دُنیا (چمن) بہت دلکش مقام ہے۔ لیکن تم غنچہ کی طرح زندگی مت بسر کرو کہ ہوا کا ایک جھونکا اس کی پتیوں کو منتشر کر دیتا ہے۔ یعنی جس شخص کی خودی غنچہ کی طرح ضعیف ہو اُسے حیاتِ ابدی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ نعمت اس کو حاصل ہو سکتی

ہے جو اپنی خودی کو پہاڑ کی طرح مضبوط کرے)

(۳) اگر تم زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہو، تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دل کو آرزو سے مالامال کرو گے، کیونکہ جو دل آرزو کی نعمت سے محروم ہے، اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔

(۴) اگر حیاتِ جاوید کے طلبگار ہو تو اپنی خودی کو پہاڑ کی طرح مجتمع (فخرندہ) اور مستحکم بنالو۔ پہاڑ کی طرح زندگی بسر کرو۔ جسے کوئی طاقت اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ خس و خاشاک کی طرح زندگی مت بسر کرو۔

کیونکہ ہوا تیز ہے اور شعلہ بیباک ہے، (یعنی دشمن (شعلہ) تمہیں مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ اس لیے تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا اور تمہارے حاسدین کا گروہ (ہوا) اس کی امداد کرنے پر ہر وقت آمادہ ہے۔

افکارِ انجم

۱

شنیدم کوکبے با کوکبے گفت — کہ در بحرِ وجود پیدا حدے نیست

سفر اندر سرشتِ ما نہادند — ولے این کاروان را منزلے نیست

۲

اگر انجم بہ شستے کہ بود است — ازل دیرینہ تا بیدا چہ سود است

مرا فرقت ازین کند روزگار دیر — خوش آنکس کہ محروم وجود است

۳

کسے این بارِ گراں را بر نتابد — ز بود ما نبود ما حباباں بہ

فضائے نیلگوں خوش نیاید — ز جنبش پستی آں خاکداں بہ

۴

خنک انساں کہ جانش بیقرار است — سوارِ راہوارِ روزگار است

قبائے زندگی بر قامتش راست — کہ او نو آفرینِ آیندہ کار است

تمہید اس نظم میں اقبال نے ستاروں کی زبان سے حضرتِ انسان کی عظمت اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کو واضح کیا ہے کہ اس میں تخلیق کی قوت پائی جاتی ہے اور اس وصف میں کوئی مخلوق اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ ع

مگر با ایزد انباز است آدم

مطلب ایک دن ایک ستارے نے دوسرے ستارے سے کہا کہ ہم غیر محدود فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہم ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنی منزلِ مقصود کا کچھ پتہ نہیں ہے۔

ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں کروڑوں سال پہلے تھے، اندریں حالات ہمیں اپنی چمک دمک سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے!

ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم قوانینِ فطرت کے پابند ہیں اور سراپا مجبور ہیں۔ ہمیں اپنے موجود ہونے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ ہم سے تو وہی اچھے ہیں جو خوابِ عدم میں آرام کر رہے ہیں۔

یہ زندگی، یہ رات دن کا مسلسل سفر، جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام، ہم تو اس حالت کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری ہستی سے تو نیستی اچھی، مجھے تو یہ نیلگوں فضا مطلق پسند نہیں آتی۔ اس کی بلندی سے دنیا کی پستی بدرجہا بہتر ہے۔

مبارک ہے اور خوش قسمت ہے انسان کہ اس میں جستجو کی صفت پائی جاتی ہے جس کی بدولت وہ اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا رہتا ہے۔ ہم اسیرِ روزگار ہیں لیکن وہ روزگار پر حکمران ہے۔ سچ پوچھو تو زندگی کا اطلاق اسی پر درست ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ یعنی وہ نت نئی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے اور کائنات کے پوشیدہ اسرار ظاہر کرتا رہتا ہے۔

زندگی

شبے زار نالید ابرِ بہار — کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر و گفت — خطا کردۂ خندۂ یکدم است
ندانم بہ گلشن کہ برد ایں خبر
سخن ہا میانِ گل و شبنم است

تمہید اس مختصر نظم میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ زندگی کی ماہیت کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ہر شخص زندگی کو اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لہذا ہر شخص کا نظریہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، جس شخص کو راحت نصیب ہو گئی وہ یہ سمجھتا ہے کہ زندگی راحت کا نام ہے۔ لیکن جو شخص مصائب میں گرفتار ہے وہ زندگی کو مصیبت خیال کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زندگی سے متعلق نظریات کا اختلاف کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

اکبر الہ آبادی نے اس خیال کو یوں بیان کیا ہے:۔

یعنی اگر تو اپنے علم کو اپنے نفس کے تابع کر دے گا، تو تیرا علم و فضل تیرے حق میں وبال بن جائے گا۔ لیکن اگر تو اسے اپنے دل (روحِ الٰہی) کے تابع کر دے گا، تو تیرے حق میں بلکہ ساری دنیا کے حق میں رحمت بن جائے گا۔

اقبال نے لفظ "محاورہ" کو یہاں کلمہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عربی زبان میں اس کے یہی معنی ہیں۔

پہلا بند علم نے کہا کہ میں ہفت اقلیم (صفات) اور عناصر اربعہ (چار) دونوں کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوں۔ یعنی ساری کائنات پر میرا سکہ رواں ہے۔ میں عالم ناسوت (دنیا یں سو) ہی میں غور و فکر کرتا ہوں۔ کیونکہ کارکنانِ قضا و قدر نے مجھ کو اسی مادی عالم سے وابستہ کر دیا ہے جو محسوس و مشہود ہے، مجھے عالم لاہوت (خدا، فرشتے، ارواح) سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میرے ساز (معلومات کا سرمایہ) سے سیکڑوں نغمے (علوم) نکلتے ہیں اور میں سرمایۂ

معلومات یا انکشافات و نتائج تحقیقات کو ہمیشہ عام کرتا رہتا ہوں۔
یا لفاظِ دگر میرے یہاں ایسی کوئی تعلیم نہیں ہے جو مخفی طور پر حجرہ کا دروازہ بند کر کے تلقین کی جاتی ہو، یا صرف خاص خاص مریدوں کو بتائی جاتی ہو۔ میرے یہاں تو ہر بات الم نشرح ہے۔ ہر نئی تحقیق اخبارات میں شائع ہو جاتی ہے۔

دُوسرا بند یہ سُن کر عشق نے کہا کہ اے علم! میں تیرے عیارانہ طور طریقوں سے بخوبی واقف ہوں۔ تُو وہ آفت کا پرکالہ ہے کہ پانی میں آگ لگا سکتا ہے، قانونِ قدرت تو یہ ہے کہ دریا سے

دُنیا میں جسے جو پیش آیا اکبرؔ
بس اُس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

مطلب ایک رات ابرِ بہار نے رو رو کر یہ بات کہی کہ زندگی گریۂ پیہم کا نام ہے (شاعر نے بارش کو گریۂ ابر سے تعبیر کیا ہے)
یہ سُن کر برقِ تیز رفتار چمکی اور بولی کہ غلط کہا۔ زندگی، خندۂ یکدم کا نام ہے (شاعر نے بجلی کی چمک کو خندہ سے تعبیر کیا ہے)۔
خدا معلوم اس مکالمہ کی اطلاع گلشن میں کس طرح پہنچ گئی کہ گل اور شبنم میں بھی اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یعنی گل کہتا ہے کہ زندگی خندۂ یکدم کا نام ہے۔ اور شبنم اس کی تردید کر رہی ہے کہ نہیں، زندگی گریۂ پیہم کا نام ہے۔

محاورہ علم و عشق

علم

نگاہم راز دارِ ہفت و چار است
گرفتارِ کمندم روزگار است
جہان بینم بایں سو باز کردند
مرا با نیمۂ دیگر چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم
بہ بازار افگنم رازے کہ دارم

عشق

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است　　ہوا آتش گذار و زہر دار است
چو با من یار بودی نور بودی　　بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی
ولیکن در نخِ شیطاں فتادی

بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز　　جہانِ پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر　　تہِ گردوں بہشتِ جاوداں ساز
ز روزِ آفرینش ہمدم استیم
ہماں یک نغمہ را زیر و بم استیم

تمہید اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ علم بھی ایک قابلِ قدر شئے ہے۔ لیکن اگر وہ تابعِ عشق نہ ہو تو اس کا وجود دنیا والوں کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر ہو جاتا ہے۔ یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تمام تصانیف میں اس نکتہ کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ ماخذ اس تصور کا مرشد رومیؒ کا یہ شعر ہے:-

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

موجیں بلند ہوتی ہیں۔ لیکن تو انسانوں کو ایسی قوت عطا کر سکتا ہے کہ وہ دریاؤں سے شعلہ پیدا کر دیں۔ اور ہوا کو جو نارمل حالات میں زندگی بخش ہے، مہلک بنا دیں۔

نوٹ:- اس شعر میں اشارہ ہے سائنس کی ان ایجادات کی طرف جن کا استعمال پہلی جنگِ عظیم میں کیا گیا تھا۔ جس کے بعد اقبال نے یہ کتاب لکھی تھی۔ ۱۲۰

"دریا شعلہ زار است، ہوا آتش گذار و زہر دار است" میں اشارہ ہے ان بحری جہازوں اور بم کے گولوں کی طرف جن کی بدولت پانی سے شعلے بلند ہوئے اور ہوا زہریلی ہو گئی۔ اے علم! جب تک تو

میرے ساتھ رہا، تیرا وجود اہلِ عالم کے حق میں خیر و برکت کا موجب رہا۔ لیکن جب تُو نے اپنا تعلق مجھ سے منقطع کر لیا، تو تیرا نُور، نار میں مبدل ہو گیا۔ یعنی تیرا وجود مفید ہونے کے بجائے مُضر ہو گیا۔ تو اسی عالمِ لاہوت میں پیدا ہوا تھا، جس کا تُو آج مُنکر ہے۔ لیکن افسوس کہ تُو شیطان کے پھندے میں گرفتار ہو گیا۔ یعنی آج دُنیا علم کو مقاصدِ مذمومہ کے حصول کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ مثلاً تباہ کُن آلاتِ حرب سب کے سب علم ہی کی بدولت عالمِ وجود میں آئے ہیں۔

تیسرا بند

اے علم! میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تُو اپنے طریقِ عمل میں تبدیلی پیدا کر یعنی اس دُنیا کو اُجاڑنے کے بجائے (جیسا کہ ۱۹۴۵ء میں ایک ایٹم بم نے اُجاڑ کر دیا تھا) اسے گلستان بنانے کی کوشش کر۔

اِس کی صُورت یہ ہے کہ کچھ دنوں میری صحبت میں رہ کر اپنے دل میں محبت (درد) کا رنگ پیدا کرے۔ اِس کے بعد تیرا وجود اہلِ عالم کے حق میں سراپا برکت ہو جائے گا اور تُو اس دُنیا کو بھی بہشتِ جاوداں بنا سکے گا۔

اے علم! اِس حقیقت کو فراموش مت کر کہ ہم دونوں روزِ ازل سے ایک دوسرے کے رفیق کار رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی نغمہ کی اُونچی اور نیچی آوازیں ہیں۔

نوٹ: - زیر ایرانی موسیقی کی اصطلاح میں اُونچے سُروں کو اور بَم نیچے سُروں کو کہتے ہیں۔ ہندی موسیقی میں ان کو تار استھان اور مندر استھان کے سُر کہتے ہیں۔ ۱۲۰

سرودِ انجم

ہستی ما نظامِ ما
مستی ما خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما
زندگیِ دوامِ ما
دور فلک بکامِ ما می نگریم و می رویم

جلوہ گہِ شہودِ ما بستۂ نمودِ ما
رزمِ نمود و بودِ ما کشمکشِ وجودِ ما
عالمِ دیر و زود را می‌نگریم و می‌رویم

گرمیِ کارزارہا خامیِ پختہ کارہا
تاج و سریر و دارہا خواریِ شہریارہا
بازیِ روزگار را می‌نگریم و می‌رویم

خواجہ ز سروری گذشت بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت دورِ سکندری گذشت
شیوۂ بت گری گذشت می‌نگریم و می‌رویم

خاک خموش و در خروش سست نہاد و سخت کوش
گاہ بہ بزم ناؤ نوش گاہ جنازہ بر دوش
میرِ جہان و خرقہ پوش می‌نگریم و می‌رویم

تو بہ طلسمِ چون و چند عقلِ تو در کشاد و بند
عشقِ غزال در کمند ذرہ ز تابِ او سپند
ما بہ نشیمنِ بلند می‌نگریم و می‌رویم

پردہ چہ و نور چیست؟ اہلِ فسون و زور چیست؟
چشم و دل و شعور چیست؟ فطرتِ ناصبور چیست؟
این ہمہ نزد و دور چیست می‌نگریم و می‌رویم

پیشِ تو قرن‌ہا دمے سالِ تو پیشِ ما دمے
اے بجہانِ تو یمے ساختہ بہ شبنمے
ما بہ تماشای عالمے می‌نگریم و می‌رویم

تمہید

اِس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعری اور فلسفہ کے علاوہ موسیقیت بھی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس میں غیر معمولی دِلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ اِس نظم میں اقبال نے ستاروں کی زبان سے اہلِ دُنیا کی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ اِنسان کے علاوہ کائنات میں جس قدر اشیاء پائی جاتی ہیں، وہ سب قوانینِ فطرت کی پابند ہیں، اِس لیے ان کی زندگی ایک نہج پر بسر ہو رہی ہے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔ اور اسی لیے اس کی زندگی سرتاپا

انقلاب کی تصویر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی عقل محدود ہے۔ اس لیے ہمیشہ ذہنی کشمکش میں گرفتار رہتا ہے۔

پہلا بند اس بند میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ستارے (اور ستارے اس وقت کائنات کی نمائندگی کرتے ہیں) چونکہ قوانین فطرت کے پابند ہیں، اس لیے وہ اپنی زندگی میں ناکامی سے دوچار نہیں ہوتے۔ مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات کبھی جور فلک کی شکایت نہیں کرتے۔

مطلب ستارے زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ نظام ہی ہماری ہستی ہے یعنی ہماری ہستی نظام کی پابندی پر موقوف ہے۔ اور حرکت ہی ہماری مستی ہے۔ یعنی ہماری راحت اور خوشی حرکت پر منحصر ہے۔ اور مسلسل گردش ہی ہماری زندگی ہے۔ یعنی سکون ہمارے حق میں پیامِ موت ہے۔ چونکہ ہم نظام (شمسی) کی پابندی کرتے ہیں۔ اس لیے ہماری زندگی کامیاب ہے (دورِ فلک بکام ما) اور ہم باطمینان تمام، کائنات کے حادثات کا نظارہ کرتے رہتے ہیں۔ اور گردش پیہم میں مصروف رہتے ہیں۔

دوسرا بند اس کائنات میں ہر لحظہ نئے نئے مظاہر جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ اور نت نئی اشیاء عالمِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ یہاں ہر گھڑی کون و فساد کا عالم برپا ہے۔ مخلوقات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اور فنا کے گھاٹ اترتی رہتی ہیں۔ ہر وقت موجودات میں تصادم واقع ہوتا رہتا ہے۔ ہر اس دنیا کو جو زمان و مکان کے طلسم میں گرفتار ہے اور اس کے حوادث کو جو زمان و مکان میں واقع ہوتے رہتے، بڑے اطمینان کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں اور مصروفِ سفر رہتے ہیں۔

تیسرا بند اس دنیا میں ہر وقت نئے حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں جنگ و جدل کا ہنگامہ برپا ہے۔ کہیں عقلمندوں

سے غلطی سرزد ہوتی ہے اور اس غلطی سے بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے، ایک شخص تخت نشین ہو رہا ہے، دُوسرا پھانسی کے تختہ پر چڑھ رہا ہے۔ آج ایک شخص حکمران ہے، کل وہی شخص تاج و تخت سے محروم ہو کر جلا وطنی کی ذلت برداشت کر رہا ہے۔ ہم دُنیا کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں اور مصروفِ سفر رہتے ہیں۔

چوتھا بند ۱۹۱۷ء میں ہماری آنکھوں نے یہ تماشا بھی دیکھا، کہ زارِ روس جو کروڑوں انسانوں پر حکومت کرتا تھا ایک گردشِ چرخ، تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا۔ اور اس کو اور اس کے خاندان کو اُسی کی رعایا نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ بالفاظِ دگر بادشاہ حکومت سے محروم ہو گیا اور رعایا اُس کی غلامی سے آزاد ہو گئی۔ نہ زارِ روس باقی رہا نہ قیصرِ جرمنی اور نہ فغفورِ چین کا کہیں نشان نظر آتا ہے۔ بالفاظِ دگر ہمارے دیکھتے دیکھتے ملوکیت کا دَور ختم ہو گیا اور انسان ان بُتوں کی پرستش سے آزاد ہو گیا۔

پانچواں بند اس بند میں ستارے انسان کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہیں کہ حضرت انسان کی زندگی بھی کس قدر حیرت انگیز ہے! اگرچہ اس کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے جو حرکت اور شعور دونوں سے معریٰ ہے۔ اس کے باوجود انسان ہر وقت ایک نہ ایک ہنگامہ برپا کرتا رہتا ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ بہت ضعیف ہے۔ اس کے باوجود ہر وقت مشقت اور محنت کی زندگی گذارتا ہے۔ آج ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ محفل میں بیٹھا ہوا لطفِ زندگی اٹھا رہا ہے۔ کل اسی شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس کا جنازہ کاندھوں پر اٹھائے قبرستان لیے جا رہے ہیں! اس سے بھی بڑھ کر تعجب خیز بات یہ ہے کہ انسان اگرچہ اشرف المخلوقات (میرِ جہان) ہے۔ لیکن اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کرتا ہے اور اکثر اوقات اس غلامی پر فخر کرتا ہے۔

چھٹا بند اس بند میں ستارے زبانِ حال سے انسان سے خطاب کرتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ تو اشرف المخلوقات ہے اور اس شرف کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے تجھے عقل سے بہرہ ور کیا ہے، لیکن اس کے باوجود تو زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے اور تیری عقل کی کیفیت یہ ہے کہ کسی معاملہ میں تو وہ تیری رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیری عقل کشودِ کار سے عاجز ہو جاتی ہے۔ اور تو تقدیر کے سامنے ایسا بے دست و پا ہو جاتا[1] ہے۔ جیسے وہ ہرن جو شکاری کے جال میں پھنس جائے اور مجبور، عاجز اور بیکس ہو جائے۔ ہم تیری اس بے چارگی کا دُور سے نظارہ کرتے رہتے ہیں اور اپنا سفر طے کرتے رہتے ہیں۔

ساتواں بند اس بند میں ستاروں نے عقل کی بے چارگی کی تصویر کھینچی ہے۔ یعنی بعض ان مسائل کا بیان کیا ہے۔ جن کے حل کرنے سے انسانی عقل عاجز ہے۔ مثلاً حقیقت غیب میں کیوں ہے؟ نظر کیوں نہیں آتی؟ جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے؟ ظلمت اور نور کی اصل کیا ہے؟ بظاہر تو یہ دونوں متضاد ہیں لہذا سوال یہ ہے کہ ان کی اصل واحد ہے یا کثیر؟ حواسِ ظاہری اور حواسِ باطنی کی ماہیت کیا ہے؟ ہم دیکھتے تو ہیں، لیکن کیونکر دیکھتے ہیں! ہم جانتے تو ہیں لیکن کس طرح جانتے ہیں؟ علم کی ماہیت کیا ہے؟ جسے ہم فطرتِ اشیاء کہتے ہیں، اس کی ماہیت کیا ہے؟ اشیاء میں جو خواص پائے جاتے ہیں یہ ان کی ذات میں داخل ہیں یا خارج

---

[1] ع سست بنہاد و سخت کوشش

اس مصرع کا مضمون قرآنِ حکیم کی ان دو آیتوں سے ماخوذ ہے:۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ انسان بہت کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ بیشک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔

سے اثر انداز ہوتے ہیں؟ اشیاء کا حسن و قبح عقلی ہے یا غیر عقلی؟ زمان و مکان کی ماہیت کیا ہے۔

انسان چونکہ صاحبِ عقل و شعور ہے، اس لیے اس قسم کے صدہا سوالات میں الجھا رہتا ہے۔ لیکن ہم ان مسائل سے بالکل بے تعلق ہیں۔ اس لیے می نگریم و می رویم۔

آٹھواں بند آخری بند میں اقبال نے ستاروں کی زبان سے انسان کو یہ پیغام دیا ہے کہ اے انسان اگرچہ اجرامِ فلکی کے مقابلہ میں تیری حیاتِ ارضی کا زمانہ بہت مختصر ہے۔ رسالِ تو پیش ما دمے۔ یعنی جسے تو ایک سال کہتا ہے، وہ ہماری نظر میں ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہے، لیکن تجھے تمام مخلوقات پر یہ تفوق حاصل ہے کہ تو "یم بکنار" ہے۔ یعنی تجھ میں خدا نے یہ استعداد ودیعت کر دی ہے کہ اگر تو اپنی خودی کی تربیت کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دے، تو تیرے اندر صفاتِ ایزدی (یم) کا عکس پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی تو اس کائنات پر حکمران ہو سکتا ہے ؎

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او، مولےٰ صفات

لہٰذا کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تو اپنی حقیقت سے غافل ہے اور مرتبۂ نیابت الٰہیہ سے مُونھ موڑ کر دنیا حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے، جو سراسر فانی ہے! تو سمندر کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے۔ لیکن تو قطرۂ (شبنم) پر قانع نظر آیا ہے!

ہم کو دیکھ! ہم بلحاظِ پیدائش تجھ سے کمتر ہیں۔ لیکن ہم ہر لحظہ نئے عالم کی تلاش میں مصروف ہیں۔ کیا تو ہماری زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکتا؟ کاش تو بھی ہماری طرح سرگرم جستجو ہو جائے تاکہ اپنا مقصدِ حیات حاصل کر سکے۔

نسیم صبح

ز روے بحر و دشت و کوہساری آیم — ولیک می ندانم ز کجا خیزم
دہم بہ مرغ چمن مژدہ از پیام بہار — بزیر نشیمن او یاسمن ریزم
بہ سبزہ غلطم و بر شاخ لالہ پیچم — کہ رنگ و بوے او بساحت چمن ریزم
خمیدہ تا نشود شاخ نازک گلہا — بہ برگ لالہ و گل نرم نرمک آویزم

چو شاعرے ز غم عشق در خروش آید
نفس نفس بنواہاے او در آمیزم

مطلب نسیم صبح کہتی ہے کہ مجھے یہ تو معلوم ہے کہ میں سمندروں اور پہاڑوں کی طرف سے آتی ہوں۔ مگر مجھے اپنی اصل سے آگاہی نہیں ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے دوسرے مصرع میں دانستہ ابہام کا رنگ پیدا کیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والا خود اس کا جواب دینے کی کوشش کرے۔ یعنی نسیم صبح کی اصل مادی نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔

میں بلبل کو بہار کی آمد آمد کا مژدہ سناتی ہوں اور اس کے آشیانہ کے نیچے (سطح زمین پر) چنبیلی کے پھول (جو چاندی کی طرح سفید ہوتے ہیں) بکھیر دیتی ہوں۔

میں سبزہ پر لوٹتی ہوں اور لالہ کی شاخوں سے بغل گیر ہوتی ہوں تاکہ اس کا رنگ اور اس کی خوشبو دونوں نکھر جائیں۔

میں پھولوں کی پتیوں پر بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوں، مبادا میری گردش سے ان کی نازک شاخیں خمیدہ ہو جائیں۔

جب کوئی شاعر غم عشق سے مجبور ہو کر مصروف آہ و نالہ ہوتا ہے تو میں پیہم اس کی نواؤں میں شامل ہوتی رہتی ہوں تاکہ ان میں دلکشی کا رنگ پیدا ہو جائے۔

پند باز با بچۂ خویش

تو دانی کہ بازاں ز یک جوہرند | دلِ شیر دارند و مشتِ پرند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش | جسور و غیور و کلاں گیر باش
میامیز با کبک و تورنگ و سار | مگر ایں کہ داری ہوائے شکار
چہ قومے فرومایہ و ترسناک | کند پاک منقارِ خود را بخاک
شد آں باز بیگانہ از کیشِ خویش | کہ گیرد ز صیدِ خود آئینِ خویش
بسا شکرے افتادہ بر روئے خاک | شد از صحبتِ دانہ چیناں ہلاک
نگہدار خود را و خورسند زی | دلیر و درشت و تنومند زی
تنِ نرم و نازک بہ تیہو گذار | رگِ سخت چوں شاخِ آہو بیار
نصیبِ جہاں آنچہ از خرمی است | ز سختی و محنت و پردردی است
چہ خوش گفت فرزندِ خود را عقاب | کہ یک قطرۂ خوں بہتر از لعلِ ناب
بپرہیز از ہمنشیناں خویش | بخلوت گرا چوں نیاگانِ خویش
شنیدم ز بازانِ پیر | نشیمن بشاخِ درختے مگیر
نگیر آشیانہ بہ باغ و کشت | کہ دارد بکوہ و بصحرا بہشت
ز دستاں زمیں دانہ چیدن خطاست | کہ پہنائے گردوں خدا دادِ ماست
نجیبے کہ پا بر زمیں سودہ است | ز مرغِ سرا خوار تر بودہ است
پئے شاہبازاں بساط است سنگ | کہ بر سنگ رفتن کند تیز چنگ
تو از زادۂ شاہانِ صحراستی | بگوہر چو سیمرغ والاستی
جوانے ابیّے کار در تیز جنگ | بود مرد یک تا بہ چشمِ پلنگ
بہ پروازِ تو سطوتِ خسرواں | بہ رگہائے تو خونِ کافوریاں
تو چرخے ز گردندۂ کوژپشت | بخور آنچہ گیری ز نرم و درشت

ز دستِ کسے طعمۂ خود مگیر
نکو باش و پندِ نکویاں پذیر

مطلب ایک باز نے اپنے بچے سے کہا کہ ساری دنیا کے بازوں کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے یعنی بلحاظِ خواص ذاتی سب یکساں ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ سب اگرچہ مشت پر ہوتے ہیں، لیکن شیروں کا سا دل رکھتے ہیں۔

۲۔ پس تجھے لازم ہے کہ تو اپنے اندر مردانہ صفات پیدا کرے یعنی نیکی اختیار کر، اپنی تدابیر میں پختگی کا رنگ پیدا کر، جرأت اور ہمت اور غیرت کا مادہ پیدا کر۔ یعنی دوسرے کا مارا ہوا مت کھا۔ اور بڑے پرندوں کا شکار کر۔ یعنی چڑیا کو شکار کرنا تیری شان کے شایاں نہیں ہے۔

۲۔ تیتر، جنگلی مرغ (تورنگ) اور مرغ نغمہ سرا (سار) سے کبھی میل جول پیدا نہ کرنا مبادا ان کی عادات تیرے اندر سرایت کر جائیں۔ ہاں اُن کو شکار کرنے کی نیت سے اُن سے رابطہ پیدا کر سکتے ہو۔ کیونکہ یہ تمام پرندے بہت فرومایہ (پست فطرت) اور بزدل ہوتے ہیں۔

۴۔ اُن کی فرومائگی اس بات سے ظاہر ہے کہ جب ان پرندوں کی چونچ غلیظ اشیاء سے آلودہ ہو جاتی ہے، تو یہ عموماً اپنی چونچ مٹی سے رگڑ کر صاف کرتے ہیں۔ یعنی ان کا تعلق زمین سے ہے اور بازاں کا تعلق فضائے آسمانی سے ہوتا ہے۔ آجتک کسی شخص نے کسی باز کو زمین پر دانہ چگتے یا مٹی سے چونچ صاف کرتے نہیں دیکھا۔

۵۔ جرباشہ (باز کی برادری کا ایک شکاری پرندہ ہے۔ مگر جسامت میں باز سے بہت چھوٹا ہوتا ہے) اُن پرندوں کا طریقہ حیات (آئین و کیش) اختیار کر لیتا ہے جن کو وہ شکار کرتا ہے۔ تو انجام کار وہ بدنصیب باشہ خود شکار ہو جاتا ہے۔

نوٹ:۔ اسی لیے انگریز جب تک اس ملک میں رہے، کالے آدمیوں سے دُور رہے۔

۶۔ میں نے بہت سے شکروں (شکرا بھی ایک شکاری پرندہ ہے، جو باشہ سے قدرے بڑا ہوتا ہے) کو محض اس لیے تباہ ہوتے دیکھا کہ انہوں نے اُن پرندوں کی صحبت اختیار کر لی تھی جو زمین پر دانہ چگتے ہیں۔

۷۔ تو اپنی خودی کی حفاظت کر اور دلیری، درشتی، سختی اور تنومندی کی صفات اپنے اندر پیدا کر۔

۸۔ یاد رکھ کہ نازک اور نرم جسم بٹیر کا ہوتا ہے نہ کہ باز کا۔ تجھے لازم ہے کہ تو اپنے اعصاب کو ہرن کے سینگوں کی طرح سخت بنالے۔

۹۔ کیونکہ دنیا میں وہی شخص خرمی اور کامیابی کی زندگی بسر کر سکتا

ہے، جو محنتی اور جفاکش ہو۔

۱۰۔ عقاب نے اپنے بیٹے سے کیسی عمدہ بات کہی کہ خون کا ایک قطرہ، لعلِ ناب سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یعنی دیکھنے میں قطرۂ خون اور لعل دونوں سُرخ ہوتے ہیں، لیکن اگر یہ دونوں تیرے سامنے ہوں تو تجھے لازم ہے کہ لعل کے بجائے قطرۂ خون کو اختیار کرے۔ کیونکہ تیرے حق میں وہی مفید ہے۔ لعل کے کھانے سے تجھ میں جسمانی طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

۱۱۔ ہرنوں اور بھیڑوں کی طرح (دوسرے بازوں کے ساتھ) رل مِل کر زندگی بسر مت کر، بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح تنہائی میں زندگی بسر کر۔

نوٹ :۔ شکاری پرندے تنہا زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کے اندر اپنی قوتِ بازو پر اعتماد کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے جس پر شکار موقوف ہے۔

۱۲۔ تو کبھی کسی درخت پر اپنا آشیانہ مت بنانا، کیونکہ تیرے رہنے کی جگہ باغ نہیں ہے بلکہ کوہ و صحرا ہے۔

۱۳۔ زمین پر گرا پڑا دانہ کبھی مت کھانا۔ کیونکہ جو عالی خاندان سے

۱۴۔ باز زمین پر چلنے پھرنے کا شیوہ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ پالتو مُرغیوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

۱۵۔ بازوں کو زمین کے بجائے پتھروں پر چلنا چاہیئے تاکہ اُن کے پنجے پتھر کی رگڑ سے تیز ہو جائیں۔

۱۶۔ یاد رکھ کہ تو شکاری پرندوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اور اپنی اصل کے لحاظ سے سیمرغ کی طرح اصیل اور شریف ہے۔

۱۷۔ تو وہ جوانِ اصیل ہے کہ مقابلہ کے وقت اپنے فن سے چیتے کی آنکھیں باہر نکال سکتا ہے۔

۱۸۔ تیری پرواز میں فرشتوں کی سی شوکت پائی جاتی ہے اور

تیری رگوں میں کافوری بازوں کا خون گردش کر رہا ہے۔

۱۹۔ تو اپنی غذا اپنے مارے ہوئے شکار سے حاصل کر، خواہ وہ شکار آسانی سے حاصل ہو یا دشواری سے۔

۲۰۔ لیکن کبھی دوسرے باز کا مارا ہوا مت کھائیو۔ کیونکہ یہ بات غیرت کے خلاف ہے۔

نوٹ:۔ باز اور شاہین یہ دونوں اقبال کے محبوب پرندے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پرندوں میں اقبال کے مردِ مومن کی بعض صفات پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اپنے خط میں جو انھوں نے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کو لکھا تھا۔ بایں الفاظ اس بات کی وضاحت فرمائی تھی کہ "شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے، (۵) تیز نگاہ ہے۔"

کرم کتابی

شنیدم شبی در کتب خانهٔ من | به پروانه می گفت کرم کتابی
به اوراق سینا نشیمن گرفتم | بسی دیدم از نسخهٔ فاریابی

نفهمیده ام حکمت زندگی را | همان تیره روزم ز بی آفتابی
نکو گفت پروانهٔ نیم سوزی | که این نکته را در کتابی نیابی

تپش می کند زنده تر زندگی را
تپش می دهد بال و پر زندگی را

تمہید اس تمثیلی نظم میں پروانہ سے عاشق (مومن) اور کرمِ کتابی سے عالم (فلسفی) مراد ہے۔ اور اس نظم سے اقبال اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی کی حقیقت، اوراقِ سینا (فلسفہ) سے نہیں

معلوم ہو سکتی، بلکہ عشق و تپش اسے معلوم ہو سکتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت، فلسفہ کی دسترس سے بالاتر ہے۔

مطلب ایک شب ایک کرم کتابی (دیمک) نے پروانہ سے یہ کہا کہ میں نے مدتوں فلسفہ اور شاعری کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن زندگی کی حقیقت سے آگاہی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ سن کر پروانہ نے اس سے یہ کہا کہ زندگی کی حقیقت کتابوں سے معلوم نہیں ہو سکتی، اگر تو اس راز سے واقف ہونا چاہتا ہے تو عشق اختیار کر کیونکہ زندگی پرواز کا نام ہے اور یہ طاقت صرف عشق سے پیدا ہو سکتی ہے۔

زندگی جز لذّت پرواز نیست

آشیاں با فطرت او ساز نیست

نوٹ:۔ ابن سینا، حکماء کا اور فاریابی، شعراء کا نمائندہ ہے

(۱) سینا سے ابو علی الحسین ابن عبد اللہ ابن سینا مراد ہے، جو دنیائے اسلام کے نامور حکماء میں سے تھا۔ یہ فلسفی ۳۷۰ھ میں ترکستان کے مشہور شہر بخارا میں پیدا ہوا تھا۔ تمام علوم و فنون میں ید طولےٰ رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف میں اشارات، الشفاء (جو ۱۸ جلدوں میں ہے) نجات اور قانون بہت مشہور ہیں۔ ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

(۲) فاریابی سے ظہیر الدین طاہر بن محمد فاریابی مراد ہے جو بارہویں صدی عیسوی کے مشہور فارسی شعراء میں سے تھا۔ اس نے ۱۲۰۱ء میں وفات پائی۔ اس کی شہرت کا دارومدار زیادہ تر اس شعر پر ہے:۔

دیوانِ ظہیر فاریابی

در کعبہ بدزد اگر بیابی

کبر و ناز

یخ بجوئے کہ داز دو کہسار ناز گفت ۔۔۔ ما را ز ہرزۂ تو شود تلخ روزگار
گستاخی و سراسیمگی و بیباک میروی ۔۔۔ ہر سال شوخ دیدہ و آوارہ تر ز پار
شایانِ دودمانِ کہستانیان نئی ۔۔۔ خود را مگوئے دخترکِ ابرِ کوہسار
گردندۂ بشکستہ بضعف کناک ۔۔۔ با دور نگینہ بروے مرغزار
گفت آبجو کہ ہیچ مال اش مگوے ۔۔۔ بر خویشتن مناز و خیالی عنی مکار

من می روم کہ در خورِ آغوش نیم
تو خویش را ز مہرِ درخشاں نگاہ دار

تمہید اس تمثیلی نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ کہ انسان بسا اوقات دوسروں کو ان عیوب کی بنا پر ہدفِ اعتراض بناتا ہے، جو خود اس کی ذات میں موجود ہوتے ہیں۔ پس ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم دوسروں کے عیوب دیکھنے کے بجائے اپنی کمزوریوں کی اصلاح کریں۔ دوسروں پر اعتراض وہ شخص کر سکتا ہے، جو خود تمام عیوب سے پاک ہو، اور یہ بات بہت مشکل ہے۔ بقول ظفر

نہ تھی جیبوں کی جب ہمیں اپنے خبر ۔۔۔ رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر ۔۔۔ تو جہاں میں کوئی برا نہ رہا

مطلب ایک دن برف (یخ) نے تکبر کی راہ سے پہاڑی ندی پر یہ اعتراض کیا کہ تیری وجہ سے ہماری زندگی بہت تلخ ہو گئی ہے تو بہت گستاخ، بیباک، شوخ اور آوارہ ہے۔ تو اس لائق نہیں ہے کہ تیرا شمار کوہستان کے باشندوں میں کیا جائے اس لیے تو اپنے آپ کو "دخترِ کوہسار" کہنا چھوڑ دے اور یہاں سے بہت دور کسی مرغزار میں سکونت اختیار کر۔

مجھ کو دیکھ! میں کس قدر بلندی پر ہوں! وہ تو زمین میں پڑی ہوئی ہے پس مناسب یہی ہے کہ تو یہاں سے چلی جائے۔

یہ سن کر ندی نے برف سے کہا کہ تجھے ایسی دلخراش گفتگو زیبا نہیں ہے۔ تکبر اور غرور کا یہ انداز ترک کر دے۔ اچھا! میں تو یہاں سے جاتی ہوں کیونکہ تیرے زاویۂ نگاہ سے میں کوہستانی قبیلے سے نہیں

ہوں۔ لیکن تو اپنے آپ کو آفتاب کی شعاعوں سے محفوظ رکھ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چند روز کے بعد جب تو آفتاب کی گرمی سے پگھل جائے گا، تجھے بھی اس خاندان سے با دیدۂ نم رخصت ہونا پڑے۔

نوٹ:۔ "شہاں منی نگار" کا لفظی ترجمہ ہے۔ غرور کا درخت مت بو، آخری شعر کے دوسرے مصرع میں ندی نے دراصل یخ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ آفتاب کی شعاعوں سے پگھلنے سے پہلے میں بھی وہی تھی جو اس وقت تو ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد تو بھی وہی ہو جائے گا، جو آج میں ہوں۔

لالہ

آن شعلہ ام کہ صبح ازل در کنار عشق
پیش از نمود بلبل و پروانہ می تپید
افزون ترم ز مہر و بہ ہر ذرہ تن زنم
در شرر ز خویشتن بی چمن دمید
در سینۂ چمن ز نفس گرم آتشید
یک شاخ نازکی ز نم او گرم کشید
سوزم ببود و گفت یکی مرہم بایست
لیکن دل ستم زدہ کی بیارمید
در گلستان نشان بہشتی ز تاب خود
تا جوہرم بحیلہ گر رنگ و بو رسید
شبنم برای من گہر آبدار ریخت
خندید صبح و باد صبا گرد من وزید
بلبل ز گل شنید کہ سوزم ربودہ اند
نالید و گفت چارۂ ہستی گران خرید

وا کرد سینہ تفتۂ خورشید در کشم
آیا بود کہ باز برانگیزد آتشم

تمہید یہ ایک بلند پایہ تمثیلی نظم ہے، اس میں "لالہ" سے دراصل گل لالہ مراد نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ازلی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں کائنات (بلبل اور پروانہ) کی پیدائش سے پہلے عشق کی آغوش میں تڑپ رہا تھا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ "لالہ" اقبال کے نظامِ افکار میں سوزِ عشق کا مظہر یا نشان (SYMBOL) ہے۔ چونکہ عشق ایک ازلی حقیقت ہے اور اصل حیات ہے جو ہر وقت فعل تخلیق میں مصروف ہے، اس لیے لالہ بھی جو سوزِ عشق کا مظہر ہے بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ

آں شعلہ ام کہ صبحِ ازل در کنارِ عشق
پیش از نمودِ بلبل و پروانہ می تپید

اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ سوزِ عشق، باعثِ تخلیقِ کائنات ہے، اور اس تصور کا ماخذ یہ ہے :۔ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرِفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ۔ اللہ تعالےٰ نے فرماتا ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ کوئی اُس سے محبت کرے اس لیے اُس نے انسان کو پیدا کیا۔ پس ثابت ہو گیا کہ اگر سوزِ عشق کار فرما نہ ہوتا، تو یہ کائنات ہی پیدا نہ ہوتی اور ضمناً یہ بھی ثابت ہو گیا۔ کہ سہ

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
تا نسوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

مطلب لالہ کہتا ہے کہ میں بظاہر پھول ہوں، لیکن دراصل سوزِ عشق کا مظہر ہوں، اسی لیے اس کائنات کی تخلیق سے پہلے عشق کی آغوش میں تڑپ رہا تھا۔ یعنی تخلیقِ کائنات میں مصروف تھا۔ (جیسا کہ دوسرے شعر سے واضح ہے)۔

(۲) میں اپنی قدروقیمت اور تاثیر کے لحاظ سے آفتاب سے بڑھ کر ہوں، اور آفتاب کی طرح کائنات کے ہر ہر ذرہ کو فیض پہنچاتا ہوں۔ چنانچہ آسمان کے ستاروں میں میری ہی وجہ سے یہ چمک پیدا ہوئی ہے۔

(۳) جب یہ ثابت ہو چکا کہ میں ساری کائنات میں جاری اور ساری ہوں ۔ اور ہر شے میری ہی تابش سے وجود پذیر ہوئی ہے تو اب اس حقیقت کو واضح کرتا ہوں کہ جب ایک شاخِ نازک نے مجھ کو تہ خاک سے نمی کی طرح اپنے اندر جذب کیا، تو میں نے چمن میں اس طرح اقامت اختیار کر لی جس طرح سینہ میں نفس۔ یعنی میں باعث

رونق و شادابیٔ چمن بن گیا۔

(۴) اُس شاخِ نازک نے میرا سوز اپنے اندر جذب کر لیا۔ اور مجھ سے کہا کہ میرے اندر مستقل طور سے سکونت اختیار کرے۔ لیکن میں چونکہ ستم زدہ تھا۔ اس لیے ایک جگہ آرام کس طرح کر سکتا تھا! عاشق کو قرار کہاں!

(۵) میں نے اس شاخ کے اندر بہت پیچ و تاب کھایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں گلِ لالہ کی شاخ میں نمودار ہو گیا۔

(۶) شبنم نے مجھے شادابی اور تازگی بخشی اور بادِ صبا نے مجھے دلکشی عطا کی۔

(۷) جب بلبل نے گل سے یہ سُنا کہ میں نے "سوز" دے کر رنگ و بو خریدا ہے، تو اُس نے رو کر یہ بات کہی کہ گلِ لالہ یعنی میں نے ہستی کا لباس بہت گراں خریدا یعنی گل کی شکل میں ظہور سے پہلے میں سراپا سوزِ عشق تھا۔ میں نے سوز دیکر رنگ و بو خریدا (لالہ، رنگ و بُو ہی کا دوسرا نام ہے) تو بلبل نے یہ بات بالکل سچ کہی کہ،

"لالہ جامہ ہستی گراں خریدہ است"

(۸) یہی وجہ ہے کہ اب میں ہر وقت اپنے سینہ کو کھولے ہوئے خورشید کی نگاہِ کرم کا امیدوار ہوں۔ کہ وہ مجھ کو سوز کی دولت سے مالامال کر دے (خورشید کنایہ ہے ذاتِ باری تعالےٰ سے جو منبعٔ فیض و کرم ہے)۔

حکمت و شعر

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم — دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

این فروتر رفت و تا گوہر رسید — آن بگردابی چو خس منزل گرفت

حق اگر سوزی ندارد حکمت است

شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

تمہید اس مختصر تمثیلی نظم میں اقبال نے اس فرق کو واضح کیا ہے جو حکمت اور شعر میں پایا جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ فلسفہ (حکمت) اور شعر دونوں حق کے علمبردار ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے، کہ فلسفہ، سوز و گداز کے عنصر سے معریٰ ہوتا ہے اس کے برعکس شعر میں سوز کی آمیزش ہوتی ہے۔ اقبال کی رائے میں فلسفہ اور شاعری دونوں کا مقصد یکساں ہے۔ یعنی تلاشِ حق، لیکن طریقِ کار میں اختلاف ہے۔ فلسفی، عقل کو راہنما بناتا ہے۔ اس لیے اس کے اقوال میں خشکی ہوتی ہے۔ لیکن شاعر "دل" سے ہدایت حاصل کرتا ہے، اس لیے اس کے کلام میں گرمی پائی جاتی ہے۔ اسی گرمی کو اقبال نے "سوز" سے تعبیر کیا ہے۔ سوز اور دل (عشق) میں وہی رابطہ ہے جو چراغ اور اس کی لَو میں پایا جاتا ہے۔

اس نظم میں لفظِ حق اہم ہے۔ اس لیے پہلے اس کی تشریح کرتا ہوں:-

حق کے لغوی معنیٰ ہیں ثَبَتَ یعنی چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ یا قائم ہو گیا۔ چونکہ امرِ واقعی بھی اپنی جگہ قائم ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس جگہ سے منحرف نہیں ہوتا۔ اس لیے علمائے لغت سچی اور صحیح بات کو حق سے تعبیر کرنے لگے۔

فلسفہ کی اصطلاح میں حق اُس امرِ واقعی کو کہتے ہیں جس کے وجود میں کوئی شک نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا وجود چونکہ ایک امرِ واقعی ہے۔ یعنی وہ بلاشبہ خارج میں موجود ہے۔ اس لیے اس کو الحق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کو حق کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی حقیقت ثابت ہے۔ علم عقائد میں مذکور ہے کہ اَلْجَنَّةُ حَقٌّ - اس کا مطلب یہ ہے کہ جنّت درحقیقت موجود ہے، اس کے وجود میں کوئی شک نہیں۔

مطلب فلسفی (ابنِ سینا) اور عاشق (رومیؒ) دونوں جویائے حقیقت ہیں۔ مگر ان میں یہ فرق ہے کہ حکیم (فلسفی) عقل و سواس

اور شکوک کے غبار میں صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ اس لیے منزلِ مقصود (محمل) تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن عاشق، عقل کے بجائے عشق کو رہنما بناتا ہے۔ اور عشق کا کام یہ ہے۔ کہ وہ یقین کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے شکوک کا غبار سامنے سے چھٹ جاتا ہے۔ اور منزلِ مقصود صاف نظر آجاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عاشق محمل کا پردہ اٹھا کر محبوبہ (حقیقت) کو دیکھ لیتا ہے۔

دوسرے شعر میں اسی فرق کو یعنی طریق جستجو کے نتیجہ کو یوں واضح کیا ہے۔ کہ حقیقت کی تلاش میں دونوں غوطہ لگاتے ہیں۔ لیکن فلسفی تو شکوک کے بھنور میں پھنس کر سطح پر رہ جاتا ہے۔ اور عاشق تہ میں پہنچ کر موتی (حقیقت) نکال لاتا ہے۔

تیسرے شعر میں اقبال نے فلسفہ اور شعر میں فرق بیان کیا ہے، کہ اگر حق (سچی بات) میں سوز و گداز کا رنگ نہ ہو تو وہ فلسفہ (حکمت) ہے۔ اور اگر یہ رنگ موجود ہو تو اسے شعر سے تعبیر کرتے ہیں یعنی فلسفی اور شاعر دونوں جویائے حق ہیں اور دونوں حق کا اظہار کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فلسفی کے بیان میں اس کے دل کا سوز شامل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ دل کے بجائے عقل کو اپنا رہنما بناتا ہے۔ اور شاعر چونکہ دل (عشق) کو رہنما بناتا ہے۔ اس لیے اس کے کلام میں سوز و گداز کا عنصر لازمی طور سے شامل ہو جاتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

حق بے سوز = فلسفہ
حق با سوز = شعر

کرمکِ شب تاب

یک ذرۂ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت   شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

وامانده شعاعے گرہ خوردہ و شرر شد — از سوزِ حیات است کہ کارش ہمہ زر شد

دارائے نظر شد

پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد — بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد

ترکِ من و تو کرد

یا اخترکے ماہ جبینے — نزدیک تر آمد بتماشائے زمینے

از چرخِ برینے

یا ماہِ تنک سوز کہ یک جو تمام است — ماہے کہ بدوشِ شب و خورشید مرام است

آغاز و تمام است

اے کرمکِ شب تاب سراپائے تو نور است — پرواز تو یک سلسلۂ غیب و حضور است

آئینِ ظہور است

در تیرہ شبستانِ چمن مرغِ شب آستی — آہ اینچہ سوز است کہ در ذاتِ تو ہستی

مائیم کہ مانندِ تو از خاک دمیدیم — دیدیم تپیدیم، ندیدیم تپیدیم

جائے نرسیدیم

گم کردہ جہت در رہِ دور و دراز — در منزلِ گم گشتہ نگر پائے بہ در دار

این جسم نگہ دار

تمہید اقبال نے بانگِ درا میں بھی جگنو پر ایک دلکش نظم لکھی ہے اور ان دونوں نظموں میں اپنی قوتِ تخیّل کا کمال دکھایا ہے۔
فرق یہ ہے کہ 'بانگِ درا' والی نظم میں تصوّف کا رنگ غالب ہے اور اس نظم میں انھوں نے آخر میں انسان سے خطاب کیا ہے کہ منزلِ گم گشتہ کا ذکر کرتے یا ماضی کی غفلت پر کفِ افسوس ملنے کے بجائے منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پیامِ مشرق کے بعد پھر کسی کتاب میں اقبال نے جگنو یا انجمِ سحر یا اسی قبیل کی کوئی اور نظم نہیں لکھی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیامِ مشرق کے بعد ان کے خیالات کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ یعنی مظاہرِ فطرت کے بجائے دین کے بلند ترین حقائق ان کی فکر کا موضوع بن گئے۔

۱ کہتے ہیں کہ جگنو بظاہر ایک حقیر مخلوق (ذرۂ بے مایہ) ہے

مطلب لیکن اس نے اپنے اندر سوز و گداز کا رنگ پیدا کیا، اور اس سوز و گداز (شوق) کی بدولت اس میں پروانوں کی خو، بُو پیدا ہو گئی۔ یعنی اس کا وجود سراپا آتش ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے رات کی تاریک فضا کو منور کر دیا۔

۲۔ یہاں سے شاعرانہ تخیل کی صنعت کاری شروع ہوتی ہے کہتے ہیں کہ یہ جگنو نہیں ہے بلکہ آفتاب کی وہ شعاع ہے جو اپنی اصل کی طرف واپس نہیں گئی اور اس نے اپنے آپ کو سمیٹ کر اپنے جسم میں گرہ لگا لی۔ اور ایک نقطہ (گرہ) پر مرکوز ہو کر شرر بن گئی۔ اور چونکہ اس میں سوزِ حیات پایا جاتا ہے۔ (اس کی صراحت شاعر نے پہلے بند کے پہلے مصرع میں کر دی ہے۔ یعنی متاعِ نفس اندوخت) اس لیے "کارش ہمہ زر شد" یعنی اس کی زندگی کامیاب (منور) ہو گئی ہے (کار زر شدن بمعنی معاملاتِ زندگی کا حسبِ منشاء درست ہو جانا) یا اس کی زندگی کے تمام معاملات درست ہو گئے یعنی اس میں نظر پیدا ہو گئی۔ اقبال ہمیں بتانا چاہتے ہیں کہ اگر کسی کو "نظر" کی آرزو ہو تو اسے اپنے اندر سوز و گداز کا رنگ پیدا کر لینا چاہیئے۔

۳۔ اس بند میں اقبال یہ بتاتے ہیں کہ جب کسی میں نظر پیدا ہو جاتی ہے، تو وہ اپنی پوری توجہ حصولِ مقصد پر مبذول کر دیتا ہے مثلاً پروانہ کو دیکھو، اس میں نظر پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر شمع پر اس انداز سے نثار ہو جاتا ہے، کہ خود شمع بن جاتا ہے۔ یعنی جلنے لگتا ہے اور مغائرت کے پردوں کو اس طرح ہٹا دیتا ہے کہ اس میں اور اس کے محبوب میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

۴۔ یا یہ کہ جگنو دراصل وہ چھوٹا سا ستارہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے چاند گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ یعنی تابش کے لحاظ سے چاند سے بھی بڑھ کر ہے۔ اور اہلِ زمین کا نظارہ کرنے کے لیے نیچے اُتر آیا ہے۔

۵- یا یہ جگنو وہ کم روشنی والا چاند ہے جو ایک ہی دفعہ اپنا جلوہ دکھا کر ختم ہو جائے۔ ایسا چاند جو آفتاب کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ اور کسی خاص مقام کا پابند نہیں ہے۔

۶- اے جگنو! تیرا جسم سراسر نور ہے اور تیری پرواز میں یہ خصوصیت ہے کہ کبھی تیری روشنی (بازوؤں) پَروں میں چھپ جاتی ہے اور کبھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دگر کبھی تو غائب ہوتا ہے۔ کبھی حاضر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیری زندگی (ظہور) کا یہی قانون ہے۔

۷- تو اندھیری راتوں میں رات کے پرندوں کے لیے مشعل کا کام دیتا ہے۔ تیرے اندر بلا کا سوز و گداز ہے کہ اس کی بدولت تو مجسم تب و تاب نظر آتا ہے۔ اور ہر وقت تلاش میں مصروف رہتا ہے۔

نوٹ:- چونکہ شاعر کی قوتِ تخیّل نے جگنو کو عاشق بنا دیا۔ اس لیے فطرتی طور پر شاعر نے اس مصرع میں اُسے گرم طلب یعنی تلاشِ محبوب میں سرگرداں دیکھا۔ یہ قوتِ تخیّل کی کاریگری ہے۔ اور اسی کا نام شاعری ہے۔ ورنہ کہاں جگنو کہاں عاشقی۔

۸- اس بند میں اقبال نے انسان کا موازنہ جگنو سے کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اے جگنو! ہم بھی تیری طرح خاک سے پیدا ہوتے ہیں، اور تیری ہی طرح سرگرم طلب ہیں۔ ہم میں سے جس نے محبوب کی ایک جھلک دیکھ لی ہے۔ وہ بھی تڑپ رہا ہے۔ اور جس نے نہیں دیکھی ہے، وہ بھی تڑپ رہا ہے اور ہم تگ و دو کے باوجود ابھی تک منزلِ مقصود سے دُور ہیں۔

۹- اے جگنو! میں تجھ سے ایک ایسی بات کہتا ہوں، جو بڑے پتہ کی ہے، اور اس پر میں نے بہت غور کیا ہے، اور وہ بہت بلیغ اور وسیع المعانی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ منزلِ گم گشتہ کا ذکر مت

کر۔ یعنی گذشتہ ناکامیوں پر کفِ افسوس مت مل۔ بلکہ حصولِ مقصد کے لیے جدوجہد کر، اور جو روشنی (رتب وتاب) تیرے پاس ہے، اس کو غنیمت سمجھ۔ اور اس کی حفاظت کر۔ کیونکہ اگر یہ روشنی ضائع ہو گئی، تو تیری زندگی ختم ہو جائے گی۔

حقیقت

عقابے دور بینے جوئے را گفت
نگاہم آنچہ می بیند سراب است
جوابش داد آں بحرِ حق اندیش
تری بینی ولی نم کز آب است
صدائے ماہی آمد از تہِ بحر
کہ چیزے ہست ہم پیچ و تاب است

تمہید اس مختصر نظم میں اقبال نے فلسفہ کا نہایت قیمتی نکتہ بیان کیا ہے کہ کسی شئے کی حقیقت سے آگاہی اُس وقت ہو سکتی ہے، جب طالبِ حقیقت اس شئے سے ہم آغوش ہو جائے یا بالفاظِ صحیح تر خود وہی شئے بن جائے۔ چنانچہ مرشد رومی فرماتے ہیں:۔

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

اسی لیے راقم الحروف کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی انسان کو حق سے آگاہی مطلوب ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان خود حق بن جائے۔ کیونکہ حق کو حق ہی پہچان سکتا ہے[۱] یہ تو عقلاً ناممکن ہے کہ باطل۔ حق کو پہچان سکے۔

یہیں سے سیدنا حضرت اکبرؓ کے مقام رفیع کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ خود صادق تھے، اس لیے مخبرِ صادق (صلی اللہ علیہ وسلم) پر

---

[۱] جناب مسیحؑ بھی یہی فرماتے ہیں:۔
"میں حق کی شہادت دینے کے لیے دُنیا میں آیا ہوں۔ اور جو حقانی ہے وہی میری آواز سُنتا ہے۔" (یوحنا ۱۸: ۳۷)

بلا تامل و تردد ایمان لے آئیے۔

مطلب عقاب نے مرغ آبی (یہ ایک مشہور چڑیا ہے جسے اردو زبان میں دھوبن کہتے ہیں) سے کہا کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، یہ سراب ہے یعنی دھوکہ ہے۔

اس چڑیا نے جواب دیا کہ تجھے سراب دکھائی دیتا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ سراب نہیں ہے بلکہ آب ہے۔ اور دیکھنے (دیدن) اور جاننے (دانستن) میں بڑا فرق ہے۔ جب ان کی یہ گفتگو مچھلی نے سنی تو اُس سے نہ رہا گیا۔ اور بولی۔ ارے نادانو! جو تم دیکھ رہے ہو یہ نہ سراب ہے نہ آب ہے بلکہ چیزے دیگر پیچ و تاب ہے یعنی ایک شے ہے جس میں ہر لحظہ حرکت، ہنگامہ، تلاطم اور جوش و خروش برپا ہو رہا ہے۔ کہیں لہریں ہیں، کہیں بلبلے ہیں۔ کبھی مد ہے، کبھی جزر ہے۔

تبصرہ (۱) عقاب نے پانی کو دُور سے دیکھا، اس لیے اُس نے اُسے سراب سمجھ لیا۔ یعنی اُس کی نگاہ دھوکہ کھا گئی۔ واضح ہو کہ دُور سے دیکھو تو آب اور سراب میں کوئی فرق نظر نہیں آ سکتا دونوں بالکل یکساں معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) جو تیغ عقاب کے مقابلہ میں پانی سے بہت نزدیک تھی، یعنی سطح آب پر تھی۔ اس لیے اُس نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا کہ یہ سراب نہیں ہے بلکہ آب ہے۔ کیونکہ میں اس کی سطح پر تیر رہی ہوں۔ اگر یہ سراب ہوتا، تو میں تیر نہیں سکتی تھی۔

(۳) مچھلی ان دونوں کے مقابلہ میں پانی سے زیادہ قریب ہے، یعنی وہ پانی کے اندر ہے۔ لہذا اس کی حقیقت سے بھی اُن کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہے اس لیے اس نے کہا کہ یہ نہ سراب ہے نہ آب ہے، بلکہ ایک چیزے ہے جو پیچ و تاب میں ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ مچھلی نے جو بات بتائی وہ نہ عقاب کو نظر آئی نہ جو تیغ کو۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مچھلی اندر ہے۔ یہ

دونوں باہر سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مچھلی سے بالتحقیق کوئی بات نہیں بتائی صرف اس بات پر اکتفا کیا کہ "ایک چیز ہے، جو پیچ وتاب میں ہے۔" اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ مچھلی کو بھی نہیں معلوم، کیونکہ مچھلی ابھی تک مچھلی ہے، پانی نہیں ہے۔ پانی بن جائے تو جانے کہ پانی کیا ہے۔

حدی

(نغمۂ ساربان حجاز)

ناقۂ سیارِ من
آہوئے تاتارِ من
درہم و دینارِ من
اندک و بسیارِ من
دولتِ بیدارِ من
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست
دلکش و زیباستی
شاہدِ رعناستی
روکشِ حوراستی
غیرتِ لیلاستی
دخترِ صحراستی
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست
در تپشِ آفتاب
غوطہ زنی در سراب
ہم بہ شبِ ماہتاب
تند روی چوں شہاب
چشم ہمہ دیدہ خواب
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست
لکۂ ابرِ رواں
کشتیِ بے بادباں
مثلِ خضر راہ داں
بر تو سبک ہر گراں
لختِ دلِ ساربان
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

سوز تو اندر زمام
ساز تو اندر خرام
بے خورش و تشنہ کام
پاے بہ سفر صبح و شام
خستہ شوی از مقام
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

شام تو اندر یمن
صبح تو اندر قرن
ریگ درشت وطن
پاے ترا یاسمن
اے چو غزال ختن
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

مہ ز سفر پا کشید
در پس تل آرمید
صبح ز مشرق دمید
جامۂ شب بر درید
باد بیابان وزید
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

نغمۂ من دلکشاے
زیر و بمش جانفزاے
قافلہ ہا را دراے
فتنہ ربا فتنہ زاے
اے بحرم چہرہ ساے
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

تمہید حدی وہ نغمہ ہے جو حجازی ساربان اپنی ناقہ کو سناتا ہے تاکہ وہ تیزی کے ساتھ مسافت قطع کرے، چونکہ ناقہ (اونٹنی) جفاکش، سخت کوش، متحمل مزاج اور خدمتگذار ہوتی ہے۔ اور اقبال انھی خوبیوں کو اپنی قوم کے افراد میں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے ناقہ کے پردہ میں انھوں نے قوم سے یہ خطاب کیا ہے کہ ع

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

نوٹ:- تیئس سال ہوئے جب اقبال نے قوم کو "تیز قدمی" کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن قوم نے عمل کرنا تو بڑی بات ہے، اس مشورہ کو سننا بھی پسند نہیں کیا۔

مطلب | اے میری تیز رفتار (سیار) ناقہ! تُو میری نظر میں حسن اور تیزی دونوں کے اعتبار سے "آہوئے تاتار" ہے۔ تو ہی میری دولت ہے، تو ہی میرا سرمایہ ہے اور تو ہی میری معاشں کا ذریعہ ہے! ذرا اور تیز چل! منزلِ مقصود سامنے نظر آ رہی ہے!

۲۔ تو نہایت حسین وجمیل ہے، تو نازک بدن محبوبہ ہے، اگر کوئی بڑی آنکھوں والی عورت جس کا رنگ گورا ہو، اور بال اور پتلیاں نہایت سیاہ ہوں، تجھے دیکھ لے، تو شرمندہ ہو جائے۔ یعنی تُو حور سے بھی زیادہ حسین ہے، بلکہ لیلےٰ سے بھی زیادہ دلکش ہے! تُو دخترِ صحرا ہے! یعنی فطرت نے تجھ میں وہ تمام خوبیاں رکھ دی ہیں، جو صحرا کی پاکیزہ آب و ہوا سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

رو کش: بمعنی حریف، مدِ مقابل یا شرمندہ کنندہ۔
حور: بمعنی وہ عورت جس کی تپلی نہایت سیاہ ہو، اور رنگ نہایت سفید ہو۔"

۳۔ تُو جس طرح سخت دھوپ میں ریگستان کو طے کرتی ہے اُسی طرح چاندنی راتوں میں بھی تیزی کے ساتھ سفر کرتی ہے، جیسے وہ تارہ جو تیزی کے ساتھ فضائے آسمانی میں گذر جائے۔ تو رات رات بھر چلتی ہے اور تھکنے کا نام نہیں لیتی۔ لے قدم اُٹھا تیری منزل وہ سامنے ہے!

۴۔ تو مثلِ لکۂ ابرِ رواں ہے (لکہ بمعنی دھبا یا داغ) یا تجھے کشتی بے بادباں سے تشبیہ دے سکتے ہیں، اور تو خضر کی طرح جنگل کے تمام راستوں سے واقف ہے۔ تو ہر دشواری کو بخوشی برداشت کر لیتی ہے تُو بلاشبہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔

۵۔ تجھ میں سوز و ساز دونوں کیفیتیں (حالتیں) پائی جاتی ہیں (زمام (مہار) سوز کی مظہر ہے۔ کیونکہ یہ اس امر کی دلیل ہے۔ کہ تو غیر کی اطاعت کرتی ہے۔ یا لفاظِ دگر اپنے دل پر جبر کرتی ہے۔ اور

دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے اپنی ذات کو رنج و غم میں مبتلا کرتی ہے۔ اور تیرا خرام تیرے ساز پر شاہد ہے۔ کیونکہ اسی خرام سے تجھے راحت نصیب ہوتی ہے۔ اور تو نے اس حالت (خرام) سے پوری طرح موافقت پیدا کر لی۔ تو بغیر کھائے پیئے میلوں سفر کر سکتی ہے۔ بلکہ تجھے سفر سے راحت ملتی ہے۔ اگر تو کسی جگہ مقیم ہو جائے، تو یہ قیام تیرے لیے کلفت کا موجب ہو جاتا ہے۔

۶۔ تیری تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ اگر تو یمن میں شام کرتی ہے تو صبح کے وقت قرن میں ہوتی ہے۔

قرن یمن میں ایک گاؤں ہے۔ اس کی شہرت اس بنا پر ہے کہ اس جگہ شمع رسالت کا ایک پروانہ رہتا تھا۔ جو اسلامی تاریخ میں حضرت اویس قرنیؓ کے نام سے مشہور ہے۔

وطن محبوب کا ریگ تجھے ایسا نرم محسوس ہوتا ہے، جیسے چنبیلی کے پھول! اور تو اس پر ایسی تیزی کے ساتھ چلتی ہے، جیسے غزال ختن سبزہ زار پر چوکڑی بھرتا چلا جائے۔

ختن، ترکستان میں ایک علاقہ ہے جو آہوانِ مشکین کے لیے مشہور ہے۔

۷۔ دیکھ! چاند چلتے چلتے رک گیا، اور ٹیلے کے پیچھے آرام کرنے چلا گیا۔ مشرق سے آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ رات کی تاریکی دور ہوتی جاتی ہے۔ نسیم صبح چلنے لگی۔ ذرا قدم اٹھا کر چل! منزلِ مقصود وہ سامنے ہے!

۸۔ میرا نغمہ بہت دلپذیر ہے اور اس کا آتار چڑھاؤ روح کو تازگی بخشتا ہے۔ یہ میرا نغمہ قافلوں کے لیے کوچ کا پیغام ہے۔ اور اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ فتنہ ربا بھی ہے اور فتنہ زا بھی ہے۔

فتنہ ربا میں لفظ فتنہ برے معنوں میں مستعمل ہے۔ یعنی فتنہ و فساد وغیرہ۔ اور فتنہ زا میں اچھے معنوں میں۔ یعنی عاشقانہ جذبات پیدا

کرنے والا۔

اے ناقہ! تو خوش نصیب ہے کہ مکہ مکرمہ کی طرف جا رہی ہے، جس میں حرم کعبہ واضح ہے۔ میرے ساتھ تجھے بھی اس مبارک سرزمین پر پیشانی رکھنے کی سعادت حاصل ہوگی۔

تیز ترک گامزن، منزل ما دور نیست

قطرۂ آب

ہر ہستی تازہ رو ہمہ حالت
از گشتہ راہا ز گم راہ است

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید
خجل شد چو پہنائے دریا بدید

کہ جائے کہ دریاست من کیستم
گر او ہست حقا کہ من نیستم

ولیکن ز دریا برآمد خروش
ز شرم تنک مایگی در بپوش

تمہید اس نظم کا پہلا شعر اقبال نے بطور تعارف لکھا ہے۔ یعنی شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں یہ حکایت لکھی ہے کہ بارش کا ایک قطرہ ابر سے ٹپک کر سمندر میں گرا۔ جب اُس نے سمندر کی وسعت دیکھی، تو کہنے لگا کہ افسوس! میں گرا بھی تو کہاں! بھلا سمندر کے سامنے میری کیا حقیقت ہے! جب اُس نے اپنے آپ کو بچشم حقارت دیکھا، تو صدف نے اس کو فوراً اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ حقیر قطرہ ایک آبدار موتی بن کر صدف سے نکلا۔

اقبال نے قطرہ کی حکایت کو بطرز دیگر لکھا ہے اور سعدیؒ کے دو شعروں کو اس نظم کا عنوان بنایا ہے۔ کہتے ہیں کہ

مطلب جب قطرہ نے اپنی کم مائیگی پر افسوس کیا تو سمندر نے اُس سے یہ کہا کہ تو اپنی بے بضاعتی پر افسوس مت کر میری نگاہ میں تو بہت قیمتی ہے۔ تو نے دُنیا میں بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔ تو نے رات اور دن، باغ اور صحرا کے مناظر دیکھے ہیں۔ کبھی تو گھاس کی

پتّی پر مقیم رہا ہے، کبھی بادلوں پر سوار رہا ہے، اور آفتاب کے پرتو سے تجھ میں چمک پیدا ہوئی ہے، کبھی تو نے ریگستان کی خشکی کا تجربہ کیا ہے، اور کبھی باغوں کی سیر کی ہے۔ کبھی تو انگور کی بیل میں پہنچ کر شراب (طاقت گداز) بن گیا ہے۔ کبھی خاک میں مل کر زندگی (سوز و ساز) سے محروم ہو گیا ہے۔ دراصل تو میری موجوں سے یعنی مجھ ہی سے پیدا ہوا ہے۔ اور اب تو پھر اپنی اصل سے واصل ہو گیا ہے۔ اس لیے تو رنجیدہ مت ہو۔ بلکہ میری آغوش میں آرام کر۔ یعنی اب تو موتی بن کر نکل اور دنیا میں ماہ و انجم سے بھی زیادہ تابناک زندگی بسر کر۔

محاورہ مابین خدا و انسان

خدا

جہان را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

تمہید اس دلچسپ اور معنی خیز نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے، کہ اگر انسان میں کچھ عیوب پائے جاتے ہیں تو اس میں کچھ خوبیاں بھی موجود ہیں۔

مطلب خدا نے انسان سے کہا کہ میں نے تمام انسانوں (جہان) کو یکساں پیدا کیا۔ یعنی سب کی اصل ایک ہی ہے۔ سب

آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن تُو نے اِن کو مختلف قوموں (ایرانی، تورانی، اور حبشی وغیرہ) میں منقسم کر دیا۔ میں نے زمین سے خالص فولاد پیدا کیا۔ لیکن تو نے اس دھات سے، جسے میں نے فائدہ کے لیے بنایا تھا) مہلک آلات بنائے۔ مثلاً تلوار، تیر اور بندوق۔ نیز تُو نے اس سے درختوں کو کاٹنے کے لیے کلہاڑی بنائی اور پرندوں کو قید کرنے کے لیے پنجرے بنائے۔

یہ سن کر انسان نے جواب دیا کہ اے خدا! تُو نے رات پیدا کی تو میں نے تیری تاریک رات کو منور کرنے کے لیے چراغ بنایا۔ تُو نے مٹی پیدا کی، تو میں نے اس مٹی سے پیالے بنائے۔ تُو نے بیابان، کہسار اور جنگل پیدا کیے، تو میں نے پھولوں کی کیاریاں اور گلزار اور چمن بنائے۔ تُو نے پتھر پیدا کیا۔ میں نے اُسے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا۔ (مثال کے طور پر عینک کے شیشوں کو پیش کیا جا سکتا ہے) تُو نے زہر پیدا کیا۔ لیکن میں نے زہر کو دوا میں تبدیل کر دیا۔ (مثال کے طور پر کچلہ کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو کئی دواؤں میں کام آتا ہے۔

ساقی نامہ

(در نشاط باغ کشمیر نوشتہ شد)

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے
نجوم پرن رست از مرغزارے

زمین از بہاران چو بال تذروے
ز فوارہ الماس بار آبشارے

نپیچد نگہ جز کہ در لالہ و گل
نغلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے

لب جو خود آرائی غنچہ دیدی
چہ زیبا نگارے عجب آئینہ دارے

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوت شاخسارے

بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد
ز آوائے سارے ز بانگ ہزارے

نواہائے مرغ بلند آشیانے
در آمیخت با نغمۂ جویبارے

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را
نہاد است در دامن کوہسارے

کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را
رہا سازد از محنت انتظارے

چہ خواہم دریں گلستاں گر نخواہم
شرابے کتابے ربابے نگارے

سرت گردم اے ساقی ماہ سیمائے
بیار از نیاکان ما یادگارے

بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را — فروزد چو نورے بسوزد چو نارے
۱۰ شقایق بروباں ز خاکِ نژندم — بہشتے فروچیں بجیبِ غبارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بکاشاں — ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
ز چشمِ امم ریخت آں اشکِ نابے — کہ تاثیرِ او گل دماند ز خارے
کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے — نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے
ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

تمہید اقبال نے یہ نظم نشاط باغ کشمیر میں بیٹھ کر لکھی تھی، اس کی تشبیب میں انہوں نے بہار کا منظر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد گریز کی ہے اور خدا (ساقی) سے دُعا کی ہے کہ باشندگانِ کشمیر کے دلوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کر دے۔ تاکہ وہ بھی اس دنیا میں عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔

مطلب بہار کا موسم بھی کس قدر دلفریب ہے۔ باغ کی جانب نظر کرو، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف ستارے اُگ رہے ہیں۔ (نجوم پرن سے خوشۂ پروین یعنی ستاروں کا مجموعہ مراد ہے) موسمِ بہار کی وجہ سے زمین، تدرو کے پروں کی طرح خوشنما ہو گئی ہے۔ (تدرو، ماژندران میں ایک نہایت خوش رنگ پرند ہوتا ہے) اور آبشاروں کا جو پانی فواروں سے نکل رہا ہے، وہ الماس کی طرح سفید ہے۔ گویا فواروں سے ہیرے برس رہے ہیں۔ جس طرف نظر اُٹھاؤ، لالہ اور گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ہر طرف سبزہ لہلہا رہا ہے۔ نہر کے کنارے کلیاں کس قدر حسین معلوم ہوتی ہیں! گویا ایک حسینہ آئینہ میں اپنا مونھ دیکھ رہی ہے!

باغوں یعنی درختوں کی شاخوں کی خلوت سے خوش نوا پرندوں کے گانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اور بلاشبہ سار اور ہزار کی آواز سے

جسم میں رُوح اور رُوح میں وصل کی آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ (ساراایک مرغ خوش نوا کا نام ہے۔ اور ہزار یعنی بلبل)۔

پرندوں کے گاتے کی آوازیں آبشار اور جوئبار کی آوازوں سے مل کر عجیب دلکشی کا عالم پیدا کر رہی ہیں۔ گو یا خدا نے کشمیر کے اس خطۂ بے نظیر میں جنت لا اتاری ہے۔ تاکہ انسان اس کے انتظار کی زحمت سے رہائی حاصل کر سکے، یعنی جیتے جی جنت کا لُطف اُٹھا سکے۔

باغ میں ایسا سماں ہے کہ خواہ مخواہ طبیعت شراب، غزل (کتاب) موسیقی (رباب) اور محبوب (نگار) کی طرف مائل ہوتی ہے۔

اب یہاں سے شاعر گریز کرتا ہے۔ اور خدا (ساقی) سے التجا کرتا ہے کہ اے ساقی ماہ طلعت! بزرگوں کی یاد دلوں میں از سرِ نو تازہ کر دے۔ یعنی ہمیں بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ جنھوں نے کفرستانِ کشمیر میں توحید کی شمع روشن کی تھی۔ (اشارہ ہے امیر کبیر حضرت سیّد علی ہمدانیؒ اور حضرت سیّد محمد میرک اندرابی رحمۃ اللہ[1] اور اُن کے رفقائے کار کی طرف، جن کی تبلیغی کوششوں کی بدولت آج کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی اسّی فیصدی سے بھی زیادہ ہے)

اے خدا! ہمارے دلوں (ساغر) میں آزادی کا جذبہ پیدا کر دے۔ ایسا جذبہ جو ہمارے قلوب کو منور کر دے اور ہماری جان میں آگ لگا دے۔ یعنی ہمیں سرفروشی پر آمادہ کر دے۔

اے خدا! میری سرگوں اور خوار (تشنہ) قوم میں مجاہد سرجوش نوجوان (شقائق) پیدا کر دے۔ تاکہ میری قوم جو آج مشتِ غبار کی

---

[1] استاذی المکرم حضرت مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابیؒ، پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور کے سربرستِ اجلیٰ، علومِ شریعت اور علوم طریقت دونوں میں یگانۂ روزگار تھے۔ بحمد اللہ آج بھی اُن کے اخلاف میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہیں۔۱۲

مصداق ہے۔ دُنیا میں عیش و عشرت اور کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔

اے خدا! آج ترکستان (کاشغر) سے لے کر ایران (کاشان) تک ہر شہر سے یہی صدا آرہی ہے کہ اے مسلمانو! غلامی دُنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے اور اس ملعون اور مردود زندگی سے نجات حاصل کرنا مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔

اے خدا! قوموں نے اپنی پستی اور خواری پر ایسے آنسو گرائے ہیں کہ ان کی تاثیر سے خار سے گل اُگ سکتے ہیں۔

اب یہاں سے اہلِ کشمیر کے حق میں دُعا کرتے ہیں۔

اے خدا! آج کشمیر کا مسلمان (کشیری) اپنے دین سے بے گانہ ہو چکا ہے۔ اور غلامی نے اس کی فطرت ایسی مسخ کر دی ہے کہ اُس نے ہر سنگِ مزار کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اس بُت پرستی یا قبر پرستی کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ ایک عرصہ سے (سولھویں صدی عیسوی سے) غلامی میں مبتلا ہے۔

اے خدا! غلامی نے اُسے ایسا پست ہمت کر دیا ہے کہ اب کوئی بلند خیال اس کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کبھی

ہو اگر پیدا، تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

وہ اپنی خودی سے قطعاً بے گانہ ہو چکا ہے اور ذلت و رسوائی کی اس منزل میں ہے جہاں انسان خود اپنی ہستی سے متنفر ہو جاتا ہے۔

اے خدا! کس قدر عبرت ناک ماجرا ہے کہ اس کی صناعی کی بدولت اس کے ہندو آقا (ڈوگرے اور برہمن) تو ریشمی قبائیں پہنتے ہیں، اور مشہورِ عالم کشمیری دوشالے اوڑھتے ہیں۔ لیکن وہ خود نیم برہنہ رہتا ہے اور اس کی عورتیں پنجاب کے شہروں میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ نہ اس کی آنکھ میں نگاہ ہے، نہ سینہ میں دل ہے۔ یعنی نہ اس میں عقل ہے، نہ عزم، نہ وہ موجودہ حالات کو دیکھ سکتا ہے، نہ اپنے مستقبل پر غور کر سکتا ہے۔ نہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے عزم کر سکتا ہے نہ سرِکفِ

ہو کر میدان میں آ سکتا ہے۔ مشک و زعفران بکثرت استعمال کرنے کے باوجود ضعفِ قلب میں مبتلا ہے!

اے خدا! اُس شراب سے یعنی جذبۂ حریت سے کشمیر کے موجودہ مسلمانوں کو بھی سرشار کر دے، تا کہ وہ حریت کی نعمت سے مالا مال ہو سکیں۔

شاہین و ماہی

ماہی بچۂ شوخ بہ شاہین بچہ گفت — این سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست
دارائے نہنگان خروشندہ تر از میغ — در سینۂ او دیدہ و نادیدہ بلاہاست

اپنے خروش میں ابر سے بڑھ گئے ہیں۔

با سیلِ گران سنگ زمین گیر و سبک خیز — با گوہرِ تابندہ و با لؤلؤے لالاست
بیرون نتوان رفت ز سیلِ ہمہ گیرش — بالائے سرِ ماست تہِ پاست ہمہ جاست
ہر لحظہ جوان است و روان است و دوان است — از گردشِ ایام نہ افزون شد و نہ کاست
ماہی بچہ را سوزِ سخن چہرہ برافروخت — شاہین بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست
زد بانگ کہ شاہینم و کارم بہ زمین چیست — صحراست کہ دریاست تہِ بال و پرِ ماست!
بگذر ز سرِ آب و بہ پہنائے ہوا ساز
این نکتہ نبیند مگر آن دیدہ کہ بیناست

تمہید یہ ایک آسان نظم ہے، لیکن اقبال نے اس سے جو نکتہ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ پست فطرت انسان اُس شخص سے مرعوب ہو جاتا ہے، جس کے پاس مادی ساز و سامان یا مال و دولت کی افراط ہو لیکن جس کی نگاہ مادیات سے بلند ہوتی ہے، وہ کسی شخص کو خاطر میں نہیں لاتا، خواہ وہ دنیاوی اعتبار سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ یہ نکتہ اس مثال سے واضح ہو سکتا ہے کہ اگر ہم لاہور کے قلعہ کو سطحِ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھیں، تو ہم اس کی وسعت سے یقیناً مرعوب ہو جائیں گے لیکن اگر ہم سطحِ زمین سے دس بارہ ہزار فٹ بلند ہو جائیں) تو یہی قلعہ ہمیں گھروندا نظر آنے گا۔

مطلب ایک شاہین بچہ سمندر کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ ایک ماہی بچے نے اس سے کہا کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، کوئی معمولی چیز

نہیں ہے بلکہ ایک عظیم الشان سمندر ہے، جس میں بڑے بڑے نہنگ پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے طوفان اٹھتے ہیں۔ سینکڑوں گرداب اور مختلف قسم کی آفات ہیں۔ اس کی تہ میں چمکدار موتی ہیں۔ اور جب اس میں تلاطم برپا ہوتا ہے تو کسی کی طاقت نہیں کہ اپنی جان سلامت لے جا سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ گردشِ ایام اس پر مطلق اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

یہ سن کر شاہین بچہ ہنسا اور ہوا میں بلند ہوتے ہوئے اس نے کہا کہ تو مجھ سے واقف نہیں ہے جو اس سمندر کی عظمت سے مجھے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ ارے نادان! میں ساکنانِ ارض میں سے نہیں ہوں، بلکہ شاہین ہوں۔ اس سمندر کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ ساری دنیا میرے پروں کے نیچے ہے۔ بحرِ ظلمات ہو یا صحرائے افریقہ۔ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ مجھے تیری دنیا کی کوئی شے مرعوب نہیں کر سکتی۔

اگر تو بھی اس بلند مقام کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو پانی (زمین) کی سطح سے اوپر اٹھ! فضائے آسمانی میں پرواز کر، تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میری نگاہ میں سمندر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کی موجیں، اس کے گرداب، اس کی بلائیں، اس کے نہنگ، اس کا تلاطم، اس کا سیل، یہ سب ان لوگوں کے لیے باعث خطر ہیں، جو پستی میں رہتے ہیں۔ شاہین تو پہنائے ہوا (فضائے آسمانی) میں رہتا ہے۔ یہ آفات اس کے ناخن کو بھی نہیں چھو سکتیں۔ لیکن اس نکتہ کو صرف وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو صاحبِ عقل ہے۔

بادشاہ، نواب، جاگیردار، اربابِ دولت اور صاحبانِ اقتدار صرف اس شخص کو مرعوب کر سکتے ہیں جو علائقِ دنیوی میں گرفتار ہو، اور مادیات کا پرستار ہو۔ لیکن جو شخص زخارفِ دنیوی (مال و جاہ) سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ وہ کسی بادشاہ (سمندر) کو خاطر میں نہیں لاتا، لیکن یہ یاد رہے کہ:۔

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اسکا
وجود جسکا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

کرمکِ شب تاب

شنیدم کرمکِ شب تاب می گفت — نہ آں مورم کہ کس نالد ز نیشم
تواں بے منتِ بیگانگاں سوخت — نپنداری کہ من پروانہ کیشم
اگر شب تیرہ تر از چشمِ آہوست
خود افروزم چراغِ راہِ خویشم

تمہید اس موضوع پر اس سے پہلے نظم بر ص ۱۲۲ میں بھی اقبال نے جگنو کی زندگی پر اظہارِ خیالات کیا ہے۔ لیکن اس مختصر نظم میں اس کی ایک خاص صفت کو واضح کیا ہے۔ جو اقبال کے نظامِ فکر میں بہت اہم مرتبہ رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جگنو اپنے راستہ کو خود منور کرتا ہے کسی غیر کا دستِ نگر نہیں ہوتا۔ اور اقبال نے ہمیں اسی بات کی جابجا تلقین کی ہے :-

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

اسرارِ خودی میں انہوں نے اس نکتہ کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لیے ایک مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے " خودی از سوال ضعیف می گردد"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبال نے جگنو کی زندگی سے اپنے فلسفہ کو مبرہن کیا ہے۔

مطلب میں نے سنا کہ ایک جگنو یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک بے ضرر کیڑا ہوں کسی کو میری ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اے مخاطب! تو یہ مت سمجھنا کہ میں پروانہ کا ہم مشرب ہوں، ہرگز نہیں، میں تو "بے منتِ غیر" جلتا ہوں۔ کسی کا احسان لینا میری فطرت کے خلاف ہے۔ رات خواہ کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو۔ میں دوسرے کے

سامنے روشنی کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اپنی راہ خود منور کرتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں "خود" افروز" ہوں۔

نوٹ:- اقبال یہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے اندر خود افروزی کی صفت پیدا کرے، اور یہی اس نظم کی غایت ہے۔

تنہائی

به بحر رفتم و گفتم به موج بیتابی — همیشه در طلب استی چه مشکلی داری؟
هزار لؤلؤی لالاست در گریبانت — درون سینه چو من گوهر دلی داری؟
تپید و از لب ساحل رمید و هیچ نگفت

به کوه رفتم و پرسیدم این چه بیدردی است — رسد به گوش تو آه و فغان غمزده‌ای؟
اگر به سنگ تو لعلی ز قطرهٔ خون است — یکی در آ به سخن با من ستم‌زده‌ای
به خود خزید و نفس درکشید و هیچ نگفت

ره دراز بریدم ز ماه پرسیدم — سفر نصیب! نصیب تو منزلی است که نیست؟
جهان ز پرتو سیمای تو سمن زاری — فروغ داغ تو از جلوهٔ دلی است که نیست؟
سوی ستاره رقیبانه دید و هیچ نگفت

شدم به حضرت یزدان گذشتم از مه و مهر — که در جهان تو یک ذره آشنایم نیست
جهان تهی ز دل و مشت خاک من همه دل — چمن خوش است ولی درخور نوایم نیست
تبسمی به لب او رسید و هیچ نگفت

تمہید: اگر یہ نظم بہت آسان ہے لیکن بڑی دلکش اور اثر آفرین ہے اس میں اوّل سے آخر تک ایسی رومانی کیفیت پائی جاتی ہے کہ لفظوں سے اس کا اظہار ناممکن ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اپنی فکر کی رسائی اور تخیل کی بلندی کا کمال ظاہر کر دیا ہے۔

اس کا عنوان دراصل ایک دعویٰ ہے، اور شاعر نے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل مہیا کیے ہیں، وہ بڑے سے بڑے نقادانِ فن سے خراجِ تحسین وصول کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس نظم دلپذیر کا بنیادی تصور وہی ہے جو حافظ کے اس شعر سے واضح ہے:-

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

یعنی کائنات میں کوئی ہستی عشقِ حقیقی (امانت) کے بار کو اُٹھانے کی متحمل نہ ہو سکی۔ یہ بوجھ صرف حضرت انسان نے اُٹھایا بالفاظِ دگر، اس اعتبار سے انسان اس کائنات میں بالکل تنہا (منفرد) ہے۔ کوئی ہستی اس کی شریک و سہیم نہیں ہے۔

مطلب میں نے سمندر کی موج سے پوچھا کہ تجھ پر کیا افتاد پڑی ہے کہ تو ہر وقت مضطرب رہتی ہے؟ تیری آغوش میں بلاشبہ لاکھوں موتی ہیں۔ لیکن یہ تو بتا کہ تیرے سینہ میں وہ گوہر بھی ہے، جو میرے سینہ میں ہے؟ یعنی کیا تو بھی میری طرح کسی کے عشق میں مبتلا ہے؟ یہ سن کر وہ تڑپی اور خاموش واپس چلی گئی۔ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

میں نے پہاڑ سے پوچھا۔ "کیا کبھی تیرے کانوں تک کسی غمزدہ کی آہ و فریاد بھی پہنچتی ہے؟ اگر تیرے سینہ میں محبت کا جذبہ (قطرۂ خون) موجزن ہو، تو دو گھڑی مجھ ستم رسیدہ کی داستانِ غم بھی سُن لے" یہ سن کر اُس نے اپنے آپ کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ (دم بخود رہ گیا۔ مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

میں طویل مسافت طے کرنے کے بعد چاند کے پاس پہنچا، اور اُس سے پوچھا۔ اے مسافر! تیری کوئی منزل بھی ہے کہ نہیں؟ ساری دُنیا تیری چاندنی کی بدولت رشکِ یاسمین بنی ہوئی ہے (تیرے نور سے منور ہے) لیکن یہ تو "آرزو کی تب و تاب" میں بھی گرفتار ہے، یا نہیں! یہ سُن کر اُس نے ستاروں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی اپنے رقیب کو دیکھتا ہے۔ لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

نوٹ: "رقیبانہ دید" میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ماہتاب نے زبانِ حال سے یہ کہا کہ میرا فروغ ذاتی نہیں ہے بلکہ میری روشنی بھی ستاروں کی طرح آفتاب سے مستعار ہے۔

آخر کار میں بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ اے خدا! تیری اِس طویل اور عریض دنیا میں ایک ذرہ بھی میرا ہم مشرب (درد

آشنا) نہیں ہے۔ یہ جہان جذبۂ عشق سے یکسر خالی ہے۔ اور میں سراپا عشق ہوں۔ اس لیے یہ دُنیا اگرچہ بہت دلکش ہے۔ لیکن اس قابل نہیں ہے کہ میں نغمہ سرائی کروں اور داستانِ عشق بیان کروں کیونکہ نہ کوئی میرا ہم زبان ہے۔ نہ ہم داستان۔

یہ سُن کر اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ اور بس۔

نوٹ: تبسمے بلب اور سید کنایہ ہے تصدیق سے۔ یعنی اگرچہ حضرتِ یزداں نے میری معروضات کے جواب میں کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ لیکن اس تبسم نے جو اُس کے لبوں پر نمودار ہوا۔ میری معروضات کی تصدیق کر دی کہ واقعی اقبال جو کچھ کہتا ہے، سچ کہتا ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کے علاوہ اور کسی مخلوق کے سینہ میں جذبۂ عشق ودیعت ہی نہیں کیا ہے۔

دوسری بات غور طلب اس ترکیب میں یہ ہے کہ اقبال نے یہ نہیں کہا کہ حضرتِ یزداں تبسم کرد۔ بلکہ ذاتِ باری کے بجائے خود تبسم کو فاعل قرار دیا ہے۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جو معنوی لطافت "تبسمے بلب اور سید" میں پائی جاتی ہے وہ "تبسم نمود" میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ تبسمے اور تبسم میں جو نازک ادبی فرق ہے، اس کا اندازہ ذوقِ سلیم ہی کر سکتا ہے۔

(۲) "تبسم نمود" کی ترکیب اپنے اندر گستاخی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ لیکن "تبسمے بلب اور سید" اس عیب سے پاک ہے۔

(۳) چونکہ یزداں نے، جیسا کہ سب جانتے ہیں، انسان کے سوا اور کسی مخلوق میں یہ جذبۂ ودیعت نہیں کیا، اس لیے تبسم کا رنگ خود بخود اس کے لبوں سے نمایاں ہو گیا۔ اور اربابِ ذوق جانتے ہیں کہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے تبسم نمود کے بجائے "تبسمے بلب اور سید" ہی موزوں اور برمحل ہے۔

شبنم

گفتند فرود آی ز اوج مه و پروین ‌ ‌ بر خود زن و با بحر پر آشوب بیامیز
با موج درآویز
نقشی دگر انگیز
تابنده گهر خیز

من عیش هم آغوشی دریا نخریدم ‌ ‌ آن باده که از خویش رباید نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لاله چکیدم

گل گفت که هنگامهٔ مرغان سحر چیست؟ ‌ ‌ این جنبش آهسته باد سحر چیست؟
این زیر و زبر چیست؟
پایان نظر چیست؟
خندهٔ گل چیست؟

گر نیستی ای گوهر این جستجو چیست؟ ‌ ‌ بر شاخ من این [illegible] سرا چیست؟
مقصود تو ناچیست؟
مطلوب صبا چیست؟
این کهنه سرا چیست؟

گفتم که [illegible] حیات همه جائی است ‌ ‌ بند است که شیرازهٔ او ذوق جدائی است
[illegible] است
جان [illegible] است
این راز خدائی است

ای از [illegible] تو از خاک دمیدی ‌ ‌ از ذوق نمود است که [illegible] چکیدی
در شاخ تپیدی
صد پرده دریدی
بر خویش رسیدی

نم در رگ و [illegible] است ‌ ‌ این [illegible] است
[illegible] است
[illegible] است
[illegible] است

در [illegible] است ‌ ‌ [illegible] است
از عشق [illegible] است
در [illegible] است
این [illegible] است

[illegible] ‌ ‌ با او ز خورشید جهان تاب نظر باز
با این [illegible]
[illegible]
[illegible]؟

تمہید یہ ایک اہم تمثیلی نظم ہے، جس میں اقبال نے عارف (عاشق) کو شبنم اور عامی (انسان) کو "گل" قرار دیا ہے۔ اور شبنم کی زبان سے خدا، انسان اور کائنات سے متعلقہ مسائل کا حل اپنے مخصوص افکار و خیالات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس نظم میں جن مسائل پر اظہارِ خیالات کیا ہے، وہ فلسفہ کے بنیادی مسائل ہیں۔ اور انہی مسائل کے جوابات کے نتیجہ میں فلسفہ کے متعدد مذاہب دنیا میں پیدا ہو گئے، جو سب کے سب آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور قیامت تک اسی طرح مصروفِ پیکار رہیں گے۔ ؎

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

اقبال نے ان مسائل کو ایک فلسفی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ فلسفہ انسان کو زندگی سے دُور کر دیتا ہے:۔

انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دُوری!

بلکہ انھوں نے ان مسائل کو ایک عاشق کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ عشق انسان کو حقیقت سے ہم آغوش کر دیتا ہے۔

بچشمِ عشق نگر تا سراغِ او گیری
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است

اِس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) کارکنانِ قضا و قدر نے قطرۂ شبنم کو یہ مشورہ دیا کہ تو واصلِ بحر ہو کر گوہرِ تابندہ بن جا۔ لیکن اُس نے یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ بلکہ بحر کے بجائے برگِ لالہ کو اپنا مسکن بنایا۔

(۲) گلِ لالہ نے شبنم سے چند سوالات کئے، شبنم نے اُن کے جوابات دیئے اور آخر میں گل کو ایک مشورہ دیا۔ اور یہی مشورہ اِس نظم کی جان ہے۔ اور اسی لیے اقبال نے شبنم اور گل کا یہ مکالمہ قلمبند کیا ہے۔ وہ مشورہ یہ ہے کہ انسان کو لازم ہے اگر

علائق دنیوی سے قطع نظر کر کے ذاتِ مطلق (خورشید) کو اپنی محبت کا مرکز بنائے۔۱۲

مطلب کارکنانِ قضا و قدر نے قطرۂ شبنم کو یہ مشورہ دیا کہ آسمانوں کی بلندی سے نیچے اُتر آ، اور دنیا میں رہ کر اپنی خودی کو مستحکم کرے۔ ("بر خود زدن" اقبال کی اصطلاح ہے جس سے استحکام خودی مراد ہوتی ہے) اور بحرِ پُر آشوب میں شامل ہو کر موجوں سے جنگ کر، نئی شکل و صورت اختیار کر، یعنی قطرۂ شبنم سے گوہرِ تابندہ بن جا۔

(۲) قطرۂ شبنم نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ بحر کی ہم آغوشی میں بڑا لطف (آنند) ہے۔ لیکن ایک خرابی ہے کہ پھر کچھ دنوں کے بعد اپنا سراغ ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اس لئے میں وہ شراب پینے کے لیے تیار نہیں ہوں، جو مجھے اپنی خودی سے غافل کر دے۔

نوٹ:۔ اس مصرع میں اقبال نے اپنا فلسفہ بیان کر دیا ہے یعنی وہ وصال کے بجائے فراق کی تعلیم دیتے ہیں، کیونکہ وصل کے بعد واصل فنا ہو جاتا ہے۔ میں کسی صورت میں خود فراموشی کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں، اس لیے میں ساری دُنیا سے قطع نظر کر کے برگِ لالہ پر ٹپکنا بہتر سمجھتا ہوں۔

(۳) یہ کہہ کر وہ قطرہ، گُل لالہ پر ٹپک پڑا۔ برگِ لالہ نے اس سے پُوچھا کہ باغ میں مرغانِ سحر کا یہ ہنگامہ کیا ہے؟ اور اس انجمن کا جو درختوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ مطلب کیا ہے؟ پستی اور بلندی یعنی اُن امتیازات سے جو کائنات میں مشہور ہوتے ہیں کیا مُراد ہے؟ غور و فکر کا انجام کیا ہے؟ یا مشاہدہ کی انتہا کیا ہے؟ گُل کے پہلو میں یہ خار کیوں ہے؟

(۴) سوالات کا سلسلہ جاری ہے، تُو کون ہے؟ میں کون ہوں؟ یعنی مخلوقات کی حقیقت کیا ہے؟ اور ہماری اس صحبت (ایک جائی) کا

مطلب کیا ہے؟ یعنی ہم ایک دوسرے سے کیوں ملتے ہیں؟ میری شاخوں پر جو طائرِ نغمہ سرا ہے تو کیوں؟ یہ کون ہے؟ اور کیوں گا رہا ہے؟ اور یہ صبا کیوں ہر وقت مصروفِ گلگشت رہتی ہے؟ اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ یہ دُنیا (سرائے کہنہ) کیا ہے؟

(۵) میں (شبنم) نے جواب دیا کہ:-

(ا) یہ دُنیا ایک میدانِ جنگ ہے۔ یہاں ہر جگہ زندگی مصروفِ پیکار ہے۔ اِس کشمکش اور پیکار کو اصطلاح میں "تنازع للبقاء" کہتے ہیں۔ اسی تنازع کا نتیجہ "بقائے اصلح" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی وہی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، جن میں آگے بڑھنے (ارتقاء) کی صلاحیت (قابلیت) موجود ہوتی ہے۔ اور یہ قانون، اشیاء کے علاوہ اقوام پر بھی حاوی ہے۔ اگر مسلمانوں نے آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کی، تو وہ بھی مٹ جائیں گے۔ کیوں کہ رزمگاہِ حیات میں جو بھی ٹھہرا، وہ فوراً کچلا گیا۔

(ب) دُنیا بلاشبہ ایک انجمن ہے، ایک بزم ہے، لیکن ایسی بزم ہے جس میں ہر وقت آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے:-

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بدیگرے پرداخت

یہ وہ بزم ہے جس میں ہم جُدا ہونے کے لیے ملتے ہیں۔ اس دُنیا کا شیرازہ یعنی نظام اِس نہج پر قائم ہے کہ یہاں جدائی لازمی ہے۔ اسی لیے عقلمند آدمی کسی سے دل نہیں لگاتا:-

مُسافر سے بھی کوئی کرتا ہے پیت
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

(ج) زندگی (رَم) کیا ہے؟ عاشق یا آہ و فریاد (گرم نوازی) کا دوسرا نام ہے، یعنی انسان کی حیاتِ ارضی کا مقصد یہ ہے کہ وہ فراق میں آہ و فریاد کرتا رہے:-

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش (مرشدِ رُومی)

نوٹ:- دم سے زندگی مُراد ہے، چنانچہ کہتے ہیں "جب تک دم ہے تب تک غم ہے"۔ دم بمعنی سلسلۂ انفاس مستعمل ہے۔۱۲

(د) اب رہی جان یعنی رُوح، تو یہ اس محبوبِ حقیقی کی صورت نمائی یا چہرہ کشائی کا نام ہے۔ جسے اصطلاح میں ظہور یا ظہورِ تجلیات کہتے ہیں۔ یعنی اسمائے مطلق کا ظہور، اسمائے مقیدہ کے لباس میں ہو رہا ہے، چونکہ یہ بات فہمِ انسانی سے وراء الورا، بالاتر ہے۔ اس لیے اقبال نے اس کو بجا طور پر "رازِ خدائی" سے تعبیر کیا ہے:۔

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن (ضربِ کلیم)

قرآنِ حکیم نے بھی اس معاملہ کو صیغۂ راز ہی میں رکھا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ؕ

آپ کہہ دیجیے کہ رُوح میرے رب کے حکم سے موجود ہوتی ہے، اور اس کے موجود ہونے کی کیفیت تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی، کیونکہ تم کو حقائق کا بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

(ہ) انجذابات کا سلسلہ چل رہا ہے،

کائنات میں جو کچھ ہنگامہ نظر آرہا ہے۔ مثلاً مرغانِ چمن کی نغمہ سرائی یہ سب ذوقِ نمود کا نتیجہ ہے۔ خالقِ کائنات نے ہر شے کی فطرت میں اُبھرنے کا جذبہ (ذوقِ نمود) ودیعت کر دیا ہے۔ ہر شے ظہور ــــــ اپنا ظہور چاہتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ہر شئے سے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ اور اگر وہ ظہور چاہے، تو پھر دُنیا میں کونسی طاقت اسے ظہور سے باز رکھ سکتی ہے؟ اور سچ پُوچھو تو اس کے سوا دُنیا میں کوئی طاقت موجود ہی کہاں ہے؟

میں آسمان سے نیچے کی طرف ٹپکا ہوں، تو زمین سے اُوپر کی طرف

اُبھرا ہے۔ یہ ٹپکنا اور اُگنا، چٹکنا اور شگفتہ ہونا، پہلے مسکرا کر، اپنی طرف متوجہ کرنا، پھر ایک ادا سے نگاہیں نیچی کر لینا۔ جسے شاعری کی زبان میں بجلی گرانا کہتے ہیں، یہ سب اسی ذوقِ نمود کے گوناگوں کرشمے ہیں۔

اے گُل! تو اسی ذوقِ نمود کی بدولت شاخ سے پھوٹا، اُبھرا اور شگفتہ ہوا۔ یعنی کئی پردوں کو پھاڑ کر باہر نکلا۔ اور انجام کار گُل کی شکل میں نمایاں ہو گیا۔ اور یہی تیری حیات دوروزہ کا مقصد ہے کہ تو نمایاں ہو جائے۔

(۷) (جوابات کا سلسلہ چل رہا ہے)۔

قطرۂ شبنم اب بلند ترین فلسفہ بیان کرتا ہے (میری رائے میں وحدۃ الوجود سے بالاتر کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ کیونکہ فکر انسانی اس سے اوپر نہیں جا سکتی)۔

کہتا ہے کہ اے گُل! کائنات میں جو کچھ ہنگامہ پا یا جاتا ہے بلکہ جو کچھ زندگی پائی جاتی ہے (نم در رگِ ایام) یہ سب حضرت عشق کا کرشمہ ہے (اشکِ سحر کنایہ ہے عاشق سے)

اب رہا یہ امتیاز کہ فلاں شخص دولت مند ہے اور فلاں شخص مفلس ہے۔ یہ نشیب و فراز، یہ پست و بلند کا امتیاز، یہ سب فریب نظر ہے۔ خندق والے کو زمین والا اُونچا نظر آتا ہے لیکن زمین والا ہوائی جہاز والے کو اُونچا سمجھتا ہے۔ اور جو شخص ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑا ہو وہ ساری دُنیا کو زیر پا خیال کرتا ہے۔ اور حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ نہ کوئی زیر ہے نہ زبر ہے۔ یہ سب فریبِ نظر ہے۔ بلکہ وہی ذاتِ واحد ہر شے میں جلوہ گر ہے۔

جب حقیقت یہ ہے کہ دُوسرا موجود ہی نہیں ہے، تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ "انجم بہ بر ماست" یعنی انجم ہم میں ہے اور ہم انجم میں ہیں۔ یعنی جو انجم میں تابش بن کر ظاہر ہو رہا ہے، وہی آنکھوں میں پتلی بن کر دیکھ رہا ہے۔ ورنہ کوئی فلسفی یہ نکتہ مجھے سمجھا دے کہ بھورے رنگ

کا مادہ جسے دماغ کہتے ہیں، کیسے دیکھ سکتا ہے؟
جسے تم یہ کہتے ہو کہ وہ بہت دُور ہے دراصل وہ ہماری آغوش میں ہے۔ ہمارے ہی وجود کا ایک حصّہ (لختِ جگر) ہے:۔

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

(۸) جوابات کا سلسلہ اس بند میں ختم ہو جاتا ہے)۔
قطرہ کہتا ہے۔ اے گل! جسے تو اپنی غلط بینی کی وجہ سے خار کہتا ہے، وہ خار نہیں ہے، بلکہ شاہدِ گل کی قمیص میں خیاطِ فطرت کی سوئی اٹک گئی ہے! لیکن اگر تجھے اسے خار کہنے پر اصرار ہے، تو یونہی سہی۔ خار اگرچہ خار ہے۔ لیکن گل کا ہمنشین تو ہے (ندیمانِ نگار) ۔ یعنی دراصل وہ گل پر عاشق ہے۔ اور غم میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے! گل اور خار دونوں کا وجود اسی ذاتِ واحد (بہار) کا کرشمہ ہے۔ دونوں میں وہی جلوہ گر ہے لہٰذا تو اُن دونوں میں کوئی امتیاز مت کر:۔

بیروں از شاخ بینی خار و گل را
درونِ او نہ گل پیدا نہ خار است

(۹) آخری بند میں قطرۂ شبنم گل کو نصیحت کرتا ہے کہ مخلوقات سے قطعِ نظر کر کے ذاتِ حق (خورشید) کو اپنی محبت کا مرکز بنا۔ اور اس کا طریقہ اہلِ نظر سے سیکھ لے۔ یعنی عاشقوں کی صحبت اختیار کر۔
مطلب یہ ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ مخلوقات کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بنائے۔ جو شخص مخلوق سے محبت کرتا ہے وہ ساری عمر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی مثال بقول شیخ ابن عطا اسکندرانیؒ اُس گدھے کی سی ہے جو چکی میں چلتا ہے۔ اور جو اس کی سیر کی ابتدا ہے وہی اس کی سیر کی انتہا ہے۔ یعنی وہ فانی مخلوق سے سفر شروع کرتا ہے اور فانی مخلوق ہی پر اپنے سفر کو ختم کر دیتا ہے۔ بالفاظِ دگر ساری

مگر کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔

پس جویائے حقیقت کو لازم ہے کہ مخلوقات سے خالق کی طرف چلے۔ چونکہ خالق غیر محدود ہے۔ اس لیے سالک کی سیر بھی لاانتہا ہو گی۔ اسی کو اقبال نے حیاتِ دوام سے تعبیر کیا ہے۔ اور قرآنِ حکیم نے اس آیت میں اسی حقیقتِ کبریٰ کو واضح کیا ہے :-

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (۵۳ : ۴۲)

اور یہ کہ سب کو آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے۔ یعنی ہر سالک کی انتہائے سلوک تیرے پروردگار تک ہے۔

آخری نصیحت اے گل! (اے انسان) اس عالم سفلی سے یکسر قطع تعلق کر دے اور میری طرح عالم علوی کی طرف پرواز کر۔ تاکہ اپنا مقصدِ حیات حاصل کر سکے۔ میں نے تجھے زیست کے اسرار سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب تو اپنے دل کو ٹٹول اور مجھے بتا کہ تیرے اندر پرواز (روحانی ترقی) کی آرزو پیدا ہوئی یا نہیں! اگر نہیں ہوئی تو بلاشبہ تیری بدبختی میں کوئی شک نہیں ہے۔"

نوٹ :- واری سر پرواز! میں جو لطافتِ بیان اور بلاغت کی شان مضمر ہے، اس کی شرح نثر میں نہیں ہو سکتی۔ تاہم استفہام کا مفہوم میں نے کسی حد تک واضح کر دیا ہے۔ ۱۲

عشق

گشتم چو بجستجوئے تسنیم — در وادیِ شہد و زہرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم — دامن چوں گرد باد چیدم
پویاں بے خضر سوئے منزل — بر دوشِ خیال بستہ محمل
پویا سوئے دشت گشت جائے — چوں صبح بہار جیدہ واے
پیچیدہ بجو چو موج دریا — آوارہ چو گرد بادِ صحرا
عشقِ تو دمے زبود ناگاہ — از کارِ گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز ہستی و عدم ساخت — جستن ز حقیقتم ساخت
چوں برق بجسم گرم گندم — از لذتِ سوختن خبر کرد
سرمست شدم ز پا فتادم — چوں عکس ز خود جدا فتادم

خاکم بہ ز خروش بودی | زان راز کہ با دلم سپردی
واصل بجمال گشتیم | عرفان جمال نگشتیم
جز عشق حکایتے ندارم | پروائے ملامتے ندارم
از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم

تمہید اس نظم میں اقبال نے اس انقلاب کا تذکرہ کیا ہے، جو عشق کی بدولت انسان کی زندگی میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میری عقل، حقیقت کی تلاش میں سرگردان، اور پریشان تھی۔ ناگاہ میرے دل میں عشقِ حقیقی کا جذبہ پیدا ہوا جس نے مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ اِس لیے میں نے عقل کے بجائے عشق کی پیروی اختیار کر لی۔

اِس نظم میں بعض الفاظ اور محاورات وضاحت طلب ہیں، اس لیے ذیل میں ان کا مفہوم لکھے دیتا ہوں، تاکہ عبارت کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

فکر:۔ منطق اصطلاح میں ذہن (عقل) کے ترتیبی عمل کو فکر کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی حرکت ہے جو ذہن انسانی کسی مجہول کی تحصیل کے لیے کرتا ہے، عرفِ عام میں فکر کہتے ہیں۔ کسی مسئلہ میں غور کرنے کو یہ ان الفاظ میں سے ہے جن کو ہر شخص ہر وقت بولتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہیں، جسے شک ہو، وہ خود، فکر، میں فکر کر کے دیکھ لے۔ میں اِس لفظ کی پوری وضاحت گلشنِ راز جدید کی شرح میں پیش کروں گا۔

گِرد باد:۔ یعنی بگولا۔

دامن چیدن:۔ یعنی علیحدہ ہونا، کنارہ کرنا، احتراز کرنا۔

محمل بستن:۔ کنایہ ہے سفر یا روانگی سے۔

بہ دام چیدن:۔ کنایہ ہے سعیٔ لاحاصل سے۔

بخود پیچیدن:۔ کنایہ ہے اپنی ذات میں غور کرنے سے۔

از پا افتادن:۔ کنایہ ہے حالت بے خودی سے۔

طوفانِ جمال:- کنایہ ہے وفورِ حسن وجمال سے۔

مطلب کہتے ہیں کہ جب میری عقل رفکر نے حقیقت کی جستجو شروع کی تو ہر ممکن کوشش کر دیکھی، یعنی دَیر رتبخانہ) کی سیر بھی کی۔ حرم کا طواف بھی کیا۔ مدتوں اس کی تلاش میں سرگردان رہی۔ سب سے علیحدہ ہو کر طلب کے میدان میں دَوڑتی رہی۔ منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی تگ ودو کرتی رہی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اسے کوئی رہنما نہ مل سکا ربیاباں بے خضر) جو خیال ذہن میں آیا۔ اسی کی اتباع کرنے لگی۔ اس اُمید پر کہ شاید یہی خیال منزلِ مقصود تک پہونچا دے۔

میری عقل کی حالت اُس جویائے شراب سے مشابہ تھی جو شراب کا آرزومند ہو۔ لیکن اس کا جام ٹوٹا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ کبھی سیراب نہیں ہو سکتا۔ مدتوں سعیٔ لاحاصل کرتی رہی۔ ایک عرصہ تک اپنے اندر غور وفکر کرتی رہی، اور بگولے کی طرح آوارہ پھرتی رہی۔

ناگاہ محبوبِ حقیقی کا عشق مجھ پر مستولی رغالب) ہو گیا۔ رعشق تو ولم ربود، میں رتوا کا مخاطب محبوبِ حقیقی ہے) اس کی بدولت میری مشکلات کا خاتمہ ہو گیا۔ عشقِ حقیقی نے مجھے ہستی اور عدم کے مفہوم سے آگاہ کر دیا۔ بالفاظِ دگر میری عقل کو مسلمان بنا دیا۔ اور اس طرح مجھے تصوراتِ باطلہ کی پیروی ربت پرستی) سے نجات مل گئی۔

عشقِ حقیقی نے برق کی طرح میرے خرمنِ ہستی کو جلا دیا۔ یعنی مجھے ماسوی سے بےگانہ بنا دیا۔ اور میرے اُوپر مستی کا عالم طاری کر دیا۔

اے محبوب! تُو نے مجھے راز سے آگاہ کر دیا، جس کی بدولت میں مادیات رعالم ناسوت) سے بالاتر ہو کر رُوحانیات رعالم ملکوت) میں داخل ہو گیا۔

زماں راز کہ با ولم سپردی، اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے بڑا راز جسے اس کی عقل نہیں سمجھ سکتی، یہ ہے کہ مطلق رحق تعالیٰ) مقید کس طرح بن گیا؟ یہ راز صرف عشق کی بدولت انسان پر آشکار

ہو سکتا ہے۔ لفظوں کے ذریعہ سے اس کو۔ کوئی سمجھا سکتا ہے، اور نہ کوئی سمجھ سکتا ہے۔

اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ حق تعالے انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن وہ کس طرح اس قدر قریب ہو گیا! عقل اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ اس سوال کا جواب عشق دے سکتا ہے:۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔

یہ معرفت عقل کی بدولت نہیں بلکہ صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔

بہر کیف شاعر کہتا ہے کہ جب میں اس راز سے آگاہ ہو گیا تو میری کشتی ساحل مقصود پر پہنچ گئی۔ اور میری ہستی (زمشتی) سراپا جمال بن گئی یعنی "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو گیا۔

اس لیے میں نے عقل کے مسلک کو خیرباد کہہ کر عشق کا مسلک اختیار کر لیا۔ اور مجھے کسی فلسفی کی ملامت کی پرواہ نہیں ہے۔ اب میں علم کے جلووں سے بے نیاز ہوں اور عشق کی آگ میں جل رہا ہوں اور یہ جلنا ہی میری ابدی زندگی کا ذریعہ ہے۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

تذروے با تذروے درد دل گفت ازیں پس در حرم گیرم مکانے
بصحرا صید بنداں در کمین اند بکام آہواں صبحے و شامے
دلم از فتنۂ صیاد خونم
دمے ز اندیشہ آزاد خواہم
رفیقش گفت اے یار خردمند اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فساں زن ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب و تواں را امتحان است
عیار ممکنات جسم و جان است

تمہید اس مختصر تمثیلی نظم میں اقبال نے اپنا فلسفہ واضح کیا ہے کہ مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے سے ہی انسان کی خودی مستحکم ہو سکتی ہے۔ جو شخص آرام کی زندگی بسر کرتا ہے، وہ کبھی کسی مہم کو سر نہیں کر سکتا اور نہ میدان جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ اقبال کے فلسفہ کی تائید کرتی ہے۔ یعنی جب کسی قوم میں تن پروری اور راحت طلبی پیدا ہو گئی، تو وہ قوم مغلوب ہو کر رفتہ رفتہ دنیا سے مٹ گئی۔ ع

آہ مسلم بھی زمانہ سے یونہی رخصت ہوا

اقبال نے اس نظم کے مضمون کو ایک رباعی میں بھی بیان کیا ہے۔ جس کا دوسرا شعر یہ ہے:-

بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مطلب ایک ہرن نے دوسرے ہرن سے ان الفاظ میں اپنا دردِ دل بیان کیا کہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کعبۃ اللہ (حرم) میں پناہ گزین ہو جاؤں کیونکہ وہاں کوئی شخص کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہاں صحرا میں تو زندگی بہت دشوار ہو گئی ہے۔ ہر وقت شکاری ہماری گھات میں لگے رہتے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح مجھے اس فتنہ صیاد سے امان مل سکے۔

اس کے ساتھی نے کہا اے دوست اگر تو دنیا میں زندہ رہنے کا آرزو مند ہے تو خطروں میں، مصیبتوں میں اور آفتوں میں زندگی بسر کر کیونکہ زندگی کا لطف ہی مشکلات کا مقابلہ کرنے میں ہے۔ خطرات اور مشکلات کا مقابلہ کرنے سے خودی میں وہی تیزی پیدا ہو جاتی ہے، جو تلوار کو سان پر چڑھانے سے اس کی دھار میں پیدا ہو جاتی ہے۔

تو خطرات اور مشکلات سے اپنی طاقت اور ہمت کا امتحان کر سکتا ہے۔ کیونکہ خطرہ جسم وجان (شخصیت) کے اندر جو طاقتیں مخفی ہیں ان کے لیے کسوٹی کا کام دیتا ہے۔ اور تو جانتا ہے کہ جب تک سونے کو کسوٹی پر نہ پرکھا جائے، بازار میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اسی طرح

جب تک انسان امتحان میں کامیابی حاصل نہ کرے، جب تک اپنے آپ کو کسوٹی پر نہ پرکھے، جب تک مشکلات کا مقابلہ نہ کرے اس وقت تک اسے عزت اور شہرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

جہانِ عمل

مستی میکدہ و دعوت عام است اینجا
قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا

حرف آن راز کہ بیگانۂ صوت است ہنوز
از لب جام چکیدہ است کلام است اینجا

نقد از حال بگیرند و گذشتند ز قال
عشرت نسیۂ فردا ز حرام است اینجا

ما درین رہ نفسی ہمسفر انداختہ ایم
آفتاب سحر او لب بام است اینجا

سر کار تو پاسی گدا گرد کہ خودی دانی
آنچہ پیشین تو ز تمکین است غلام است اینجا

ما کہ اندر طلب از خانہ برون تاختہ ایم
ہم از اہل پرسیدیم و عمل ساختہ ایم

تمہید اس دلکش نظم میں اقبال نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ دُنیا عمل (جدوجہد) کی دنیا ہے۔ یہاں اسی کو سروری حاصل ہو سکتی ہے (جو اس کے لیے کوشش کرے۔ جیسے

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

یہ نظم اپنی دلکشی اور روانی اور ردیف و قافیہ کی یکسانی کے لحاظ سے پڑھنے والے کو حزیںؔ کے اس شعر کی یاد دلاتی ہے ؎

از بنارس نروم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن بچہ لچھمن و رام است ایں جا

مطلب کہتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک میکدہ ہے اور اس کا دروازہ ہر پینے والے کے لیے چوپٹ کھلا ہوا ہے اور ہر شخص اپنے ظرف (حوصلہ) کے مطابق شراب (کامیابی) حاصل کر سکتا ہے۔

نوٹ :- پہلے زمانہ میں مے نوشوں کو ان کے ظرف کے مطابق شراب دی جاتی تھی۔ چنانچہ غالبؔ نے اس مضمون کو اپنے شعر میں

یوں باندھا ہے۔

ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اقبال کے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جدوجہد کے مطابق ہی کامیابی حاصل کرتا ہے۔

(۲) بے شک اس دُنیا میں فطرت نے بہت سے اسرار ورموز (راز) مختلف مقامات میں پوشیدہ کر دئیے ہیں، بلکہ غور سے دیکھو تو ہر شئے میں کوئی نہ کوئی راز پوشیدہ ہے۔ لیکن اقبال کہتے ہیں کہ جدوجہد سے فطرت کے تمام اسرار سربستہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔

نوٹ:۔ میں نے اقبال کے رمزیہ اشعار کا لفظی ترجمہ کہیں نہیں کیا ہے کیونکہ اس سے شاعر کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔ اس مصرع میں اجام، کنایہ ہے جدوجہد سے ۱۲۔

(۳) اس دنیا میں، جو عمل کی دُنیا ہے۔ محض تجاویز یا لکچروں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہاں تو زبانی گفتگو (قال) کے بجائے عمل (حال) یعنی جدوجہد کی قدرومنزلت ہوتی ہے۔ فلسفیانہ بحثوں کو عمل کی دنیا میں بالکل بے کار اور (تہ اجام) اور بے قیمت تصور کیا جاتا ہے۔

(۴) نفس جاندا ختن یعنی عاجز کرون یا مغلوب ساختن۔ ہم جدوجہد کی بدولت اس دنیا یعنی فطرت کی طاقتوں پر غالب آ سکتے ہیں۔ عمل کے سامنے اس دنیا کی طاقتوں کا عروج (آفتاب سحر) زوال (لب بام) کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی انسان کی جدوجہد کے سامنے قوائے فطرت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں انسان نے اپنی جدوجہد (سائنٹفک تحقیقات) کی بدولت قوائے فطرت کو جس طرح مسخر اور مغلوب کیا ہے، وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

(۵) تو اپنی غلطی یا نادانی کی بناء پر دنیا کو ساکن یعنی راحت کدہ سمجھتا ہے۔ حالانکہ جسے تو سکون سمجھتا ہے، وہ دراصل حرکت ہی کی دوسری شکل ہے۔ یعنی تو دنیا کو ساکن سمجھتا ہے۔ لیکن وہ ہر لحظہ متحرک ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جو شئے ساکن نظر آتی ہے، دراصل وہ بھی متحرک ہے۔ کیونکہ ہر شئے برق پاروں سے مرکب ہے۔ اور ہر برق پارہ (الیکٹران) نہایت سرعت کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔

(۶) انسان دُنیا میں آنے سے پہلے جنت میں سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن جدوجہد (طلب) کا جذبہ اُسے اس راحت کدہ سے باہر نکال لایا۔ (بروں تاختہ ایم) دنیا میں آکر انسان نے اپنے علوم میں رُوح پھونک دی۔ یعنی ان کے اقتضاء پر عمل کیا۔ واضح ہو کہ عمل دراصل علم ہی کی ترقی یافتہ یا خارجی شکل کا دوسرا نام ہے۔ جب انسان اپنے علم کو خارج میں موجود کرنا چاہتا ہے، تو اس کے اقتضاء پر عمل کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم، بشکل عمل جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

زندگی

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است
گفتم کہ کرمک است کہ از گل سر بروں زند
گفتا کہ شعلہ زاد و مثال سمندر است
گفتم کہ شر بہ فطرت خامش نہادہ اند
گفتا کہ خیز اگر بفشانی گہر است
گفتم کہ شوق سیر نہادش بہ منزلے
گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق مضمر است
گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گل تر است

تمہید | اس بلیغ نظم میں اقبال نے زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر فلسفیانہ انداز میں تبصرہ کیا ہے۔

مطلب | میں نے ایک عارف سے پوچھا کہ کمال زندگی کیا ہے۔ یعنی زندگی کی کامیابی کس بات پر منحصر ہے؟

نوٹ ۱۔ اقبال نے جو یہ لکھا ہے کہ "حیات چیست؟" اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ کمال حیات چیست؟ یعنی زندگی مرتبۂ کمال کو کیونکر پہنچ سکتی ہے۔ یہاں زندگی کی ماہیت مُراد نہیں ہے، کیونکہ وہ تو رازِ خدائی ہے، انسان اس پر مطلع نہیں ہو سکتا۔۱۲

اُس نے جواب دیا کہ شراب جس قدر تلخ ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ نشہ آور (قیمتی) ہوتی ہے۔ اسی طرح زندگی جس قدر جد وجہد (تلخی) سے معمور ہوگی۔ اسی قدر کامیاب (انگرتر) ہوگی۔ یعنی حیات کا کمال جد وجہد میں منحصر ہے۔

نوٹ :۔ اقبال نے یہ نکتہ قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ٥ (۲-۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے قتل ہو جاتے ہیں! انہیں مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں (یعنی انہوں نے اپنی حیات کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا) لیکن تم اس نکتہ سے آگاہ نہیں ہو۔۱۲

(۲) میں نے کہا کہ مجھے تو حیات، ایک کرمک بے مایہ، نہایت حقیر شئے) نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کی اصل جیسا کہ سب جانتے ہیں مٹی ہے (سر بروں زدن بمعنی ظاہر شدن)۔

اُس نے جواب دیا نہیں، حیات مٹی سے ظاہر تو ہوتی ہے، لیکن اس کی اصل مٹی نہیں ہے۔ بلکہ وہ شعلہ زاد ہے۔ یعنی اسے مٹی کے کیڑے (کرمک) سے تشبیہ نہیں دے سکتے۔ بلکہ سمندر (آگ کے کیڑے) سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مطلب اس تشبیہ سے یہ ہے کہ حیات کی اصل غیر مادی (روحانی) ہے۔

نوٹ :۔ مادہ پرستوں کے نزدیک حیات کی اصل مادی ہے یعنی حیات مادہ کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ بقول چکبست لکھنوی :۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترکیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

لیکن خدا پرستوں کی رائے میں حیات کی اصل غیر مادی ہے، جسے اقبال نے شعلہ سے تعبیر کیا ہے۔۱۲

(۳) میں نے کہا کہ شر (بدی) اس کی فطرت میں داخل ہے۔ عارف نے جواب دیا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ شر (برائی) اس کی فطرت میں داخل

نہیں ہے۔ تم جسے شر کہتے ہو، وہ سب تمھاری اپنی غلط بینی کا نتیجہ ہے۔ یعنی تم جس وقت خیر کے پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہو۔ اسی وقت شر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر تمھیں اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جائے کہ خالقِ فطرت نے جو کچھ پیدا کیا ہے، وہ خیر ہی ہے، یہی خیر ہے، تو شر مفقود ہو جائے گا۔ فطرت میں تو کہیں شر نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمھارا اس حقیقت کو نہ دیکھنا شر بن جاتا ہے۔ مثلاً

خالقِ فطرت نے زہر پیدا کیا ہے جو خیر ہے کیونکہ بہت سے امراض کی دوا ہے۔ لیکن اس کا غلط استعمال اسے شر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

خالقِ فطرت نے لوہا پیدا کیا ہے جو خیر ہے، کیونکہ اس پر تمدن کا انحصار ہے۔ لیکن انسان لوہے کی تلوار سے کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو اس کا یہ غلط استعمال لوہے کو شر بنا دیتا ہے۔

خالقِ فطرت نے کاربن پیدا کیا ہے جو خیر ہے کیونکہ وہ درختوں کی غذا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اسی کاربن کو کسی بے گناہ انسان کے جسم میں داخل کر دے، تو اس کا یہ فعل اُسے مذموم بنا دے گا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زندگی سراسر خیر ہے۔ لیکن جب ہم اس حقیقت سے روگردانی کرتے ہیں تو ہمارا یہ فعل شر بن جاتا ہے یعنی جسے ہم شر کہتے ہیں، وہ ہماری جہالت کا دوسرا نام ہے۔

(۴) میں نے کہا کہ زندگی اگرچہ ہر وقت رواں ہے لیکن اس کی منزل کہیں نظر نہیں آتی یا وہ ابھی تک (اگرچہ لاکھوں برس سے سفر کر رہی ہے) منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکی۔ عارف نے جواب دیا کہ اس کی منزل اس کے اسی شوقِ سفر میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اس کی منزل اس کے اندر ہی ہے، باہر کہیں نہیں ہے۔

از من برون نیست منزلِ گرِ من
من بے نصیبم راہے نیابم

بالفاظِ دگر، زندگی مسلسل پرواز کا نام ہے، اگر وہ منزل تک پہنچ جائے۔ تو ساکن ہو جائے گی۔ اور سکون، موت کا دوسرا نام ہے:-

زندگی جز لذتِ پرواز نیست!
آشیاں با فطرتِ او ساز نیست!

(۵) میں نے کہا کہ انسان مٹی سے بنا ہے اور مٹی ہی میں مل جاتا ہے

عارف نے کہا کہ جس طرح دانہ مٹی میں پوشیدہ ہو کر فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ دوبارہ گلِ تر کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان مر کر فنا نہیں ہو جاتا، بلکہ مرنے کے بعد نئی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ دانہ بظاہر مٹی میں مل جاتا ہے لیکن اس کی قوتِ نمو باقی رہتی ہے۔ وہ فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان کا جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔ لیکن حیات باقی رہتی ہے اور نیا جسم حاصل کر کے اپنے سفر کو جاری رکھے گی۔

حکمتِ فرنگ

شنیدم [illegible] | [illegible] نکتہ بینی
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] فرنگی | [illegible]
[illegible] | [illegible]
فرنگ [illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible] فرنگ
[illegible]

تمہید | اس طنزیہ نظم میں اقبال نے ایک عجمی مُردے کی زبان سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اقوامِ مغرب نے انسان کو ہلاک کرنے کیلئے بہت سے نئے آلات ایجاد کر دیئے ہیں، جنکا پہلے زمانہ میں کہیں نام و نشان نہ تھا۔ خدا معلوم حضرتِ اقبال اگر آج ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے زمانہ میں زندہ

ہوتے، تو اُن کے تاثرات کیا ہوتے!

مطلب سُنا ہے کہ ایران میں ایک عقلمند آدمی مرض الموت میں گرفتار ہو گیا، اور اُسے بحالت نزع میں بہت تکلیف ہوئی۔ بہرکیف جب وہ خدا کے سامنے حاضر ہوا تو اُس نے عرض کی کہ مجھے عزرائیل سے بہت شکایت ہے۔ یہ فرشتہ ہزاروں لاکھوں برس سے انسانوں کی رُوح قبض کر رہا ہے مگر ابھی تک اپنے فن میں کامل نہیں ہوا۔ اے خدا! یورپ کے لوگوں نے اپنی تمام عقل و دانش ہلاک کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے میں صرف کر دی ہے۔ چنانچہ آج یہ کیفیت ہے کہ انسان اُن کے مہلک آلات سے نہ سمندر کی تہ میں اپنی جان بچا سکتا ہے اور نہ فضائے آسمانی میں۔ (اور جس وقت مہلک گیس (غاز) چھوڑتے ہیں، تو آفتاب (مہر) کی آنکھیں اندھی (روز کور) ہو جاتی ہیں۔ اور جس وقت وہ اپنی برین گن سے گولیوں کی بارش کرتے ہیں تو ایک منٹ میں ہزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

اے خدا! میں تجھ سے دست بستہ التماس کرتا ہوں کہ تُو اپنے فرشتہ اجل کو جو اَب تک اپنے فن میں اس قدر خام ہے کہ بعض اوقات اسے ایک آدمی کی جان نکالنے میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے یورپ میں بھیج دے، تاکہ وہ اہلِ یورپ سے بسرعت تمام ہلاک کرنے کا فن سیکھ سکے۔

حور و شاعر

در جواب نظم گوئٹے موسوم بہ حور و شاعر

حور

نہ بہ بادہ میل داری نہ بہ من نظر کشائی ‏ ‏ عجب این کہ تو ندانی رہ و رسم آشنائی

ہمہ ساز جستجوئے ہمہ سوز آرزوئے ‏ ‏ نفسے کہ می گدازی غزلے کہ می سرائی

بنوائے آفریدی چہ جہان دلکشائے ‏ ‏ کہ ارم بچشم آید چو طلسم سیمیائی

شاعر

دلِ رہرواں فریبی بکلامِ نیش دارے ۔۔۔ مگر ایں کہ لذتِ او نرسد بہ نوکِ خارے
چہ کنم کہ فطرتِ من بمقامِ در نسازد ۔۔۔ دلِ ناصبورِ دارم چو صبا بلالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے ۔۔۔ تپد آں زماں دلِ من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے ۔۔۔ سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو ز بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم ۔۔۔ غزلے دگر سرایم بہوائے نو بہارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد ۔۔۔ بہ نگاہِ ناشکیبے بدلِ امیدوارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے ۔۔۔ [illegible]

تمہید اِس نظم میں اقبال نے حور و شاعر کے مکالمہ کے پردہ میں عاشق کی زندگی سے متعلق اپنا نظریہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ اس نظم کے آخری شعر میں مندرج ہے کہ

دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانی

اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ حیات کا تسلسل " سوختن ناتمام " پر موقوف ہے۔ بہشت میں " سوختن " کا نام و نشان نہیں ہے بلکہ خلش آرزو اور تپشِ انتظار بھی ناپید ہے۔ وہاں تو دائمی سرور اور ابدی سکون ہے، جسے سنسکرت میں " آنند " کہتے ہیں۔ اندریں حالات ایک عاشق جس کی زندگی سراسر تپش اور سراپا خلش ہے۔ جس کا ہر نفس سوز و گداز کا مرقع، اور ہر لحہ نالہ و فریاد کا آئینہ ہے، بہشت میں کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ جہاں نہ کوئی غم ہے نہ غمگسار، نہ نوائے درد ہے، نہ آہ شعلہ بار؟

مطلب کہتے ہیں کہ بادیہ پیمائی کے سلسلہ میں اتفاقاً عاشق کا گذر جنت میں بھی ہو گیا۔ وہاں اُس نے کچھ دیر قیام کیا، اور عالم بیخودی میں ایک غزل بھی گائی۔ جو بیحد تاثیر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب وہ وہاں سے چلنے لگا، تو ایک حور نے جس کے دل میں شاعر کی نوائے عاشقانہ نے سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دی تھی، یعنی اس کو ایک نئی دُنیا میں پہنچا دیا تھا اُس کا راستہ روک لیا۔ اور یوں گویا ہوئی۔

حُور

نہ تُو نے بادہ و ساغر کی طرف التفات کیا اور نہ میری جانب نظر اُٹھا کر دیکھا، یہ بات ہے تو کیا؟ میں سخت متعجب ہوں کہ تو شاعر ہو کر محبت کے کوچہ سے نا آشنا ہے!

دُوسرے شعر میں وہ حور، شاعر سے رابطہ پیدا کرتی ہے، اور چونکہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کی توصیف کی جائے۔ اس لیے وہ نازنین یُوں گویا ہوئی کہ:۔

اے شاعر! جو غزل تُو نے گائی، وہ کسی کی تلاش کے جذبات (رمازِ جستجو) سے لبریز تھی۔ اور تیری ہر سانس سے محبت کی گرمی (سوزِ آرزو) کا اظہار ہو رہا ہے۔ یقیناً تُو کسی کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔

۲۔ شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد اب وہ حُور اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے کہ جب سے میں نے تیرا گانا سُنا ہے، مَیں یہ محسوس کرتی ہوں کہ مَیں ایک نئی دُنیا میں آ گئی ہوں۔ (حُور چونکہ "تہذیبِ مغرب" سے آشنا نہیں ہے، اس لیے صاف لفظوں میں نہیں کہہ سکتی کہ میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں) اور یہ دنیا اس قدر دلکش اور دلفریب ہے (محبت کی دُنیا بلاشبہ ایسی ہی ہوتی ہے) کہ اب یہ جنت اُس کے سامنے بالکل ہیچ نظر آتی ہے۔

سیمیا۔ جادو کی ایک قسم ہے لیکن ادب کی اصطلاح میں اس سے مُراد ہے، وہ شے جس کی کوئی اصلیت نہ ہو، یعنی محض دھوکہ یا فریب نظر۔۱۲

شاعر

حُور کی یہ گفتگو سُن کر، جس کے ہر لفظ سے لگاوٹ کی بُو آتی تھی۔ شاعر نے یہ کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیری گفتگو بڑی دلنشین ہے۔ (کلام نیش دار یعنی چبھتے ہوئے جملے یا فقرے) لیکن اس میں وہ لذت نہیں ہے، جو ایک عاشق جگر تفتہ کو بادیہ پیمائی میں حاصل

ہوتی ہے۔

نوٹ:۔ لفظی خوبی اس مصرع میں یہ ہے کہ کلام نیش دار سے مراد ہے چبھتا ہوا فقرہ۔ اور نوک خار بھی پاؤں میں چبھتی ہے۔ یعنی فقرہ بھی چبھتا ہے اور خار بھی۔ لیکن عاشق کو کانٹے کے چبھنے میں زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ ۱۲

اے نازنین! تیری محبت کا شکریہ! لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ عاشق ایک جگہ مستقل قیام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کا دل تو ناصبور (بیقرار) ہوتا ہے۔ یہ ناصبوری اسے مثلِ صبا ہر وقت صحرا نوردی پر اکسائی رہتی ہے۔

اب شاعر، حُور کو اپنی نفسیاتی کیفیت سے آگاہ کرتا ہے۔ کہ شاعر (عاشق) کی ذہنیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آئیڈیل یعنی نصب العین کی تلاش میں سرگردان رہتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اس کی نگاہ کسی موہنی مورت پر پڑتی ہے، تو وہ اس کے درشن سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ بلکہ دوسرے لمحہ ہی میں اس کا دل اُس لڑکی سے زیادہ حسین لڑکی کے لیے بیقرار ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ ہر وقت خوب سے خوب تر معشوق کی تلاش میں منہمک رہتا ہے۔ اندریں حالات تو خود فیصلہ کر کہ میں تیری سنگت میں اپنی زندگی کیونکر اور کس طرح بسر کر سکتا ہوں!

میری حالت تو یہ ہے کہ میں شرر کو دیکھ کر ستارے کے لیے اور ستارے کو دیکھ کر آفتاب کے حصول کے لیے بے قرار ہوں۔ میں بھلا تیرے پاس کس طرح مستقل قیام کر سکتا ہوں! اگر میں کسی جگہ مستقل طور پر مقیم ہو جاؤں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میری جستجو ختم ہو گئی۔ اور جب جستجو ختم ہو گئی تو حرکت ختم ہو گئی۔ اور جب حرکت ختم ہو گئی تو سکون پیدا ہو گیا اور عاشق کی اصطلاح میں سکون سے موت مراد ہوتی ہے۔

جب میں ایک موسم بہار سے لطف اندوز ہو چکتا ہوں تو میرا دل دوسری بہار کے انتظار میں بے چین ہونے لگتا ہے۔ اور اس سے لطف

اندوز ہونے کی آرزو میں نئی غزل گانے لگتا ہوں۔

میری حالت یہ ہے کہ میری نگاہ ہر وقت بے قرار رہتی ہے اور دل ہر لحظہ نئی نئی تمناؤں کا مرکز بنا رہتا ہے۔ یعنی میں اس شئی کی انتہا چاہتا ہوں جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اے شرم وحیا کی دیوی! اگر میں تیری بہشت میں قیام کا فیصلہ کر لوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں خود اپنے محضر قتل پر دستخط ثبت کر دوں۔ تیری اس بہشت میں عاشق کس طرح رہ سکتا ہے؟ یہاں تو نہ کہیں نوائے دردمند سنائی دیتی ہے۔ نہ کہیں عشق ومحبت کا ہنگامہ برپا ہے اور نہ کسی غمگسار کا کوئی نشان نظر آتا ہے۔

نوٹ:۔ اقبال کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ عموماً اپنی نظم کا خلاصہ آخری شعر میں درج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی انہوں نے آخری شعر کے پہلے مصرع میں اپنا نظریہ بیان کر دیا جس کی تشریح تمہید میں لکھ چکا ہوں۔ ۱۲

زندگی و عمل

در جواب نظم ہائنا موسوم بہ سوالات

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر می روم، گر نروم نیستم

تمہید: اقبال نے یہ نظم جرمنی کے مشہور اسرائیلی شاعر ہنیریخ ہائنا کی نظم کے جواب میں لکھی ہے۔

ہائنا ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ جوانی میں اپنے چچا کے پاس آیا۔ جو جرمنی کے مشہور تجارتی شہر ہیمبرگ میں بہت بڑے پیمانہ پر تجارتی کاروبار کرتا تھا۔ چچا نے اس

کراچی فرم کا منتظم بنا دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ اپنی چچا زاد بہن امیلی پر عاشق ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تجارتی امور میں کوئی دلچسپی نہ لے سکا۔ جب اُس کے چچا نے یہ رنگ دیکھا۔ تو اُسے بان (BONN) یونیورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ یہاں آکر اُس نے قانون کے بجائے شاعری شروع کر دی (فراقِ جاناں میں عاشق، شاعری کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے) اور بادیہ پیمائی کا آغاز ہو گیا۔ یعنی بان سے چل کر گوٹنجن میں آیا۔ وہاں بھی دل نہ لگا، تو دُوسرے قصبہ میں چلا گیا۔ لیکن اس جگہ بھی چین نصیب نہ ہوا۔ ایک دوست سے کسی عورت کے سلسلہ میں رقیبانہ جنگ (DUEL) ہو گئی۔ وہاں سے برلین آیا۔ اور مشہور عالم فلسفی ہیگل کے درس میں شامل ہو گیا۔ یہاں آکر پھر شاعری کا جنون تازہ ہو گیا۔ دوستوں کے سمجھانے سے شاعری کے ساتھ ساتھ قانون کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ اور ۱۸۲۵ء میں برلین یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے پیرس کو اپنا مستقل وطن بنا لیا جس طرح حزیں نے بنارس کی صبح کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ جس شہر کا برہمن بچہ لچھمن اور رام ہو، اُسے چھوڑ کر دلِ حزیں کہاں چین پا سکتا ہے۔

۱۸۳۴ء میں اس کی ملاقات ایک ادنیٰ درجہ کی عورت سے ہوئی۔ جو ایک دوکان میں بطور خادمہ کام کرتی تھی، نہ صورت، نہ سیرت، نہ تعلیم، نہ تربیت، نہ لیاقت، نہ ذہانت۔ لیکن اس کے باوجود ہائینا اس کا اس درجہ گرویدہ ہو گیا[1] کہ سات سال تک عاشقانہ زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۸۴۱ء میں اس کو اپنی منکوحہ رفیقۂ حیات بنا لیا۔ اس عورت نے جس کا نام میتیلڈ تھا۔ اپنے شوہر کی زندگی کو نہایت مطلق بنا دیا۔ اور جب

[1] اس سے ثابت ہوا کہ محبت واقعی اندھی ہوتی ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ:۔

"عشق دجانے ذات کذات"

سنہ ۱۸۴۸ء میں ہائینا ریڑھ کی ہڈی کے مرض میں مبتلا ہوا، تو سنہ ۱۸۵۶ء تک یعنی تا دمِ وفات چارپائی سے نہ اُٹھ سکا۔ اس طویل عرصہ میں اُس کی بیوی نے اُس کی خدمت اور تیمارداری ایسی تندہی اور جانفشانی کے ساتھ کی کہ محبت اور رفاقت دونوں کا حق ادا کر دیا۔

ہائینا کی شاعری پر نطشے کا تبصرہ یہ ہے کہ "جرمنی نے ہائینا اور مجھ سے بڑا آرٹسٹ پیدا نہیں کیا۔" بلاشبہ ہائینا عاشقانہ شاعری کا امام ہے، چنانچہ گاٹیئر لکھتا ہے کہ "اس کی شاعری میں قدیم اسلوب بیان اور جدید عاشقانہ تصورات کا نہایت خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔"

تمام نقادانِ فن کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر عاشق کی نفسیاتی کیفیات کا بیان کسی شاعر کی نظموں میں نہیں مل سکتا۔

مطلب — ساحلِ بحر نے (جو روزِ آفرینش سے سکون کی حالت میں ہے) یہ کہا کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کہ میں کون ہوں، یعنی میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟

ایک موج نے جو جذبۂ عمل سے سرشار (از خود رفتہ) تھی۔ جب یہ بات سنی، تو بڑی تیزی سے اُٹھی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی، کہ میری زندگی تو حرکت و عمل (رفتن) پر منحصر ہے۔ اگر میں ساکن ہو جاؤں، تو فنا ہو جاؤں گی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی در اصل عمل (جدوجہد) کا دوسرا نام ہے۔ ۱۲۰

الملک للہ

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چون رسیم — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

تمہید — اقبال نے اس مختصر نظم میں اسلامی تاریخ کے ایک مشہور واقعہ کو اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں قلمبند کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دماغی کاوش درکار نہیں ہے، اس لیے

ہماری قوم کے اکثر افراد اس نظم سے آگاہ ہیں۔

مطلب جب طارق نے ساحل اندلس پر اُتر کر اپنے جہازوں میں آگ لگادی، تو بعض لوگوں نے اُس سے یہ کہا کہ تیرا یہ فعل، اقتضائے عقل کے خلاف ہے۔ اگر کسی وجہ سے واپس جانا پڑ جائے تو کیا صورت ہوگی؟ اسی لیے ہماری شریعت نے بھی ترکِ اسباب کا حکم نہیں دیا۔ (یہ دُنیا، عالمِ اسباب ہے۔ اور واپسی کے لیے سبب (کشتی) کا ہونا لازمی ہے)

جب طارق نے یہ مشورہ سُنا تو ہنسا اور اپنی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

ع ہر مُلک مِلک ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

اس مصرع کو دو طرح پڑھ سکتے ہیں:۔

(۱) ہر مُلک، مِلک ماست کہ مِلکِ خدائے ماست

(۲) ہر مُلک، مِلک ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

مطلب دونوں صورتوں میں یہی ہے کہ جب ہم خدا کے ہیں یعنی خدا ہی کے نام کو بلند کرنے کے لیے جی رہے ہیں، لامحالہ وہ ہمارا ہے اور جب وہ ہمارا ہے تو اس کا سارا مُلک ہمارا ہے، یا اُس کی ساری مقبوضات ہماری ہیں۔ پس خواہ ہم مراقش میں رہیں۔ یا اندلس میں حجاز میں یا عراق میں، چین میں یا ہندوستان میں، ساری دُنیا ہماری مِلک ہے، ساری دُنیا ہمارا وطن ہے۔

طارق بن زیاد بن عبداللہ مشہور مراقشی (بربری) قائد تھا جس نے موسیٰ بن نصیر سپہ سالار مغرب کی زیرِ ہدایت سات ہزار مجاہدوں کو لے کر رجب ۹۲ھ اپریل ۷۱۱ء میں ساحل اندلس پر قدم رکھا اور دو سال کی قلیل مدت میں تمام جنوبی اندلس کو فتح کر لیا۔

طارق نے جس تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر یہ غیر فانی جملہ اپنی زبان سے ادا کیا تھا۔ بعد فتح اندلس، اس کے لوہے کو پگھلایا۔ اور فولاد کی کثیر مقدار میں ملا کر اس مرکب سے بہت سی تلواریں بنائیں اور مراقش سے لے کر ہندوستان تک ہر ملک میں ایک ایک تلوار مسلمانوں

کے اسلحہ خانہ میں رکھ دی کہ بوقت ضرورت کام آسکے۔

جو تلوار ہندوستان بھیجی گئی تھی، وہ عالمگیرؒ کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان کے قبضہ میں آئی۔ لیکن ۱۷۹۹ء میں سلطان کی شہادت کے بعد وہ شمشیرِ آبدار مسلمانوں کی غفلت کے باعث میدانِ جنگ میں گم ہوگئی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب شاعر نے ہاتفِ غیبی سے سلطان کی تاریخ شہادت دریافت کی، تو اُس نے کہا۔ "شمشیر گم شد"

راقم الحروف کو اس شمشیر کے گم جانے کا اتنا افسوس نہیں ہے، جتنا اس بات کا کہ ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک مسلمانوں نے اس کو تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے تو یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ شمشیر کا تصور ہی دماغوں سے یکسر خارج ہوچکا ہے۔ تمام مسلمان، نان شبینہ کے لیے، اُس قوم کی دہلیز پر جبّہ سائی کر رہے ہیں جس نے ۱۷۹۹ء میں سلطان شہید کے ہاتھ سے تلوار لے کر کسی غار میں پوشیدہ کر دی۔

نوٹ:- میں نے "تلوار چھین کر" کے بجائے "تلوار لے کر" لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک سلطان زندہ رہا، اسلام کے یہ بدترین دشمن اس کے ہاتھ کے قریب بھی نہ پہنچ سکے، لیکن جب سلطان کی شہادت کے بعد قلعہ فتح ہوگیا، تو اُس کی نعش کی تلاش شروع ہوئی۔ کامل پانچ گھنٹے کی مسلسل تلاش کے بعد رات کے نو بجے سلطان کی نعش بڑے پھاٹک میں کشتوں کے انبار کے نیچے سے نکال گئی سلطان کے ہاتھ سے سب کچھ جا چکا تھا۔ دولت، ثروت، حکومت، سلطنت حتیٰ کہ جان شیریں بھی —— لیکن تلوار۔ وہی طارقؒ کی دی ہوئی تلوار —— اس کے ہاتھ میں بدستور موجود تھی۔ سلطان کی اُنگلیاں قبضۂ شمشیر میں اس طرح پیوست ہوگئی تھیں کہ عینی شاہدوں کے بیان کے مطابق

بمشکل تمام وہ تلوار سلطان کے قبضہ سے نکالی گئی۔

تفصیل کے لیے دیکھو برطانوی ہند کی تاریخ مصنفہ مسٹر جیمس مل جلد ششم صفحہ ۱۱۵ تا صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۳۶ء۔

جوُئے آب

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود — مانند کہکشاں بگریبان مرغزار
در خواب ناز بود بگہوارۂ سحاب — وا کرد چشم شوق بآغوش کوہسار
از سنگریزہ نغمہ گشاید خرام او — سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

در راہ او بہار پری خانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیش ما بایست — خندید غنچہ و سر دامان او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشان سبزپوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

صد جوئے دشت و مرغ و کہستان و باغ و راغ — گفتند ایں بسیط زمیں با تو سازگار
مارا کہ راہ از تنک آبی نبردہ ایم — از دستبرد ریگ بیاباں نگاہ دار
وا کردہ سینہ را بہواہائے شرق و غرب — در بر گرفتہ ہمسفران زبون و زار

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
با صد ہزار گوہر یکدانہ می رود

دریائے پرخروش ز بند و شکن گذشت — از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را — از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار — در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

تمہید | جیسا کہ علامۂ مرحوم نے حاشیہ میں خود تصریح فرمادی ہے، یہ گوئٹے کی مشہور نظم موسوم بہ "نغمۂ محمد" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے یہ گوئٹے کی نظموں کا انگریزی ترجمہ لندن سے سنہ ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔

ذیل میں گوئٹے کی نظم کا لفظی ترجمہ درج کرتا ہوں۔ تاکہ ناظرین اس بات کا اندازہ کرسکیں، کہ علامۂ مرحوم نے گوئٹے کا نقطۂ نگاہ بڑی کامیابی کے ساتھ اور بڑے دلکش انداز میں واضح کیا ہے۔

(۱) ذرا اس آبجو پر نظر کرو، جو ستارے کی طرح درخشاں ہے۔

لطفائے آسمانی کی مہربان رُوحوں نے، اُس کے عہدِ طفولیت میں، کوہستان میں اس کی پرورش کی۔ بادلوں سے تروتازہ حالت میں آتی ہے اور سفید چٹانوں پر رقص کرتی ہے۔ اور خوشی کے عالم میں آسمان کی طرف جست کرتی ہے۔

۲- کوہستانی دروں میں رنگین پتھروں کا تعاقب کرتی ہے، اور ایک سردار کی طرح چھوٹے چھوٹے سوتوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتی ہے۔ وادیوں میں اس کے قدموں کے نیچے پھول اُگتے ہیں۔ اور وہ سبزہ زاروں کو زندگی عطا کرتی ہے۔ لیکن نہ اُسے کوئی وادی روک سکتی ہے اور نہ پھول اُسے روانی سے باز رکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ پھول اس کے قدموں پر سر رکھ کر نگاہیں نیچی کر کے اُسے دعوتِ قیام دیتے ہیں۔ لیکن وہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی میدانوں کی طرف نکل جاتی ہے۔

۳- آگے چل کر بہت سے بلند سار چشمے اس سے آکر مل جاتے ہیں۔ اور وہ ان سب کو ساتھ لے کر میدانوں کی طرف بڑھتی ہے۔ اور اس کا پانی چاندی کی طرح اُجلا اور صاف ہوتا ہے۔ اور اس کے وجود پر میدان فخر کرتے ہیں اور پہاڑی ندیاں فرطِ مسرت سے اُسے بھائی کہہ کر پکارتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہمیں اپنے ساتھ لے چل اپنے بڑے باپ کے پاس! اُس ابدی سمندر کے پاس جو اپنے بازو پھیلائے ہمیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے بیتاب ہے۔

۴- آہ وہ بازو بے سود پھیلے ہوئے ہیں اپنے بچوں کو آغوش میں لینے کے لیے۔ کیونکہ راہ میں ریگستان ہمیں جذب کر لیتا ہے۔ اور آفتاب کی شعاعیں ہمارا خون چوس لیتی ہیں (ہمیں خشک کر دیتی ہیں)۔ اور ہمارے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں جو ہمیں جھیل کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اے بھائی! تو اپنے میدانی بھائیوں کو اپنے ساتھ اپنے باپ کے پاس لے چل!

۵- وہ آبجو یہ سن کر کہتی ہے "آؤ سب میرے ساتھ آؤ!" چنانچہ سب ندیاں اس کے ساتھ مل جاتی ہیں، اور وہ ایک عظیم الشان دریا کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ایک قوم (مسلمان) اس کا علم بلند کرتی ہے

چنانچہ وہ "جوئے آب" فاتحانہ شان کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ اور جو ممالک اس کی راہ میں پڑتے ہیں، وہ اُن کو نئے نام عطا کرتی ہے! اور اُس کے قدموں کی برکت سے صفحۂ ہستی پر نئے نئے شہر معرضِ وجود میں آتے جاتے ہیں۔

۶۔ اس انداز سے وہ آبجو آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور قلعوں کی چوٹیوں اور سنگِ مرمر کے محلات کو، جو اس کی شان و شوکت کے آثار شیریں ہیں، اپنے پیچھے چھوڑتی جاتی ہے۔ فضا میں، اس سے بہت اُوپر ہزاروں جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہیں، جو اس کی طاقت اور عظمت پر گواہی دے رہے ہیں۔

۷۔ غرضکہ اس شان و شوکت کے ساتھ وہ آبجو اپنے بھائیوں (چھوٹی نہروں) کو اپنے ساتھ لیے ہوئے جا رہی ہے۔ اور یہ سب اس کی دولت اور خزانے ہیں، سب اس کے پروردہ ہیں۔ اور یہ سب فرطِ مسرت سے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اس حالت میں وہ آبجو ان سب کو ساتھ لیے ہوئے اپنے اس باپ کی آغوش کی جانب رواں ہے، جو مدتوں سے ان سب کے انتظار میں ہے!

جیسا کہ علامہ نے حاشیہ میں لکھا ہے، یہ نظم ایک معجزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی، جس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ گوئٹے نے اس ڈرامے کی تمہید میں لکھا ہے کہ: میں نے یہ نظم اس لیے لکھی تھی کہ آنحضرتؐ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے جبکہ وہ کامیابی کے لحاظ سے مرتبۂ کمال پر تھے، اُن کے رفیقِ کار حضرت علیؓ ان کی شان میں پڑھ کر سنائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے آنحضرتؐ کی پیغمبرانہ شان سے اور اس کامیابی سے جو آپؐ کو اپنے مقصد میں حاصل ہوئی۔ بہت متاثر تھا۔ چنانچہ علامہ نے خود یہی بات لکھی ہے کہ اس نظم میں المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

علامہ نے اپنی نظم میں گوئٹے کی نظم کے آخری بند کا ترجمہ پیش نہیں

کیا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے زاویۂ نگاہ سے اس کا ترجمہ چنداں ضروری نہیں تھا اور وہ بلاوجہ اپنی نظم کو طویل بنانا نہیں چاہتے تھے۔

گوئٹے کی طرح علامہ نے بھی ساری نظم تمثیل تشبیہہ اور استعارہ کے رنگ میں لکھی ہے۔ یعنی از اوّل تا آخر رموز اور کنایات سے کام لیا ہے، اور اس کی وجہ بالخصوص یہ ہے کہ رمز اور کنایہ سے نظم میں بہت زیادہ دلکشی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے ۔

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیثِ دیگران

چونکہ یہ نظم از اوّل تا آخر رموز و کنایات سے معمور ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تمام استعارات و کنایات کی تصریح درج کروں تاکہ اس نظم کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکے۔

جوئے آب کنایہ ہے زندگی سے، اور چونکہ اسلام منبع حیات ہے اس لیے جوئے آب کنایہ ہے اسلام سے، اور چونکہ اسلام کا وجود موقوف ہے ذاتِ محمدی پر، اس لیے جوئے آب کنایہ ہے ذاتِ محمدی سے، یعنی یہ تینوں معنی مُراد ہو سکتے ہیں۔

مستانہ می رود میں مستی کنایہ ہے اُس انہماک و استغراق، ولولہ اور جوش سے، جس کا اظہار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے غلاموں کے طرزِ عمل سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں ہوا۔

بگریبانِ مرغزار کنایہ ہے اس کائنات سے۔

بہ گہوارۂ سحاب یعنی ذاتِ محمدی دنیا میں ظاہر ہونے سے قبل انائے مطلق کی آغوش میں محوِ خواب تھی۔ اگر کسی کو شک ہو تو اقبال کا یہ شعر پڑھے :-

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
بکنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را

چشمِ شوق کنایہ ہے آپ کی شانِ رحمۃٌ للعالمین سے۔

ع ہست شانِ رحمت گیتی نواز

آپؐ کے دل میں بنی نوعِ آدم کی اصلاح کا شدید جذبہ کارفرما تھا۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے۔

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ

حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہ

اے لوگو! یہ رسول جو تمہارے پاس آئے ہیں، یہ تمہارے لیے اجنبی نہیں ہیں، بلکہ تم ہی میں سے ہیں۔ یعنی تم لوگ آپؐ کے حسب ونسب اخلاق وعادات، دیانت وامانت سے بخوبی واقف ہو۔ آپؐ کی قلبی حالت حالت یہ ہے کہ آپؐ کا دل تمہاری ہمدردی سے لبریز ہے۔ ہر وہ شئی جس سے تمہیں تکلیف پہنچے، وہ اُن پر بہت گراں گذرتی ہے۔ اور آپؐ کے دل میں تمہاری خیرخواہی اور نفع رسانی کی خاص تڑپ ہے، اور آپؐ مومنوں پر تو خاص طور سے شفیق اور مہربان ہیں۔

آغوشِ کہسار کنایہ ہے کائنات سے۔ واضح ہو کہ ذاتِ محمدیؐ ساری کائنات کے لیے باعثِ رحمت ہے۔

سنگریزہ کنایہ ہے عاجز اور بے کس افراد سے۔ جیسے غلام۔

از سنگریزہ نغمہ کشاید۔ یعنی اسلام نے غلاموں کو سربلند کر دیا۔

سیمانے او کنایہ ہے اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی سے۔

زی بمعنی جانب، طرف، سوئے کے۔

بحرِ بیکراں کنایہ ہے ذاتِ حق تعالیٰ سے۔

در خود بیگانہ (۱) ساری کائنات میں کوئی ہستی حضورؐ کی مثیل نہیں ہے۔ بلکہ آپؐ کا نظیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

(۲) ساری کائنات میں کوئی مذہب، دینِ اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حضورؐ بھی یگانہ و بے مثل ہیں اور آپؐ کا لایا ہوا دین بھی یگانہ ہے۔

از ہمہ بیگانہ (۱) حضورؐ علائقِ دنیوی سے مدۃ العمر بیگانہ رہے۔ جب سارا عرب آپؐ کے قدموں کے نیچے تھا، اُس وقت بھی

آپ کے حجرۂ مبارکہ میں چارپائی رجانماز اور
لوٹے کے علاوہ اور کوئی چیز نہ تھی۔

(۲) دینِ اسلام بھی تمام ادیانِ عالم سے بے تعلق ہے یعنی
اسلام کسی دین سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کرسکتا
اس کا نظام تصورات تمام ادیانِ عالم سے مختلف ہے۔

بہار کنایہ ہے دُنیا اور اس کے ظاہری عارضی ساز و سامان سے جس کو
دیکھ کر انسان مبہوت اور اس کے بعد دنیا کا غلام ہو جاتا ہے۔

نرگس، لالہ یا سمن کنایہ ہے آفاتِ سہ گانہ (عورت، دولت اور حکومت)
سے جن کے لیے انسان، خدا اور رسولؐ سے بے وفائی کرتا ہے۔

گل عشوہ داد یعنی دنیا نے آپ سے کہا کہ آپ مجھ سے تمتع فرمایئے
خندیدنِ غنچہ کنایہ ہے فراوانیٔ دولت اور اس کی کشش سے۔

سرِ دامانِ او کشید یعنی حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

نا آشنائے جلوہ کنایہ ہے اس بات سے کہ حضورؐ نے زخارفِ دنیوی
کی طرف مطلق توجہ نہیں فرمائی۔

صحرا و برید و سینۂ کوہ درید کنایہ ہے اسلام کی ترقی اور کامیابی سے یا
دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے سے۔

صد جوئے دشت کنایہ ہے اُن نیک بندوں یا مصلحینِ عالم سے جنہوں
نے آپ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اپنی اپنی جگہ لوگوں کو توحید الٰہی اور مساواتِ
انسانی کا درس دیا۔ مثلاً ہندوستان میں رامانج اچاریہ، دادو دیال۔
سنت تکارام۔ گرو نانک مہاراج، شری کبیر، شری چیتن مہاراج
راجہ موہن رائے، دیویندر ناتھ ٹیگور، کیشب چندر سین، یہ سب
حضرات ہندو دھرم اور ہندو سماج میں پیدا ہوئے۔ لیکن
انہوں نے ساری عمر اسلام کے مذکورہ بالا بنیادی تصورات
کی تبلیغ کی۔

صد جوئے دشت سے دُنیا کی حق پرست کمزور اقوام بھی مراد
ہو سکتی ہیں۔ جن کو اسلام نے اپنے دامن میں پناہ دی۔

ریگِ بیاباں کنایہ ہے انسانیت کش خلافِ عقل تعلیمات اور رسوم سے یا اسلام کے خلاف تحریکات سے مختصراً ریگ کنایہ ہے باطل سے۔

در بر گرفتہ یعنی اسلام نے ساری دُنیا کے کمزوروں ، بے کسوں اور غلاموں کو اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دی۔ اسلام دنیا میں ہر کمزور کا حامی ہے۔ کیونکہ وہ اسی لیے آیا تھا کہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دے۔ اسی لیے اُس نے ملوکیت کو حرام قرار دیا ہے۔

ہمسفرانِ زبون۔ کنایہ اللہ کے نیک بندوں سے جن کو دشمنانِ حق نے ہمیشہ ہدفِ ملامت بنایا اور دکھ پہنچایا۔

صد ہزار گوہر۔ کنایہ ہے ان پاکیزہ نفوس سے جنھوں نے اسلام کی زندگی بخش تعلیمات کی بدولت اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچایا۔ مثلاً سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ و حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ و حضرت مخدوم کلیریؒ و حضرت روشن چراغ دہلویؒ و سلطانِ دکن خواجۂ بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ

دریائے پُر خروش کنایہ ہے اسلام کی اس شان و شوکت سے جو اس کو کچھ عرصہ کے بعد حاصل ہوئی۔ جب اُس نے قیصر و کسریٰ کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اور شتر بانوں کو جہاں بان بنا دیا۔

تنگنائے کوہ و دمن، کنایہ ہے مادی مشکلات سے۔

نشیب و فراز، کنایہ ہے اُن امتیازات سے جو دیگر مذاہب نے وضع کیے تھے۔ مثلاً برہمن، شودر، چنڈال وغیرہ۔

بیتاب و تند و تیز، یعنی اسلام نے مسلمانوں کے اندر بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا۔

نوٹ:۔ مَیں نے تشریح الفاظ میں اسلام اور زندگی کو مترادف قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے فلسفہ میں اسلام سے باہر زندگی کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ذاتِ محمدیؐ معیارِ قدر ہے۔ جو شے حضورؐ سے جتنی زیادہ قریب ہے اُتنی ہی زیادہ قیمتی ہے۔ اور جتنی زیادہ دُور ہے، اُتنی ہی زیادہ

بے قیمت ہے اور جو شئی آپ سے بالکل بیگانہ ہے یعنی آپ کے نور سے بالکل محروم ہے، اُس کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں۔ اسی نکتہ کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے :-

(۱) ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو

(۲) یا ز نورِ مصطفےٰ ؐ او را بہا است
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ؐ است

اقبال نے مجھ سے خود ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ انسان اور مسلم ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ جو مسلمان نہیں وہ انسان ہی نہیں۔ یعنی انسانیت کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میرا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام اور حیات ہم معنی الفاظ ہیں، جو شخص اسلام سے دُور ہے، وہ گویا زندگی سے دُور ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عقیدہ کی تائید میں قرآن حکیم کی ایک آیت بھی لکھ دوں :-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا
دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم مانو۔ جب وہ بُلائے تم کو اُس (دین) کی طرف جو تمھیں زندہ کرتا ہے (یعنی حضورؐ کا پیغام زندگی بخشتا ہے۔ یعنی حضورؐ کی ذات بابرکات زندگی کا سرچشمہ ہے)۔

مطلب گو ئٹے کہتا ہے کہ "محمد عربی (صلے اللہ علیہ وسلم) کا وجود جو کہکشاں کی مانند درخشاں ہے۔ اس کائنات کے حق میں بارانِ رحمت ہے۔ کیونکہ اس کی بدولت یہ کائنات سرسبز و شاداب ہو گئی۔ ذاتِ محمدی دنیا میں جلوہ گر ہونے سے پہلے، آغوشِ حق میں محوِ خواب تھی، لیکن آپ چونکہ سراپا رحمت ہیں، اس لیے آپ کی شانِ رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ آپ دُنیا میں تشریف لائے۔ آپ کے وجود کی برکت سے مُردے (سنگریزے) زندہ (نغمہ سرا) ہو گئے۔ آپ کی تعلیم (ذات) آئینہ کی طرح صاف شفاف اور پاکیزہ ہے۔

آپ کا لایا ہوا دین آہستہ آہستہ ہمہ گیر ہوتا جاتا ہے یعنی عالمگیریت کی شان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں، جب یہ نظامِ زندگی (جوئے آب) ساری دنیا پر چھا جائے گا۔ (بحرِ بیکراں بن جائے گا) یہ مفہوم اس حدیث سے ماخوذ ہے:۔

لَا یَبْقیٰ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰہُ الاِسْلَام یعنی نہیں باقی رہے گا کوئی مکان اور نہ کوئی خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کرے گا۔

دوسرا عمیق تر مفہوم جس کا لطف صرف اہلِ ذوق ہی اُٹھا سکتے ہیں، یہ ہے کہ ذاتِ محمدی، ذاتِ حق (بحرِ بیکراں) سے واصل ہونے کے لیے مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ساری کائنات کو اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی ہے۔ یہ ذات بالکل یگانہ ہے، کائنات میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اور چونکہ اس کی توجہ ذاتِ حق پر مرکوز ہے۔ اس لیے ماسویٰ سے بے گانہ ہے۔

(۲) جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو دُنیا اپنی پوری دلفریبیوں اور فتنہ سازیوں کے ساتھ آپ کی راہ میں حائل ہوئی، اور اس نے آپ کو تبلیغ اسلام سے باز رکھنا چاہا۔ یعنی سردارانِ قریش آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے عورت، دولت اور حکومت یہ تینوں چیزیں پیش کیں، اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ دُنیا انہی تین فتنوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن آپ نے ان تینوں چیزوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔

دُنیا کی لذتوں اور راحتوں نے قدم قدم پر آپ کا دامن پکڑا اور کہا کہ ہم آپ کی کنیزیں ہیں، ہم سے تمتع حاصل کیجیے۔ لیکن آپ نے ان جلوہ فروشوں سے قطع تعلق کا اعلان فرمایا۔ اور حق کی اشاعت میں مصائب برداشت کیں (صحرا برید) جن کی تفصیل سے سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

(۳) جب آپ نے توحید کا علم بلند فرمایا جس کے سایہ میں ہر بیکس اور مظلوم کو پناہ مل سکتی ہے، (جو ساری دُنیا کے لیے امن و امان کا کفیل ہے۔

کمزوروں کا حامی اور غلاموں کا دستگیر ہے۔ تو ساری دُنیا کے حق پرستوں نے آپ سے عرض کی کہ ہم چونکہ کمزور ہیں، ملوکیت کے شکنجے میں گرفتار ہیں، سارے دولتمند ہمارے درپئے آزار ہیں۔ ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے، اس لیے آپ ہماری حمایت فرمائیں اور ہم کو ظالموں کے جور و ستم سے بچائیں۔

یہ سُن کر آپ نے اپنی آغوشِ رحمت ساری دُنیا کیلئے وا کر دی۔ اور سب کو اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دی۔ کیونکہ آپ رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ اور آپ کا پیغام "ذِکْرٌ لِلْعَالَمِیْنَ" ہے۔ آپ بھی ساری دُنیا کے لیے رحمت ہیں اور آپ کا پیغام بھی ساری دُنیا کے لیے نصیحت ہے۔ جس میں شرق و غرب کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

پس آپ سب کو اپنے ساتھ لیے ہوئے بامِ عروج کی طرف جا رہے ہیں۔ اور ساری کائنات کو رحمتِ ایزدی کا مژدہ سُنا رہے ہیں۔ (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ)

(۴) اسلام کا پیغام جو اپنی عظمت و وسعت کے لحاظ سے اب دریائے پُر خروش کا مصداق ہے، اور یہ شان و شوکت اُسے حضورؐ ہی کی جدوجہد کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ ایک عالمگیر پیغام ہے۔ جس نے انسانوں کے بنائے ہوئے تمام غیر فطری امتیازات کو باطل کر دیا۔ اور اُن تمام تصورات کو مٹا دیا، جو انسان نے اپنے نسلی تعصبات کی بناء پر دُنیا میں رائج کرا دیئے تھے۔

اسلام میں نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ کوئی آمرِ مطلق، نہ کوئی اعلیٰ ذات والا ہے نہ ادنیٰ ذات والا۔ نہ پنڈت ہے نہ اچھوت، نہ سرمایہ دار ہے نہ مزدور، نہ حاکم ہے نہ محکوم۔ ؎

نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں

بلکہ سب بھائی بھائی ہیں، اس لیے سب برابر ہیں۔ عزت کا صرف ایک ہی معیار ہے جو خدا کا مقرر کردہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص جسقدر

زیادہ متقی ہے، اللہ کی نگاہ میں اسی قدر زیادہ مکرم ہے۔

اسلام نے ذات، پات، قوم، قبیلہ، رنگ، نسل اور زبان کے تمام امتیازات (نشیب و فراز) کو مٹا دیا۔ کُلُّکُمْ اَبْنَآءُ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ تم سب آدم کے بیٹے ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ لہذا سب برابر ہیں۔ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور گورے کو کالے پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے۔

اسلام، پیغام انقلاب ہے، اس لیے ہر دم اور ہر زمانہ میں "تازہ" ہے، وہ کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ وہ سراسر حرکت اور جد وجہد ہے۔ اور اپنے پیروؤں میں ولولہ اور جوش، سوز اور گداز اور سرفروشی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یعنی نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ اور چونکہ ہر وقت آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے، اس لیے اس کے پیروؤں میں کبھی جمود کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ۱۲

نامۂ عالمگیرؒ

بیکے از فرزندانش کہ دعائے مرگ پدر میکرد

خدائی گر بزودی دیر مینہ بود — بے دید عجیبہ وبت دگشود
زما سینہ چاکان این تیرہ خاک — شنیدست صد نالۂ دردناک
بے بحر سلطنت بیدرخون نشست — نہ یک نالہ از سینۂ او گسست
نہ از گریۂ بے کسان تپید — نہ از درد ایوب آہے کشید

پسندد از آن کز مہجیریہ
بدام دعائے تو گردد سید

تمہید مجھے افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے نہ میں اس مرد مومن کے سوانح حیات اس مختصر شرح میں درج کر سکتا ہوں اور نہ اس کے علمی اور عملی کمالات پر تبصرہ کر سکتا ہوں۔ لہذا رموز بے خودی سے چند اشعار درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جو علامۂ مرحوم نے اس کی شان میں لکھے ہیں:-

حق گزید از ہند عالمگیر را
آں فقیر صاحب شمشیر را

از پئے احیائے دیں مامور کرد
بہر تجدید یقیں مامور کرد

برق تیغش خرمن الحاد سوخت
شمع دیں در محفل ما بر فروخت

کور ذوقاں داستانہا ساختند
وسعت ادراک او نشناختند

شعلۂ توحید را پروانہ بود
چوں براہیم اندریں بتخانہ بود

در صف شاہنشہاں یکتاستے
فقر او از ترکشش پیداستے

بلاشبہ اقبال نے ان چھ شعروں میں عالمگیرؒ کی پوری زندگی درج کر دی ہے، گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اس سے بہتر تبصرہ آج تک میری نظر سے نہیں گذرا۔

حضرت عالمگیرؒ نے اپنی شاہزادگی اور بادشاہت کے دوران میں جو خطوط سپردِ قلم کئے تھے، وہ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ ہونے کے علاوہ ادب اور انشاء کا بھی قابل قدر نمونہ ہیں۔ آج سے نصف صدی پہلے تک تعلیم یافتہ ہندوستانی ان خطوط کو اپنی تعلیم کے زمانہ میں اسی ذوق وشوق سے پڑھتا تھا جس ذوق وشوق سے موجودہ نسل "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کو پڑھتی ہے۔

اس خط کا قصہ یہ ہے کہ عالمگیرؒ کا دُوسرا بیٹا ابوالمعظم شمس الدین محمد (جو شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے لقب سے ۱۷۰۷ء میں تخت نشین ہوا) اپنے باپ کی درازئ عمر سے تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے ایک پرائیویٹ مجلس میں اُس نے اپنے مصاحبوں سے یہ بات کہی کہ تخت وتاج کے انتظار میں بال سفید ہو گئے۔ (اس کی عمر پچیس سال سے متجاوز ہو چکی تھی) لیکن بڈھے کو موت ہی نہیں آتی۔ خدا کرے وہ بہت جلد اس دُنیا سے رخصت ہو تاکہ میری دِلی آرزو بر آئے۔ جب اس کی اطلاع حضرت عالمگیرؒ کو ہوئی، تو انھوں نے اپنے سعادت مند فرزند کو یہ خط لکھا۔

وہ خدا جو ازلی و دیرینہ بود ہے، اُس نے یہ دُنیا اور اس کے انقلابات بہت دیکھے ہیں۔ اور اس دُنیا کے مضطرب الحال انسانوں کے

بہت سے نالے سُنے ہیں۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں ہزاروں انسان حضرت امام حسینؓ کی طرح خاک و خون میں تڑپ چکے ہیں۔ لیکن اس نے کسی کی موت پر اظہارِ تاسف نہیں کیا۔ نہ گریۂ یعقوبؑ پر اس کا دل پسیجا اور نہ وہ ایوبؑ کی آہ و فریاد سے متأثر ہوا۔

اے نادان! کیا تو سمجھتا ہے کہ وہ تیری دُعا قبول کرے گا؛ یعنی اپنی مشیت کے خلاف، محض تیری آرزو پوری کرنے کے لیے تجھے قبل از وقت موت دے دیگا؛ تو لاکھ میرے مرنے کی دُعائیں کر سب بے سُود ہیں۔ مَیں اُسی وقت مروں گا جب اُس کی مرضی ہوگی۔

بہشت

کجا این دورگاہے شیشہ بازے؟ — بہشت این گنبد گردان ندارد
[illegible] — [illegible] ندارد

[illegible] — [illegible] جان ندارد
[illegible] — [illegible] طوفان ندارد
[illegible] — وصال اندیشۂ ہجران ندارد
[illegible] — [illegible] ندارد

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

تمہید یہ نظم اقبال کی نُدرتِ فکر کی بہت عمدہ مثال ہے۔ عموماً لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بہشت بڑی اچھی جگہ ہے، وہاں ہر قسم کی نعمت موجود ہے اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے، لہٰذا وہ جگہ رہنے کے لائق ہے۔ لیکن اقبال کہتے ہیں کہ بہشت کی دلچسپیاں مسلم ہیں مگر وہ اس قابل نہیں ہے کہ وہاں مستقل طور سے رہنے کی آرزو کی جائے چنانچہ یہ نظم انہوں نے اسی نظریہ کے اثبات میں لکھی ہے۔ اور اس کے ہر شعر میں طنز اور شوخی کا دلپذیر امتزاج پایا جاتا ہے، جو اُن کے شاعرانہ

فن کی نمایاں خصوصیت ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ کہاں یہ عالمِ خاک اور کہاں بہشت! کہاں یہ مکار، عیار اور دغا باز دُنیا اور کہاں جنت! جس میں نہ عیاری ہے نہ مکاری! دُوسرے مصرع میں اقبال نے اس کی وجہ بیان کر دی ہے کہ بہشت میں گنبد گردوں یعنی آسمان تو ہے ہی نہیں پھر وہاں عیاری (شیشہ بازی) کا گذر ہو تو کیسے؟

نوٹ: مشرقی شعراء کا پختہ عقیدہ ہے کہ دُنیا میں جس قدر عیاری اور مکاری پائی جاتی ہے، یہ سب فلک کی کرشمہ سازی ہے۔ اور اسی لیے وہ اس کو "حقہ بازی" یا شعبدہ ناز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

(۲) وہاں کوئی شخص اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ وہ ظالمانہ برتاؤ نہیں کرتا جو اس دنیا کے لوگ روا رکھتے ہیں۔
(اشارہ ہے برادرانِ یوسفؑ کی سنگدلی اور سفاکی کی طرف)
اور نہ وہاں کوئی عورت کسی مرد کی محبت میں گرفتار ہو کر سر بازار رسوا ہوتی ہے۔ (اشارہ ہے زلیخا کی رسوائی کی طرف)

(۳) نہ وہاں راستباز کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور نہ کسی کے دل میں دیدار کا اشتیاق چٹکیاں لیتا ہے (اشارہ ہے حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواستِ دیدار کی طرف)۔

(۴) نہ وہاں کسی کی کشتی طوفانِ باد میں محصور ہوتی ہے۔ اور نہ وہاں کے سمندر میں تلاطم برپا ہوتا ہے (لطمہ بمعنی سیلی یا تھپڑ)
مطلب یہ ہے کہ جنت میں "حوادث ارضی و سماوی" رونما نہیں ہوتے، ہر شخص نہایت عافیت اور سکون اور طمانیت کی زندگی بسر کرتا ہے۔

(۵) نہ وہاں کے باشندوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات اور وساوسِ شیطانی پیدا ہوتے ہیں (ریگ و سنگ کنایہ ہے شکوک سے)

اور نہ وہاں عاشقوں کو ہجر کا دھڑکا ہے نہ فراق کا خوف ہے۔
(وہاں ہر شخص کو دائمی وصال کی لذت حاصل ہوگی)

(۴) اس شعر میں اقبال نے عقل کو "غلط سیر" لکھا ہے اور اسی ترکیب میں اس شعر کا لطف مضمر ہے۔ کیونکہ عقل انسانی لازمی اور یقینی طور سے غلطی کرتی ہے اور انہی غلطیوں کی بنا پر راہ میں دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور انسان کو انہی دشواریاں اور پیچیدگیوں میں لطف آتا ہے، انہی میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ اور اقبال نے پہلے مصرع میں اسی نکتہ کی وضاحت کی ہے، کہ جنت میں وہ لذت کہاں، جو ہمیں اس دنیا میں "عقل غلط سیر" کی بدولت محسوس ہوتی ہے۔ وہاں تو کوئی شخص غلطی کر ہی نہیں سکتا۔

(۷) اس لیے اقبال کا "فتویٰ" یہ ہے کہ انسان کو ایسی بے مزہ دنیا میں نہیں رہنا چاہیے جہاں یزدان تو ہو لیکن شیطان نہ ہو۔ ہر طرف نیکی ہی نیکی ہو، بدی کے ارتکاب کا امکان ہی نہ ہو۔

اقبال نے اس نظم میں ظریفانہ انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ لطفِ زندگی اس بات میں مضمر ہے کہ انسان ایسے ماحول میں رہے جہاں اُسے اپنی قوت ارادی کے اظہار کا موقع مل سکے۔ یعنی کمالِ زندگی یہ ہے کہ انسان کے سامنے فجور اور تقویٰ دونوں کی راہیں کھلی ہوئی ہوں، پھر وہ اپنی قوتِ ارادی سے فجور کی راہ کو ترک کر دے اور تقویٰ کی راہ کو اختیار کرے۔ جہاں یہ اختیار نہ ہو، جہاں صرف نیکی ہی نیکی ہو، وہاں جینے میں کوئی لطف نہیں ہے، بلکہ

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے
نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

کشمیر

رفت بہ ہستی کہ نکالی رہی تیر | سبزہ جہاں جہاں سی بہ ارمنی بمن گو

باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج | صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
تا نہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز | بستہ بہ چہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آب جو تپید | خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز | قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او گشا باز بخویشتن نگر

تمہید: اس بہاریہ نظم میں اقبال نے اپنی شاعرانہ مصوری اور مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ آخری شعر حسب معمول اس ساری نظم کی جان ہے۔ اور علی الخصوص "باز بہ خویشتن نگر" کی ترکیب تو اس قدر دلکش ہے کہ رمز و کنایہ کا سارا دفتر اس پر قربان ہے۔

اقبال نے پہلے چار اشعار میں کشمیر کی وادیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ پانچویں شعر میں ناظرین کو موسیقی اور مے نوشی کی ترغیب دی ہے۔ آخری شعر میں کشمیر جنت نظیر کی سب سے بڑی دلکشی یعنی دختر برہمن کا ذکر کیا ہے۔ اور صرف دو لفظوں میں اس کا سراپا بیان کر دیا ہے۔ اس کے رخسار گل لالہ کی طرح سرخ ہیں اور اس کا جسم چنبیلی کی طرح سفید اور خوشبودار ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! پہلے ایک نظر اسے دیکھ، پھر اپنے آپ کو دیکھ!

"باز بخویشتن نگر" بلا مبالغہ بڑی دلکش، بلیغ، نیش دار اور پہلودار ترکیب ہے۔ اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:-

(ا) پہلے اسے دیکھ، پھر اپنی حالت پر غور کر کہ کیا تو اسے حاصل کر سکتا ہے؟

(ب) اس کے حسن دلستاں کو دیکھ کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کر کہ کارکنان قضا و قدر نے تجھے حوران بہشتی کے انتظار کی زحمت سے نجات دے دی۔

(ج) اس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنے دل سے پوچھ کہ اب وہ کشمیر سے واپس جانا چاہتا ہے؟

(۶) اس کا جلوہ دیکھ کر اپنی حالت کا جائزہ لے کر اب تو ہوش
میں بھی ہے یا نہیں؟ دل تیرے قابو میں بھی ہے یا نہیں؟

کیوں چپ ہو نسیم! کچھ تو بولو!
آنکھیں تو ملاؤ! دل کہاں ہے؟

(۷) ایک مفہوم اور بھی پوشیدہ ہے جو اکبر الہ آبادی کے اس
شعر کو پڑھ کر واضح ہو سکتا ہے:۔

شیخ جی اس بُت کا جلوہ دیکھ ساکت ہو گئے
ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے چت ہو گئے

مطلب اشعار تو آسان ہیں، لیکن بعض الفاظ تشریح طلب ہیں۔ ان
کا مطلب ذیل میں درج کئے دیتا ہوں:۔

رخت کشادن = کسی جگہ قیام کرنا۔

تل یعنی ٹیلہ۔

دمن۔ دمنہ کی جمع ہے یعنی آثار خانہ۔ یہ لفظ اسلام سے پہلے عربوں
کی عاشقانہ شاعری میں بہت مستعمل تھا۔ چنانچہ زہیر کہتا ہے:۔

اَمِنْ اُمِّ اَوْفیٰ دِمْنَۃٌ لَمْ تَکَلَّمِ

کیا یہ اُمِّ اوفیٰ (شاعر کی معشوقہ) کے گھر کے نشانات ہیں، جو مجھ
سے نہیں بولتے؟

جہاں جہاں۔ فارسی میں تکرار لفظی کثرت کا فائدہ دیتی ہے۔ لہٰذا جہاں
جہاں، چمن چمن، فوج فوج، شرر شرر، شکن شکن ان تمام لفظوں
سے کثرت کا اظہار مقصود ہے۔

قلقل اور سار۔ خوشنما پرندے جن کی آواز بھی رسیلی ہوتی ہے۔

ناردان۔ انار کا درخت۔

سپہر فتنہ باز۔ شعراء آسمان کو فتنہ باز باندھتے ہیں۔ کیونکہ

یہ دو دل کو یک جا بٹھاتا نہیں
کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں

نسترن۔ ہندی میں سیوتی کا پھول۔

خاک شرر شرر ببیں ۔ یعنی گل لالہ کی یہ کثرت ہے گویا خاک میں بیشمار شرارے چمک رہے ہیں۔

آب شکن شکن نگر۔ یعنی موجوں کی کثرت کی وجہ سے پانی میں بے شمار شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔

زخمہ بمعنی مضراب۔

سانگیں بمعنی قدح شراب (بڑے سائز کا پیالہ)

دخترکے برہمنے میں کاف سے دلکشی کا اظہار مقصود ہے ۔

عشق

عقلے کہ جہاں سوزد یک جلوۂ بیباکش
از عشق بیاموزد آئین جہانتابی

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با ایں ہمہ بیتابی

ہر معنی پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بدل در شو شاید کہ تو دریابی

تمہید اس نظم میں اقبال نے عشق کی بعض نمایاں خصوصیات بیان کی ہیں۔ دوسرے شعر میں اقبال نے مرشد رومیؒ اور حکیم ابو النصر فارابی کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مختصر سوانح حیات ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) مرشد رومیؒ مسلکِ عشق کے علمبردار اقبال کے روحانی پیشوا بلکہ مرشد ہیں۔ اور دنیائے اسلام میں مولانا کے لقب سے مشہور ہیں ۔ اصل نام محمد تھا، جلال الدین لقب، عرف مولانائے روم۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی اولاد میں تھے۔ سنہ ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے اور سنہ ۶۷۲ھ میں بمقام قونیہ واصل ہوئے۔ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصاریٰ بھی جنازے کے آگے آگے توریت اور انجیل پڑھتے اور نوحہ کرتے جاتے تھے۔ مزار مبارک آج تک بوسہ گاہ خلائق ہے۔

(۲) حکیم ابو نصر محمد بن محمد بن طرخان الفارابی ترکی النسل تھا بقول ابن خلکان

مسلمانوں میں اس سے بڑا فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ فاراب اس کا مولد ہے۔ خراسان، عراق، شام اور مصر میں تحصیل علوم کے بعد بغداد آیا۔ اور یہاں سے دمشق گیا اور اسی شہر کو اپنا وطن بنا لیا۔ سیف الدولہ ہمدانی والیٔ ملک شام چونکہ بہت علم دوست تھا، اس لیے الفارابی کا مربی اور قدردان تھا۔ نہ ساری عمر شادی کی نہ مکان بنایا، نہ سامان جمع کیا نہ دُنیا سے کوئی تعلق پیدا کیا۔ یعنی حقیقی معنوں میں فلسفی تھا سیف الدولہ نے اس کی درخواست کے مطابق چار درہم یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ۹۵۰ء میں وفات پائی۔

مطلب کہتے ہیں کہ عقل کی مدد سے انسان دُنیا میں تباہی تو پھیلا سکتا ہے۔ مثلاً ایٹم بم بنا سکتا ہے۔ مہلک گیس ایجاد کر سکتا ہے لیکن دنیا کو راحت کدہ نہیں بنا سکتا۔ عقل انسان کو عیاری اور فریب کاری کی راہیں سمجھا سکتی ہے۔ لیکن دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے اپنی زندگی قربان کرنے یا اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے پر آمادہ نہیں کر سکتی، مختصر یہ کہ عقل کا کام جہاں سوزی ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس دنیا کو منور کرنا چاہتا ہے۔ اگر دُنیا والوں کو راحت پہنچانی چاہتا ہے۔ تو اسے عشق کا مسلک اختیار کرنا پڑے گا۔ یعنی جب انسانی عقل تابع عشق ہو جاتی ہے، تو انسان میں ایثار کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ عقل یہ کہتی ہے، اپنے لیے زندہ رہو۔ لیکن عشق سمجھاتا ہے دوسروں کے لیے جیو۔

۲۔ اے مخاطب! عاشقانہ سوز و گداز سے لے کر تکلیف، حیرت و استعجاب تک جس قدر کیفیات انسان کے قلب میں پیدا ہوتی ہیں، یہ سب حضرت عشق ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

رومی مسلک عشق کے علمبردار ہیں اور عشق کا ثمرہ تب و تاب ہے، فارابی مذہب عقل کا نمائندہ ہے اور عقل کا نتیجہ حیرت و استعجاب ہے جب فلسفی پر عقل کی بے مائیگی اور بیچارگی کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو لامحالہ اس پر حیرت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں، یہ کیفیت عقل کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس جذبہ کا نتیجہ ہے جو عقل کی

بیچارگی کے مشاہدہ کے بعد دل پر طاری ہوتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ جذبات کا تعلق عشق سے ہے نہ کہ عقل سے۔

نوٹ :- افلاطون پہلا فلسفی ہے جس نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ فلسفہ کا آغاز بھی حیرت سے ہوتا ہے اور اس کا انجام بھی حیرت ہی پر ہوتا ہے، اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے :-

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

۲- اے مخاطب! میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ مجھے اس حقیقت سے آگاہی ہو گئی ہے کہ اگرچہ عشق انسان کو ہر وقت مضطرب رکھتا ہے اور اس پر بہت سے مصائب بھی نازل کرتا ہے، اس کے باوجود قلب انسانی کو آسائش اور طمانیت اسی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

نوٹ :- اس نظم میں عشق سے عشقِ الٰہی مراد ہے اور اس شعر کا مضمون قرآنِ حکیم سے ماخوذ ہے :-

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳ : ۲۸)

اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

۳- عشق کی ماہیت اور کیفیت کا اظہار لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔ اے مخاطب اگر تو اس سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو دل کے دریا میں غوطہ لگا۔ یعنی مسلکِ عشق اختیار کر۔ ع

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

بندگی

دوش پیر میکدہ آن ساحر بادہ فروش
گفت این سخنے وارجو آویزہ بگوش
مشرب بادہ گساران کس نیابد درست
کہ ندارد میکدہ خبری ہستی ہوش
می نگیرم کہ رود بندہ آزاد عشق
ادب آموز دست مغ بادہ باندازہ نوش
کم رو اسیر ایں ذوق طلب جوئیدت
بندگی با ہمہ جبروت خدائی مفروش

تمہید اس نظم کا عنوان ہے بندگی۔ بندگی سے انسانوں کی بندگی یعنی غلامی مراد نہیں ہے بلکہ مقامِ عبدیت یعنی اللہ کی بندگی مراد ہے۔ اقبال کے نظامِ افکار میں بندگی بمعنی عبدیت، انسانیت کی معراج ہے جس سے بالاتر اور کوئی مقام نہیں ہے۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:-

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

واضح ہو کہ اقبال نے عبدیت کا فلسفہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے مستنبط کیا ہے:-

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط
اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱:۱۷)

ہر عیب سے پاک ہے وہ اللہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے چاروں طرف برکت رکھی ہے ہم نے تاکہ دکھائیں ہم اس کو اپنی بعض نشانیاں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی یا رسول کے بجائے "عبدہ" کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ لہٰذا بصراحت النص ثابت ہے کہ مقامِ عبدیت، مقامِ نبوت و رسالت سے بھی بالاتر ہے۔ اسی لیے اقبال نے یہ غیر فانی شعر لکھا ہے:-

عبد دیگر، عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار، او منتظر

واضح ہو کہ اس نظم کا بنیادی تصور یا مرکزی خیال اس مصرع میں مذکور ہے۔ اور اس مصرع ہی کی خاطر اقبال نے یہ نظم لکھی ہے:-

ع بندگی با ہمہ جبروت خدائی مفروش

مطلب کل رات خانقاہ (میکدہ) میں ایک مرید باختصاص (ترسا بچہ) سالکانِ طریقت سے یہ کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں ایک نکتہ بتاتا ہوں، جو آویزۂ گوش بنانے (یعنی دل و جان قبول کرنے) کے لائق ہے، اور وہ یہ کہ بزرگانِ سلف (بادہ گسارانِ کہن) کی تعلیم یہ ہے، کہ سالک کو لازم

ہے، کہ جب خانقاہ سے اجازت ارشاد حاصل کر کے باہر نکلے، تو مسلکِ عشق (مستی) کے ساتھ ساتھ قوانینِ شریعت (ہوش) کو ملحوظ خاطر رکھے۔

سالک کو اجازت ہے کہ وہ لوگوں کو عشق (نکتہ شوق) کا درس دے لیکن خود بھی شریعت کے قوانین کی کامل اتباع کرے اور لوگوں کو بھی اطاعتِ احکامِ الٰہی کی تلقین کرے۔

اور اس حقیقت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھے کہ اگرچہ ہم عاشق (اگر د رہ) ہیں، لیکن ہمارا کمالِ ذاتی اس پر موقوف ہے کہ ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مقامِ عبدیت میں ترقی حاصل کرنے کی التجا کرتے رہیں۔

گرچہ عین ذات را بے پردہ دید
رَبِّ زِدْنِیْ از زبانِ او چکید

ہمارا جوہر، ذوقِ طلب ہے، یعنی اپنی اصل کے لحاظ سے ہم عبد ہیں اس لیے ہم عبدیت کے دائرہ سے کبھی نہیں نکل سکتے۔ بندہ خواہ کتنی بھی ترقی کیوں نہ کرے، بہر حال بندہ ہی رہے گا۔ خدا کبھی نہیں بن سکتا۔ لہٰذا سالک کو لازم ہے کہ خواہ اس کی بارگاہ میں کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ حاصل ہو جائے لیکن اپنے کو اس کا ناچیز بندہ ہی یقین کرے۔

دُوسرا مفہوم یہ ہے کہ خواہ اس میں صفاتِ ایزدی کا رنگ کتنا ہی شدید کیوں نہ پیدا ہو جائے، لیکن وہ اپنی توجہ اپنے مقامِ عبدیت سے ایک لحظہ کے لیے بھی نہ ہٹائے۔ کمالِ انسانی، عبدِ کامل بننے میں ہے نہ کہ خدا بننے میں، یقین نہ ہو تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ عمل کو دیکھو کہ آپ روحانیت کے لحاظ سے اس مقام پر ہیں جہاں کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

ع بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

مگر اس کمال کے باوجود آپ ساری عمر یہی دعا کرتے رہے رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی اے خدا میرے علم و عرفان میں اضافہ فرما۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدیت کا احساس مدۃ العمر آپ سے زائل نہیں ہوا۔

غلامی

آدم از بے بصری بندگیِ آدم کرد — گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

تمہید اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جب انسان کسی انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے تو دائرۂ انسانیت (آدمیت) سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور حیوانات کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ بلکہ ان سے بھی گیا گزرا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حیوانات میں عقل نہیں ہے اور انسان اس نعمت سے بہرہ ور ہے۔

مطالب کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنی حقیقت یا اپنے مجد و شرف سے آگاہ ہو جائے، تو وہ کبھی کسی انسان کی غلامی نہیں کر سکتا۔ لیکن افسوس کہ وہ اپنے مقام سے بے خبر ہے۔ اس لیے ذلت گوارا کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات بنایا تھا۔ لیکن اس نے اپنا شرف (گوہر) بادشاہوں کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔ یعنی ملوکیت کا غلام بن گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آج کتوں سے بھی بدتر ہے کیونکہ میں نے آج تک کسی کتے کو نہیں دیکھا جس نے دوسرے کتوں کی غلامی اختیار کی ہو۔

نوٹ:- یہ نکتہ قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:-

أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ط

یعنی جو لوگ ذوقِ حق کے منکر ہیں (اور اس لیے انسانوں کی غلامی کرتے ہیں) وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ (خوار تر)۔

چیستانِ شمشیر

آں سخت کوش چیست کہ گیرد ز سنگ آب — مرآتِ صنعتے کہ سکندر غنی شود
مثلِ نگاہ دیدہ ز نفس کدر شود — در جوئے آب و در بیابان آذری شود

مضمون او بہ مصرعِ برجستہ تمام
منت پذیر مصرعِ دیگر نمی شود

مطلب بتاؤ کہ وہ سخت کوش (مشقت برداشت کرنے والا) کون ہے، جو پتھر سے آب حاصل کرتی ہے؟ سکندر کی طرح آب کے لیے خضر کی محتاج نہیں ہوتی۔ یعنی خضر سے آب طلب نہیں کرتی۔

لفظ آب میں ایہام ہے (۱) آب بمعنی تلوار کی دھار (۲) آب بمعنی پانی۔
اس کا چہرہ نگاہ کی طرح روشن ہے (اشارہ ہے صیقل کی طرف) وہ سراسر آب میں رہتی ہے (یہاں آب سے دھار مراد ہے) اس کے باوجود اس کا دامن آب (پانی) سے تر نہیں ہوتا۔

اس کا مضمون (مقصد) ایک ہی مصرع (وار یا ضرب) سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اسے دوسرے مصرع کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی وہ ایک ہی وار میں دشمن کا کام تمام کر دیتی ہے۔ دوسرے وار کی حاجت نہیں پڑتی۔

جمہوریت

متاعِ معنیِ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی   ز موراں شوخیِ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

تمہید اقبال مغربی جمہوریت کے قائل نہیں ہیں۔ انھوں نے بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک ہر کتاب میں اس طرزِ حکومت کی مذمت کی ہے۔ بانگِ درا میں لکھتے ہیں:-

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ارمغانِ حجاز میں اسی بات کو یوں کہتے ہیں:-

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

اقبال کو اس طرزِ حکومت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اگر ایران کی اکثریت باطل پر متفق ہو جائے، تو حق بآسانی مغلوب ہو جائے گا۔ اور چونکہ دولتمند افراد زر کے زور سے ووٹ خرید سکتے ہیں، اس لیے اس طرزِ حکومت میں حق کے اُبھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اسی بات کو ضربِ کلیم میں انہوں نے یوں واضح کیا ہے:۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مطلب اے مخاطب، تو کوروں نظرت (خود غرض اور طماع) انسانوں سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ دُوسروں کے حقوق کی نگہداشت یا حفاظت کر سکیں گے؟ کہاں چیونٹی، کہاں سلیمان!

اس لیے میں تجھے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ جمہوریت کی غلامی کرنے کے بجائے کسی مردِ پختہ کار کی غلامی کر، تاکہ تیرے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ یاد رکھ! اگر دو سو گدھوں کے مغز (دماغ) ایک جا کئے جائیں، تو بھی اُن سے ایک انسان کا دماغ نہیں بن سکتا۔ بالفاظِ دگر دو سو گدھے مل کر بھی وہ بات نہیں سوچ سکتے جو ایک انسان سوچ سکتا ہے۔

نوٹ:۔ پختہ کار سے تجربہ کار، دانشمند اور صاحب الرائے شخص مُراد ہے جو دُوسروں کے حقوق کی نگہداشت کر سکے۔

بہ مبلغِ اسلام در فرنگستان

نماند باز بر افروخت آتشِ نو
که آتشکده شد بر جسمِ سلمانی

بیا که پرده ز روی عجم برداریم
که آفتاب جهانگیر شد ز عریانی

هزار نکته بیاموختی ز پیرِ فرنگ
کمالِ حسن سخن را ز علم برهانی

عبیرِ خیر تر از سینهٔ چه بداند
شراب شوق نشان ده به سینهٔ پیمانی

بسوزِ عود که در انجمن نه سوزِ تو ہست
به بزمِ مجلسیان کن غزل خوانی

بهٔ گوشِ کسی که ز افکار و روایت
چه پیغمبر ز نوری شد به مسلمانی

حدیثِ عشق به اهلِ هوس چه میگوئی
بچشمِ مور مکش سرمهٔ سلیمانی

تمہید آج سے چالیس بیالیس سال پہلے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر فرنگستان (یورپ) میں اسلام کی تبلیغ کی جائے تو اسلام اور مسلمانوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ لیکن علامہ اقبال اُن لوگوں میں سے تھے جن کو اس تجویز سے اختلاف تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اقوام یورپ کے سروں پر نسل اور رنگ اور خون کے تفوق کا بھوت اِس بُری طرح سوار ہے کہ اگر یہ اقوام بالفرض اسلام قبول کرلیں، تو بھی ایشیائی مسلمانوں کو اپنا غلام ہی سمجھیں گی۔ اور اُن کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گی، جو حاکم اپنے محکوم کے ساتھ، اور آقا اپنے غلام کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ مثلاً ایک انگریز اگر مسلمان ہوجائے، تو بھی وہ افریقہ کے حبشی مسلمان کو "کالا آدمی" ہی سمجھے گا۔ چنانچہ "ضربِ کلیم" میں لکھتے ہیں :-

اگر قبول کرے دینِ مصطفےٰؐ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

یعنی کوئی یورپین قوم مسلمان ہوجانے کے بعد بھی کسی ہندی یا ایشیائی مسلمان کو اپنا ہم مرتبہ تسلیم نہیں کرسکتی، اور اس کا سبب وہی نسل اور رنگ کے تفوق کا احساس ہے جو اُن کی رگ و پے میں سرایت کرچکا ہے۔

اس لیے اقبال کی تجویز یہ ہے کہ یورپ کو مسلمان بنانے کے بجائے ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق، شام، حجاز، مصر اور ترکی کے مسلمانوں کو مسلمان بناؤ۔ یعنی اُن کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرو۔ اور جب مسلمانوں میں سیاسی اور مادی اعتبار سے طاقت پیدا ہوجائے گی، تو وہ مغربی اقوام کی غلامی سے آزاد ہوسکیں گے۔ اور جب وہ آزاد ہو جائیں گے، تو یورپین اقوام کے دماغ سے اپنی برتری کا احساس نکل جائیگا کیونکہ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ وہ منطق کے بجائے تلوار کے سامنے جھکتی ہے۔ اور دلیل کے بجائے طاقت سے مرعوب ہوتی ہے۔

جس وقت ایشیا کے مسلمان یورپ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوں گے تو ان کی دلیل میں وزن ہوگا۔ اور ان کی بات میں تاثیر ہوگی۔ انسان کی فطرت

ہے کہ وہ اپنے حکمران کی تقلید کرتا ہے۔

غلام کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، آقا کی نظر میں اُس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اگر غلام یہ چاہتا ہے کہ آقا کو حق کی تبلیغ کرے، تو اُسے چاہیئے کہ پہلے آقا کے دل و دماغ میں قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کرے، ورنہ تمام کوشش بیکار ہو جائے گی۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے اس کی غلامی سے نجات حاصل کرے۔ اقبال نے اسی نکتہ کو اس نظم کے آخری شعر میں واضح کیا ہے اور جیسا کہ ان کا اندازِ بیان ہے، انھوں نے اس نظم کی پوری رُوح اس شعر میں کھینچ کر رکھ دی ہے۔ جس طرح اندھے کو سرمۂ سلیمانی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح اقوامِ یورپ کو تبلیغ اسلام سے کوئی نفع حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہل چلا کر زمین کو زراعت کے قابل نہ بنایا جائے، بارش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلمان پہلے اپنے اندر طاقت پیدا کر کے اقوامِ یورپ کے غرور اور احساسِ برتری کو زائل کریں۔ اور جب وہ ایشیائی اقوام (مسلمانوں) کو اپنی طرح انسان سمجھنے لگیں یعنی مساوات کا درجہ دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اُسی وقت اُن کو اسلام کی دعوت دیں۔ موجودہ حالات میں ان اقوام کو اسلام کی تبلیغ کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہوا کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرنا۔

چونکہ یہ نظم اقبال نے رمزیہ انداز میں لکھی ہے، اس لیے مطلب بیان کرنے سے پہلے (جو بڑی حد تک واضح ہو چکا ہے) رموز و کنایات کی تشریح درج کرتا ہوں:-

آتشِ نمرود۔ کنایہ ہے اُن جدید تحریکات سے جو اس وقت اسلام سے برسرِ پیکار ہیں مثلاً نیشنلزم (وطنیت) اور سائنٹفک میٹریلزم (اشتراکیت)۔

داغِ جگر۔ کنایہ ہے عشقِ رسولؐ سے جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی قوتِ محرکہ ہے۔

پردہ برانداختن بمعنی عریاں کردن۔ کنایہ ہے پیغامِ محمدی کی اشاعت سے۔

شکستاں را۔ یعنی غیر مسلموں کو مغلوب کر دیا۔

علم برہانی ۔ یعنی منطقی دلائل۔
شہرِ سلیمی ۔ کنایہ ہے اسلام کے حقائق و معارف سے ۔
رہ عراق و خراسان زن ۔ یعنی عراق اور خراسان کے مسلمانوں کو بیدار کر۔
مقام شناس ۔ کنایہ ہے مبلغ اسلام سے ۔
تازہ کن عزِ عجمی ۔ یعنی عجمیوں کو اسلام کے حقائق سے آگاہ کر۔
حدیثِ عشق ۔ کنایہ ہے تعلیماتِ اسلام سے
اہلِ ہوس ۔ کنایہ ہے اقوامِ مغرب سے ۔
مور ۔ بمعنی چیونٹی ، کنایہ ہے اُن اقوام سے جن میں اسلام کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ۔
سُرمۂ سلیمانی ۔ ایک خاص سُرمہ کا نام ہے جس کے لگانے سے مخفی اشیار ظاہر ہو جاتی ہیں۔ کنایہ ہے حقائق و معارفِ اسلام سے ۔

مطالب اے مبلغ اسلام ! آج یورپ پھر اسلام سے برسر پیکار ہے ، اور اس کو مغلوب کرنے کے لیے نئے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو رہا ہے ۔ یعنی وطنیت اور اشتراکیت اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں ۔ اندریں حالات ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کو از سرِ نو دُنیا میں عام کر دیں ۔ آفتاب اگر پوشیدہ ہے ، تو جہانگیر نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح اگر ہم نے حقائق اسلام کو دُنیا سے پوشیدہ رکھا ، تو اسلام بھی دُنیا کو فتح نہیں کر سکے گا ۔

تو نے اقوامِ یورپ کو عقلی دلائل کی مدد سے ساکت تو کر دیا لیکن اس طریق سے اُن کے دلوں میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی ۔ تیرا مقصد انہیں لاجواب کر دینا نہیں بلکہ مسلمان بنانا ہے ۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے ۔ کہ حجازیوں ، تورانیوں ، عراقیوں ، خراسانیوں اور تمام عجمی مسلمانوں کو از سرِ نو اسلام کے حقائق سے روشناس کر ۔ اُن کے اندر یورپ کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر ۔

تو اُن لوگوں کو اسلام کا پیغام سُنا رہا ہے ، جن میں اس کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ۔ اندھوں کی آنکھوں میں سُرمہ لگانے سے

کیا فائدہ؟ پہلے اُن میں بینائی پیدا کر۔ پھر سُرمہ لگانا مفید ہوگا۔ یعنی یورپین اقوام یہ کہتی ہیں کہ اگر اسلام دُنیا کا بہترین مذہب ہوتا۔ تو اِس کے پیرو ہمارے غلام نہ ہوتے۔ اس لیے پہلے مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ کر۔ انہیں یہ بتا کہ اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جب وہ آزاد ہوجائیں گے، تو یورپ میں تبلیغ اسلام کا راستہ بالکل صاف ہوجائے گا۔

دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ یورپین اقوام کے دلوں میں سیاسی اور مادی تفوق کی بناء پر یہ خیال پختہ ہوگیا ہے کہ ایشیائی اقوام ہم سے ہر معنی میں پست تر ہیں۔ اور انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اس قوم کا کلچر یا تمدن یا مذہب قبول نہیں کرسکتا۔ جس کو وہ اپنے مقابلہ میں ذلیل اور پست یقین کرتا ہے۔ لہٰذا تو سب سے پہلے اُن کے احساسِ برتری کو زائل کر۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کر۔

جب مسلمان سیاسی، اقتصادی، تمدنی اور معاشرتی اعتبار سے ان کے ہم پلہ بن جائیں گے، تو پھر وہ مسلمانوں کی تبلیغ سے متاثر ہوسکیں گے۔ موجودہ حالات میں اُن کو تبلیغ کرنا ایسا ہی ہے جیسے چیونٹی کی آنکھ میں سُرمہ لگانا یا بھینس کے آگے بین بجانا۔

نوٹ:۔ اسی لیے علامہ سید جمال الدین افغانی مرحوم نے ۱۸۸۲ء میں مصر کے مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ "جب تم یورپ میں اسلام کی تبلیغ کرو، تو اُن سے یہ مت کہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ورنہ وہ کبھی تمہاری تبلیغ سے متاثر نہیں ہوں گے۔ ہر سمجھ دار آدمی یہ کہے گا۔ کہ اگر اسلام کوئی عمدہ مذہب ہوتا، تو مسلمان اس قدر ذلیل ہرگز نہ ہوتے۔"

یہی مشورہ اقبال نے دیا ہے کہ غیروں کو مسلمان بنانے کے بجائے پہلے مسلمانوں کو مسلمان بناؤ۔ تاکہ غیر اقوام اُن کے اعلیٰ اخلاق کو دیکھ کر اسلام کی طرف مائل ہوسکیں۔

علامہ نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ آج ہمارا وجود تبلیغِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

غنی کشمیری

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر ۔۔۔ نوا سنجِ کشمیرِ مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشت ۔۔۔ چو بیروں شد از وے در وا گذاشت
یکے گفتش اے شاعرِ دل رسے ۔۔۔ عجب دارد از کارِ تو ہر کسے
جوابش چہ خوش گفت مردِ فقیر ۔۔۔ فقیر و باقلیمِ معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاراں رواست ۔۔۔ دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش ۔۔۔ متاعے گرانے ست در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

تمہید غنی کشمیری کا نام مرزا محمد طاہر تھا۔ علوم و فنونِ متداولہ میں شیخ محسن فانی کا شاگرد تھا۔ تحصیلِ علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰۶۰ھ میں شاعری شروع کی۔ اور بہت جلد اپنے ہمعصروں میں امتیاز حاصل کر لیا۔ مرزا صائب اس کا بہت قدردان تھا اور اکثر کہا کرتا تھا کہ کاش غنی میرا دیوان مجھ سے لے لیتا اور اپنا یہ شعر مجھے دے دیتا۔ ؎

حسنِ سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدم

بخلاف دیگر شعراء، غنی بہت خوددار اور قناعت پسند تھا۔ بیدلؒ کی طرح ساری عمر کسی امیر کے دروازہ پر نہیں گیا۔ حضرت عالمگیرؒ نے اس کی قابلیت کا حال سن کر سیف خان گورنر کشمیر کو لکھا کہ غنی کو ہمارے پاس بھیج دو۔ خان موصوف نے غنی کو طلب کیا اور بادشاہ کے حکم سے آگاہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ بادشاہ کو لکھ بھیجو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے، اس لیے باریابی کے لائق نہیں ہے۔ خان موصوف نے کہا کہ میں آپ

جیسے یگانۂ روزگار کے لیے یہ تضحیک آمیز الفاظ کیسے لکھ سکتا ہوں؟ علاوہ بریں آپ تو باہوش وحواس ہیں۔ یہ سُن کر غنیؔ نے کہا۔ اگر یہ بات ہے، تو میں دیوانہ ہُوا جاتا ہوں، یہ کہہ کر وہ اپنے گھر واپس آیا۔ اور اُسی دن اُس پر دیوانگی کا عالم طاری ہوگیا۔ اور تین چار روز کے بعد چالیس سال کی عمر میں ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی اور سری نگر میں مدفون ہُوا۔

بدیع الزمان نصیر آبادی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ملّا محمد طاہر غنیؔ در تحصیلِ علوم سعیِ بلیغ نمودہ، با وجودِ جمداشتِ سن در کمالِ بے تعلقی بود، چشم برزخارفِ دُنیوی نکشودہ، لعلتِ آں غنیِ معنوی ہم بودہ، چنانکہ خود گفتہ است۔

سعیِ روزی برغنی دارد مرا از جائے خویش
آبرو چوں شمع می ریزم ز سے بر پائے خویش

اُس کا یہ شعر بہت مشہور ہے :۔

غنیؔ روز سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشمِ زلیخا را

مطلب

غنیؔ کشمیری کا یہ دستور تھا کہ جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو گھر کا دروازہ بند رکھتا تھا۔ اور جب گھر سے باہر جاتا تھا، تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اُس سے دریافت کیا کہ اس عجیب وغریب طرزِ عمل کی کیا وجہ ہے؟ اس نے جواب دیا۔

"میں جو کچھ کرتا ہوں بالکل درست ہے۔ اس مکان میں میرے علاوہ اور قیمتی شئی کونسی ہے؟ اس لیے جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو "متاعِ گراں" کی حفاظت کرتا ہوں۔ اور جب میں گھر سے باہر چلا جاتا ہوں تو پھر گھر میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے؟"

خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا ایدہ اللہ

(جولائی ۱۹۲۲ء)

امتے بود کہ ما از اثر حکمت او
واقف از سرّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصل ما یک شرر باختہ رنگے بود است
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم
نکتۂ عشق فرو شست ز دل پیر حرم
در جہاں خوار باندازۂ تقصیر شدیم
باد صحراست کہ با فطرت ما در سازد
از نفسہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم
آہ ازاں غلغلہ کز گنبد افلاک گذشت
نالہ گردید چو پابستۂ بم و زیر شدیم
اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
در بغل تیر و کماں کشتۂ نخچیر شدیم
ہر کجا راہ دہد اسپ بآں تاز کہ ما
بارہا مات دریں عرصہ بتدبیر شدیم (نظیری)

تمہید چونکہ یہ ایک اہم تاریخی نظم ہے۔ اِس سے اقبال نے خلافِ معمول اس کی تاریخِ تصنیف بھی درج کر دی ہے تاکہ پڑھتے وقت اس نظم کا تاریخی پس منظر متعین ہو سکے۔ پہلے مصطفیٰ کمال کے مختصر سوانحِ حیات لکھوں گا۔ پھر پس منظر سے روشناس کروں گا:۔

(۱) مصطفیٰ ۱۸۸۰ء میں بمقام سالونیکا (یورپین ٹرکی) پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں ملٹری کالج کا کورس ختم کرنے کے بعد فوج میں کپتان کے عہدہ سے زندگی شروع کی۔ ۱۹۱۱ء میں انوربے (انور پاشا شہید) کے زیرِ کمان طرابلس کی جنگ میں حصہ لیا۔ چونکہ اس کی طبیعت میں رشک وحسد، بغض وعناد اور رعونت کا مادہ پیدائشی تھا (جس کا اظہار کامل اُس وقت ہوا، جب ۱۹۲۵ء میں ترکی کے آمرِ مطلق کی حیثیت سے اس نے اپنے سیاسی معترضین کو بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جس طرح جوزف اسٹالین نے کیا) اس لیے اسی زمانہ سے وہ انوربے کا مخالف ہو گیا۔ محض اس لیے کہ ترکی قوم انوربے کو اپنی آنکھ کا تارا سمجھتی تھی اور اس زمانہ میں مصطفیٰ کمال محض ایک میجر تھا، اور انوربے کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بہرکیف ۱۹۲۱ء میں اس کو اپنی فوجی مہارت اور جنگی قابلیت دکھانے کا موقع ملا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جنگِ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء میں ناکامی کے بعد یونانیوں نے اناطولیا

پر قبضہ کرنے کی نیت سے، اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یعنی انگریزوں کی درپردہ تائید کے بل بوتے پر اپنی فوجیں ساحل اناطولیہ پر اُتار دیں اور اندرونِ ملک پر قبضہ کرتے ہوئے بروصہ تک چلے گئے۔
یہ حالات تھے جب مصطفیٰ کمال نے جولائی ۱۹۲۲ء میں یونانیوں (دراصل انگریزوں) کے خلاف جارحانہ اقدام شروع کیا، اور تمام دنیائے اسلام، مصطفیٰ کمال زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ مرحوم نے یہ نظم سپردِ قلم کی تھی جب تک اس زمانہ (جولائی تا ستمبر ۱۹۲۲ء) کے واقعات کو مدنظر نہ رکھا جائے۔ اس نظم کے آخری دو شعر سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جولائی ۱۹۲۱ء میں سقاریہ کی جنگ میں ترکوں نے اپنی پانصد سالہ حربی روایات کو زندہ کر دیا۔ اور، اب تک بے سروسامانی کے باوجود محض اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر رہی تھی فضلِ ایزدی اس لیے انہیں نکھار کر مصطفیٰ کمال اس قسم کے ترہات سے بالاتر تھا، یونانیوں کے ٹڈی دل کا مقابلہ کیا۔ اور انجامکار انہیں پسپا کر دیا۔ اس کے بعد سردی کا زمانہ شروع ہو گیا اور مصطفیٰ کمال کو پورے ۱۰ ماہ اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کے لیے مل گئے۔ چنانچہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کر کے اس مردِ آزمودہ کار نے ۲۶ جولائی ۱۹۲۲ء کو باقاعدہ جنگ کے بجائے پہلی مرتبہ جارحانہ پیشقدمی شروع کی۔ اس نازک موقع پر علامہ مرحوم نے مصطفیٰ کمال کو یہ پیغام دیا:۔

اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم ÷ در بغل تیر و کماں کشتہ نخچیر شدم!
ہر کجا راہ دہد اسپ براں تاز کہ ما ÷ بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدم

یعنی اے مصطفیٰ کمال! تو ظاہری اسباب، مادی ساز و سامان، یونانی فوجوں کی کثرت اور انگریز قوم اور برطانوی حکومت کی عملی تائید کسی بات کی پرواہ مت کر! اگرچہ یہ دُنیا عالمِ اسباب ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صید بغیر کوشش ہاتھ آجاتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیر و کمان کے باوجود شکاری خود شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے تو بلاخوف و خطر پیشقدمی کئے جا، آگے بڑھے جا۔
تجھے جس طرف موقع ملے، بلاتامل اسی سمت میں اقدام کر، اور کچھ دنوں کے لیے

اپنی تدابیر کو بالائے طاق رکھ کر تقدیر کی کارفرمائی کا تماشا بھی دیکھے ! کیا تُو اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہے کہ انسان بارہا اپنی بہترین تدبیروں کے باوجود اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات بے سروسامانی کے باوجود، کامیابی اس کے قدم چوم لیتی ہے !

میرا قیاس یہ ہے کہ نظیری کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ تین سو سال کے بعد کوئی فلسفی شاعر میرے اس شعر سے ترکوں کی حوصلہ افزائی کا کام لے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زاویۂ نگاہ کی تائید اور وضاحت کے لیے اس سے بہتر شعر نہیں مل سکتا۔ اور اقبال نے اس پر تضمین کر کے اس شعر کو حیاتِ جاوید عطا کر دی۔

قصہ مختصر ستمبر ۱۹۲۲ء کے پہلے ہفتہ میں ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا۔ چونکہ اس شہر کو فتح کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یونانیوں کو ایشیائے کوچک سے یک بینی و دو گوش خارج کر دیا گیا۔ اس لیے تمام دُنیائے اسلام نے فتح کی خوشی میں چراغاں کیا۔ اور مسلمانوں نے مصطفےٰ کمال کو اپنا ہیرو تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اس کے نام کے بعد اَیَّدَہُ اللہ کی ایمان افروز ترکیب کا اضافہ کیا تھا۔ لیکن جب اُس نے ۱۹۲۸ء میں یہ جگر خراش اعلان کیا کہ جمہوریہ ترکیہ کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ اور اس اعلان واجب الاذعان کے بعد اس "مردِ دانا" نے قرآنِ حکیم کے بجائے سوئس کوڈ کو جمہوریہ کا دستور یہ قرار دیا، تو ساری دُنیا کی طرح حضرت علامہ کی عقیدت بھی زائل ہو گئی۔ ایک شعر لکھے دیتا ہوں :-

لاطینی و لادینی ! کس پیچ میں اُلجھا تُو
دارو ہے ضعیفوں کا لَا غَالِبَ اِلَّا ھُو

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس شعر میں "تُو" کا مخاطب مصطفےٰ کمال ہی ہے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک یعنی تا دمِ وفات مصطفےٰ کمال بظاہر جمہوریہ کا صدر رہا۔ لیکن درحقیقت وہ پندرہ سال تک ایک جابر اور مطلق العنان بادشاہ کی طرح ترکی پر بلا شرکتِ غیرے حکومت کرتا رہا۔ یعنی جوزف اسٹالین کی طرح وہ بھی جمہوریت کے لباس میں بادشاہی کرتا رہا۔

دراصل جمہوریت کی اسی ناکامی کو دیکھ کر اقبال نے اس طرزِ حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ موجودہ جمہوریت اور سابقہ ملوکیت میں صرف نام کا فرق ہے۔ ورنہ اسٹالین اور مصطفیٰ کے مظالم کی فہرست ہلاکو اور چنگیز سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ بظاہر عام مسلمانوں سے خطاب ہے لیکن مصطفیٰ کمال بالخصوص مخاطب ہے اے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات افروز تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ ہم مسلمان تقدیر الٰہی کے راز سے واقف ہوئے۔ یعنی اس حقیقت سے آگاہ ہوئے کہ دراصل سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ یعنی وہ اگر چاہے تو مٹھی بھر ترکوں کو مادی ساز وسامان کے بغیر یونانیوں پر غالب کر دے۔

(۲) ہماری اصل تو مشتِ خاک (شرر باختہ رنگ) ہے۔ لیکن یہ سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کا فیض ہے کہ ہم دُنیا میں حکمران (خورشید جہانتاب) ہو گئے۔

(۳) لیکن افسوس کہ حکومت کے نشہ میں مسلمانوں نے اپنے سینوں کو عشقِ رسولؐ سے خالی کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم باندازۂ تقصیر اس دُنیا میں ذلیل ہو گئے (چونکہ تقصیر بہت بڑی تھی، اس لیے بہت ہی بڑی ذلت بھی ہمارے حصّہ میں آئی)۔

(۴) خُدا نے ہماری فطرت ایسی بنائی ہے کہ عیش وعشرت (نفسہائے صبا) کے بجائے جدوجہد کی زندگی (باد صحرا) ہمیں زیادہ راس آتی ہے۔

(۵) ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہماری آواز گنبدِ افلاک سے بھی اوپر جاتی تھی۔ لیکن جب ہم عیش وعشرت میں مبتلا ہو گئے تو ہماری وہ شہرت (آواز) آہ وفریاد میں تبدیل ہو گئی۔ آخری دو شعروں کا مطلب تمہید میں لکھ چکا ہوں، اس لیے اس کا اعادہ بے کار ہے۔

طیارہ

حریفی در چمن با مرغکی گفت | ہمی گفت با طائر دیگر
خدا ندہد بال آدمی زادہ را | زمین گیر کرد این سادہ را
بدو گفتم ای مرغک بہ تسبیح | اگر مرغی حق بازو گیر ہیچ
ولی طیارہ را بال و پر ساختیم | سوئے آسمان رہ گذر ساختیم
چو طیارہ آن ہیچ گردون بپیچ | پر او ز بال ملک تیز تر
بہ پرواز شاہین بہ ہیبت عقاب | نخجیرش ز بہرہ نایاب
گہ در خروشندہ و تند جوش | میان نشیمن چو ماہی خموش
خرد از آب و گل جبرئیل آفریدہ | زمین را بگردون دلیل آفریدہ
چو آن مرغ زیرک کلامم شنید | ہوا یک نفس آشنا بازدید
بشوخی بہ بنقار خاید و گفت | از این آنچہ گوئی ندارم شگفت
کہ ای نکتہ ور بر چمن و چمید | اسیر طلسم آب و پست و بلند

تو کار زمین را نکو ساختی؟
کہ با آسمان نیز پرداختی؟ (سعدیؒ)

تمہید اس نظم میں اقبال نے اہل یورپ پر طنز کیا ہے کہ یہ قومیں یوں تو رات دن ترقی کر رہی ہیں۔ لیکن اپنی معاشرت کی اصلاح نہیں کر سکیں۔ انھوں نے سورج کی شعاعوں کو اپنا غلام بنا لیا۔ لیکن خود نفسِ امارہ کی غلامی سے نہ نکل سکیں۔ آسمان کے معاملات کی درستی میں مصروف ہیں۔ لیکن "کارِ زمین" ہنوز محتاجِ درستی ہے۔ مادیات کے اعتبار سے آسمان پر ہیں۔ مگر روحانیات کے لحاظ سے مُردہ ہیں۔

مطلب ایک دن ایک طائر دوسرے طیور سے یہ کہہ رہا تھا کہ خدا نے انسان کو پر عطا نہیں کئے بلکہ اس بے قوت (سادہ) کو زمین پر رہنے کیلئے بنایا ہے۔ یہ سنکر میں نے کہا کہ ہم نے ہوائی جہاز بنا کر آسمان تک جانے کا انتظام کر لیا ہے۔ تو جانتا ہے ہوائی جہاز کسے کہتے ہیں؟ یہ وہ جہاز ہے جو فرشتوں سے زیادہ تیز اڑتا ہے، اور طاقت کے لحاظ سے عقاب کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جب اُڑتا ہے تو فضائے آسمانی میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب مستقر پر پہنچتا ہے۔ تو بالکل خاموش ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھ کر انسان کی عقل نے آسمان تک جانے کیلئے ایک رہوار جبرئیل اجتبایا ہے۔ جب اس عقلمند پرندے نے میری گفتگو سُنی تو میری طرف دوستانہ انداز

سے دیکھا اور کہا " جو کچھ تو کہتا ہے سب صحیح ہے۔ لیکن میرے دوست! سوال تو یہ ہے کہ کیا تو نے اپنے زمینی معاملات سب درست کر لیے ہیں؟ جواب تو آسمان پر جانے کی تیاری کر رہا ہے؟ پہلے انسان کی طرح زمین پر رہنا تو سیکھ! آسمان کی طرف پرواز کا خیال میری رائے میں قبل از وقت ہے!

عشق

آن حرفِ دلفروز کہ راز است و رمز نیست — من فاش گویمت کہ لبِ غنچہ وا شنید
دزدید ز آسمان و بہ گل گفت شبنمش — بلبل ز گل شنید و ز بلبل صبا شنید

تمہید کہتے ہیں کہ عشق وہ لفظ ہے جو دل افروز ہے یعنی اس کے تلفظ ہی سے دل کو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ عشق اپنی اصل یا اپنی ماہیت کے لحاظ سے تو راز ہے۔ لیکن اپنی ہمہ جائی۔ ہمہ گیری اور ہر دلعزیزی کے اعتبار سے مطلق راز نہیں ہے، ہر شخص اس سے واقف ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ عشق دُنیا میں کیسے آیا؟ یعنی سب سے پہلے اس لفظ کو کس نے سُنا اور کس سے سُنا؟

قصہ یہ ہوا کہ شبنم نے آسمان پر فرشتوں کی زبان سے اس لفظ کو سُنا، وہ آسمان سے چرا کر زمین پر لائی اور گل سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ جب بُلبل گل کے پاس آئی تو گل نے اُسے اس راز سے آگاہ کر دیا۔ بُلبل پر جب بادِ صبا سے ایک کیفیت کا عالم طاری ہوا تو اس نے صبا کو اس راز سے مطلع کر دیا۔ بادِ صبا کو اللہ ایسا موقع دے، اُس نے اس لفظ کو ساری دُنیا میں عام کر دیا۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ عشق کی اصل مادّی یا دُنیاوی نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے اور ایک غیر مادی شئی ہے، جو بوساطت شبنم آسمان سے آئی ہے۔

نوٹ:- "شبنم" اقبالؔ کی شاعری میں فیضانِ سماوی کی مظہر ہے۔ کیونکہ وہ "اُوپر" سے آتی ہے۔

تہذیب

انساں کہ رخ ز غازۂ تہذیب بر فروخت
خاکِ سیاہِ خویش چو آئینہ وا نمود

پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر
افسونِ قلم شد و تیغ از کمر گشود

ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت
رقصید گردِ او بنوائے چنگ و عود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموسِ او درید
جز تشنہ کامِ خونِ برادر کسی نبود

تمہید یہ نظم اقبال نے جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اگرچہ اقوام یورپ زبان سے دنیا کو تہذیب اور شائستگی کا درس دیتی ہیں لیکن خود اُن کا عمل درندوں سے بدتر ہے۔ وہ ایشیائی اقوام کو غیر مہذب قرار دیتی ہیں لیکن اُن کا طرزِ عمل ایسا ہے کہ حیوانات بھی شرما جائیں۔

مطلب کہتے ہیں کہ حضرت انسان (اقوامِ یورپ) نے بظاہر اپنے چہرہ کو تہذیب کے غازہ سے دلکش بنا رکھا ہے لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے۔ یعنی یہ کتنا غلط نہیں ہے کہ اس ادعائے تہذیب کے باوجود جنگِ عظیم میں اُس نے اپنی پستیٔ فطرت اور خباثتِ باطنی (خاکِ سیاہِ خویش) کو آئینہ کی طرح واضح کر دیا۔ یعنی اقوامِ یورپ کی روسیاہی ہر شخص کو صاف نظر آ گئی۔

یورپ نے ریشم کے دستانوں میں شیر پنجہ چھپا لیا۔ اور بظاہر تلوار بھی کمر سے کھول کر رکھ دی، اور اس کے بجائے قلم سے (عقلی دلائل سے) کام لینا شروع کر دیا۔ لیکن یہ سب عیاری اور مکاری کی باتیں تھیں۔

اِس حرص کے بندے نے ایک بتخانہ بنایا اور اس میں "صلحِ عام" کا بُت بڑے قرینہ سے سجایا اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ اس بُت کا طواف شروع کیا۔ یعنی دُنیا میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ ہم تو امن کے علمبردار ہیں۔ لیکن جب ۱۹۱۴ء میں جنگ برپا ہوئی تو دُنیا نے دیکھ لیا کہ تہذیب و تمدن کی مدعی اقوام دراصل بھیڑیوں کی طرح ایک دُوسرے کے خون کی پیاسی ہیں، جن کو بیگناہ ہوں

کا خون بہانے میں کوئی تامل نہیں ہے۔

نوٹ:۔ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ اور خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ قرآنِ حکیم کی ان آیات سے ماخوذ ہیں :۔

(۱) قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳)

فرشتوں نے عرض کی کہ اے خدا! کیا تو زمین میں اپنا نائب اسے بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون گرائے گا؟

(۲) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۱۶/۴)

اُس نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ لیکن وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے ۔

maablib.org

مئے باقی

مقدمہ

ہر شخص جس نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے، اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اقبال فلسفی ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں، بعض ناقدین ان کی شاعری کو اُن کے فلسفہ یا پیغام پر مقدم رکھتے ہیں۔ یعنی ان کو ایک فلسفی شاعر قرار دیتے ہیں بعض اس کے برعکس، اُنکے فلسفہ کو اُن کی شاعری پر تفوق دیتے ہیں۔ یعنی ان کو ایک شاعر فلسفی سمجھتے ہیں۔ میں اس وقت اس بحث پر اظہار خیال کرنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بہر صورت ان کا شمار دُنیا کے نامور ترین شعراء میں ہے۔ ان کے فلسفہ سے اختلاف کرنا ممکن ہے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت ہر شخص کے نزدیک مُسلّم ہے۔

اصنافِ شاعری میں غزل سب سے زیادہ دلکش اور مقبول صنف ہے۔ کیونکہ شاعر اپنے وارداتِ قلبی اور جذباتِ عاشقی کے اظہار کا ذریعہ اسی کو بناتا ہے۔ اگرچہ علامہ کی شاعرانہ عظمت کا دارومدار ان کی غیر فانی نظموں پر ہے لیکن غزل میں بھی ان کا مرتبہ کسی سے کم نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ غزل گو کی حیثیت سے انہیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو سعدیؔ، حافظؔ، جامیؔ، نظیریؔ۔ عرفیؔ اور غالبؔ کو حاصل ہوئی۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو اپنے شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔

سعدیؔ۔ نظیریؔ۔ عرفیؔ۔ غالبؔ کی غزلوں اور اقبال کی غزلوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اول الذکر شعراء نے بہترین تغزل پیش کیا ہے۔ لیکن اقبال کی غزل ان کے مخصوص فلسفیانہ افکار یعنی پیغام کی بھی حامل ہے۔ موازنہ کے وقت اس خصوصیت کو ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔

پیامِ مشرق کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اقبال نے حافظؔ اور نظیریؔ کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ عدیم النظیر ہیں۔

(۱) تغزل کے اعتبار سے نظیری کا جواب نہیں ہے۔ جس طرح اردو شاعری میں حسرت موہانی مرحوم کو سب نے غزل گو شعراء کا امام تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح فارسی شاعری میں نظیری کو رئیس المتغزلین کا لقب حاصل ہے صائب لکھتا ہے۔

صائب چہ مجال است شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید غزل را

خود علامہ کہتے ہیں :-

بملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

(ب) لطفِ سخن اور عذوبتِ بیان کے لحاظ سے کوئی شاعر حافظ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں :-

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ
قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ شخص جو دوسروں کو حافظِ صہبا گسار سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرتا ہے، خود اسی صہبا سے اپنے کلام میں مستی کا رنگ پیدا کرتا ہے تو بے اختیار حافظ کی ولایت کا اعتراف کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ذیل میں حافظ اور اقبال کے چند مصرعے درج کرتا ہوں جن کے تقابل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال حافظ سے متاثر ہوئے ہیں۔

حافظ کہتے ہیں :-

درخراباتِ مغاں نورِ خدا می بینم

اقبال کہتے ہیں :-

درخراباتِ مغاں گردشِ جامے دارم

حافظ کہتے ہیں :-

بملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را

اقبال کہتے ہیں :-

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے

حافظ کہتے ہیں :-

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

وقبالؔ کہتے ہیں:۔

اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

حافظؔ اور اقبالؔ میں دوسری مماثلت یہ ہے کہ دونوں نے فقیہ شہر کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طبقہ کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

اب ہم اقبالؔ کی غزلوں کی بعض خصوصیات درج کرتے ہیں:۔

۱۔ فلسفہ طرازی:۔ چونکہ اقبالؔ فلسفی ہیں اس لیے انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی فلسفیانہ نکات نظم کئے ہیں عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی شعر میں فلسفہ کی آمیزش ہوتی ہے تو شعریت کم ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ کا کلام بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن وہ حتی المقدور سلامت زبان اور اندازِ بیان کی بدولت شعر میں دلکشی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند شعر درج کرتا ہوں:۔

گماں مبر کہ سرشتند در ازل رگل ما ٭ کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیرِ وجود

زخود گذشتۂ اُلے قطرۂ محال اندیش

شدن بہ بحر و گہر بر نخاستن ننگ است

اگرچہ مقصودِ خیالِ تنگ و تازِ من و تست

ہست در دیدہ و مانندِ نظر پیدا نیست

مطرب میخانہ دوش نکتۂ دلکش سرود

بادہ چشیدن خطاست بادہ کشیدن رواست

---

(۲) موسیقیت:۔ بعض اشعار میں شاعری اور موسیقی دونوں ہم آغوش نظر آتی ہیں اور اس رنگ کا دارومدار زیادہ تر روانی اور سلاست اور موزوں الفاظ پر موقوف ہے۔ چند شعر درج کرتا ہوں:۔

در دیر نیاز من، در کعبہ نماز من ÷ زنار بدوشم من، تسبیح بدستم من

آشنا ہر خار را از قصہ ما ساختی ÷ در بیابان جنوں بردی و رسوا ساختی

صد نالۂ شبگیرے، صد صبح بلا خیزے ÷ صد آہ شرر ریزے، یک شعر دلآویزے

در اندر حرم گنجی، در در بتخانہ می آئی ÷ ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

(۳) تغزل :- اقبال کے تغزل میں نظیری کا رنگ جھلکتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہر پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

گر آں نگاہِ ناز کہ اوّل دلم ربود ÷ عمرت دراز باد ہماں تیرم آرزوست

بزم بباغ و راغ کش، زمزمہ بتار چنگ زن ÷ بادہ بجور، غزل سرا، بند کشا قبائے را

عشق است و ہزار افسوں، حسن است و ہزار آئیں
نے من بشمار آیم نے تو بشمار آئی

(۴) درسِ خودی :- غزلوں کے اکثر اشعار میں اقبال نے اپنا مخصوص فلسفہ پیش کیا ہے یعنی قوم کو خودی کا پیغام دیا ہے۔ اور چونکہ خودی کی تربیت عشق پر موقوف ہے اس لیے ضمناً مسلکِ عشق کی دعوت بھی دی ہے :-

بچشم عشق نگر، تا سراغ او بینی ÷ جہاں بچشم خرد، سیمیا و نیرنگ است

در بود و نبود من اندیشہ گماں ہا داشت ÷ از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے ÷ یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

از خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست ÷ تجلّیٔ دگرے، در خور تماشا نیست

رمز حیات جوئی؟ بجز در تپش نیابی ✤ در قلزم آرمیدن، ننگ است آبجو را

---

(۵) تصوف:۔ بعض اشعار میں اقبال نے وحدۃ الوجود کی تلقین کی ہے:۔

کشید نقشِ جہانے بہ پردۂ چشمم ✤ ز دستِ شعبدہ بازے، اسیر جادویم

دانۂ سبحہ بزمّار کشیدن آموز ✤ گر نگاہِ تو دو بین است ندیدن آموز

در جہان است دلِ ما کہ جہاں در دلِ ماست ✤ لب فرو بند کہ ایں نکتہ کشودن نتواں

بر وجودِ ما ست ز یک شعلۂ حیات ✤ از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

(۶) مذمتِ تہذیبِ مغرب:۔ چونکہ علامہ نے ساری عمر اس تہذیب کے خلاف جہاد کیا۔ اس لیے غزلوں میں بھی اس کے مفاسد کو واضح کیا ہے ؎

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق ✤ نخرد بادہ کس از کارگہِ شیشہ گراں

فرنگ شیشہ گری کرد و جام و مینا ریخت ✤ بحیرتم کہ ہمیں شیشہ را پری داند

آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز ✤ آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں

---

(۷) مضمون آفرینی:۔ بقول غالب، شاعری دراصل مضموں آفرینی کا نام ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا۔ اقبال چونکہ شاعری میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔

اس لیے ان کے کلام میں مضمون آفرینی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ؎

بر سازِ زندگی سوزے ز سوزِ زندگی سازے ✤ چہ بیدردانہ می سوزد، چہ بیتابانہ می سازد

بجرمِ ما ازو دانہ، تقصیرِ او از سجدہ ✤ نے بآں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

بشاخِ زندگیٔ ما نمے ز تشنہ لبی است ؞ تلاشِ چشمۂ حیواں، دلیلِ کم طلبی است

قدم بیباک تر نہ در حریمِ جانِ مشتاقاں ؞ تو صاحب خانہ ای، آخر چرا دزدانہ می آئی

---

(۸) شوخی و طنز:- یہ اقبال کی شاعری کی وہ خصوصیت ہے جو اُن کے کلام میں از اوّل تا آخر ہر جگہ نمایاں ہے:-

سجدۂ تو برآورد از دلِ کافراں خروش ؞ اے کہ دراز تر کنی، پیشِ کساں نماز را

طرحِ نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم ؞ ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

خورم بیادِ تنکزشئیِ امامِ حرم ؞ کہ جز بصحبتِ یارانِ رازداں نچشید

پیرِ ما مصلحتاً رو بہ مجاز آوردہ است ؞ ورنہ با زہرہ وشاں ہیچ سروکارش نیست

---

(۹) عشقِ رسولؐ:- یہ کلامِ اقبال کی وہ خصوصیت ہے جس نے اُن کو اور اُن کے کلام دونوں کو زندۂ جاوید کر دیا ہے:-

تب و تابِ بتکدۂ عجم نرسد بسوز و گدازِ من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربیؐ گرفت حجازِ من

تو بر نخلِ کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی ؞ تو بر شمعِ یتیمے صورتِ پروانہ می آئی

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار ؞ یا رسول اللہؐ او پنہان و تو پیدائے من

---

(۱۰) ذاتیات:- ان غزلوں میں ایسے اشعار بھی ہیں جو اقبال کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں:-

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ ؞ سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ز شعرِ دلکشِ اقبال می تواں دریافت ⁂ کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش ⁂ اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر ⁂ دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

---

(۱۱) رمز و ایماء :- یہ اقبال کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است ⁂ حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

چونکہ ان کا سارا کلام رمز و ایماء سے معمور ہے۔ اس لیے صرف چار مثالیں درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں :-

راہ کو راست بخود غوطہ زن اے سالکِ رہ ⁂ جادہ را گم نکند در تۂ دریا ماہی

اے مسلمان دگر اعجازِ سلیماں آموز ⁂ دیدہ بر خاتم تو اہرمنے نیست کہ نیست

درجہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز ⁂ کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں

چنگِ تیموری شکست آہنگِ تیموری بجاست ⁂ سر بروں می آرد از سازِ سمرقندے دگر

---

(۱۲) سلاست و روانی :- یہ وصف کلام میں دلکشی پیدا کر دیتا ہے اور اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کو زبان اور انتخاب الفاظ دونوں پر قدرت حاصل ہو۔ پیامِ زبور اور بالِ جبریل میں ہر جگہ یہ خصوصیت نمایاں ہے :-

گرچہ متاعِ عشق را عقل بہائے کم نہد ⁂ من ندہم بہ تختِ جم آہِ جگر گداز را

لشو و نصیبِ جانت کردے قرار گیرد ⁂ تب و تابِ زندگانی بتو آشکار بادا

ای گنبدِ مینائی ای پستی و بالائی ! ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ درشد بدلِ عاشق با این همہ پہنائی

شلام کہ مرا از من در کوئے حرم بستند ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ راہے ز مژہ کا دم از کعبہ بہ بتخانہ

حرفِ آخر میں نے ان غزلوں کی شرح میں حسب ذیل امور کو مدِنظر رکھا ہے :۔

(۱) آسان لغات کے معانی درج نہیں کئے ہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ پیامِ مشرق کے پڑھنے والوں کو فارسی مصادر اور آسان فارسی الفاظ مثلاً گل ، برگ ، زندہ دل ، خاک ہند ، شیشہ ، درس ، نوا ، خداوند ، پیمان ، بوالہوس ، خلوت ، حجاب ، ربط ، رہرو ، کودک ، ناتمام ، تغافل وغیرہ کے معانی ضرور معلوم ہوں گے ۔

(۲) لفظی ترجمہ سے حتی الوسع اجتناب کیا ہے ۔ اور اگر کہیں ترجمہ کیا ہے تو اس طرح کہ مفہوم واضح ہو جائے :۔

(۳) آسان اشعار کا مطلب بہت مختصر لکھا ہے لیکن مشکل اشعار کی وضاحت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے ۔

(۴) شرح اس انداز سے کی ہے کہ پڑھنے والے کلام اور پیغام دونوں کی روح سے آشنا ہو سکیں ۔ اور یہ وہ مقصود ہے جو میں نے اقبال کی تمام کتابوں کی شرح میں پیش نظر رکھا ہے ۔ اقبال کے کلام اور پیغام کی روح یہ ہے کہ

(ا) انسانی عقل ناقص ہے اس لیے اسے رہنما مت بناؤ بلکہ عشق کی غلامی اختیار کرو ۔

(ب) انسان اشرف المخلوقات ہے ۔ وہ اس مقام کو تربیت خودی کی بدولت حاصل کر سکتا ہے ۔ اور خودی کی تربیت عشقِ رسول ؐ اور صحبتِ عاشقانِ رسول ؐ پر موقوف ہے ۔

(ج) انسان کی روحانی ترقی غیر محدود ہے اس لیے منزل کا تصور دماغ سے نکال دو ۔

(د) نصب العین یہ ہے کہ بندہ اپنے اندر اپنے مولیٰ کی صفات پیدا کرے اور یہ بات شانِ فقر سے حاصل ہو سکتی ہے :۔

ع بندہ از تاثیر او مولا صفات

شرحِ غزلیات

میِ باقی

بہار تا بہ گلستاں کشید بزمِ سرود
نوائے بلبلِ شوریدہ چشمِ غنچہ کشود

گماں مبر کہ سرشتند در ازل گلِ ما
کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیرِ وجود

بہ علم غرّہ مشو کارِ مے کشی دگر است
فقیہِ شہر گریبان و آستیں آلود

بہار برگِ پراگندہ را بہم بربست
نگاہِ ماست کہ بر لالہ رنگ و آب افزود

نظر بخویش فرو بستہ دانشاں این است
دگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیرِ زندہ دلے
بہ ہر زمانہ خلیل است و آتشش نمرود

چہ نقشہا کہ نہ بستم بکارگاہِ حیات
چہ رفتنی کہ نہ رفت و چہ بودنی کہ نبود

بہ دیریاں سخنِ نرم گو کہ عشقِ غیور
بنائے بتکدہ افگند در دلِ محمود!

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

علامہ نے حسب دستورِ قدیم، اپنی پہلی غزل کے پہلے شعر میں اپنے نظامِ فلسفہ کا بنیادی تصور رمز و کنایہ کے لباس میں پیش کر دیا ہے اور آئندہ پانچ شعروں میں اپنے نظامِ فلسفہ کے عناصرِ ترکیبی کی صراحت کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص اس غزل کے ابتدائی چھ اشعار کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو جائے تو وہ فلسفۂ اقبال سے بڑی حد تک واقف ہو سکتا ہے۔

اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ "مئے باقی"[1] کی اکثر و بیشتر غزلوں کا لفظی ترجمہ بہت آسان ہے۔ لیکن وہ مقصود نہیں ہے۔ اقبال نے جیسا کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اپنے پیغام کو رمز و ایماء کے پردے میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ اس لیے جو شخص اقبال کے پیغام (فلسفہ) یا ان غزلوں کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، اس کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ ان پردوں کو ہٹائے تاکہ شاہدِ معنی بے حجاب ہو کر اپنی صورت دکھائے ان غزلوں ہی پر کیا منحصر ہے اقبال کا سارا کلام بانگِ درا سے لیکر ارمغانِ حجاز تک رمز یہ اسلوب کا آئینہ دار ہے۔ اسی لیے ہر صاحب نظر اس پر سو جان سے نثار ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد عروسِ معنی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

لفظی ترجمہ تو بہت آسان ہے کہ جب بہار نے گلستان میں محفلِ نشاط آراستہ کی تو بلبلِ شوریدہ کے نالوں نے غنچوں کی آنکھیں کھول دیں۔ لیکن یہ مضمون اقبال کا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نہ کوئی مفہوم ہے نہ معنی۔ بالفاظِ دگر اس ترجمہ سے کوئی بات پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب تک شعر سے کوئی بات یعنی مضمون پیدا نہ ہو، وہ شعر نہیں بلکہ تک بندی کا مصداق ہے شاعری تو مضمون کا نام ہے نہ کہ قافیہ کا۔

---

[1] مئے باقی سے مراد ہے وہ شراب جس کا سرور کبھی زائل نہ ہو۔ اقبال نے اپنی غزلوں کو مئے باقی سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ انھوں نے ان غزلوں میں وہ بلند حقائق و معارف بیان کئے ہیں جو اپنے اندر بقائے دوام کی صفت رکھتے ہیں، اور اگر انسان ان پر عامل ہو جائے تو اس کو بھی یہ نعمتِ کبریٰ حاصل ہو جائیگی۔ غزل کو شراب سے اس لئے تعبیر کیا کہ غزل میں بھی شراب کی سی مستی ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو وہی سرور حاصل ہوتا ہے جو اس شخص کو شراب پینے سے حاصل ہوتا ہے۔ ۱۲

مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ جب ذوالجلال (بہار) نے دُنیا (گلستان) کو گوناگوں مخلوقات سے آراستہ کر دیا تو انسان (بلبل شوریدہ) نے اپنے جذبۂ عاشقی (نوا) کی بدولت ساری کائنات (چشمِ غنچہ) میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

گویا اقبال نے بارغ کے تلازمہ کے پردہ میں اپنے فلسفہ کے بنیادی تصور کو واضح کیا ہے کہ اگر انسان کے اندر جذبۂ عشق ودیعت شدہ نہ ہوتا تو کائنات (غنچہ) ساکن و جامد رہتی۔ یہ بیداری، یہ سرگرمی، یہ ہنگامہ، یہ جوش و خروش جو کائنات میں پایا جاتا ہے سب حضرتِ عشق کی کرشمہ سازی ہے۔

اقبال کے نزدیک عشق باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ اسی جذبہ نے خدا کو تخلیق پر مائل کیا۔ اور اسی لیے اُس نے، اشرف المخلوقات (انسان) میں عشق کی آگ پوشیدہ کر دی اور اس نے اسی آگ کی بدولت، کائنات کو بیدار کر دیا (غنچہ کی آنکھیں کھول دیں)، اگر عشق نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

اسی نکتہ کو اقبال نے جاوید نامہ میں یُوں بیان کیا ہے:-

درو دِ عالم ہر کجا آثارِ عشق ✽ ابنِ آدم سرے از اسرارِ عشق
سرِ عشق از عالمِ ارحام نیست ✽ او ز سام و حام و روم و شام نیست
حرفِ اِنّی جَاعِلٌ تقدیرِ او ✽ از زمیں تا آسماں تفسیرِ او

(۱) اس شعر کا لفظی ترجمہ بھی بےکار ہے کیونکہ اس بات سے کہ "اے مخاطب! تو یہ گمان مت کر کہ ہم یا ہماری روحیں ازل میں پیدا ہو چکی ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم ابھی تک وجودِ مطلق کے ضمیر میں خیال کی طرح پوشیدہ ہیں۔" اقبال کا مطلب واضح نہیں ہو سکتا۔

بات یہ ہے کہ اس شعر میں اقبال نے اپنے فلسفہ کے ایک اہم پہلو کو واضح کیا ہے۔ ان کا نظریہ جیسا کہ ایک گفتگو کے دَوران میں انھوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا، یہ ہے کہ صرف وجودِ مطلق، چونکہ وہ واجب الوجود ہے اس لیے درحقیقت موجود ہے۔ اب رہا انسان، تو وہ فی الحقیقت موجود نہیں ہے بلکہ موجود ہونے کی کوشش کر رہا ہے[1]۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان باعتبارِ ذاتِ خویش، ممکن الوجود ہے اور

---

[1] اقبال نے اس مفہوم کو انگریزی میں ادا کیا تھا اور اُن کے الفاظ یہ تھے:-

ممکن وہ ہے جس کی ماہیت، وجود نہ ہو (یہ تو واجب کی شان ہے) بلکہ عدم ہو۔ اب چونکہ انسان کی ماہیت عدم ہے اس لیے اسے موجود ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پس جس حد تک وہ موجود ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی حد تک اس پر وجود کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کوشش کی یہ صورت یہ ہے کہ انسان سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر اپنی نسبت استوار کرتا جائے گا اسی قدر موجود ہوتا جائے گا۔ اس میں نکتہ یہ مضمر ہے کہ جس قدر عشق رسولؐ میں پختہ ہوتا جائے گا (اسی کو نسبت کہتے ہیں) اسی قدر اس میں "صِبْغَۃَ اللّٰہ" اللہ کا رنگ پیدا ہوتا جائے گا، یعنی وہ عدم سے وجود کی طرف آتا جائے گا۔ جب فنا فی الرسولؐ ہو جائے گا تو موجود ہو جائے گا۔ جو شخص حضورؐ سے جس قدر دُور ہے، اسی قدر وجود (نور) سے دُور ہے۔ اسی لیے اقبال نے یہ بات کہی ہے :-

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ٭ آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰؐ او را بہاست ٭ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰؐ است

چونکہ انسان ممکن الوجود ہے اسی لیے اقبال نے اس کو "طلسم بود و عدم" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی ماہیت پر نظر کرو تو معدوم ہے لیکن وجود سے ایک گونہ نسبت ہے۔ اس لیے مجازاً اُسے موجود کہہ دیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ آدم خلعتِ وجود سے سرفراز ہونے کے لیے جدوجہد کرتا ہے لیکن ہنوز اس جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ واضح ہو کہ انسان (آدم) ابھی بھی دائرہ امکان سے باہر نہیں نکل سکتا کیونکہ یہ دائرہ، احتیاج و عدمِ ذاتی کا مظہر ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان منازلِ وجود میں ترقی کرتے ہوئے خواہ کسی منزل پر کیوں نہ پہنچ جائے، شانِ افتقار و احتیاج اس سے کبھی جُدا نہیں ہو سکتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ احتیاج تو اس کی عین ذات ہے۔ اسی نکتہ کو بیدل نے یوں بیان کیا ہے ؎

چہ ممکن است رود داغِ بندگی ز جبیں ٭ زمیں فلک نشود آدمی خدا نشود

چونکہ انسان کبھی خدا نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ حقیقی معنیٰ میں موجود بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں فنا فی الرسول ہو جانے کی بدولت اس میں وجود کا

عکس مزید پیدا ہو جائے گا۔ اقبالؔ اور بیدلؔ دونوں نے یہ نکتہ شیخ اکبرؒ سے سیکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

وَالعَبدُ عَبدٌ وَاِن تَرَقّیٰ وَالرَّبُ رَبٌ وَاِن تَنَزَّل

بندہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے بندہ ہی رہے گا۔ اور رب کتنا ہی تنزل کیوں نہ کرے (پھر بھی) رب ہی رہے گا۔

اقبالؔ نے اسی نکتہ کو زبورِ عجم میں یوں بیان کیا ہے۔ گویا زبور کا یہ شعر پیام کے اس شعر کی تفسیر ہے :-

چو موج می تپد آدم بجستجوئے وجود ⁂ ہنوز تا کمر اندر میانۂ عدم است

نوٹ :- ناظرین اس حقیقت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں کہ اقبالؔ کے کلام کو کما حقہٗ سمجھنے کے لیے یا کسی شعر کا مفہوم متعین کرنے کے لیے اُن کے سارے کلام کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر ان کا سارا کلام مستحضر نہ ہو گا تو شارح کی رسائی حقیقی مفہوم تک نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں ان تمام حضرات سے جو اقبالؔ کو سمجھنا چاہتے ہیں، یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف ایک کتاب پڑھنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ سارا کلام از اوّل تا آخر غور سے پڑھیں۔ ۱۲

(۳) کہتے ہیں کہ ظاہری علوم پر گھمنڈ مت کرو۔ یعنی یہ مت سمجھو کہ اگر تم نے بعض ظاہری علوم پڑھ لیئے ہیں تو تم ان علوم کی مدد سے سلوک کی راہیں بھی طے کر سکتے ہو۔ "تہ مے کشی" کنایہ ہے راہ سلوک طے کرنے سے (فقیہ شہر نے کتابی علم کے بھروسہ پر تقویٰ کی راہ اختیار کی (شراب پی) تو گریباں اور آستین دونوں آلودہ ہو گئیں یعنی وہ اس بلند مقام کو حاصل نہ کر سکا۔ اس کے لیے کسی ماہر فن کی (مرشد کی) ضرورت تھی جو اُسے پینے (متقی بننے) کا طریقہ بتاتا یعنی راہِ سلوک طے کرنے کے لیے انسان کو شیخ کامل کی صحبت اختیار کرنی لازمی ہے۔

(۴) بہار نے صرف اتنا کیا کہ منتشر اوراق (برگِ پراگندہ) کو یکجا کر دیا یعنی فطرت نے مختلف اقسام کے پھول پیدا کر دئیے۔ لیکن ان پھولوں میں جس قدر حسن (آب و رنگ) پایا جاتا ہے، یہ سب ہماری جمالیاتی حس یا ہمارے

ذوق جمال کی کرشمہ سازی ہے۔ اگر ہمارے اندر حسن و جمال کی قدردانی کا مادہ نہ ہوتا تو کائنات میں جس قدر حسن پایا جاتا ہے، وہ سب کالعدم ہو جاتا۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ "حسن" باہر نہیں ہے۔ بلکہ دیکھنے والے کے اندر ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :-

حسن را از خود بروں جستن خطاست ؛ آنچہ می بایست پیش ما کجاست!

یعنی نفس مدرک PERCEIVING MIND سے باہر کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ اگر انسان نہ ہوتا تو کائنات کا وجود متحقق ہی نہیں ہو سکتا تھا مرشد رومیؒ نے بھی یہی تعلیم دی ہے :-

بادہ از ما مست شد نے ما ازو ؛ پیکر از ما ہست شد نے ما ازو

(۵) "نظر بخویش فرو بستہ" اس شخص کو کہتے ہیں جو کائنات سے صرف نظر کر کے اپنی ذات کے مشاہدہ میں مشغول ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایسے شخص (کامل) کی شناخت یہ ہے کہ وہ نہ غائب کا ذکر کرتا ہے نہ موجود کا۔ یعنی غیر کا ذکر نہیں کرتا کیونکہ اُسے اپنی ذات میں ایک جہاں نظر آجاتا ہے۔

امام حسینؓ نے شہادت سے پہلے یہی نکتہ اپنے فرزند دلبند امام زین العابدینؒ کو تلقین فرمایا تھا "فکرک فیک یکفیک" یعنی دُنیا والوں سے قطع تعلق کرے اور اپنی ذات میں فکر کر۔ بس یہ فکر تجھے بالکل کافی ہے۔ پھر تجھے کسی کی طرف دیکھنے کی حاجت نہ ہوگی۔

بات یہ ہے کہ جو لوگ معرفتِ نفس سے محروم ہیں یعنی اپنے آپ کو نہیں دیکھتے، وہ لامحالہ دوسروں کو دیکھتے ہیں۔ اور جب دُوسروں کے پاس وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو اُن کے پاس نہیں ہیں تو وہ دُوسروں کی غلامی اختیار کرنے پر مائل ہو جاتے ہیں تاکہ وہ چیزیں حاصل کر سکیں جو اُن کے پاس نہیں ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دُنیا والوں کے غلام ہو جاتے ہیں اور غلامی موت کا دُوسرا نام ہے۔

لیکن جو شخص اپنے نفس میں غور کرتا ہے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ساری دُنیا میرے اندر موجود ہے، اس لیے وہ کسی کے سامنے دست

سوال دراز نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ساری دنیا اس کی غلام ہو جاتی ہے۔ مثلاً ساری دنیا شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی لیکن خود شاہجہان (ہندوستان کا شہنشاہ) حضرت میاں میر رح کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔

(۶) ایک رات خانقاہ (میکدہ) میں مرشد کامل نے یہ نکتہ بیان کیا کہ تم یہ مت سمجھو کہ دنیا میں صرف ایک ہی خلیل ؑ اور ایک ہی نمرود گذرا ہے۔ نہیں، ہر زمانہ میں اُن کے جانشین پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، خدا پرستوں کے نمائندہ ہیں، اور نمرود دشمنان دین کا نمائندہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کے بندے اور ان کے دشمن ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ سُنّت اللہ ہے، قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ٭ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(۷) اس شعر میں شاعر نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا میں کسی شے کو ثبات نہیں ہے۔ یہاں ہر روز بلکہ ہر لمحہ لاکھوں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن کسی حادثہ یا واقعہ کو صفت دوام حاصل نہیں ہو سکتی۔ لاکھوں انسان روزانہ پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ مرتے ہیں۔ لاکھوں نقوش ابھرتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔

(۸) کہتے ہیں کہ بت پرستوں (اہلِ دیر) پر تشدد مت کرو۔ ان کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ۔ کیونکہ اگر محمود جیسے شخص کے دل میں عشق اپنا اثر مرتب کر سکتا ہے (جو بت شکن تھا) تو اگر بت پرستوں کے دل میں بتوں کی محبت جاگزیں ہو گئی تو چنداں تعجب یا شکایت کی بات نہیں ہے۔ عشق وہ بڑی بلا ہے کہ محمود کے دل میں بتکدہ قائم کر سکتا ہے اسے ایاز کی محبت میں مبتلا کر سکتا ہے۔

(۹) ہندوستان کے باشندے چونکہ مردہ ہیں، اس لیے میرا کلام جو دراصل حیات کا پیغام ہے، ان کے قلوب میں کوئی تاثیر پیدا نہیں کر سکتا۔ یعنی ہندوستان کے باشندے روحانی اعتبار سے مردہ ہیں

اس لیے میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے سچ ہے مردہ کو میرا کلام تو کیا، حضرت داؤد علیہ السلام کا نغمہ بھی زندہ نہیں کر سکتا۔ یعنی جب پیغمبر بھی مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا، تو میں کس شمار میں ہوں؟

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں
در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمدہ اند ایں ہمہ خونیں جگراں؟
اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق
نخرد بادہ کس از کارگہِ شیشہ گراں!
خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں!
برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست
اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں
کس ندانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دستِ زدِ بے بصراں

(۱) اس شعر میں محض تغزل ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ جیتے جی تو حسینوں نے میری کوئی قدر نہ کی۔ لیکن جب میں مر گیا تو انھیں میری وفائیں یاد آئیں اور اب وہ سب میری تربت کے گرد بیٹھے نوحہ خوانی میں مصروف ہیں۔

(۲) یہ بھی آسان شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ فیضِ بہار تو دیکھو! چمن میں چاروں طرف گلاب اور لالہ کے پھول کھلے ہوئے ہیں (یہ دونوں سرخ رنگ کے پھول ہیں)، اس لیے ان کو خونیں جگر سے تعبیر کیا ہے)۔

(۳) اے مخاطب! تو اسکول اور کالج (مدرسہ) میں ادب و دانش و ذوق، ان تین خوبیوں کی تلاش کر رہا ہے! یہ تیری نادانی ہے۔ شیشہ گر کی دکان میں

جام، صراحی اور بوتل تو مل سکتی ہے، لیکن شراب نہیں مل سکتی، اسی طرح کالجوں میں ڈگریاں، ڈپلومے اور سرٹیفکیٹ تو مل سکتے ہیں لیکن آدمیت، تہذیب، عقل و حکمت اور عشق (ذوق) نہیں مل سکتا۔ یعنی کالج کی تعلیم سے طلبہ کا ظاہر تو منور ہو جاتا ہے، لیکن ان کا باطن منور نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ شراب خریدنے کے لیے کوئی شخص شیشہ فروش کی دوکان پر نہیں جاتا۔ اسی طرح اگر تجھے ادب، دانش اور ذوق حاصل کرنا ہے تو یہ چیزیں کالجوں میں نہیں مل سکیں گی۔ اگر ان کا شوق ہے میکدہ رخانقاہ مرشد) کا رخ کرنا چاہیئے:-

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا ❊ کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اکبر الٰہ آبادی نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:-

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

دم) کہتے ہیں کہ مغربی علوم کے مطالعہ سے میری عقل میں اضافہ ہو گیا لیکن میرا دل بزرگوں کی صحبت سے منور ہوا اس لیے اگر کسی کو روحانیت کی تلاش ہو تو اُسے مغربی علوم کی تحصیل کے بعد اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنی لازم ہے۔

(۵) اے مخاطب! اگر تو حقیقی معنی میں انسان بننا چاہتا ہے تو وہ علم (فن) سیکھ جو تیری خودی کو مستحکم کر دے۔ اور اس علم سے اجتناب کر جو تو نے اہلِ مغرب سے حاصل کیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی تقلید مت کر اپنی خودی میں ڈوب کر اپنی معرفت حاصل کر۔ دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنے سے تیری خودی کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گی:-

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

(۶) افسوس! میری قوم میں کسی شخص نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ میری مثال اُس متاعِ گراں بہا کی سی ہے جو اندھوں کے ہاتھ لگ جائے۔

یعنی میری قوم میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ اس لیے میرا جوہر دنیا والوں پر آشکار نہ ہو سکا۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر
بر سر بام آ نقاب از چہرہ بیباکانہ کش
نیست در کوے تو چوں من آرزومندے دگر
بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش
از نگہ بافم بہ رخسار تو روبندے دگر
یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر
عشق را نازم کہ از بیتابیٔ روز فراق
جان ما را بست با درد تو پیوندے دگر
تا شوی بیباک تر در نالہ اے مرغ بہار
آتشے گیر از حریم سینۂ من چندے دگر
چنگ تیموری شکست آہنگ تیموری بجاست
سر بروں می آرد از ساز سمرقندے دگر
رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

(۱) اس شعر میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنی ہوس (آرزو) کی پرستش کرتا رہتا ہے۔ اور بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا پرست ہوں۔ کہتے ہیں کہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ہر وقت کسی نہ کسی آرزو کے حصول میں منہمک رہتے ہیں اور جب وہ آرزو پوری ہو جاتی ہے تو نفس امارہ دوسری آرزو کا بت ہمارے سامنے موجود کر دیتا ہے۔ یعنی یعنی ہم ایک خدا (آرزو) کی بندگی سے نکلتے ہیں تو دوسرے خدا کی بندگی

میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔ اور زندگی کے آخری لمحہ تک یہی سلسلہ قائم رہتا ہے۔

(۲) تغزل کے رنگ میں ہے۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب ا بر سر بام آ اور نقاب اُٹھا کر اپنا جمال دکھا، میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تیرے عاشقوں میں مجھ سے بڑھ کر تیرا قدردان اور کوئی نہیں ہے ۔

(۳) چونکہ میں غیرت مند ہوں اور اس غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ میرے سوا تجھے اور کوئی نہ دیکھے، اس لیے میں نے تارِ نگاہ سے تیرے چہرے پر دوسری نقاب ڈال دی ہے تاکہ میری آنکھ تجھے نہ دیکھ سکے۔ شاعر نے اپنی غیرت کے اثبات کی خاطر اپنی آنکھ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے یہ محض شاعرانہ اندازِ بیاں ہے۔ غالب نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے ۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

(۴) تغزل کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ پیمانِ محبت یا عہدِ وفا باندھنے کیلئے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے معشوق کی ایک نگاہ اس کا ایک زیرِ لب تبسم اور بوقتِ رخصت ایک اشکِ تابندہ، بس یہ تین چیزیں ہمیشہ کے لیے عاشق کو معشوق کا گرویدہ بنا دیتی ہیں۔ یعنی محبوب کی ایک نگاہ یا اس کا تبسم یا اشک ہزار قسموں سے بھی زیادہ مؤثر ہوتا ہے ۔

(۵) کہتے ہیں کہ میں اپنے جذبۂ عشق پر ناز کرتا ہوں کہ اسے میرا اس درجہ خیال ہے کہ اُس نے جب یہ دیکھا کہ فراق کی گھڑی سر پر آ کھڑی ہوئی تو اسے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں عاشق، فراق کی سختیوں سے تنگ آ کر محبوب سے محبت کرنا نہ چھوڑ بیٹھے اس لیے اس نے فراق کے پہلو رہے تابی) کو مدِ نظر رکھ کر میرے دل میں تیرے دردِ فراق سے رابطہ مزید پیدا کر دیا۔ یعنی مجھے تیری محبت میں اس قدر دیوانہ کر دیا کہ فراق کی حالت میں خواہ مجھ پر کتنی ہی مصائب کیوں نہ آئیں، میں تیرے خیال سے غافل نہیں ہو سکتا۔ یہ محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے، اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ میں عاشق پختہ کار ہوں، محبوب کے خیال سے کسی صورت میں دستبردار نہیں ہو سکتا۔

(۶) اے بلبل! اگر تو آہ و فریاد میں پختہ ہونا چاہتی ہے تو ابھی کچھ دن اور میری صحبت میں رہ کر اپنے رنگ عاشقی کو پختہ کرلے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اے مخاطب! اگر تو عشق کی دنیا میں نام پیدا کرنا چاہتا ہے تو میرے پیغام کا مطالعہ ابھی کچھ دن اور کر، تاکہ تیری تمام خامیاں دور ہو جائیں اور تیرے عشق میں پختگی کا رنگ پیدا ہو جائے۔

(۷) چنگ تیموری سے دور ملوکیت اور آہنگ تیموری سے نظام ملوکیت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر ملوکیت (شخصی حکومت) کا دور ختم ہو چکا ہے لیکن جمہوریت، اشتراکیت اور آمریت کے پردوں میں ملوکیت کا فرسودہ نظام ہنوز برقرار ہے مثلاً ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام

چونکہ وہ نظام (آہنگ تیموری) برقرار تھا، اس لئے ساز سمرقند سے (سمرقند تیمور کا پایہ تخت تھا) ملوکیت کا نغمہ پھر نکلنے لگا۔ یعنی زارِ روس ختم ہو گیا لیکن اس کی جگہ لینن، اسٹالین اور میلنکوف نے ملوکیت کا نام بدل کر، اشتراکیت کے پردہ میں مطلق العنانی کو پھر زندہ کر دیا۔ غور سے دیکھو تو تیمور، چنگیز اور ہلاکو اور مصطفےٰ کمال، ہٹلر اور اسٹالین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ۱۹۱۶ء میں کوئی شخص روس میں زار کے خلاف لب کشائی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح آج ۱۹۵۳ء میں کوئی شخص اسی روس میں کمیونسٹ پارٹی یا اس کے لیڈر کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتا۔ لہٰذا عملی اعتبار سے زارِ روس اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۸) اقبال نے اپنے نام کے پردہ میں دراصل پیر حرم کی غیر اسلامی زندگی پر طنز کیا ہے۔ پیرِ حرم سے پیشوایانِ دین بھی مراد ہیں اور وہ طبقہ بھی جو اسوقت کعبہ پر مسلط ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب یہ لوگ غیر اللہ کی محبت میں (دول مغرب کی غلامی) فنا کا مقام حاصل کر چکے ہیں تو طوافِ کعبہ سے انہیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

مرا زدیدۂ بینا شکایت دگر است
کہ چوں بجلوہ در آئی حجاب من نظر است

بہ نوریاں ز من پا بہ گِل پیامے گوے
حذر ز مشتِ غبارے کہ خویشتن نگر است!
نوازنیم و بہ بزمِ بہار می سوزیم
شرر بہ مشتِ پرِ ما ز نالۂ سحر است
ز خود رمیدۂ چہ دانم نواے من ز کجاست
جہانِ او دگر است و جہانِ من دگر است
مثالِ لالہ فتادم بہ گوشۂ چمنے
مرا ز تیرِ نگاہے نشانہ بر جگر است
بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
ہزار انجمن آراستند و برچیدند
دریں سرا چہ کہ روشن ز شعلِ قمر است
ز خاکِ خویش بہ تعمیرِ آدمے برخیز
کہ فرصتِ تو بقدرِ تبسّمِ شرر است
اگر نہ بوالہوسی با تو نکتۂ گویم
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہاے بے اثر است
نواے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت
عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

(۱) کہتے ہیں کہ پہلے تو مجھے اپنی آنکھ سے یہ شکایت تھی کہ اُسے تابِ دید نہ تھی، خدا خدا کر کے دیکھنے کی طاقت پیدا ہوئی تو اب یہ شکایت ہے کہ میری نظر خود میرے اور محبوب کے درمیان حجاب بن جاتی ہے یعنی میری نظر خود دیکھنے لگتی ہے مجھے دیکھنے کا موقع نہیں دیتی۔ شاعر نے اپنی نظر اپنی ذات سے جُدا فرض کر کے یہ دلکش مضمون پیدا کیا ہے کہ میرا محبوب اسقدر حسین ہے کہ میری نگاہ بھی اُس پر عاشق ہے۔

(۲) اے مخاطب! فرشتوں (نوریاں) سے انسان کا جو زمان و مکان کی قید میں ہے (پا بگِل) یہ پیغام کہہ دے کہ انسان کو بنظرِ حقارت مت دیکھو کیونکہ اگر وہ اپنی معرفت حاصل کرے تو اُس مقام پر فائز ہو سکتا ہے جہاں تم کبھی ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ "خویشتن نگر" کنایہ ہے مردِ مومن یا عارفِ کامل سے۔

اس شعر میں تلمیح ہے قصۂ خلافتِ آدم کی طرف کہ جب اللہ تعالےٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کی کہ ہم سے بڑھ کر اس اعزاز کا مستحق کون ہو سکتا ہے ؟ اس پر ارشاد ہوا کہ تم آدم کی مخفی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو۔ وہ اگر قانون کی پابندی کرے تو اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ اور تم یہ کام نہیں کر سکتے کیونکہ ہم نے تم کو علم اسماء عطا نہیں فرمایا۔ تفصیل کے لیے دیکھو قرآن (۲ - ۳۰)

(۳) اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنا چاہتے ہو۔ بالفاظِ دگر اقوامِ عالم میں سربلندی کے طالب ہو تو عشقِ الٰہی (نالۂ سحرا) اختیار کرو۔ اس عشق کی بدولت تمہاری شخصیت (مشتِ پر) سراپا آتش بن جائے گی۔ یعنی تمہارے اندر بے اندازہ قوت پیدا ہو جائے گی۔ اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے :-

عطارؔ ہو رومیؔ ہو رازیؔ ہو غزالیؔ ہو ٭ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

اقبال کے نظامِ فکر میں "نالۂ سحر" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ کیفیتِ عشق کی مظہر ہے اور عشق ان کے فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہے۔

(۴) زخورد رمیدہ۔ کنایہ ہے اس شخص سے جو عشق سے نا آشنا ہو۔ کہتے ہیں کہ جو شخص عشق سے نا آشنا ہے وہ کیا سمجھ سکتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یا جس بات کی تلقین کر رہا ہوں، اس کی اصل کیا ہے ؟ وجہ ظاہر ہے کہ وہ اور دنیا میں رہتا ہے اور میں اور دنیا میں رہتا ہوں، یعنی وہ مادیات میں منہمک ہے۔ اس لیے روحانیت کی قدر و منزلت نہیں کر سکتا۔ اسی نکتہ کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے :-

مرے صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے ٭ انہیں کیا خبر کہ کیا ہے نوائے عاشقانہ

(۵) محض تغزل کا رنگ ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے، کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کی ترچھی نگاہ سے زخمی ہو کر، لالہ کی طرح باغ کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا ہوں۔ چونکہ لالہ بھی سوزِ عشق کا مظہر ہے اس لیے شاعر نے اپنے آپ کو اس سے تشبیہ دی ہے۔

(۶) عاشقوں کے مذہب میں زندگی نام ہے مصائب کے برداشت کرنے

سکا، چونکہ کعبہ کا راستہ محفوظ ہے اس لیے میں نے وہاں کے سفر کا ارادہ نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان کا کمال زندگی یہ نہیں کہ جب ساری عمر دولت جمع کرنے میں بسر ہو جائے تو بڑھاپے میں فرسٹ کلاس میں یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر حج کر کے واپس آ جائے اور یہ سمجھے کہ بڑا تیر مارا یا بلکہ کمال زندگی اس میں ہے کہ اللہ کی راہ میں ہر قسم کی تکلیف برداشت کرے یعنی سر ہتھیلی پر رکھ کر اعلائے کلمۃ الحق کا فرض انجام دے۔

(۷) آسان شعر ہے مطلب یہ ہے کہ انسان خصوصاً اس دنیا میں اگر عارضی طور سے دولت یا ثروت حاصل ہو جائے تو اس پر فخر کرنا زیبا نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا اور اس کی نعمار (حکومت، دولت، عزت) سب فانی ہیں۔ یہاں کسی شئی کو قرار نہیں ہے۔

(۸) اے مسلمان! یاد رکھ تیری زندگی بہت مختصر ہے۔ اسلئے تمام غیر ضروری کاموں سے دستکش ہو کر اپنی پوری توجہ اپنی خودی کی تربیت پر مبذول کر دے۔ (تعمیر آدم سے معرفت نفس بھی مراد ہو سکتی ہے، اور استحکام خودی بھی)۔

(۹) اے حق طلب! اگر تو بندہ ہوا و ہوس نہیں ہے (اگر تو سچا عاشق بننا چاہتا ہے) تو میں تجھ کو ایک نکتہ بتاتا ہوں جس کی بدولت تو کمال حاصل کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ نالۂ بے اثر سے عشق میں پختگی کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی تو وصال کی دعا مت مانگ کیونکہ وصل کے بعد جدوجہد ختم ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ سکون یعنی موت ہے۔

(۱۰) کہتے ہیں کہ اگرچہ عجمی ممالک (ہندوستان، افغانستان، ترکستان اور ایران) میں میرے کلام کی کسی قدر اشاعت ہو گئی ہے لیکن عربی ممالک میرے عاشقانہ نغموں سے ہنوز بے خبر ہیں۔

نوٹ:- اقبال نے یہ شعر ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا، اُس وقت یہی کیفیت تھی لیکن اب عربی زبان میں بھی ان کی کتابوں کے تراجم شائع ہو رہے ہیں۔ الحمدللہ

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا

حدیثِ دل بزبانِ نگاہ می گوییم
پئے نظارۂ روئے تو می کنم پاکش
نگاہِ شوق بہ جوئے سرشک می شوییم
چو غنچہ گرچہ بکارم گرہ زنند ولے
ز شوقِ جلوۂ آفتاب می روییم
چو موجِ ساز وجودم ز سیل بے پرواست
گمان مبر کہ دریں بحر ساحلے جوییم
میانِ من و او ربطِ دیدہ و نظر است
کہ در نہایتِ دوری ہمیشہ با اوییم
کشید نقشِ جہانے بہ پردۂ چشمم
ز دستِ شعبدہ بازے اسیرِ جادوییم
درونِ گنبدِ دربستہ اش نگنجیدیم
من آسمانِ کہن را چو خار پہلوییم
بہ آشیاں ننشینم ز لذتِ پرواز
گہے بشاخِ گلم گاہ بر لبِ جوییم

(۱) کہتے ہیں کہ میں اس محفل (دنیا) میں لوگوں کو غزل سنا رہا ہوں دوست کا پیغام پہنچا رہا ہوں، دراصل اس بہانہ سے اپنا محرمِ راز تلاش کر رہا ہوں تاکہ (اگر وہ مل جائے تو) اُس سے اپنا حالِ دل کہہ سکوں۔
مطلب یہ ہے کہ اقبال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بے حسی پر ماتم کر رہے ہیں کہ کسی کے دل میں اسلام کی محبت نہیں ہے۔
(۲) کہتے ہیں کہ محبوب کی محفل میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ سخن تو حجاب بن جاتا ہے، اس لیے میں اپنا حالِ دل زبان کے بجائے نگاہ سے واضح کر دیتا ہوں۔ یعنی عاشق اپنے معشوق کی طرف اس انداز سے دیکھتا ہے کہ اس کا حالِ دل معشوق پر واضح ہو جاتا ہے۔ مضمون پامال ہے لیکن اسلوبِ بیان دلکش ہے۔
(۳) اے محبوب! میں پسند نہیں کرتا کہ ناپاک نگاہ تیرے پاکیزہ چہرے پر پڑے، اس لیے میں اپنی نگاہ کو پاک آنسوؤں کے پانی سے دھو رہا ہوں۔
اس شعر میں حسنِ تعلیل کی خوبی پائی جاتی ہے۔ یعنی شاعر نے فراق میں گریہ کا

باعث یہ قرار دیا ہے کہ میں اس طرح اپنی نگاہِ شوق کو پاک کر رہا ہوں۔

(۴) اس شعر کو سمجھنے سے پہلے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ "شوقِ جلوہ گرِ آفتاب" سالک (انسان) کی اصل ہے اس لیے وہ اس سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے (یہ اُس کا مقصدِ حیات ہے) دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ دوسرے مصرع میں حرفِ "ز" سببیہ ہے۔

اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں:-

شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ کارکنان قضا و قدر (قانون قدرت کے مطابق بار بار میری روحانی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، لیکن شوق (عشق) کا جذبہ میری شخصیت میں کار فرما ہے اس لیے اس عشق کی بدولت میں ان رکاوٹوں پر غالب آکر اپنی اصل (جلوہ گاہِ آفتاب) سے ہم آغوش ہونے کے لیے جد و جہد کرتا رہتا ہوں (روئیدن بمعنی اُگنا۔ کنایہ ہے جد و جہد سے) مطلب شاعر کا یہ ہے کہ جد و جہد کے بغیر کوئی سالک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر راہ میں دشواری پیدا ہو جائے تو سالک کو ہمت سے کام لینا چاہیئے۔

(۵) سازِ وجودم یعنی میری ہستی سیلِ بے پروا کنایہ ہے مشکلات سے، بحر کنایہ ہے دُنیا سے۔ اور ساحل کنایہ ہے عافیت و راحت سے

کہتے ہیں کہ جس طرح موج کا وجود سیلِ بے پروا، سے ہے اُسی طرح میرا وجود مشکلات سے ہے۔ اس لیے اے مخاطب! تو یہ گمان مت کر کہ میں دنیا میں عافیت یا راحت کا آرزومند ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان تو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ راہِ حق میں ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کرے پس جس طرح موج، سیلاب سے خوفزدہ نہیں ہوتی۔ اُسی طرح مسلمان مشکلات سے نہیں ڈرتا۔

(۶) کہتے ہیں کہ مجھ میں اور اُس میں وہی رابطہ ہے جو دیدہ (آنکھ) اور نظر میں پایا جاتا ہے۔ یعنی نظر آنکھ میں رہتی ہے لیکن اس قرب کے باوجود آنکھ، نظر کو یا نظر، آنکھ کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہی حال ہمارا ہے کہ اگرچہ ہم اُس سے بہت دُور ہیں بلکہ وہ ہم سے بہت دُور ہے اس کے باوجود ہم ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں یا وہ ہمارے ساتھ رہتا ہے۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے اللہ تعالیٰ کی صفت ہمہ جائی اور صفتِ فوقیت کا بیان کیا ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے (ہمہ جائی) اس کے باوجود کسی جگہ یا سمت میں محدود نہیں ہے، یعنی جہات سے بالاتر ہے (فوقیت) وہ ہم سے دُور بھی ہے، اس لحاظ سے کہ آنکھ سے نظر نہیں آسکتا۔ وہ ہم سے قریب بھی ہے اس اعتبار سے کہ وہی باعثِ حیات ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے ذیل کی تین آیتوں پر غور کرنا مفید ہوگا۔

(۱) لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ کوئی چیز اس کی مانند نہیں ہے۔

(۲) لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ۔ آنکھ اس کو پا نہیں سکتی (دیکھ نہیں سکتی)

(۳) نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔ ہم انسان سے اُس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

(۴) کہتے ہیں کہ ایک زبردست شعبدہ باز (ذاتِ مطلق) نے میری آنکھ کے پردہ پر جہان کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس لیے میں اسیر طلسم (جادو) ہو گیا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ فریب نظر ہے، یعنی کائنات دکھائی تو دیتی ہے لیکن دراصل موجود نہیں ہے جس طرح پردہ پر جو تصویر بنائی جاتی ہے وہ نظر تو آتی ہے لیکن اس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہوتا۔

(۵) من سے ذات مومن مراد ہے اور اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ مومن اس کائنات میں نہیں سما سکتا کیونکہ وہ زمان و مکان سے بالاتر ہوتا ہے۔ خارپہلو سے حریف، مدمقابل، یا ایذاء دہندہ مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ میں آسمان کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہوں کیونکہ مجھ میں یہ طاقت ہے کہ طلسم زمان و مکان کو باطل کر سکتا ہوں مطلب یہ ہے کہ مومن میں یہ طاقت ہے کہ اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

(۶) کہتے ہیں کہ میں عاشق ہوں اور عاشق کو کسی لمحہ قرار نہیں ہوتا اس لیے میں ایک حالت (آشیاں) میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ عشق نے میرے اندر لذتِ پرواز پیدا کر دی ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی میں شاخ گل پر بیٹھتا ہوں کبھی لب جوئے پر، یعنی عاشق (مومن) کی زندگی میں ہر وقت انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے۔

خیز و نقاب برکشا، پردگیانِ ساز را
نغمۂ تازہ یاد دہ، مرغِ نواطراز را
جادہ ز خونِ رہرواں تختۂ لالہ در بہار
ناز کرا می زند قافلۂ نیاز را
دیدۂ خوابناکِ او گر بہ چمن کشودۂ
رخصتِ یک نظر بدہ، نرگسِ نیم باز را
حرفِ نگفتۂ شما، بر لبِ کودکاں رسید
از منِ بے زباں بگو خلوتیانِ راز را
سجدۂ تو برآورد، از دلِ کافراں خروش
اے کہ دراز ترکنی، پیشِ کساں نماز را
گرچہ متاعِ عشق را عقل بہائے کم نہد
من ندہم بہ تختِ جم آہِ جگر گداز را
برہمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
تو کہ صنم شکستۂ، بندہ شدی ایاز را

(۱) اُٹھ! اور ان نغموں کو جو ساز کے پردوں میں پوشیدہ ہیں واضح (آشکار) کر دے۔ اور گلشن کے پرندوں کو نئے نئے نغمے سُنا۔ مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب اور دینِ اسلام کے اعلیٰ اور پاکیزہ حقائق قوم کے ترجمانوں (مرغِ نواطراز) کے سامنے پیش کر تاکہ ان میں جدوجہد کا ولولہ پیدا ہو۔ یا دنیا کو ان حقائق سے روشناس کر جو قرآن حکیم کے الفاظ میں پوشیدہ ہیں۔

(۲) چلنے والوں کے خون سے راستہ ایسا سُرخ ہو رہا ہے جیسے بہار میں گلِ لالہ کا تختہ خون آلودہ نظر آتا ہے۔ یہ کس کے ناز نے نیاز کے قافلہ کو قتل کر دیا!

یہ اس شعر کا لفظی ترجمہ ہے اور جیسا کہ میں نے مقدمہ میں واضح کیا ہے اقبال کے اشعار کا لفظی ترجمہ بالکل بے کار ہے کیونکہ اس سے شاعر کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ذیل میں مفہوم لکھتا ہوں:-

جادہ کنایہ ہے زندگی سے۔ رہرواں کنایہ ہے اللہ کے عاشقوں سے، تختۂ لالہ کنایہ ہے ان مصائب سے جو عاشقانِ خدا پر وارد ہوتی ہیں، خواہ وہ بصورتِ قتل وارد ہوں خواہ بصورتِ قید و بند، نازِ مجازِ عقلی ہے جس سے صاحبِ ناز۔ یعنی معشوق مراد ہے۔ اور نیاز بھی مجازِ عقلی ہے جس سے صاحب

نیاز۔ یعنی عاشق مراد ہے۔ رمز و کنایہ کے پردوں کو ہٹا دیا جائے تو شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر عاشقان حق گذرے ہیں ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مختلف اقسام کے مصائب سے دوچار نہیں ہوا۔

(۳) چمن کنایہ ہے دنیا سے اور نرگس کنایہ ہے سالک یا عاشق سے مطلب یہ ہے کہ اے خدا اگر تو نے انسان کے دل میں اپنی محبت کا جذبہ پیدا کیا ہے تو اُسے اپنی معرفت بھی عطا فرما۔

(۴) اے مخاطب! میری طرف سے یہ پیغام عرفاء کی خدمت میں پہنچا دے یعنی ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ جن اسرار و رموز کو آپ حضرات نے مخفی رکھا تھا، میں نے ان کو شعر کا لباس پہنا کر، عوام تک پہنچا دیا۔

(۵) اس شعر میں اقبال نے ریاکار سے خطاب کیا ہے کہ تو لوگوں کے سامنے دکھانے کے لیے نماز پڑھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح دنیا مجھے پارسا تصور کرے گی، حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ کافر بھی تیری نماز کو دیکھ کر تیری ریاکاری پر افسوس کرتے ہیں۔

(۶) اگرچہ عقل، عشق کو بہت حقیر سمجھتی ہے۔ یعنی فلاسفر، عاشقوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں عشق کے مقابلہ میں بادشاہی کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ اس شعر میں اقبال نے عشق حقیقی کا مرتبہ اور اس کی فضیلت واضح کی ہے کہ عاشقوں کی نگاہ میں بادشاہی بھی ہیچ ہے اور یہ بات بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ آجتک کوئی عاشق کسی بادشاہ کے دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بادشاہ، عاشقوں کے دربار میں حاضر ہوتے رہے ہیں۔

(۷) ایک برہمن نے سلطان محمود غزنوی سے یہ بات کہی کہ میری کرامت دیکھ! اگرچہ تو نے بہت سے صنم توڑ دیئے لیکن تو اپنے آپ کو صنم پرستی سے باز نہ رکھ سکا۔ اس شعر میں اشارہ ہے اُس تعلق خاطر کی طرف جو سلطان کو ایاز سے تھا۔ مطلب یہ ہے کہ عشق وہ بڑی بلا ہے کہ بادشاہوں کے قلوب بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

بلا زبان سلطان جب سے ہم زبانی
کہ جہاں قماش گرفتن بجرئے وگرانے

بمتاعِ خود چہ نازی کہ بہ شہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسمِ ایازے
ہمہ ناز بے نیازی، ہمہ ساز بے نوائی
دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے
ز مقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے نہ فرازِ من فرازے
رہِ عاشقی رہا کن کہ باو تواں رسیدن
بدلِ نیازمندے بہ نگاہِ پاکبازے
بہ رہِ تو ناتمامم ز تغافلِ تو خامم
من و جانِ نیم سوزے، تو و چشمِ نیم بازے
رو ز تختِ گل بہ جبیں سجدہ ریزم
کہ نیازِ من نگنجد بدو رکعت نمازے
ز تمیزِ آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دِ نگہے بہانہ سوزے نگہے بہانہ سازے

(۱) مَیں لازمانِ سلطان (عاشقانِ الٰہی) کو اس نکتہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ خلوصِ نیت کے ساتھ عشق اختیار کریں گے تو ساری دُنیا اُن کی غلام ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ اللہ کے عاشقوں کی شان ہر زمانہ میں یہی رہی ہے کہ ساری دنیا ان کے سامنے جھکتی ہے۔

(۲) اے انسان! اپنے کمال پر ناز مت کر۔ عشق کی دنیا کا دستور، ہوس کی دُنیا سے مختلف ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ بڑے بڑے شہنشاہ گدا نظر آتے ہیں اور ایاز کے تبسم کے سامنے غزنوی کے دل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ معشوق کی بارگاہ میں دنیاوی بادشاہوں کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب دنیاوی معشوقوں کے سامنے بادشاہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو معشوقِ حقیقی کی بارگاہ میں ان بادشاہوں کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ یہاں تو خلوص کی قدر ہے خواہ وہ خلوص بادشاہ سے ظاہر ہو، یا کسی گدائے بے نوا سے۔

(۳) عاشق (گدائے بے نیاز) کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی بے نیازی پر ناز کرتا ہے (جبکہ دُنیا والے دولت پر ناز کرتے ہیں)، اور اپنی بینوائی ہی کو اپنا

سازوسامان یقین کرتا ہے (جبکہ دُنیا والے جاگیر پر تکیہ کرتے ہیں) چونکہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا (بے نیازی) اور کسی سامان کا طلب گار نہیں ہوتا (بے نوائی) اس لیے گدائے بے نیاز (خدا کے عاشق) سے بادشاہ بھی خائف رہتے ہیں۔ عاشق بھی ناز کرتا ہے مگر دولت پر نہیں بلکہ اپنی بے نیازی پر، اور وہ بھی سازوسامان رکھتا ہے مگر مادی نہیں بلکہ روحانی۔ اسی لیے اس کی شانِ بے نیازی (کہ وہ بادشاہوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا) بادشاہوں کو لرزہ براندام کردیتی ہے۔

(۴) کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تو مجھ سے میرا مقام کیا دریافت کرتا ہے! میں تو بندۂ عشق ہوں (بہ طلسم دل اسیرم) اور جب ایک شخص دنیا سے قطع تعلق کرکے اپنا رابطہ اللہ سے استوار کرلیتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ نہ تاجِ شاہی (فراز) سے متاثر ہوتا ہے نہ حالتِ گدائی (نشیب) سے یعنی اس کی نگاہ میں دنیاوی امتیازات کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ شاہ و گدا (نشیب و فراز) سب یکساں ہوجاتے ہیں۔ وہ ہر شے میں اسی کا جلوہ دیکھتا ہے۔

(۵) اے مخاطب! اگر تو اپنے دل میں نیاز اور نگاہ میں پاکیزگی کا رنگ پیدا کرنا چاہتا ہے (اور انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے) تو عقل کا طریق چھوڑ دے اور اس کے بجائے عشق کا راستہ اختیار کرے۔

(۶) کہتے ہیں کہ اے خدا! میں حتی المقدور جد و جہد (مجاہدہ) کر رہا ہوں، لیکن ابھی تک عشق میں کامل نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ابھی تک تو نے میری طرف التفات نہیں کیا۔ میں ایک کمزور انسان ہوں جب تک تیری توفیق میرے شاملِ حال نہ ہو، میں کامل نہیں ہوسکتا۔ تو جب تک میری جانب نگاہِ کرم نہیں کرے گا۔ میں اسی طرح گنہگار رہوں گا۔

(۷) کہتے ہیں کہ میں عاشقِ صادق ہوں۔ ہر جگہ اسی کا جلوہ دیکھتا ہوں اس لیے دو رکعت نماز (رسوم ظاہری) ادا کرنے سے میرے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں حرم کے علاوہ دیر میں بھی اسے سجدہ کرتا ہوں اور میرے سجدوں کی بدولت رہ دیر بھی تختۂ گل بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقِ صادق کی نگاہ میں دیر و حرم میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔

(۹) کہتے ہیں کہ عاشق اور معشوق کے درمیان عجیب ناز و نیاز کا رنگ نظر آتا ہے۔ معشوق بوجہ ناز، بہانہ سازیاں کرتا ہے یعنی عاشق کو تڑپاتا ہے۔ اور عاشق بسبب نیاز، ان بہانہ سازیوں کو بسر و چشم برداشت کرتا ہے اور ہر ناز معشوقانہ پر سرِ نیاز خم کرتا ہے۔ بظاہر دونوں میں جنگ و ستیز کا رنگ نظر آتا ہے درا صل عاشق کی لذت اسی ناز و نیاز میں پنہاں ہے۔

بیا کہ ساقیِ گل چہرہ دست بر چنگ است
چمن ز باد بہاراں جواب ارژنگ است
حنا ز خونِ دلِ نوبہار می بندد
عروسِ لالہ چہ اندازہ تشنۂ رنگ است
نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے
بمعنئی کہ برو جامۂ سخن تنگ است
بچشمِ عشق نگر تا سراغ او گیری
جہاں بچشمِ خرد سیمیا و نیرنگ است
ز عشق درس عمل گیر و ہر چہ خواہی کن
کہ عشق جوہرِ ہوش است و جانِ فرہنگ است
بلند تر ز سپہر است منزلِ من و تو
براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است
ز خود گذشتہ اے قطرۂ محال اندیش
شدن بہ بحر و گہر برنخاستن ننگ است
تو قدرِ خویش ندانی بہا ز تو گیرد
وگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

(۱) ارژنگ:۔ مانی کا نگار خانہ، مجموعۂ تصاویر، نقش و نگار، دلکش مناظر وغیرہ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! بہار کا موسم آگیا۔ باغ میں چل کر دیکھ! ساقی گل چہرہ باغ میں چنگ بجا رہا ہے۔ اور بادِ بہاری کی بدولت، باغ مانی کی بنائی ہوئی تصویر کا جواب نظر آرہا ہے یعنی نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اس میں بھی تغزل کا رنگ ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ گل لالہ کی دلہن اس قدر رنگ کی شوقین ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ

پر بہار کے دل کے خون کی حسد کی لگائی ہے۔ یعنی موسم بہار میں گل لالہ کا رنگ خون کی طرح سرخ نظر آتا ہے۔

(۳) اس شعر کی شرح یوں ہو گی "از نغمۂ دل افروزِ نگاہ و سامع بمعنی می رسد کہ بر و جامۂ سخن تنگ است" یعنی موسم بہار میں، مطرب دلنواز (مرشد) جب نغمہ سرائی کرتا ہے (درس دیتا ہے) تو سامعین (عاشقوں) پر وہ روحانی حقائق منکشف ہوتے ہیں کہ لفظوں کے ذریعہ سے ان کا بیان ناممکن ہے۔

(۴) اس شعر میں اقبال نے کائنات کے متعلق اپنا نظریہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کائنات (جہان) کو کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ تو اسے لازم ہے کہ مسلکِ عشق اختیار کرے اگر وہ مسلکِ عقل پر عامل ہو گا تو اس کو اس کائنات کے متعلق صحیح علم کبھی حاصل نہیں ہو سکتا یعنی ساری عمر اسی مسئلہ پر غور کرتے میں بسر ہو جائے گی۔ لیکن اس کے باوجود وہاں سے اس نے اپنی فکر کا آغاز کیا تھا وہیں رہے گا۔ اور اس سعیِ لاحاصل کا نتیجہ، حیرانی اور سرگرانی، آشفتگی اور پریشانی کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دِل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا (اکبر الٰہ آبادی)

اقبال کا دعویٰ یہ ہے کہ عقل کی نگاہ میں یہ کائنات معمّا اور نیرنگ ہے یعنی شعبدہ بازی یا طلسم یا فریبِ نظر یا جادو منتر کا کھیل یا مہمل اور ناقابل التفات شئی ہے۔ ہاں اگر اس کو عشق کی نگاہ سے دیکھو گے، تو تمہیں اس کا سراغ مل جائے گا۔ اب ہم اس دعویٰ پر دلائل پیش کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ جب سے انسان نے غور و فکر شروع کی ہے، اُس وقت سے یہ سوال بڑی شدت کے ساتھ اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کہ اس کائنات کی اصل کیا ہے (اقبال نے یہاں "سراغ" کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے) یعنی یہ کہاں سے آئی ہے؟ بالفاظِ دگر (۱) خود بخود پیدا ہوئی ہے؟ یا (۲) کسی اور ہستی نے اُسے پیدا کیا ہے؟ فلسفہ کی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ کائنات قدیم ہے یا حادث؟ دیکھنے میں یہ سوال کس قدر مختصر ہے۔ لیکن اڑھائی ہزار سال اس پر بحث کرتے ہوئے گذر

چکے ہیں۔ اس کے باوجود ہنوز روزِ اوّل ہے۔ یعنی یہ مسئلہ وہیں ہے۔ جہاں فیثا غورث، گوتم بدھ، کنفیوشس، مہاویر سوامی بلکہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تھا[1]۔

اگر میں اس مسئلہ کی تاریخ بیان کروں تو یہ کتاب فلسفہ کی تاریخ بن جائیگی اس لیے چند لفظوں میں اس بحث کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں تاکہ اقبال کا عرض مبرہن ہوجائے (اور شارح کا فرض منصبی یہی ہے کہ ماتن کے قول کی تائید کردے)۔

(۱) دیمقراطیس نے یہ کہا کہ یہ کائنات ازلی اور ابدی ہے۔ ہندوستان میں اس کی ہمنوائی کپل بانی سانکھ درشن نے کی ہے، چارواک مت کی تعلیم بھی یہی ہے۔

(ب) ارسطو نے یونان میں اور گوتم (بانی نیائے درشن) نے ہندوستان میں یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات ازلی اور ابدی تو بے شک ہے لیکن مصنوع ہے یعنی خدا نے روح اور مادہ کو ترکیب دے کر یہ دنیا بنائی ہے۔

(ج) شنکر اچاریہ نے یہ کہا کہ دنیا دھوکہ یا فریب نظر ہے۔ جیسے رات کے وقت ایک آدمی، رسّی کو سانپ سمجھ لے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا وجود محض ذہنی ہے، دراصل کچھ بھی نہیں ہے۔ جس طرح سانپ کہیں نہیں ہے، دیکھنے والا اپنی قوتِ متخیلہ کی بدولت رسّی کو سانپ کی شکل میں دیکھتا ہے۔

(د) مہاویر سوامی اور گوتم (بانی بودھ دھرم) کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا ایک ازلی جیلخانہ ہے۔ اس میں ہر جگہ دُکھ اور عذاب، مصیبت اور کلیش ہے اس لیے اس کو ترک کر دینا چاہیے۔

(ہ) سوفسطائیہ نے یہ کہا کہ ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ عقل کا مدار حواس پر ہے اور حواس قطعاً ناقابلِ اعتماد ہیں۔ یہ مسلک مشہور تو نہیں ہوا۔ لیکن ہر زمانہ میں موجود رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی اس عقیدے کے لوگ دنیا میں موجود ہیں جن کو لا ادری AGNOSTIC کہتے ہیں۔

---

[1] واضح ہو کہ اوّل الذکر چاروں مذہبی پیشواؤں کا زمانہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ یعنی ۵۰۰ھ تا ۶۰۰ ق م لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے بھی ایک ہزار سال پہلے ہوئے ہیں، ان کی ولادت ۱۵۰۱ ق م میں ہوئی تھی۔

(۵) مجوسیت، یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات مخلوق یعنی حادث ہے۔ خدا نے اس کو نیست سے ہست کیا ہے۔

(۶) بعض حکمار (اشراقی) یہ کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی تو ہو نہیں سکتی اس لیے یہ کائنات ازلی ہے، لیکن اس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ خدا سے نکلی ہے جس طرح شعاع آفتاب سے نکلتی ہے۔

(۷) بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ کائنات ہی خدا ہے۔ یورپ میں حکیم اسپنوزا کا یہی مسلک ہے۔ ہیگل اور بریڈلے بھی اسی نظریہ کے حامی ہیں۔ اگرچہ جزئیات میں باہمدگر مختلف ہیں۔

(۸) بعض فلاسفہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ دنیا "ایشور کی لیلا" ہے یعنی خدا اپنی تفریح طبع کے لیے ایک بے مقصد کھیل میں مشغول ہے۔

(۹) بعض حکمار کا یہ خیال ہے کہ دنیا اصلی یا حقیقی دنیا کی نقل ہے اس لیے ہمیں اس دنیا سے قطع نظر کر کے اصل دنیا کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔

ان تمام خیالات یا نظریات کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے اقبال کا دعوے ثابت ہو سکتا ہے کہ عقل ہزاروں سال سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر ہنوز کامیاب نہیں ہو سکی :-

صدیوں فلاسفی کی چناں و چنیں رہی ؎ لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

اقبال کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان مذاہب میں غور و فکر کرے گا جو عقل کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ نکلے گا کہ وہ آدمی حیران اور سرگشتہ ہو جائے گا یعنی اس کی نظر میں یہ جہاں بلاشبہ "سیمیا اور نیرنگ" کا مصداق بن جائے گا۔ یعنی وہ عقل کی بنا پر اس کائنات کے متعلق کسی صحیح اور تسلی بخش نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ عقل ان میں سے ہر نظریہ کی تائید بھی کرتی ہے اور تردید بھی۔ مثلاً عقل ہی یہ بات کہتی ہے کہ دنیا ازلی ہے اور عقل ہی یہ بات کہتی ہے دنیا ازلی نہیں ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہی عقل ان دونوں متضاد باتوں پر دلائل بھی فراہم کرتی ہے بالفاظ دگر عقل رہنما بھی ہے اور راہزن بھی ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کریں کہ اگر وہ عقل کی نگاہ سے اس دنیا کو دیکھیں گے تو انہیں سیمیا اور نیرنگ کے علاوہ اور کیا نظر آ سکتا ہے؟

اس لیے اقبال ہمیں مسلک عشق پر عامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ عشق کی بدولت ہمیں اس کائنات کا سراغ مل سکتا ہے۔ یعنی عشق کی تعلیم یہ ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس لیے بنائی ہے یا پیدا کی ہے کہ انسان اسمیں غور و فکر کرکے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لائے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اور اطاعت کی بدولت نیابت الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہوکر اس کائنات میں حکم حق جاری کرے۔ اگر کائنات نہ ہوتی تو آدم حکم حق کس میں جاری کرتا؟ خلافت کے لیے ارض کا ہونا تو شرط اولین ہے۔ پس یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مقصد سے پیدا کی ہے اسی کو قرآن کی اصطلاح میں "تخلیق بالحق" کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نہایت واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے:-

"اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ط (۳۰-۸)

کیا منکرین اسلام نے کبھی اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمان اور زمین اور ان دونوں کے درمیان موجود ہے اس کو یعنی ساری کائنات کو اللہ تعالیٰ نے خاص مصلحت یا مقصد کی بنا پر پیدا کیا ہے؟

اسی صداقت کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے:-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ط

جو لوگ اس کائنات میں غور و فکر کرتے ہیں وہ بلا شبہ پکار اٹھتے ہیں کہ اسے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو یونہی بے فائدہ بیکار یا بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عشق وہ نعمت کبریٰ ہے جس کی بدولت کائنات اور حیات انسانی دونوں میں مقصد اور مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی عشق زندگی کو با مقصد بنا دیتا ہے۔ اگر انسان مسلک عشق اختیار نہ کرے تو ساری عمر سرگردان رہے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنا مقصد حیات متعین نہ کر سکے گا اور جب مقصد ہی کا تعین نہ ہو سکا تو اس کے حصول کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لیے اقبال نے یہ بصیرت افروز شعر کہا ہے:-

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق ❊ عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

(۵) اس شعر میں بھی عشق ہی کی عظمت اور برتری کو واضح کیا ہے کہتے ہیں کہ تو عشق کو اپنا رہنما بنائے، اس کے بعد جو جی میں آئے کر، تیرا کوئی عقل تجھے نقصان

نہیں پہنچا سکے گا یعنی پھر تجھ سے کوئی ایسا عمل سرزد ہی نہیں ہو سکے گا جو تجھے منزلِ مقصود (اصلاحِ باطن) سے غافل کر دے کیونکہ عشق تو اصلِ حیات ہے اور اس لیے شور و ہوش (اور عقل و فرہنگ) دونوں کی جان ہے یعنی جب تو مسلکِ عشق پر گامزن ہو جائے گا تو ہوش اور فرہنگ دونوں غلطی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

(۳) اے مخاطب! انسان (من و تو) کی منزلِ مقصود، آسمان سے بھی بلند تر ہے یعنی تیرا مقصدِ حیات، مادی نہیں ہے بلکہ کائنات (مادہ) کی تسخیر ہے اس مقصد کی عظمت (بلندی) کو شاعر نے یوں واضح کیا ہے کہ انسان کا مقصدِ حیات اس قدر بلند ہے کہ آفتاب، جو زمین سے نو کروڑ میل دور ہے وہ بھی "میل فرسنگ" ہے۔

(۴) اس شعر کے پہلے مصرع میں اجمال ہے بیشک اس کی صراحت نہ ہو مطلب واضح نہیں ہو سکتا کہتے ہیں کہ اے انسان (قطرہ) تو یہ چاہتا ہے کہ خدا کی ذات (بحر) میں شامل ہو کر خدا بن جاؤں۔ تیری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی (اسی لیے اقبال نے انسان کو "محال اندیش" سے تعبیر کیا ہے) جب تو سمندر میں شامل ہو جائے گا تو تیری ہستی تو فنا ہو جائے گی، تو باقی کہاں رہے گا جو تیرے خدا بننے کا سوال پیدا ہو۔ (اسی لیے اس حالت کو "ز خود گذشتہ" سے تعبیر کیا ہے)

جب یہ صورت محال ہے تو پھر انسان کا نصب العین کیا ہے؟ اس کا جواب اقبال یہ دیتے ہیں کہ کمالِ انسان یہ نہیں ہے کہ قطرہ سمندر میں مل جائے یعنی انسان خدا کی ذات میں اپنی انفرادی ہستی کو گم کر دے۔ یہ تو کمال کے بجائے زوال ہے کمال یہ ہے کہ فرد (قطرہ) خدا (بحر) کی صفات اپنے اندر پیدا کرے یعنی سمندر میں داخل ہو کر موتی بن کر باہر نکلے۔ اگر فرد نے اپنے آپ کو فنا کر دیا تو پھر اس کی ہستی ہی ختم ہو گئی۔ اسی لیے انسان کا ذاتِ حق میں فنا ہو جانا اس کے لیے باعثِ فخر نہیں ہے بلکہ باعثِ ننگ ہے۔

اس شعر میں اقبال نے اپنا فلسفہ بیان کیا ہے جو یہ ہے کہ انسانی خودی کا کمال فنا میں نہیں ہے (جیسا کہ بعض مذاہب میں تعلیم دی گئی ہے) بلکہ بقا میں ہے اور اس کے لیے بقا ضروری ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی! ؎ ترا او بیند و او را تو بینی!

مشاہدہ کے لیے خودی کی بقا شرط ہے یعنی فرد کے لیے لازمی ہے کہ

وہ اپنی خودی کو برقرار رکھے چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:۔

خودی اندر خودی گنجد محال است ✽ خودی را عین خود بودن کمال است

مختصر یہ ہے کہ "وہ تجھے دیکھے اور تو اسے دیکھے" یہ ہے اقبال کی تعلیم کا خلاصہ اور ملاقات کے لیے دونوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ واضح ہو کہ اقبال کا یہ فلسفہ قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۔ (۱۸/۱۱۰)

پس جسے ہو امید ملنے کی اپنے رب سے، سو اس کو کرنا چاہیے عمل نیک اور نہ شریک ٹھہرائے عبادت میں اپنے رب کی کسی کو۔

(۸) اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے دنیا میں جس قدر چیزیں قیمتی ہیں مثلاً جواہرات (لعل و گہر) یہ سب اس لیے قیمتی ہیں کہ انسان نے ان کو قیمتی قرار دے دیا ہے ورنہ بذاتِ خود، لعلِ درخشندہ کوئی قیمت نہیں رکھتا، وہ تو محض ایک پتھر کا ٹکڑا ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ان پتھروں کے لیے اپنی خودی کو ذلیل نہ کرے۔ یہ ہے وہ نکتہ جو اس شعر سے مستفاد ہوتا ہے۔ اگر انسان اس نکتہ کو سمجھ جائے تو وہ لعل و گوہر یعنی دنیاوی دولت اور ساز و سامان کے لیے کبھی اپنی خودی کو اپنے ضمیر کو فروخت نہ کرے۔

صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من
آں سیلِ سبک سیرم، ہر بند گسستم من
در بود و نبودِ من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویدا شد، ایں نکتہ کہ ہستم من
در دیر نیازِ من، در کعبہ نمازِ من
زنار بدوشم من، تسبیح بدستم من
سرمایۂ دردِ تو، غارت نتواں کردن
اشکے کہ ز دل خیزد، در دیدہ شکستم من
فرزانہ بگفتارم، دیوانہ بکردارم
از بادۂ شوقِ تو ہشیارم و مستم من

(۱) اس شعر میں "من" سے مومن مراد ہے۔ بریں تقدیر شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ مومن صورت پرست نہیں ہوتا یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا ظاہری اور باطنی ہر قسم کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے وہ دنیا میں کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ اس کی شخصیت اس سیل بے پناہ کی طرح ہوتی ہے جو اپنے راستہ سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح مومن ان تمام مشکلات کو جو اعلائے کلمۃ الحق میں درپیش ہوتی ہیں، دور کرتا چلا جاتا ہے کوئی شے اس کو تبلیغ حق سے باز نہیں رکھ سکتی۔

(۲) اندیشہ سے عقل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل کی بدولت انسان کو اپنی ہستی کا یقین حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ عقل اگر ایک طرف ہستی کا اثبات کرتی ہے تو دوسری طرف وہی عقل انسان کے وجود میں شبہات بھی وارد کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے وجود کے متعلق شکوک میں مبتلا ہو جاتا ہے کبھی کہتا ہے کہ میں موجود ہوں کبھی کہتا ہے ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح نہ ہو اور میں جو کچھ سمجھتا ہوں وہ غلط ہو۔ لیکن عشق انسان کے اندر یقین کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ عقل انسان کو اکثر اوقات یہ سمجھاتی ہے کہ اگر تو میدان جنگ میں گیا تو ممکن ہے کہ مارا جائے اس لیے انسان عمل سے باز رہتا ہے اور جب وہ عمل نہیں کرتا تو اس کا وجود اور عدم دونوں یکساں ہو جاتے ہیں۔ لیکن عشق انسان کو جہاد پر آمادہ کرتا ہے اور انسان سربکف ہو کر میدان میں آجاتا ہے یعنی عمل سے انسان کو اپنے موجود ہونے کا یقین ہو جاتا ہے کیونکہ مردہ عمل (جہاد) نہیں کر سکتا۔

(۳) اس شعر میں "من" سے عاشق مراد ہے اور اس اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ عاشق ہر شے میں اور ہر مقام میں، خواہ دیر ہو یا حرم، خدا ہی کا جلوہ دیکھتا ہے اس لیے وہ دیر و حرم کے تمام امتیازات کو مٹا دیتا ہے اور اس کی نظر میں زنار اور تسبیح دونوں یکساں ہو جاتے ہیں۔

(۴) اس شعر میں تغزل کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ اے محبوب! کوئی شخص اپنے سرمایہ کو از خود تباہ نہیں کر سکتا۔ وہ اشک جو تیری محبت میں میری آنکھوں سے نکلتے ہیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں اس لیے میں ان کو زمین پر نہیں گرنے دیتا بلکہ جب وہ میری آنکھوں میں آجاتے ہیں تو میں انہیں پی جاتا ہوں کیونکہ اگر وہ زمین پر گر پڑیں گے

تو ضائع ہو جائیں گے۔ آنسو بذاتِ خود قیمتی نہیں لیکن وہ چونکہ تیری محبت میں نکلتے ہیں اس لیے میری نظر میں نہایت قیمتی ہیں، میرا سرمایۂ حیات ہیں۔

(۵) کہتے ہیں کہ تیری محبت نے میرے اندر دو متضاد کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ میں زبان سے کوئی بات عقل (شرع) کے خلاف نہیں کہتا کیونکہ مسلمان ہوں اور مسلمان زبان سے خلافِ شرع کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں تیری محبت میں سر بکف ہو کر میدان میں آجاتا ہوں، اور جان دینا عقل کے خلاف ہے یعنی دیوانگی ہے پس میں تیری محبت کی شراب پی کر ہشیار (فرزانہ) بھی ہوں اور مست (دیوانہ) بھی ہوں۔

ہوا سے فرودیں در گلستاں میخانہ می سازد
سبو از غنچہ می ریزد از گل پیمانہ می سازد
محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد
بہ طوفِ شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد
بہ سازِ زندگی سوزے بہ سوزِ زندگی سازے
چہ بیدردانہ می سوزد چہ بیبا کانہ می سازد!
تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می گیرد
چو شاہیں زادہ اندر قفس با دانہ می سازد
بگو اقبالؔ را اے باغباں رخت از چمن بندد
کہ ایں جادو نوا ما را ز گل بیگانہ می سازد

(۱) شعراء عجم غنچہ کو سبو (صراحی)، اور گل کو پیمانہ سے تشبیہ دیتے ہیں فرودیں یا فروردیں۔ ایران میں اس مہینہ کا نام ہے جو اپریل سے مطابقت رکھتا ہے یعنی موسم بہار شعر آسان ہے اور مطلب یہ ہے کہ موسم بہار میں گلستان کو دیکھو تو میخانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ غنچہ تو صراحی نظر آتا ہے اور گل پیمانہ معلوم ہوتا ہے یعنی باغ میں ہر طرف غنچے اور پھول نظر آتے ہیں اور ان کی شکل چونکہ صراحی اور پیالوں سے مشابہ ہے اس لیے شاعر نے گلستان کو میخانہ تصور کیا ہے۔

(۲) یہ بہت دلکش شعر ہے کہتے ہیں کہ جب محبت کامل ہو جاتی ہے تو رقابت کا احساس فنا ہو جاتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ پروانے چونکہ محبت میں کامل ہیں، اس لیے جب وہ کسی محبوب (شمع) کا طواف کرتے ہیں تو کوئی پروانہ کسی پروانے

سے جنگ و جدل میں رجوز قیبوں کا شیوہ ہے ا مصروف نہیں ہوتا بلکہ سب مل کر آشتی کے رنگ میں اپنے محبوب کا طواف کرتے ہیں، یعنی تمام پروانوں میں کامل اعتماد اور ہم آہنگی کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(۳) یہ شعر مشکل ہے اس لیے پہلے نثر لکھتا ہوں :-

بہ ساز زندگی سوز زندگی چہ پیدروا نمی سوزد ؛ بہ سوز زندگی، ساز زندگی چہ بیتیا بازمی سازد

اس کے بعد لفظوں کی تشریح کرتا ہوں :-

واضح ہو کہ اقبال کے یہاں سوز و ساز کی ترکیب بکثرت مستعمل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال شاعر حیات ہیں اور سوز و ساز، حیات کی دو اہم شانیں ہیں، اور عاشق کی زندگی انہی دو کیفیتوں کے مجموعہ کا نام ہے ۔ سوز (سوختن) سے مراد ہے محبت میں جلنا، تڑپنا، پگھلنا، سلگنا، ضبط کرنا۔ ساز (ساختن) سے مراد ہے محبت میں ہر اس حالت سے مطابقت اور موافقت پیدا کرنا جس سے مقصد میں کامیابی حاصل ہو سکے۔ عاشق کبھی فراق محبوب میں تڑپتا ہے یہ حالت سوز ہے۔ اور کبھی اس کے حصول کی غرض سے ناموافق حالات سے مطابقت پیدا کرتا ہے یعنی معشوق جس حال میں اُسے رکھتا ہے اس حال سے موافقت پیدا کرتا ہے اس پر جو مشکلات وارد ہوتی ہیں انھیں بخوشی برداشت کرتا ہے یہ حالت ساز ہے اور اس کی زندگی انہی حالت سوز و ساز میں بسر ہوتی ہے ۔

اقبال کہتے ہیں ساز زندگی کے ساتھ سوز زندگی وابستہ ہے اس لیے یہ سوز، ساز زندگی کے ساتھ ساتھ قائم رہتا ہے یعنی ساز کے ساتھ ساتھ عاشق میں سوز کی کیفیت بھی برقرار رہتی ہے۔ اور سوز زندگی کے ساتھ ساز زندگی پیوستہ ہے اس لیے یہ ساز، سوز زندگی کے ساتھ ساتھ قائم ہے یعنی عاشق میں سوز کے ساتھ ساز کی کیفیت بھی برقرار رہتی ہے ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں اس طرح باہمد گر پیوستہ ہیں کہ ان کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس لیے جب عاشق پر حالتِ سوز طاری ہوتی ہے اسی وقت اس میں حالت ساز بھی جلوہ فرما ہوتی ہے اور جب اس پر حالت ساز وارد ہوتی ہے اسی وقت اس میں کیفیت سوز بھی کار فرما نظر آتی ہے، وہ ہر وقت ان دونوں حالتوں کا حامل ہے بالفاظ دگر سوز میں ساز

کا رنگ نظر آتا ہے اور ساز میں سوز کا، اور یہی عاشق کی زندگی کا خلاصہ ہے۔

(۴) کہتے ہیں کہ جب شاہین قفس کی زندگی اختیار کر کے واقعہ سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ یعنی قید کی ذلت گوارا کر لیتا ہے تو وہ اس قدر بزدل ہو جاتا ہے کہ چکوروں کو دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب مرد مومن، غیر اللہ کی غلامی اختیار کر لیتا ہے تو اس میں اسقدر بزدلی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کافر کو دیکھ کر لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے یعنی جہاد نہیں کر سکتا۔

نوٹ:۔ جہاد فی سبیل اللہ تو بڑی چیز ہے پھر مسلمان محض اس خوف سے کلمۂ حق بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرا افسر مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور جب وہ ناراض ہو گیا تو نہ کوٹھی سلامت رہے گی نہ عہدہ باقی رہے گی۔ ۱۲

(۵) اے باغبان! اقبال کو باغ سے نکال دے کیونکہ یہ جادو نوا ہم کو گلوں سے بیگانگی کا درس دے رہا ہے۔ اگر یہ کافر باغ میں رہ گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم واقعی گلوں سے بیگانہ ہو جائیں گے اس شعر کا مطلب لکھنے کی ضرورت تو نہیں ہے مگر طلبہ کی خاطر لکھے دیتا ہوں کہ اس تعریض کے پردہ میں اقبال نے اپنے کلام کی تاثیر کا اثبات کیا ہے کہ اگر قوم میرے کلام کو سمجھ لے تو دنیا اور اس کی فانی لذتوں سے بیگانہ ہو کر اپنے مقصد حقیقی کے حصول کی طرف راغب ہو سکتی ہے "گل" سے دنیا کی وہ عارضی اور فانی لذتیں مراد ہیں جن کے طلسم میں پھنس کر انسان اپنے مقصد حیات سے غافل ہو جاتا ہے۔ شعر کا لطف اسی لفظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔

از ما بگو سلامے آں ترک تند خو را

کآتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

ایں نکتہ را شناسد آں دل کہ دردمند است

من گرچہ توبہ گفتم نشکستہ ام سبو را

اے بلبل از وفایش صد بار با تو گفتم

تو در کنار گیری باز ایں رمیدہ بو را

رمز حیات جوئی جز در تپش نیابی

در قلزم آرمیدن ننگ است آب جو را

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیافریدی آزارِ جستجو را
گفتی مجو وصالم بالاتر از خیالم
عذرِ تو آفریدی اشکِ بہانہ جو را
از نالہ بر گلستاں آشوبِ محشر آور
تا دم بسینہ پیچد گلزار ہائے و ہو را

(۱) تُرکِ تندخو، کنایہ ہے معشوق سے۔ فارسی شاعری میں معشوق کو ایک سفاک، غضبناک، ظالم، جفاکار، خون ریز اور تندخو انسان تصور کیا جاتا ہے شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے معمولی رنگِ تغزل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے قاصد! میرے محبوب سے سلام کے بعد یہ کہنا کہ تیری ایک نگاہِ ناز نے میری تمام آرزوؤں میں ہیجان برپا کر دیا یعنی آتشِ اشتیاق کو اور بھی تیز کر دیا۔

(۲) کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے محتسب کے حکم تعمیل میں شراب سے توبہ کر لی ہے لیکن سبو نہیں توڑا ہے میرے اس طرزِ عمل میں جو نکتہ پوشیدہ ہے اس کی قدر وہی کر سکتا ہے جو خود بھی دردمند یعنی عاشق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ناصح کے کہنے سے میں نے بظاہر اپنے محبوب سے قطع تعلق کر لیا ہے لیکن اس کی محبت ہنوز میرے دل میں پوشیدہ ہے۔ جس وقت ان ناصحین سے نجات حاصل ہو جائے گی پھر اس کی محبت میں سرگرم ہو جاؤں گا۔

(۳) رمیدہ بو کنایہ ہے گل سے کیونکہ اس کی بو عارضی ہوتی ہے بہت جلد نکل جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اے بلبل! میں نے بارہا تجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ گلوں کا حسن پائیدار نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تو پھر اسے گلے لگا رہی ہے یعنی اس سے محبت کا اظہار کر رہی ہے۔ یہاں بلبل سے حضرتِ انسان مراد ہے۔ اور گل سے دنیا (عورت، دولت، حکومت) مراد ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تینوں چیزیں رو بزوال اور ناپائیدار اور فریبِ نظر ہیں اس کے باوجود ہر شخص ان کے حصول میں منہمک ہے۔

(۴) اے مخاطب! کیا تو حیات کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنی چاہتا

ہے یعنی زندگی نام ہے مسلسل تڑپتے رہنے کا اور اسی طرح اپنی انفرادیت (شخصیت) کو برقرار رکھنے کا۔ خودی (ایگو) کے لیے یہ بات تو باعث ننگ ہے (موجب توہین ہے) کہ وہ اپنی ہستی کو خدا (قلزم) کی ہستی میں مدغم کر دے قبل ازیں صراحت کر چکا ہوں کہ یہ اقبال کا مخصوص فلسفہ ہے جس کی تبلیغ انہوں نے اپنی تمام تصانیف میں کی ہے۔ ان غزلیات میں بھی قبل ازیں اس نکتہ کو واضح کر چکا ہوں اس لیے اس جگہ اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ع

چیست حیات دوام! سوختن ناتمام

(۵) کہتے ہیں کہ اے خدا! میں خوش ہوں کہ تو نے اپنے عاشقوں کو سوز دوام (سوختن ناتمام) کی نعمت عطا فرمائی ہے اور اسی غرض سے تو نے جستجو کے آزار کا کوئی علاج (درماں) پیدا نہیں کیا۔ یعنی خدا کے عشاق ساری عمر اس کی جستجو کرتے ہیں لیکن اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خدا انسان کی دسترس سے بالاتر ہے۔ اور اس کا نتیجہ، سوز دوام ہے۔

(۶) اے محبوب! تو نے جو یہ کہا کہ "میرا وصل ناممکن ہے کیونکہ میں تو تیرے تصور سے بھی بالاتر ہوں" تیرے اس قول نے میرے اشکوں کو از سر نو رواں ہو جانے کے لیے ایک نیا عذر مہیا کر دیا۔ یعنی اس خیال سے میرے آنسو تھم گئے تھے کہ شاید کبھی تیرا وصل میسر ہو جائے لیکن جب تو نے یہ کہا کہ میرا وصل ناممکن ہے تو میرے آنسو پھر بہنے لگے۔

(۷) اے مخاطب! جب تک دم میں دم باقی ہے اظہار عاشقی کئے جا اور مسلسل آہ و نالہ سے گلستان میں محشر کا ہنگامہ برپا کر دے یعنی اے مسلمان! جب تک تو اس دنیا میں زندہ ہے تیرا فرض یہ ہے کہ حق و صداقت کا اعلان کرتا رہے۔

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابان جنوں بردی و رسوا ساختی
جرم ما از دانۂ تقصیر او از سجدۂ
نے بآں بیچارہ می سازی نہ با ما ساختی

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل
یک جہان و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

پرتوِ حسنِ تو می افتد بروں مانندِ رنگ
صورتِ مے پردہ از دیوارِ مینا ساختی

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی!

(۱) اے خدا! تو نے اپنے عاشقوں کو ساری دنیا میں رسوا کیا ہے۔ ہر شخص (خار) ہماری داستانِ عشق سے آگاہ ہے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے عاشق ہوتے ہیں دنیا میں ان کو عموماً مصائب دشواریاں اور ناکامیاں درپیش ہوتی ہیں۔ چونکہ وہ عیاری، مکاری، خوشامد، ضمیر فروشی اور خیانت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اس لیے ان کے پاس دولت، ثروت اور وجاہت دنیوی نہیں ہوتی۔ بدیں وجہ دنیا کے طالب انہیں ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ مطلب ہے "رسوا ساختی" کا۔ اللہ والوں کو دنیا والوں نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا ہے اور قیامت تک یہی صورت قائم رہے گی۔

(۲) اس شعر میں شوخی کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ اے خدا! تیرا طرزِ عمل ہم محدود العقل انسانوں کی سمجھ سے تو بالکل بالاتر ہے۔ تو نے آدم کو اس بنا پر جنت سے نکال دیا کہ اس نے گندم کا دانہ کھا لیا تھا اور ابلیس کو اس لیے راندۂ درگاہ کر دیا کہ اس نے تجھے سجدہ نہیں کیا۔ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ تو نے نہ اس سے موافقت کی نہ ہم سے۔

اس شعر میں اقبال نے حقیقت کو افسانے کے رنگ میں پیش کیا ہے تاکہ دلکشی کا رنگ پیدا ہو سکے اور یہی ایک شاعر کے فن (آرٹ) کا کمال ہے۔

(۳) اس شعر میں بھی شوخی کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے صرف ایک ہی دنیا بنائی، اور وہ بھی ایسی ہے کہ اس میں ہر روز بلکہ ہر لمحہ لاکھوں عاشقوں کی تمناؤں کا خون ہوتا رہتا ہے۔ یعنی تیری یہ دنیا تلخیوں سے معمور ہے۔ لیکن ہم، تیرے عاجز بندے، ہر روز ایک نئی دنیا پیدا کرتے رہتے ہیں جو ہمارے تصور کی کشت سے پھول کی طرح اگتی رہتی ہے۔ یہ ایک شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ عاشق کی قوتِ متخیلہ اس قدر

زبردست ہوتی ہے کہ وہ جب چاہے ایک دنیا پیدا کر دے۔ چنانچہ وہ ہر وقت خیالی دنیائیں پیدا کرتا رہتا ہے اور انہی میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔

علامہ مرحوم نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا کہ "عاشق، شاعر اور پاگل یہ تینوں بظاہر تمہاری دنیا میں رہتے ہیں۔ لیکن دراصل اپنی دنیا میں رہتے ہیں جو تمہاری دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔"

(۴) اے خدا! اگرچہ تو نے اپنے آپ کو مخلوقات کے پردہ میں پوشیدہ کر لیا ہے۔ اس کے باوجود تیرا حسن ان پردوں میں سے اسی طرح چھن چھن کر باہر نکل رہا ہے جس طرح شراب کا رنگ بوتل کی دیوار سے نمایاں ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدا ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا لیکن اس کے جمال کا پرتو ہر شئے سے نمایاں ہے۔ یعنی ہر شئے مظہر ذاتِ باری ہے اور یہی اس شعر کا بنیادی تصور ہے جسے اقبال نے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

(۵) شوخی کے رنگ میں اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ آپ نے یہ دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں آج کے بعد کل اور کل کے بعد پھر کل آتا ہے اور ہر کل پہلے کل کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس یکسانیت سے ہم پر حیرت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور حیرت سے لطفِ زندگی باقی نہیں رہتا ہم چونکہ جدت پسند ہیں، اس لیے آپ سے دست بستہ التماس ہے کہ کوئی نئی دنیا پیدا کیجیے۔ اس دنیا سے تو دل بالکل سیر ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان بالطبع جدت پسند واقع ہوا ہے۔ اقبال نے شاعرانہ انداز میں انسانی فطرت کے اسی پہلو کو واضح کیا ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ انسان کو یکساں حالت پسند نہیں ہے۔

خوش آنکہ رختِ خرد را بہ شعلۂ مے سوخت
مثالِ لالہ متاعے ز آتشے اندوخت

تو ہم ز ساغرِ مے چہرہ را گلستاں کن
بہار خندہ فروشی بصوفیاں آموخت

دلم تپید ز محرومیٔ فقیہِ حرم
کہ پیرِ میکدہ جامے بعشوۂ نفروخت

مسنج قدرِ سرود از نوائے بے اثرم
ز برقِ نغمہ تواں حاصلِ سکندر سوخت

صبا بہ گلشنِ ویمر سلامِ ما برساں
کہ چشمِ نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

(۱) مبارک ہے وہ انسان جو اپنی عقل کو عشق کی آگ میں جلا دے (یعنی عقل کے بجائے عشق کی پیروی کرے) اور اسی آتشِ عشق کو اپنا سرمایۂ حیات بنائے یعنی عاشقانہ زندگی اختیار کرے۔

(۲) اے مخاطب اجبار کی تاثیر سے صوفیوں (زاہدوں) نے بھی اپنا خرقہ فروخت کر دیا۔ تاکہ ان دام سے شراب خرید کر پی سکیں۔ اس لیے جب زاہدوں نے تو بہ توڑ دی تو اے مخاطب تو بھی شراب پی کر اپنے چہرہ پر سرخی پیدا کرے۔

(۳) فقیہ حرم کی بدنصیبی پر میرا دل کڑھتا ہے کہ میکدہ (خانقاہ) میں اس کے فتووں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ پیر میکدہ (شیخ خانقاہ) نے فتوے کے عوض فقیہ کو ایک جام بھی نہیں دیا۔ مطلب یہ ہے۔ خانقاہ میں یا اربابِ طریقت کی نظر میں فقہا کے فتاویٰ کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ عموماً اربابِ حکومت اور اصحابِ اقتدار کو خوش کرنے کے لیے اور ان سے دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لیے، ان کی آرزو کے مطابق فتویٰ دے دیتے ہیں۔ مثالیں درکار ہوں تو مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کر لیا جائے۔

(۴) اے مخاطب! یہ سچ ہے کہ میری آہ و فریاد (نوا) بے اثر ہے لیکن تو اس سے نغمہ (عشق) کی قیمت کا اندازہ مت کر یعنی میری نوا بے اثر ہے تو کیا؟ عشق بذاتِ خود بہت قیمتی شے ہے۔ دوسرے مصرع میں اسی حقیقت کو شاعرانہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ برقِ نغمہ تو وہ بڑی بلا ہے کہ حاصلِ سکندر کو بھی جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ یعنی عشق کے سامنے سکندر کی عظیم الشان سلطنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۵) اے صبا! جب تو گلشنِ ویمر میں جائے تو گوئٹے کی روح سے میرا بہت بہت سلام کہدینا کیونکہ اس کے کلام (خاکِ آں دیار) نے نکتہ ورانِ عالم کی آنکھوں میں روشنی پیدا کر دی یعنی ان کے دل و دماغ کو منور کر دیا۔

اس شعر میں اقبال نے گوئٹے کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ گوئٹے کا شمار، اقبال کی طرح، شعرائے عالم میں ہے یوں تو اس کی تصانیف بہت سی ہیں لیکن فاؤسٹ اس کا شاہکار ہے اور اس کی شہرت کا اسی کتاب پر دارومدار ہے۔

اس کتاب کے متعلق علامہ اقبال کی رائے یہ ہے کہ "اس کتاب میں گوئٹے نے حکیم فاوسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرایہ میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں۔ یعنی واضح کئے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن، خیال میں نہیں آسکتا۔"

گوئٹے سنہ ۱۷۴۹ء میں بمقام فرانکفرٹ (جرمنی) پیدا ہوا تھا۔ سنہ ۱۷۷۵ء میں ویمر کے نواب کی دعوت پر اُس نے اس شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا۔ طویل عرصہ تک عاشقانہ زندگی بسر کرنے کے بعد آخرکار سنہ ۱۸۰۶ء میں جبکہ اس کی عمر ۵۷ سال کی ہو چکی تھی اُس نے شادی کی قیود گوارا کیں۔

گوئٹے نے اپنی غیر فانی تصنیف فاوسٹ کی ابتدا سنہ ۱۷۷۰ء کے قریب کی تھی اور سنہ ۱۸۳۰ء میں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُس عرصہ میں دوسری تصانیف (دیوان، ڈراموں، غزلوں اور نظموں کے لکھنے) میں مشغول رہا۔ گوئٹے کا فلسفہ دو لفظوں میں قلمبند کیا جا سکتا ہے :-

(۱) ترکِ علائقِ دنیوی (۲) اختیارِ شیوۂ تسلیم۔ گوئٹے کا عقیدہ جسے اُس نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے، یہ تھا کہ "حریتِ نفس اور لذتِ وجود صرف وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو ہر روز ان دونوں کو از سرِ نو فتح کر سکے" یعنی صرف وہی شخص مرتے وقت یہ کہہ سکتا ہے کہ میں آزادی اور زندگی سے متمتع ہو سکا۔ دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ گوئٹے نے سنہ ۱۸۳۲ء میں وفات پائی اور ویمر میں مدفون ہوا۔

بیار بادہ کہ گردوں بکامِ ما گردید
مثالِ غنچہ نوا از شاخسار دمید
خورم بیادِ تُنک نوشیِ امامِ حرم
کہ جز بصحبتِ یارانِ رازداں نچشید
فزوں قبیلۂ آں پختہ کار باد کہ گفت
چراغِ راہِ حیات است جلوۂ امید
نوا ز حوصلۂ دوستاں بلند تر است
غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچکس نشنید

عیارِ معرفتِ مستی است عقبیٰ من
خوشم از آنکہ متاعِ مرا کسے نخرید
زشعرِ دلکشِ اقبالؔ می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ میداد و عاشقی ورزید

(۱) اے مخاطب! موسمِ بہار میں شاخوں سے نغمے پھوٹ رہے ہیں یعنی ہر طرف مستی کا عالم چھایا ہوا ہے۔ شراب پی، کیونکہ اس وقت آسمان ہماری مرضی کے مطابق حرکت کر رہا ہے۔ یعنی زمانہ ہم پر مہربان ہے۔ لہٰذا اس موقع کو غنیمت سمجھ اور کچھ لطفِ زندگی حاصل کر لے۔

(۲) مجھے امامِ حرم (رقامی مفتی وغیرہ) کی محرومی اور بدقسمتی پر افسوس آتا ہے کہ یہ حضرات اگر کبھی پیتے بھی ہیں تو چوری چھپے اور وہ بھی اپنے چند رازداروں کے ساتھ۔ بھلا اس طرح پینے میں انہیں کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے؟ مے نوشی کا مزہ تو اسی میں ہے کہ علانیہ پی جائے اور میخانہ میں پی جائے سینکڑوں کے مجمع میں پی جائے اس شعر میں فقیہہ یا امام پر طنز کی ہے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔

(۳) خدا کرے اُس مرشدِ کامل (پختہ کار) کے پیروؤں (قبیلہ) کی تعداد میں دن دُونی رات چوگنی ترقی ہو (اللہ اُس کے سلسلہ کو ساری دُنیا میں پھیلا دے) جس نے اپنے مریدوں کو یہ تعلیم دی کہ امید، چراغِ راہِ حیات ہے۔ یعنی سالکِ راہ کو کتنی ہی مشکلات کیوں نہ درپیش ہوں، ہمیشہ رحمتِ باری تعالیٰ کے نزول کا اُمیدوار رہنا چاہیئے۔ چنانچہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:-

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔

یعنی اے مسلمانو! اللہ کی رحمت سے کبھی نا امید نہ ہونا۔

(۴) چونکہ میرا کلام (پیغام) مسلمانوں کے حوصلہ سے فزوں تر ہے، اس لیے میں ایسی جگہ جا کر پیغام سناتا ہوں جہاں کوئی نہ سُن سکے۔ یہ طنزیہ اندازِ بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ کوئی مسلمان میرے کلام کو نہیں پڑھتا اور چونکہ کوئی پڑھتا نہیں، اس لیے اس پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1]

---

[1] اقبال کے کلام سے ان کی قوم نے جس مجرمانہ غفلت اور بے اعتنائی کا ثبوت دیا۔ اسی کو دیکھ کر اقبال نے یہ شعر لکھا تھا ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تُو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

(۵) اس شعر میں بھی لطیف قسم کا طنز پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ جنسِ سخن (کلام) مشتری (خریدار) کی علمی قابلیت (ذہنی ارتقاع) کا معیار ہوتا ہے یعنی اقبالؔ جیسے بلند پایہ پیغام گو شاعر کا کلام صرف ایک علم دوست انسان (جس کی ذہنیت بہت بلند ہو اور دل و دماغ علوم و فنون کی روشنی سے منور ہوں) پسند کر سکتا ہے۔ چونکہ مسلمان ان صفات سے یکسر محروم ہیں، اس لیے اقبال دوسرے مصرع میں اظہار مسرت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرا کلام کسی نے نہیں خریدا۔ کیونکہ اگر کوئی شخص خرید لیتا تو دوسرے ہی دن اُسے کسی نالی میں ڈال دیتا[1]

(۶) اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اُس نے فلسفی ہونے کے باوجود مسلکِ عشق اختیار کر لیا۔ مطلب یہ ہے کہ فلسفہ انسان کو تسلی اور طمانیت عطا نہیں کر سکتا، اس لیے ہر وہ فلسفی جو فطرت کی طرف سے ذوقِ سلیم لے کر آیا ہے انجامکار مسلکِ عشق اختیار کر لیتا ہے۔

نوٹ:۔ اس شعر سے اقبال کی دو شانیں واضح ہو گئیں۔ یعنی وہ فلسفی بھی ہیں اور شاعر بھی۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز ایں نگر کہ شعلہ در گیرم آرزوست

---

[1] اقبال نے یہ بات ۱۹۲۳ء میں لکھی تھی اور اب ۱۹۵۳ء ہے لیکن تیس سال گزر جانے کے بعد بھی اقبال کی قوم، ناول اور افسانوں کی سطح سے بلند نہیں ہوئی ہے۔ ممکن تھا کہ پچاس ساٹھ سال کے بعد کلام اقبال کی طرف متوجہ ہو جاتی لیکن اب وہ معموں کے حل کرنے میں ایسی منہمک ہو گئی ہے کہ اقبال کی تو ہستی ہی کیا ہے فی الحال تو وہ خالقِ ہستی کی طرف بھی متوجہ ہونے کیلئے تیار نہیں ہے۔ ۱۲

گفتند لب ببند و ز اسرارِ ما مگو
گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزوست
گفتند ہر چہ در دلت آید ز ما بخواہ
گفتم کہ بے حجابیِ تقدیرم آرزوست
از روزگارِ خویش ندانم جز ایں قدر
خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزوست!
کو آں نگاہِ ناز کہ اوّل دلم ربود
عمرت دراز باد ہماں تیرم آرزوست

(۱) اے مخاطب! میں مسلمان ہوں اس لیے میری آرزو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کروں اور تیر و سنان و خنجر و شمشیر کے زخم اپنے جسم پر کھاؤں۔ اگر تو دُنیا کا طالب ہے تو میری ہم نشینی مت کر کیونکہ میں تو مسلکِ شبیرؓ پر عامل ہونا چاہتا ہوں۔ یعنی خدا کی راہ میں اپنا سر کٹانا چاہتا ہوں۔

(۲) میں آشیانہ بنانے کے لیے تنکے جمع کر رہا ہوں، اس کے باوجود میں ایسے شعلہ کا بھی آرزو مند ہوں جو میرے آشیانہ کو جلا کر خاک کر دے۔ یعنی اگرچہ میں دُنیا میں رہتا ہوں اور جائز طریقوں سے دولت بھی جمع کرتا ہوں، لیکن میں اپنی جان اور اپنا مال دونوں خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ کیونکہ عاشقِ صادق کا مقصود دُنیا نہیں ہوتا۔

(۳) بہت بلند پایہ شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوبِ حقیقی نے مجھ سے یہ کہا کہ میرا راز کسی پر فاش مت کرنا۔ میں نے جواب میں یہ کہا کہ بہت خوب! میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ لیکن اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ نعرۂ تکبیر بلند کر دوں۔ یعنی اہلِ دُنیا کو یہ سنا دوں کہ اللہ اکبر یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ اللہ (محبوب) کے تمام اسرار اسی نعرۂ تکبیر میں پوشیدہ ہیں اور ایک مسلمان جب اللہ اکبر کہتا ہے تو بالفاظِ دگر وہ ان تمام اسرار کو فاش کر دیتا ہے۔

نوٹ:۔ مسلمان رات دن اللہ اکبر کہتے رہتے ہیں لیکن صرف زبان سے کہتے ہیں۔ اگر اس کے مفہوم سے آگاہ ہو جائیں تو دُنیا میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ انگریز کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

(۴) محبوب نے مجھ سے کہا کہ تم جو مانگو گے وہ ہم تمہیں عطا کر دیں گے۔ مانگو کیا مانگتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں اپنی تقدیر کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہوں یعنی اپنے حقیقی مقام سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔

واضح ہو کہ مقام سے آگاہی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے اور مسلمان کا حقیقی مقام یہ ہے کہ وہ عبدہٗ بن جائے یعنی مقام عبدیت پر فائز ہو جائے۔ اور اس سے بلند تر اور کوئی مقام نہیں ہے اور یہ مقام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ اقبال نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ عبدیت سے بلند تر اور کوئی مقام نہیں ہے اس لیے ہر مسلمان کو اسی کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی مضمون کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:-

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں کہ میری انتہا کیا ہے

(۵) اس شعر میں اقبال نے دراصل انسان کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی خدا کی یاد سے غافل ہو کر بسر کر دیتا ہے اور جب دُنیا سے رخصت ہونے لگتا ہے تو کفِ افسوس ملتا ہے۔ اس نکتہ کو انہوں نے شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ میں جب اپنی زندگی پر غور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی ایک خواب تھی جس کا نقش تو ذہن سے محو ہو چکا ہے یعنی میں بھول گیا کہ کیا خواب دیکھا تھا۔ لیکن اب اس کی تعبیر کی آرزو ہے۔ یعنی اب صرف یہ خیال دامنگیر ہے کہ دیکھئے بعد وفات کیا صورت پیش آتی ہے۔ اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے:-

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو شخص اپنی زندگی غفلت میں بسر کرتا ہے، یعنی جیتے جی اللہ تعالیٰ سے رابطہ پیدا نہیں کرتا اُسے مرتے وقت یہی محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی خواب سے زیادہ نہیں تھی۔ جس طرح خواب دیکھنے کے بعد

آنکھ کھل جاتی ہے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح غافل انسان بھی اس دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے۔ کوئی نیکی اس کے ساتھ نہیں جاتی۔

(۴) اس شعر میں رنگِ تغزل پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! جب تو نے پہلی مرتبہ میری طرف نگاہِ ناز سے دیکھا تھا تو میں نے اپنا دل تیرے قدموں پر نثار کر دیا تھا اور اس نگاہِ ناز کی لذت ابھی تک میرے دل میں باقی ہے۔ اس لیے میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو وہی تیر پھر میرے سینہ کے پار کر دے۔

دانۂ سبحہ بہ زنار کشیدن آموز
گر نگاہِ تو دوبین است ندیدن آموز
پا ز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم
با نسیمِ سحر آمیز و وزیدن آموز
آفریدند اگر شبنمِ بے مایہ ترا
خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خار گلِ تازہ رسے ساختہ اند
پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابانِ تو برکند ترا
صفتِ سبزہ دگر بارہ دمیدن آموز
تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیروں
عزلتِ خم کدہ و جوشِ رسیدن آموز
تا کجا در تہِ بالِ دگراں می باشی
در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز
درِ بتخانہ زدم، مغبچگانم گفتند
آتشے در حرم افروز و تپیدن آموز

(۱) کہتے ہیں کہ اگر تو عاشقِ صادق ہے تو دیر و حرم میں امتیاز کرنا چھوڑ دے یعنی تسبیح کے دانوں کو زنار میں پرو دے۔ اور اگر تو دیر و حرم میں امتیاز کرتا ہے اگر تیری نگاہ دوربین ہے، تو ثابت ہوا کہ تو عاشقِ صادق نہیں ہے۔ لہٰذا کوشش کر کہ دیر و حرم تجھے دو نظر نہ آئیں۔ "ندیدن آموز" بہت دلکش ترکیب ہے۔ اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ "نہ دیکھنا سیکھ" یعنی آنکھ بند کر لے لیکن مرادی معنی یہ ہیں کہ دیر و حرم کو دُو نہ دیکھنا سیکھ یعنی ان دونوں کو ایک سمجھ۔

(۲) اے مخاطب! غنچہ کے خلوت کدے سے خوشبو کی طرح باہر نکل اور نسیم سحر سے پیوستہ ہو کر دُنیا کو معطر کر دے یعنی اے مسلمان! تو اپنے حجرے سے باہر نکل اور اسلام کے پیغام سے دُنیا کو منور کر دے۔ مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اہل عالم کو فائدہ پہنچائے اور اسلام سے بڑھ کر دُنیا کے حق میں فائدہ رساں اور کوئی چیز نہیں ہے۔

(۳) اگر خدا نے تجھے دولت مند نہیں بنایا تو کیا ہوا؟ تو اپنی بے مائگی کے باوجود دُنیا کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ اگر تو دوسروں کو دولت نہیں دے سکتا تو غمزدوں کی دلداری تو کر سکتا ہے۔ شبنم سے سبق حاصل کر! وہ بے مایہ ہے لیکن لالہ کے داغ جگر کو ٹھنڈک تو پہنچا دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں غریب سے غریب آدمی بھی اپنی بساط کے مطابق دوسروں کی خدمت کر سکتا ہے اور یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ ؎ طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

(۴) اگر فطرت نے تجھے گل کے بجائے خار بنایا ہے تو تجھے لازم ہے کہ رنج و ملال کو اپنے دل میں جگہ نہ دے بلکہ اپنی حد میں رہ کر چمن کے قانون کی پابندی کر یعنی گل کی حفاظت کر جیسے فطرت نے اسی لیے پیدا کیا ہے اور اگر تو قانونِ فطرت کی پابندی کرے گا تو فطرت کی نگاہ میں تیرا مرتبہ گل سے کم نہیں ہوگا۔
اقبال نے اس شعر میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان خواہ کسی حالت میں ہو امیر ہو یا غریب، اُسے اپنا پورا فرض ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ قیامت کے دن خدا کسی غریب آدمی سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ تو نے حج کیوں نہیں کیا؟ قوم کی مالی امداد کیوں نہیں کی؟ یہ سوالات تو دولتمندوں سے ہوں گے۔ ہر شخص سے اس کے مرتبہ کے مطابق بازپرس ہوگی کہ ہم نے جس حال میں تم کو پیدا کیا تھا تم نے اس حال میں رہ کر ہمارے قوانین کی کس حد تک اطاعت کی؟

(۵) باغبان اگر تجھے تیری کیاری سے اکھاڑ کر باہر پھینک دے تو تجھے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو سبزہ کی طرح پھر زمین سے اُگ! سبزہ کو لوگ رات دن پامال کرتے رہتے ہیں لیکن وہ جس قدر پامال ہوتا ہے اُسی قدر دوبارہ اُگتا ہے۔ اسی طرح اگر حوادث روزگار تجھے ناکام کر دیں تو مایوس مت ہو۔ پھر کامیابی کے لیے کوشش کر اور یاد رکھ کہ جو شخص کوشش

کرتا رہتا ہے وہ انجام کار ضرور کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے ہم کو سعیٔ پیہم کا درس دیا ہے۔

(۶) رسیدن یعنی پختہ ہوجانا۔ کہتے ہیں کہ شراب وہی قیمتی ہوتی ہے جو مدتوں مٹکے میں پڑی رہے اور پختہ ہوتی رہے۔ اسی طرح اے انسان تو بھی کسی مرشد کامل کی صحبت (خانقاہ) میں رہ کر اپنے اندر پختگی پیدا کرے تاکہ تو دنیا میں قدر و منزلت حاصل کر سکے جس طرح کچی شراب کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اسی طرح اس شخص کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی جسکی سیرت خام ہو۔ اور سیرت میں پختگی عزلت یعنی صحبتِ مرشد سے پیدا ہو سکتی ہے۔

نوٹ:۔ روحانی ترقی کے لیے عزلت (خلوت) کی زندگی اشد ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جسقدر مذہبی پیشوا گزرے ہیں سب نے مدتوں خلوت کی زندگی بسر کی ہے۔

(۷) اے انسان تو کب تک دوسروں کی غلامی کرتا رہے گا اگر تو روحانی ترقی حاصل کرنی چاہتا ہے یا اگر تو اپنی خودی کو پختہ کرنا چاہتا ہے تو آزادی کی فضا میں سانس لے۔ جو شخص انسانوں کا غلام ہوتا ہے وہ کبھی بھی خدا کا بندہ نہیں بن سکتا کیونکہ ایک غلام بیک وقت دو آقاؤں کو کبھی ہرگز خوش نہیں رکھ سکتا پس اگر تو اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے تو انسانوں کی غلامی سے نجات حاصل کر۔

(۸) جب میں نے خانقاہ (بتخانہ) کے دروازے پر دستک دی یعنی جب میں نے مرشد کی صحبت اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو تربیت یافتہ حضرات (مغ بچگاں) نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ پہلے شریعت کی پابندی کر تاکہ تیرے اندر خدا کی اطاعت اور محبت کا رنگ پیدا ہو جائے اس کے بعد مرشد کی صحبت اختیار کرنا مفید ہوگا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری کا آرزومند ہوتا ہے تو ارباب یونیورسٹی اسے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ پہلے اس مضمون میں ایم۔ اے پاس کرو۔ پھر ڈاکٹریٹ کے لیے اجازت مل سکے گی۔

نوٹ:۔ تمام بزرگان دین کا طریقہ یہی رہا ہے کہ جو شخص ان کے پاس روحانیت میں کمال حاصل کرنے کیلئے آتا تھا پہلے اس کو شریعت کی پابندی کی تلقین کرتے تھے یعنی یہ کہتے تھے کہ پہلے علم دین پورے طور سے حاصل کرو پھر اس پر عمل کرو۔ اس کے بعد طریقت کے کوچہ میں قدم رکھنا۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک ایک شخص میٹرک پاس نہ کرے وہ کالج میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؟

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلی دگرے در خور تقاضا نیست
بملک جم ندہم مصرع نظیری را
"کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست"
اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نۂ و ز مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمیٰ نیست
نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست
بیا کہ غلغلہ در شہر دلبراں فگنیم
جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گرد صحرا نیست
ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورقِ ما روشناس دریا نیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت
بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش
حذر ز بیعتِ پیرے کہ مرد غوغا نیست
برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

(۱) اس شعر میں اقبال نے اپنا فلسفہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کی شخصیت (خاک) میں عشق کی آگ پوشیدہ کر دی ہے (آتشے کہ پیدا نیست) اور خودی کی تربیت اسی بات پر موقوف ہے کہ ہر شخص اپنی آتش پنہاں کو عریاں (آشکار) کرے اور پھر اسے شعلوں میں تبدیل کر دے۔ اس کے لیے صحبت مرشد ضروری ہے اور مرشد کا کام بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ اس چنگاری کو جو خاک کے نیچے دبی ہوتی ہے شعلہ میں تبدیل کر دیتا ہے جو شخص دوسروں سے آگ مانگتا ہے وہ اپنی خودی کی تربیت نہیں کر سکتا۔ آتشے کہ پیدا نیست یعنی وہ آگ جو ظاہر نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اے انسان اگر تو تجلی دیکھنا چاہتا ہے تو خود اپنی تجلی دیکھ، ارے نادان! یہ آتش تو خود تیرے اندر پنہاں ہے۔ دوسرے کی تجلی اس لائق نہیں ہے کہ اس کے دیکھنے کا تقاضا کیا جائے۔

(۲) اگر کوئی شخص مجھے جمشید کی سلطنت دے اور یہ کہے کہ اس صداقت کا انکار کرو جس کا اظہار نظیری نے اپنے مشہور مصرع میں کیا ہے تو میں اس بات کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوں گا۔ نظیری کے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی جان معشوق پر قربان نہیں کی اس کا شمار عاشقوں کے زمرہ (قبیلہ) میں نہیں ہو سکتا اقبال اس مصرع کو ملک جم سے بھی زیادہ قیمتی اس لیے سمجھتے ہیں کہ یہ مصرع ان کے فلسفہ کی بہترین طریق پر ترجمانی کرتا ہے وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ جو شخص اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان نہ کرے وہ مسلمانوں یعنی عاشقوں کی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ جو مسلمان عاشق رسول نہیں ہے وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔

(۳) کہتے ہیں کہ اگرچہ عقل بہت عیار ہے اور اس لیے عشق کو مغلوب کرنے کی غرض سے اس نے تمام منکرین خدا کی "مجلس اقوام" بنا کر عشق کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے لیکن اے مسلمان! تو رنجیدہ مت ہو، عشق تنہا نہیں ہے۔ ایک ہستی اس کے ساتھ بھی ہے جو ساری کائنات کی خالق ہے۔ اگر تو اس سے عہد وفا باندھے تو پھر تیری یعنی عشق کی کامیابی یقینی ہے۔

(۴) رہ یا راہ اور مقام ایرانی موسیقی میں دو راگنیوں کے نام ہیں۔ نغمہ سے دلکش تعلیمات مراد ہیں اور بربط سلیمٰی سے شریعت اسلامیہ مراد ہے۔ سلیمٰی ایک عربی حسینہ کا نام ہے۔ جیسے فارسی ادب میں عذرا اور ہندی ادب میں شکنتلا مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! تو حقیقت حال (راہ اور مقام) سے آگاہ نہیں ہے ورنہ وہ کونسی خوبی ہے جو اسلامی تعلیمات میں موجود نہیں ہے۔ راہ اور مقام چونکہ موسیقی کی اصطلاحیں ہیں اس لیے نغمہ اور بربط سے مناسبت کی بنا پر ان لفظوں میں شاعرانہ خوبی پیدا ہو گئی ہے جسے صنعت ایہام سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۵) نظر بخویش بستن یعنی مراقبہ یا مطالعۂ باطن کرنا جسے تصوف کی اصطلاح میں سیر انفسی کہتے ہیں۔ جلوۂ دوست جہاں گرفت یعنی کائنات کی ہر شے سے خدا کا ظہور ہو رہا ہے مطلب یہ ہے کہ میں سیر انفسی میں یعنی اپنی ذات کے مشاہدہ میں اس قدر منہمک اور اس درجہ مستغرق ہوں کہ سیر آفاقی کی فرصت نہیں ہے یعنی مجھے اپنے دل کی دنیا میں خدا کی قدرت کے اسقدر گوناگوں جلوے نظر آ رہے ہیں کہ ان سے نظر ہٹا کر آب و گل کی دنیا کی طرف توجہ کرنے کی فرصت یا رغبت ہی نہیں ہے۔ اس شعر میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ باطنی دنیا خارجی دنیا سے

بہت زیادہ دلکش ہے۔ ۱۲۰

(۶) اے مخاطب! عورتوں کے عاشق بیشک گریباں چاک کر کے جنگلوں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں لیکن جنون زندہ دلاں انکو صحرا نوردی کی طرف راغب نہیں کرتا یعنی خدا کے سچے عاشق رہبانیت اختیار نہیں کرتے بلکہ دنیا والوں کو اسلام کا پیغام سناتے ہیں اس لیے آؤ ہم سب مل کر دنیا میں کلمۂ حق بلند کریں۔

(۷) نہنگ کنایہ ہے نفس امارہ اور اس کی تحریکات سے۔ زورق بمعنی کشتی۔ اقبال کہتے ہیں کہ سالک کا کمال یہ ہے کہ وہ ان دشمنوں کو مغلوب کرے جو اس کے نفس میں پوشیدہ ہیں اور وہ دشمن پانچ ہیں یعنی شہوت، غضب حرص و طمع، طلب لذائذ اور تکبر۔ انہی دشمنوں کو اقبال نے "نہنگاں" سے تعبیر کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک دشمن، سالک کو فنا کر دینے کیلئے کافی ہے اور نفس امارہ انہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قابل تحسین شخص وہ ہے جو نہنگوں کا مقابلہ کر سکے نہ کہ وہ جو ساحل دریا پر بیٹھا رہے۔

(۸) اس شعر میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ خودی مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے سے پختہ ہو سکتی ہے اس لیے قابل تحسین وہ سالک ہے جو اس راہ پر چلتا ہے جس میں قدم قدم پر مشکلات لاحق ہوں۔

(۹) مرد غوغا کنایہ ہے اس مرشد کامل سے جو اپنے مریدوں کے اندر انقلاب برپا کرنے یا باطل سے برسر پیکار رہنے کا جذبہ پیدا کر سکے۔ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ مومن جب تک زندہ رہتا ہے باطل سے برسر جنگ رہتا ہے، اور یہ جنگ ہمیشہ انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب تو عاشقوں (رندان بادہ پیما) کی جماعت میں شامل ہو کر جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لے۔ اس "پیر" کی صحبت سے اجتناب کر جو تیرے اندر جہاد کا داعیہ پیدا نہ کر سکے۔

(۱۰) کہتے ہیں کہ شاعرانہ آرٹ کا کمال یہ ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر (خیالات) کو صاف لفظوں میں بیان نہ کرے بلکہ اپنی عبارت میں ابہام کا رنگ پیدا کر دے تاکہ پڑھنے والا غور و فکر پر مجبور ہو جائے اور جب وہ مفہوم سمجھنے کے لیے کوشش کرے گا تو شاعر کی بات اس کے دل پر نقش جم جائے گی۔ علاوہ بریں ذہنی مسرت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب پڑھنے والا شاعر کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لیے جد و جہد کرے اور یہ بات اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب شعر میں ابہام یا

استعارہ یا کنایہ کا رنگ ہو اسی کو رمزیہ یا ایمائی شاعری کہتے ہیں اور جو شاعر زندگی کے اعلیٰ حقائق نظم کرتا ہے وہ علی العموم یہی انداز بیان اختیار کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری تمام تر رمزیہ اور ایمائی ہے، اور اسی انداز بیان میں ان کے کلام کا سارا لطف مضمر ہے۔ حدیث خلوتیاں یعنی عرفا کی گفتگو۔ خلوتی کنایہ ہے عارف کامل سے۔ اسے خلوتی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ عموماً خلوت میں رہتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کا کمال یہ ہے کہ بات کو واضح طریق پر یا صاف لفظوں میں بیان نہ کیا جائے دیکھو! عرفا کی گفتگو کا مفہوم ہمیشہ رمز و ایما کے پردوں میں پوشیدہ ہوتا ہے

موج را از سینۂ دریا گسستن می تواں
بحر بے پایاں بجوئے خویش بستن می تواں
از نوائے می تواں یک شہر دل در خوں نشاند
یک چمن گل از نسیمے سینہ خستن می تواں
می تواں جبریل را گنجشک دست آموز کرد
شہپرش با نخے آتش دیدہ بستن می تواں
اے سکندر سلطنت نازک تر از جام جم است
یک جہاں آئینہ از سنگے شکستن می تواں
گر بجو محکم شوی سیل بلا انگیز چیست
مثل گوہر در دل دریا نشستن می تواں
من فقیر بے نیازم مشربم این است و بس
مومیائی خواستن نتواں، شکستن می تواں

(۱) اس غزل کا یہ پہلا شعر رمزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ عرفا کی اصطلاح میں آبجو یا موج کنایہ ہے انائے مقید یا انسانی خودی سے اور دریا یا بحر کنایہ ہے انائے مطلق یا خدا سے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی رو سے موج اور بحر میں کوئی مغائرت نہیں ہے بلکہ عینیت کا رشتہ ہے یعنی موج، عین بحر ہے اور بحر عین موج ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مغائرت کے لیے دوئی شرط ہے اور ہمہ اوست کی رو سے دوسرا موجود ہی نہیں ہے۔ ع ایں وحدت است لیک بتکرار آمدہ

جب دوسرا وجود نہیں تو مغائرت (دوئی) کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اور جب مغائرت نہیں تو موج اور بحر عین یک دگر ہیں یعنی تعینات کے درجہ میں بحر کو موج سے

تعبیر کرتے ہیں اور اطلاق کے مرتبہ میں موج کو بحر کہہ سکتے ہیں مطلق جب اپنے آپ کو مقید کر دیتا ہے تو کثرت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اگر ان تعینات سے قطع نظر کر لی جائے تو صرف مطلق (واحد) باقی رہ جائے گا۔ مثلاً سمندر کی سطح پر ہزاروں لاکھوں موجیں رقصاں نظر آتی ہیں لیکن جب ان کا رقص ختم ہو جاتا ہے تو سطح آب پر کسی موج کا وجود نظر نہیں آتا صرف سمندر باقی رہ جاتا ہے۔ خلاق المعانی مرزا بیدل عظیم آبادی نے کیا خوب لکھا ہے:۔

از موج تواں شنیدن اسرار محیط ٭ در کام اگر کشد زبان خود را

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ باعتبار وجود، موج اور بحر یا دریا میں کوئی فرق نہیں ہے کوئی مغایرت نہیں ہے، کیونکہ اللہ کے علاوہ دوسرا تو موجود ہی نہیں ہے۔ (لا موجود الا اللہ) لیکن جب وہی ذات مطلق تعینات کے پردوں میں یا تقیدات کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے تو باعتبار ذات، مغایرت پیدا ہو جاتی ہے یعنی ہم مطلق اور مقید میں امتیاز کر سکتے ہیں یعنی خودی اور خدا میں مغایرت پیدا ہو جاتی ہے۔

اقبال نے پہلے مصرع میں جو یہ کہا ہے کہ موج (خودی) کو بحر (خدا) سے جدا کر سکتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ باعتبار وجود، موج کو سینۂ دریا سے (خودی کو خدا سے) جدا نہیں کر سکتے لیکن باعتبار ذات جدا کر سکتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہم نے مانا کہ اصل کے لحاظ سے خودی، خدا سے جدا نہیں ہے لیکن چونکہ خودی درجۂ تقید میں ہے اس لیے عقلاً اطلاق سے متمیز ہے یعنی ہم مقید کو مطلق سے جدا کر سکتے ہیں۔

خودی کا اثبات کرنے کے بعد دوسرے مصرع میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ موج (انسانی خودی) مسلکِ عشق اختیار کرے تو بحر بے پایاں (خدائے غیر محدود) کو اپنی آغوش میں لے سکتی ہے (با الفاظ دگر، سمندر (خدا) آبجو (خودی) میں سما سکتا ہے۔

واضح ہو کہ یہی اقبال کا بنیادی فلسفہ ہے، اسی کو عرفِ عام میں فلسفۂ خودی یا فلسفۂ فقر کہتے ہیں۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کی بنا پر ان کو مفکرینِ عالم کی صف میں جگہ ملی۔ یہی ان کا پیغام ہے۔ اور اسی پیغام یا فلسفہ کو انہوں نے سینکڑوں طریقوں سے اپنی تصانیف میں ادا کیا ہے۔ ان کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) خودی حق ہے۔ ؎ خودی را حق بداں باطل مپندار

(ب) یہ خودی خدا تو نہیں ہے مگر خدا سے جدا بھی نہیں ہے۔

کہ بحر از موج خود دیرینہ تر نیست

(ج) چونکہ اصل کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں اگر خودی کوشش کرے تو اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کر سکتی ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ آبجو (بظاہر مختصر ہے لیکن) بحر بے پایاں کو اپنے اندر سمو سکتی ہے یا سمندر، قطرہ میں سما سکتا ہے یا قطرہ خود سمندر بن سکتا ہے۔ خودی، خدا تو نہیں بن سکتی۔ لیکن خدائی صفات اپنے اندر ضرور پیدا کر سکتی ہے۔

(د) سمندر (خدا) کو اپنی آبجو میں بند کر لینے یا آبجو میں بحر بے پایاں کے خواص اور اس کی صفات پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ خودی مسلکِ عشق اختیار کرے۔

(ہ) چونکہ عاشقی ایک فن ہے اور دنیا میں کوئی فن، فنکار یا استاد یا ماہرِ فن کی صحبت اختیار کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے مرشد کی صحبت شرطِ اولین ہے۔

(و) چونکہ ذاتِ محمدی واسطہ ہے خالق اور مخلوق یا معبود اور عبد کے درمیان اس لیے حضورؐ سے نسبت حاصل کرنا اور اس نسبت کو درجہ کمال تک پہنچانا لازمی ہے۔ اسی کو عشقِ رسولؐ سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ اس کے بغیر کامیابی ناممکن ہے اسی لیے اقبال نے مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دیا ہے۔

(ز) فنافی الرسولؐ ہو کر خودی میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

پنجۂ او پنجۂ حق می شود ✽ ماہ از انگشتِ او شق می شود

ٹھیک جس طرح آگ میں فنا ہو کر لوہے میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح ذاتِ رسولؐ میں فنا ہو کر سالک میں خدائی صفات جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔

(ح) فنافی الرسولؐ کا مطلب ہے حضورؐ کی کامل اتباع یعنی اپنی مرضی اور خواہش کو حضورؐ کی مرضی اور خواہش کے تابع کر دینا۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں فنافی الرسولؐ کے مقام سے تعبیر کرتے ہیں۔

(ط) اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ خود بندے سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اور جب یہ حالت رونما ہو جاتی ہے تو خدا اپنے بندے سے خود

پوچھنے لگتا ہے کہ "بتا تیری رضا کیا ہے۔"

حسب ذیل حدیث اس حقیقت پر شاہد ہے:۔

"لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا۔" یعنی میرا بندہ ایک عرصہ تک (جو سالک کی استعداد پر موقوف ہے) نوافل یعنی اطاعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یعنی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کے طرزِ عمل یعنی اتباعِ رسول ؐ سے خوش ہو کر اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پس جب اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں خود اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں خود اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں خود اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اسی حالت یا مقام کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے:۔

ع یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

(ی) چونکہ اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرنے کے لیے عشقِ رسول ؐ اور صحبتِ مرشد شرطِ اولین ہے۔ اسی لیے اقبال نے ساری قوم کو انہی دو باتوں کی طرف بلایا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فلسفۂ خودی کی عمارت انہی دو ستونوں پر قائم ہے۔ فافہم و تدبر۔ ۱۳

(۲) صرف ایک ذرا سے پورے شہر کے افراد کو خون میں نہلا سکتے ہیں۔ اور ایک نسیم کے جھونکے سے لاکھوں گلوں کا سینہ چاک کر سکتے ہیں، یہ ہے اس شعر کا لفظی ترجمہ اور نہایت آسان ہے لیکن اقبال کا مطلب اس رمزیہ عبارت سے یہ ہے کہ مرشد کامل کی زبان اور نگاہ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ وہ ایک مختصری تقریر سے ہزاروں سامعین کے دلوں میں عشقِ رسول ؐ کی آگ بھڑکا سکتا ہے اور ایک نگاہ سے ان کے اندر محبتِ الٰہی کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔

(۳) موئے آتش دیدہ۔ اگر بال کو آگ کے سامنے رکھا جائے تو جل جاتا ہے اور جل کر بہت ہی کمزور ہو جاتی ہے۔ اقبال نے یہ ترکیب محض بال کی کمزوری کو واضح کرنے کے لیے استعمال کی ہے یعنی مضبوط درکنار ہم ایک کمزور بال

سے بھی جبرئیل کے پروں کو باندھ سکتے ہیں۔ موئے آتش دیدہ کنایہ ہے عاشق سے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق حقیقی میں وہ طاقت ہے کہ ایک عاجز اور ناتواں انسان (موئے آتش دیدہ) اگر عشق حقیقی اختیار کرے تو وہ جبرئیل جیسی طاقتور اور عظیم المرتبت ہستی کو اپنا مطیع بنا سکتا ہے۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ سلطنت کرنے کیلئے بہت دانائی اور عاقبت بینی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے ایک غیر دانشمندانہ یا ظالمانہ فعل سے بہت سے آئینے ٹوٹ سکتے ہیں یعنی بہت سے انسان تباہ ہو سکتے ہیں۔

(۵) بگوہر محکم شدن یعنی اپنی خودی کو پختہ یا مستحکم کرنا۔ بدریعہ عشق۔ سیل بلا انگیز کنایہ ہے آفات ارضی و سماوی سے کہتے ہیں کہ اگر تو اپنی خودی کو مستحکم کرے تو دنیا کی کوئی مصیبت تجھے راہ راست سے منحرف نہیں کر سکتی یا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ تو تمام آفتوں میں اپنی خودی کو اسی طرح محفوظ رکھ سکتا ہے جس طرح موتی صدف میں محفوظ رہتا ہے۔ اگرچہ سمندر میں ہر وقت تلاطم برپا رہتا ہے مگر موتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا محض اس لیے کہ اس نے اپنی خودی کو محکم کر لیا ہے۔

(۶) میں ایک گدائے بے نیاز ہوں (بے نیازی عاشق کا طغرائے امتیاز ہے) اس لیے میرا مذہب یہ ہے کہ مرجانا (شکستن) قبول ہے لیکن کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا (مومیائی خواستن) گوارا نہیں ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ "خودی از سوال ضعیف می گردد۔"

صد نالۂ شبگیرے صد صبح بلاخیزے
صد آہ شرر ریزے یک شعر دلآویزے
در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست؟
آں تیشۂ فرہادے ایں حیلۂ پرویزے
با پردگیاں برگو کایں مشت غبار من
گردیست نظربازے خاکیست بلاخیزے
ہوشم برد اے مطرب مستم کند اے ساقی
گلبانگ دلآویزے از مرغ سحرخیزے

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوے ہنگامۂ چنگیزے
مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

(۱) کہتے ہیں کہ ایک شعرِ دلآویز انسان کے دل میں عشق کی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ نالۂ شب گیر، صبحِ بلاخیز اور آہِ شرر ریز۔ یہ سب عشق ہی کی مختلف کیفیات ہیں۔

(۲) اے مخاطب! تو جاننا ہے کہ عشق اور ہوس میں کیا فرق ہے! سُن! عشقِ حقیقی، عاشق کے اندر ایثار اور قربانی کا رنگ پیدا کر دیتا ہے (فرہاد نے اپنی جان قربان کر دی) اور عشقِ مجازی، عاشق کو مکاری اور عیاری کا درس دیتا ہے (پرویز نے فرہاد کو دھوکے سے ختم کرا دیا)۔

(۳) اس شعر میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ انسان بظاہر مشتِ خاک ہے لیکن اس میں عشق کرنے (نظر بازی اور بلاخیزی) کی استعداد پائی جاتی ہے۔ اس لیے فرشتوں (پردگیاں) سے افضل ہے۔

(۴) آسان شعر ہے یعنی عاشق کو مرغِ سحر خیز (بلبل، کوئل، قمری) کی نغمہ سرائی بیخود کر دیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ موسیقی بقول شیکسپیئر عشق کی غذا ہے۔

(۵) یہ شعر بھی آسان ہے۔ کہتے ہیں کہ حالاتِ حاضرہ یہ بتا رہے ہیں کہ سمرقند (ترکستان) کی خاک سے پھر کوئی ہلاکو یا چنگیز پیدا ہوگا جو اشتراکیت کو اسی طرح ختم کر دے گا جس طرح اس نے ملوکیت (زاریت) کو فنا کر دیا۔ اس شعر میں اشارہ ہے اس تحریک کی طرف جو بطلِ حریت انور پاشا شہید نے ۱۹۲۲ء میں ترکستان میں اس مقصد سے جاری کی تھی کہ ترکوں کو اشتراکیوں کی غلامی سے رہا کر کے ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ چونکہ اقبال ہر اس تحریک کے حامی اور مداح تھے جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی ہو، اس لیے انھوں نے اس شعر میں اپنی توقعات (اپنے جذبات) کا اظہار کر دیا۔

(۶) اے مطرب! مجھے مرشدِ رومی کی کوئی غزل سُنا، تاکہ میرے دل میں عشقِ حقیقی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ آتشِ تبریز کنایہ ہے اس دریٔ محبت سے جو شمس تبریزی نے مولانا رومی کو دیا تھا۔ جس کی بدولت مولانا جلال الدین رومی مرشدِ رومی یا مولائے روم بن گئے۔

مولوی ہرگز نشد مولائے روم ٭ تا غلامِ شمس تبریزی نشد

باز بہ سرمہ تاب دہ چشمِ کرشمہ زائے را
ذوقِ جنوں دو چند کن شوقِ غزل سرائے را
نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار
لعبتِ خاک ساختن می نسزد خدائے را
قصۂ دل نگفتنی است درد جگر نہفتنی است
خلوتیاں کجا برم لذتِ ہائے ہائے را
آہ درون تاب کو اشکِ جگر گداز کو
شیشہ بسنگ می زنم عقلِ گرہ کشائے را
بزم بباغ و راغ کش زخمہ بتارِ چنگ زن
بادہ بجور غزل سرائے بند کشا قبائے را
صبح دمید و کارواں کرد نماز و رخت بست
و شنیدۂ گر زمزمۂ درائے را
نازِ شہاں نمی کشم ، زخمِ کرم نمی خورم
در نگر اے ہوس فریب ہمتِ ایں گدائے را

(۱) اے محبوب! اپنی چشمِ کرشمہ زا میں سرمے کی ایک تحریر پھر کھینچ دے تاکہ میرا ذوقِ جنوں دوچند ہو جائے۔

(۲) کہتے ہیں کہ اے خدا! مٹی کی گڑیا (کنایہ ہے ضعیف انسان سے) بنانا تیری شانِ رفیع کے شایاں نہیں ہے! دوسرا آدم پیدا کر جو اس کمزور اور عاجز انسان سے زیادہ پختہ ہو۔ اقبال نے شوخی اور طنز کے پردہ میں ہمیں استحکامِ خودی کا پیغام دیا ہے تاکہ ہم ابلیس کا مقابلہ کر سکیں۔

(۳) عاشق اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہے لیکن فقہا ر(ارباب شریعت) یہ کہتے ہیں کہ اظہارِ جذبات مت کرو۔ کیونکہ اگر تم نے اس سلسلہ میں کوئی بات خلافِ شرع کہدی تو ہم تمہیں سُولی پر چڑھا دیں گے۔ اس لیے عاشق تنگ آکر زاہدوں سے پوچھتا ہے کہ میں ہائے ہائے تو اس سے نہیں کر سکتا کہ تمہاری اجازت نہیں ہے لیکن عاشقی کی ساری لذت اسی ہائے ہائے (اظہارِ عشق) میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے خدارا مجھے بتاؤ کہ میں اس لذت کو کہاں لے جاؤں؟ یعنی وہ جگہ بتاؤ جہاں

آزادی کے ساتھ دل کھول کر اظہارِ جذبات کر سکوں۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مرشد کی تلقین یہ ہے کہ وارداتِ عاشقی (قصۂ دل اور دردِ جگر) کو لوگوں سے پوشیدہ رکھو مبادا فتنہ برپا ہو جائے اس پر عاشق یہ کہتا ہے کہ میں علانیہ آہ و فریاد (ہائے ہائے) کو نہیں روک سکتا کہ یہ مسلکِ عشق کے خلاف ہے۔ اور لطفِ زندگی اسی ہائے ہائے میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے سخت حیران ہوں کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں!

(۴) میں نے زاہدوں (فقیہوں) کے کہنے سُننے سے مسلکِ عشق کے بجائے مسلکِ عقل اختیار کر لیا تھا۔ لیکن تجربہ نے بتایا کہ اس سے دل کو طمانیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے میں عقلِ گرہ کُشا کے شیشہ کو پتھر پر مار کر چکنا چور کئے دیتا ہوں۔ اے خدا! مجھے بتا دو کہ خانقاہِ مرشد کا راستہ کدھر ہے تاکہ میں وہاں جا کر آہِ سینہ تاب اور اشکِ جگر گداز یعنی عشق کی لذت سے بہرہ اندوز ہو سکوں۔ آہ اور اشک کنایہ ہیں عاشقانہ زندگی سے جس کا ثمرہ اطمینانِ قلب ہے:۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ صرف اللہ کی محبت یا اس کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔

(۵) اے محبوب! ممکن ہے یہ وقت پھر میسر نہ ہو سکے۔ چل باغ میں بیٹھ کر لُطفِ زندگی اٹھا (یعنی موسیقی، شاعری اور شراب کا شغل کر) اور بے تکلفی کا رنگ اختیار کر (بندِ قبا کشادن کنایہ ہے اختلاط باہمی سے یا اُن حرکات سے جو محبت پر دلالت کریں)

(۶) صبح ہو گئی (کارواں) نے نمازِ فجر سے فارغ ہو کر سامانِ سفر درست کر لیا۔ بس اب روانہ ہونے والا ہے۔ لیکن اے محاطب! تو نے ابھی تک تیاری نہیں کی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے روانگی کے گھنٹے کی آواز نہیں سُنی! اس شعر میں اقبال نے ہمیں غفلت کی زندگی ترک کرنے اور سرگرم عمل ہو جانے کی تلقین کی ہے۔

(۷) عاشقِ صادق یعنی اللہ کے بندے کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی بادشاہوں کے دربار میں نہیں جاتا اور کسی کا احسان نہیں اُٹھاتا۔ لیکن بوالہوس (دُنیا کا بندہ) ساری عمر بادشاہوں کی غلامی میں بسر کر دیتا ہے۔

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد
که میر قافله و ذوق رهزنی دارد
نشان راه ز عقل هزار حیله مپرس
بیا که عشق کمالی ز یک فنی دارد
فرنگ گرچه سخن با ستاره می‌گوید
حذر که شیوهٔ او رنگ جوزنی دارد
ز مرگ و زیست چه پرسی درین رباط کهن
که زیست کاهش جاں، مرگ جانکنی دارد
سر مزار شهیداں یکی عناں درکش
که بے زبانی ما حرف گفتنی دارد
دگر بدشت عرب خیمه زن که بزم عجم
مئے گذشته و جامے شکستنی دارد
نه شیخ شهر نه شاعر نه خرقه پوش اقبال
فقیر راه نشین است و دل غنی دارد

(۱) کہتے ہیں کہ کشمکشِ عقل کا یہ فریب بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ ایک طرف تو انسانی عقل رہنمائی کی مدعی ہے۔ دوسری طرف یہی عقل انسان کو غلط راستہ پر لے جانا چاہتی ہے اور اس لیے کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے سوا اور کوئی رہنما، مشیر اور معیارِ حق و باطل نہیں ہے (اہلِ عقل، عشق کی برتری کو تسلیم نہیں کرتے، اگر وہ ایسا کریں تو پھر عقل کے زمرہ سے خارج ہو جائیں گے)۔ لیکن یہی عقل انسان کو اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کی ترکیب سمجھاتی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے پوچھ لیجیے۔ اور اگر مزید شہادت درکار ہو تو زلیخا کا نام کافی ہے۔

(۲) اے طالب! عقلِ حیلہ جو تجھ کو منزلِ مقصود کا پتہ نہیں بتا سکتی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے پاس روباہ کی طرح حیلے بہانوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن صحیح علم اس کے پاس ہرگز نہیں ہے۔ اُس راہ کا نشان جو تجھے کوئے جاناں تک پہنچا سکتی ہے، صرف عشق سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عشق ایک فن ہے یعنی صرف نشانہ ہی کا فن جانتا ہے اسے عقل کی طرح بہت سی ترکیبیں اور ہزاروں حیلے یاد نہیں ہیں۔

(۳) یہ سچ ہے کہ اہلِ یورپ نے سائنس اور متعلقہ علوم میں بہت ترقی کر لی ہے لیکن

مسلمانوں کو ان سے دُور رہنا چاہیے کیونکہ ان کی سیرت (شیوہ) میں عیاری اور مکاری کا رنگ پایا جاتا ہے (جو زن یعنی جادوگر، عیار، ساحر)۔

نوٹ:۔ اقبال کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن آج کل حالات کچھ ایسے ہیں کہ اگر ستاروں اور عاریوں؟ سے حذر کیا جائے تو پوری قوم نانِ شبینہ کو محتاج ہو جائے گی۔

(۴) باطِ کہن۔ سرائے کہنہ کنایہ ہے دُنیا سے۔ اے مخاطب! تو اس دُنیا میں مرگ و زیست کا مفہوم کیا پوچھتا ہے؟ دُنیاوی زندگی اور موت کوئی بھی قابلِ ستائش نہیں ہے۔ کیونکہ زیست، دراصل جان کے آہستہ آہستہ گھلنے کا دُوسرا نام ہے۔ یعنی انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ موت کے خوف سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ اور موت، اس کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جانکنی ہے یعنی جان کو جسم سے کھینچ کر باہر نکالنے کا دوسرا نام ہے اور حکماء اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر تکلیف دہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

(۵) معمولی شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! اگر تو کبھی ہم شہیدوں کے مزار کے نزدیک ہو کر گذرے تو دو منٹ کے لیے اپنے گھوڑے کی باگ روک لینا۔ ہماری بے زبانی تجھ سے ایک بات کہنا چاہتی ہے یعنی ہمارے مزارات زبانِ حال سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے جان دے کر اپنے دعویٰ کی صداقت مبرہن کر دی۔

(۶) اے مخاطب! عجمی شاعری اور عجمی تمدن ترک کر دے اور عربی شاعری، عربی ادب، عربی تمدن اور عربی معاشرت اختیار کر۔ کیونکہ عجمی شاعری کے تصورات کہنہ اور فرسودہ ہو چکے۔ مے کنایہ ہے مضامین یا معنی سے اور جام کنایہ ہے الفاظ یا صورت سے۔

(۷) اقبال نہ تو عمائدِ شہر میں سے ہے، نہ وہ کوئی نامور شاعر ہے اور نہ شیخِ طریقت (خرقہ پوش) ہے۔ وہ ایک فقیر راہ نشین ہے مگر دلِ غنی رکھتا ہے۔ کسی سے کچھ طلب نہیں کرتا۔

نوٹ:۔ اقبال نے اپنے آپ کو ازراہ انکسار "فقیر راہ نشین" لکھا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ ایک درویش گوشہ نشین تھے۔

حسرتِ جلوۂ آں ماہِ تمامے دارم
دست بر سینہ نظر بر لبِ بامے دارم

حسن می گفت کہ شامے نہ پذیرد سحرم
عشق می گفت تب و تابِ دوامے دارم
نہ بامروز اسیرم نہ بفردا نہ بدوش
نہ نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم
بادۂ رازم و پیمانہ گسارے جویم
در خراباتِ مغاں گردشِ جامے دارم
بے نیازانہ ز شوریدہ نوایم مگذر
مرغِ لاہوتم و از دوست پیامے دارم
پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم
تیغِ خونریزم و خود را بہ نیامے دارم

(۱) آسان شعر ہے۔ اگلے وقتوں کے عاشقوں کی تصویر کھینچی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے دیدار کی آرزو میں سینہ پر ہاتھ رکھے کوٹھے کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑا ہوتا ہے۔

(۲) اس شعر میں سلسلۂ حسن و عشق کے دوام کا بیان کیا ہے کہ حسن اگر اس بات پر نازاں ہے کہ مجھے کبھی زوال نہیں ہوگا تو عشق اس کے جواب میں یہ کہتا ہے کہ میری تب و تاب بھی دوامی ہے۔ یہاں حسن سے محبوب حقیقی مراد ہے۔ کیونکہ دنیاوی حسن تو محض چند روزہ ہے۔

(۳) اس شعر میں عاشق حقیقی کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے کہ عشق حقیقی اس کو تمام انقلابات و حوادثِ روزگار سے بلکہ زمان و مکان کی قیود سے بالاتر کر دیتا ہے۔ عاشقِ صادق کی زندگی میں نہ ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل، نہ پستی ہوتی ہے نہ بلندی۔ بس کیف و مستی کی ایک حالت ہوتی ہے جو ہمیشہ یکساں طاری رہتی ہے اور اس مستی کی بدولت تمام دنیاوی امتیازات اس کی نگاہ سے محو ہو جاتے ہیں۔

(۴) بادۂ راز کنایہ ہے عرفانِ الٰہی سے۔ پیمانہ گسار کنایہ ہے طالب یا سالک سے۔ خراباتِ مغاں کنایہ ہے خانقاہِ مرشد سے اور گردشِ جام کنایہ ہے تعلیم و تلقین سے۔ مطلب یہ ہے کہ مرشد کامل کی خانقاہ میں عرفانِ حقیقی حاصل

ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہر وقت وہاں معرفت کا درس دیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے سالک کی جو مرشد کی صحبت میں رہ کر عرفان حاصل کر سکے۔

(۵) شوریدہ نوائی یا نوائے شوریدہ کنایہ ہے درسِ عاشقی یا اسرارِ معرفت سے۔ مرغِ لاہوتی کنایہ ہے عارف کامل سے۔ دوست کنایہ ہے محبوبِ حقیقی سے پیام کنایہ ہے وعدۂ الٰہی سے کہ اگر تم مجھ سے محبت کرو گے تو میں تم سے محبت کروں گا۔ اقبال کی شاعری اسی پیام کی حامل اور علمبردار ہے جسے انھوں نے شعر کے لباس میں پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! مجھے محض شاعر مت سمجھ اور اس وجہ سے میرے کلام سے بے اعتنائی مت کر۔ میں شاعر نہیں ہوں بلکہ پیامبر ہوں یعنی شاعری کے پردہ میں محبوبِ حقیقی کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور وہ پیغام یہ ہے کہ اے میرے بندو! اگر تم مجھ سے محبت کرو گے تو میں تم سے محبت کروں گا۔ اور مجھ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ میرے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کامل اتباع کرو۔

(۶) پردہ برگرفتن کنایہ ہے افشائے راز سے۔ واو بمعنی لیکن۔ در پردہ سخن گفتن یعنی رمزیہ اندازِ بیان۔ تیغ خونریز کنایہ ہے درسِ عاشقی یا تلقینِ جہاد سے کہتے ہیں کہ اگرچہ میں رموزِ قلندری فاش کر رہا ہوں لیکن میرا اندازِ بیان رمزیہ ہے یعنی میں استعاروں میں گفتگو کرتا ہوں۔ ؎

چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

میں دراصل مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین کر رہا ہوں لیکن تلقین کا اسلوب ایمائی ہے:۔

بشاخِ زندگیِ ما نمے ز تشنہ لبی است
تلاشِ چشمۂ حیواں دلیلِ کم طلبی است
حدیثِ دل بہ کہ گویم چہ راہ پیمایم
کہ آہ بے اثر است و نگاہ بے ادبی است
غزل بزمزمہ خواں پردہ پست تر گرداں
ہنوز نالۂ مرغاں نوائے زیر لبی است
متاعِ قافلۂ ما حجازیاں بردند
ولے زباں نکشائی کہ یار ما عربی است
نہالِ ترک ز برقِ فرنگ بار آورد
ظہورِ مصطفوی را بہانہ بولہبی است

مسنج معنیٔ من در عیارِ ہند و عجم
کہ اصلِ ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است
بیا کہ من زِ خمِ پیرِ روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

(۱) نم کنایہ ہے کامیابی سے۔ تشنہ لبی کنایہ ہے حالتِ فراق سے۔ تلاشِ چشمۂ حیواں کنایہ ہے خواہشِ وصل سے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقِ صادق کی کامیابی کا راز فراق میں پوشیدہ ہے۔ آرزوئے وصال، خامی یا نادانی کی دلیل ہے کیونکہ ؎

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل"

لذتِ عاشقی اسی میں ہے کہ وصال نصیب نہ ہو ؎ فراقِ عاشقاں عینِ وصال است

اچھا ہے انکو پاس وفا سے حجاب ٭ پھر کیا رہیگا دل میں جو حسرت نکل گئی

(۲) تغزل کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ اپنا دردِ دل کس سے بیان کروں! کامیابی حاصل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں! آہ میں اثر نہیں اور اس کی طرف دیکھنا گستاخی میں داخل ہے۔

(۳) پردہ پست سرگرداں یعنی دھیمے سروں میں گاؤ۔ مرغان کنایہ ہے سالکانِ طریقت سے۔ نوائے زیر لبی کنایہ ہے سالکِ راہ کی خامی سے یا عشق کی ابتدائی منزل سے مطلب یہ ہے کہ جب تک سالک میں رنگِ عاشقی پختہ نہ ہو اُس وقت تک اس کے سامنے عشق کے اسرار برملا واضح طریق سے بیان مت کرو۔ کیونکہ وہ ان کا تحمل نہیں کر سکے گا۔

(۴) متاعِ قافلہ کنایہ ہے ناموسِ ملت سے۔ حجازیاں کنایہ ہے شریفِ مکہ اور اس کے رفقائے کار سے جنہوں نے پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۸ء میں ملت سے غداری کرکے دشمنانِ اسلام کو عربی ممالک پر مسلط کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ عربوں نے ترکوں سے غداری کرکے ملتِ اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچایا بلکہ ملتِ اسلامیہ کا وقار خاک میں ملا دیا لیکن ہم اس لیے خاموش ہیں کہ ان نادانوں کو ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گونہ نسبت حاصل ہے۔ یہ شعر اقبال نے ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا لیکن جب عربوں کی غداری کے تلخ نتائج ان کے سامنے آئے تو ۱۹۳۶ء میں وہ زبان کشائی پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ترکانِ جفا پیشہ کے پھندے سے نکل کر ٭ بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

(۵) اس شعر میں مصطفےٰ کمال کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے کہ قدرت ایزدی تو دیکھو! ترکوں پر فرنگیوں نے فوج کشی کی تو اس کا نتیجہ خلاف توقع یہ نکلا کہ ترک کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔ کسی درخت پر بجلی گرتی ہے تو وہ جل جاتا ہے لیکن، برق فرنگ سے ترکوں کا درخت سرسبز اور بار آور ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن اسلام را بولہب) کا یہ حملہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت کے ظہور کے لیے بہانہ بن گیا۔

(۶) عیار ہند و عجم سے شاعری کا وہ معیار مراد ہے جو ہندوستان اور ایران میں مسلّم ہے کہو کنایہ ہے کلام اقبال سے گرمئ نم شبی کنایہ ہے عشق حقیقی سے کہتے ہیں کہ میری شاعری کو ہندی اور ایرانی شاعری کے معیار پر مت جانچو۔ میری شاعری کی بنیاد خمار گندم نہیں ہے بلکہ عشق حقیقی ہے یعنی میں نے اپنی شاعری میں قوم کو محبت الٰہی کا درس دیا ہے۔

(۷) یہ شعر پہلے شعر کی توضیح ہے کہ اے مخاطب میرا کلام اور پیغام مرشد رومی کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ میری شراب پیر روم کے میخانہ سے آئی ہے اس لیے اس میں انگوری شراب سے کہیں زیادہ مستی ہے۔

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بتخانہ
ایں جلوتِ جانانہ آں خلوتِ جانانہ

شادم کہ مزارِ من در کوے حرم بستند
راہے ز مژہ کاوم از کعبہ بہ بتخانہ

از بزم جہاں خوشتر از حور و جناں خوشتر
یک ہمدم فرزانہ وز بادہ دو پیمانہ

ہر کس نگہے دارد ہر کس سخنے دارد
در بزم تو می خیزد افسانہ ز افسانہ

ایں کیست کہ بر دلہا آوردہ شبیخونے؟
صد شہر تمنا را یغما زدہ ترکانہ

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال بہ منبر زد رازے کہ نہ باید گفت
نا پختہ بروں آمد از خلوت میخانہ

(۱) عاشقِ صادق یعنی خدا تعالیٰ کے عاشق کی نگاہ میں کعبہ اور بتخانہ دونوں یکساں ہیں۔ بتخانہ اس کی جلوت گاہ ہے یعنی بتوں میں بھی اسی کا ظہور ہے اور کعبہ اسکی خلوت گاہ ہے یعنی وہاں بھی وہی جلوہ گر ہے اگرچہ آنکھوں سے مستور ہے۔ چونکہ بتخانہ میں بت نظر آتے ہیں اور کعبہ میں کچھ نظر نہیں آتا اس لیے شاعر نے بتخانہ کو جلوت جانانہ اور کعبہ کو خلوت جانانہ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے مطلب یہ ہے کہ دونوں میں اسی کا جلوہ ہے۔

(۲) اس شعر کے اندازِ بیان میں عرفی کا رنگ جھلکتا ہے:-

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم ٭ اگر بہ ہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

کہتے ہیں کہ میں خوش ہوں کہ دوستوں نے میرا مزار کوئے حرم میں بنایا میں چونکہ بتوں کا پرستار ہوں اس لیے پلکوں سے زمین کھود کر بتخانہ تک پہنچ جاؤں گا اور میری مسرت کا باعث یہ ہے کہ اب مجھے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کاوش کرنی پڑے گی۔ اور جو شئے کاوش کے بعد حاصل ہوتی ہے اس کے حصول سے قدرتی بات ہے کہ انسان کو بہت خوشی ہوتی ہے

(۳) کہتے ہیں کہ عاشق کی نگاہ میں ایک ہم مشرب یا ہم مذاق اور دو پیالے شراب ساری دنیا بلکہ حور وجناں سے بھی زیادہ خوشتر ہے۔

(۴) کہتے ہیں کہ اے محبوب تیری محفل میں جس قدر عشاق جمع ہیں ان میں سے ہر ایک تجھے اپنی نظر یا اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر شخص تیرے حسن وجمال کے اس پہلو پر گفتگو کرتا ہے جو اسے پسند ہے اور چونکہ ہر شخص کا زاویۂ نگاہ جداگانہ ہوتا ہے اور اندازِ گفتگو بھی مختلف ہوتا ہے بلکہ موضوعِ سخن بھی منفرد ہوتا ہے۔ اس لیے تیری محفل میں بات میں سے بات نکلتی رہتی ہے یعنی تو اسقدر حسین ہے کہ لوگ رات دن تیرے حسن کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں لیکن سلسلۂ گفتگو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا روزِ آفرینش سے خدا کی حمد وثنا کر رہی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا کیونکہ ہو نہیں سکتا۔

(۵) محض رنگِ تغزل ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کون ہے جس نے میرے دل پر شبخون مارا اور ترکوں کی طرح میری ساری آرزوؤں کو لوٹ کر لے گیا مطلب یہ ہے کہ معشوق نے میرے دل پر پوری طرح قبضہ کر لیا ہے یغما بمعنی لوٹ مار۔

(۶) اقبال نے اپنی ذات کے پردہ میں قوم سے خطاب کیا ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم عشقِ رسول اختیار کرو تو فرشتوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے تم اپنے اندر یزدانی صفات

پیدا کر سکتے ہو" یزداں بکمند آور" یہ شاعرانہ اسلوب بیان ہے اس سے مراد ہے اپنے آپ کو صفات ایزدی کے رنگ میں رنگین کرنا۔ اقبال نے اس شعر کا تصور اپنے مرشد کے اس شعر سے اخذ کیا ہے:-

بزیر کنگرۂ کبریاش مرداں اند ❊ فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اور مرشد رومی نے یہ تصور، قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:-

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔

اے مسلمانو! تم دنیا والوں سے کہدو کہ ہم نے تو اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگین کر لیا ہے اور اللہ کے رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبال نے اس شعر میں مسلمان کا نصب العین واضح کیا ہے یعنی اس کا آئیڈیل یہ ہے کہ وہ اپنے اندر خدائی صفات کا رنگ پیدا کرے۔ اور یہ رنگ عشق رسول کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اکابر امت مثلاً حضرت داتا گنج بخش، حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری، حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت محبوب الٰہی، حضرت چراغ دہلوی، حضرت مخدوم کلیری، حضرت خواجہ سلیمان تونسوی اور سیدی و مرشدی شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی زندگیاں اس شعر کی زندہ تفسیر ہیں۔

(۷) مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ اگر سالک اسرار و رموز معرفت، علانیہ بیان کرنے لگے یعنی نا اہلوں کے سامنے حقائق و معارف پیش کرنے لگے تو یہ سمجھو کہ وہ ناپختہ یعنی خام ر نا تجربہ کار ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ افشائے راز دلیل خامی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر سالک، تصوف کے بلند حقائق نا اہلوں کو بتانے لگے گا، تو چونکہ وہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہوں گے اس لیے وہ لوگ یقیناً گمراہ ہو جائیں گے یعنی انہیں نفع کے بجائے نقصان ہوگا۔ اسی نکتہ کو سیدنا جناب مسیح نے یوں بیان فرمایا ہے:-

وَلَا تَطْرَحُوا دُرَرَكُمْ قُدَّامَ الْخَنَازِيْرِ ۔ (متی ۷-۵)

اور اپنے موتیوں کو خنازیر کے آگے مت ڈالو۔

بے تو از خواب عدم دیدہ کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں با تو نبودن نتواں

در جہان است کہ جہاں غیر دل ماست
لب فرو بند کہ ایں عقدہ کشودن نتواں

دلِ یاراں ز نوا ہائے پریشانم سوخت
من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نتواں
اے صبا از تنک آغوشی شبنم چہ شود
تب و تاب از جگر لالہ ربودن نتواں
دل بجو بند و کشادے ز سلاطین مطلب
کہ جبیں بر در ایں بتکدہ سودن نتواں

(۱) اقبال نے اس شعر میں نظریۂ وحدۃ الوجود کی وہ تعبیر پیش کی جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بیان فرمائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات اور انسان دونوں کو اپنی قدرت کاملہ سے عدم کی تاریکی سے نکال کر خلعت وجود عطا کیا ہے۔ ؏

بے تو از خواب عدم، چشم کشودن نتواں

اس مصرع میں اقبال نے قرآن حکیم کی تعلیمات کی روح کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اور تصوف بھی یہی سکھاتا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے۔ اکبر الٰہ آبادی نے بھی یہی تلقین کی ہے۔

تمہاری بحثوں سے میرے شبہے خدا کی ہستی میں کم نہ ہوتے
مگر یہ بات آگئی سمجھ میں، خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ط

بے شک انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب وہ معدوم محض تھا۔ اب شعر کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا کہ اے خدا! اگر تو نہ ہوتا تو ہم موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ دوسرے مصرع میں اسی بنیادی تصور کی وضاحت کی ہے کہ جس طرح تیرے بغیر ہمارا موجود ہونا محال ہے اسی طرح اگر تو ہمیں موجود کرنا چاہے تو ہمارا موجود نہ ہونا محال ہے۔

"با تو نبودن نتواں" میں ایک نکتہ یہ بھی مضمر ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے یعنی جسے اس کی معیت نصیب ہو جاتی ہے وہ حیات ابدی حاصل کر لیتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اس کو ایک مادی مثال سے واضح کر دوں:۔ سیلاب میں ہر چیز ڈوب سکتی ہے لیکن کشتی محفوظ رہتی ہے لہذا جو شخص کشتی سے وابستہ ہو گا وہ ڈوبنے سے محفوظ رہے گا۔

(۲) یہ شعر بھی غور طلب ہے۔ اسمیں اقبال نے فلسفہ کے اس عظیم الشان مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو صدیوں سے حکما میں مبحوث فیہ ہے یعنی اس کائنات کا وجود نفس مدرک پر موقوف ہے یا مستقل بالذات ہے؟ مرشد رومیؒ اور ان کے ہم خیالوں کا مذہب یہ ہے کہ ع بادہ از ما مست شد نے ما ازو

یعنی اگر ہم نہ ہوتے تو شراب میں مستی پیدا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ "مستی" ہمارے اندر ہے، شراب میں نہیں ہے (کائنات ہمارے دل میں ہے۔ یعنی ہمارے اندر ہے) اسے مسلک تصوریت (IDEALISM) کہتے ہیں۔ ارسطو اور اس کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ کائنات کا وجود مستقل بالذات ہے۔ اگر نفس مدرک نہ ہو تو بھی موجود ہوگی۔ یعنی کائنات نفس مدرک میں نہیں ہے بلکہ نفس مدرک، کائنات میں ہے (جس طرح اور ہزاروں لاکھوں اشیا، کائنات میں ہیں) اسے مسلکِ خارجیت (REALISM) کہتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ حکما میں یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کہ نفس مدرک (دل) جہان میں ہے یا جہان، نفس مدرک (دل) میں ہے؟ بالفاظِ دگر، جہان اپنے وجود کے تحقق کے لیے نفس مدرک کا محتاج ہے یا نہیں ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ خاموشی بہتر ہے کیونکہ عقلی بحثوں سے کوئی شخص اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا۔

(۳) اس شعر میں بھی وحدۃ الوجود کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں میرے دوست احباب میری نوا ہائے پریشان سے سخت دل گرفتہ ہیں۔ کیونکہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ ان کی فہم سے بالاتر ہے۔ لیکن میں بھی مجبور ہوں کیونکہ "من از آں نغمہ تپیدن کہ سرودن نتواں" یعنی میں اس مسلک کی طرف دعوت دے رہا ہوں جسے سمجھ تو سکتے ہیں لیکن بذریعہ الفاظ ادا نہیں کر سکتے (یہ مفہوم ہے سرودن نتواں کا) یعنی ایک نغمہ ایسا بھی ہے جسے سن سکتے ہیں لیکن گا نہیں سکتے۔ اسی نکتہ کو خلاق المعانی حضرت بیدلؒ نے یوں بیان فرمایا ہے:-

عکس افتادہ بآئینہ ہوشش ٭ گل تواں گفت ولے چیدن نیست

یعنی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ پھول ہے مگر اسے توڑ نہیں سکتے۔

بس یہی بات اقبال کہہ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کو سمجھ تو سکتے ہیں لیکن لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔

نوٹ:۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں راقم الحروف نے علامہ مرحوم سے اس مسئلہ کی وضاحت کی درخواست کی تھی اس کے جواب میں مرحوم نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ بات کہی تھی کہ کوئی شخص وحدۃ الوجود کی حقیقت بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتا۔"

(۴) صبا کنایہ ہے رفیقِ کار یا غمگسار سے۔ تنک افشانی شبنم کنایہ ہے معشوق کی نگاہِ التفات سے۔ تب و تاب کنایہ ہے سوزِ دروں سے۔

کہتے ہیں کہ اے ہمدم! اس محبوب کی نگاہ سے جو کبھی کبھی میسر آ جائے، بھلا کہیں تیرے سوزِ دروں میں کمی ہو سکتی ہے! مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت عشق کی آگ کو سرد نہیں کر سکتی۔

(۵) اے مسلمان! تو اپنا رابطہ حق تعالیٰ سے استوار کرلے اور کسی بادشاہ کے دروازہ پر مت جا، کسی دولتمند سے مالی منفعت کی توقع مت کر، کیونکہ جو شخص اللہ کو چھوڑ کر سلاطین کے دروازے پر جاتا ہے وہ بت پرست ہو جاتا ہے اور مسلمان کبھی ہرگز بتوں کو سجدہ نہیں کر سکتا۔

نوٹ:۔ اسی لیے سلسلہ عالیہ چشتیہ کے تمام اکابر نے متفق اللسان ہو کر یہ تحقیق فرمائی ہے کہ جو شخص چشتی ہو کر کسی بادشاہ کے دروازے پر جائیگا، وہ اس سلسلہ سے کوئی فیض حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء کا دربار میں جانا تو بڑی بات ہے کسی بادشاہ کو اپنے دربار میں بھی حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی تھی تو اقبال نے یہ کہا ہے:۔

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی ؎ مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

(بانگ درا ص ۹۰)

~~ایں گنبد مینائی ایں پستی و بالائی~~
در شد بدلِ عاشق با ایں ہمہ پہنائی
اسرارِ ازل جوئی؟ بر خود نظرے وا کن
یکتائی و بسیاری، پنہانی و پیدائی
اے جانِ گرفتارم دیدی کہ محبت چیست؟
در سینہ نیاسائی از دیدہ بروں آئی
برخیز کہ فروردیں افروخت چراغِ گل
برخیز و دمے بنشیں با لالۂ صحرائی

عشق است ہزار افسوں حسن است ہزار آئیں
نے من بہ شمار آیم نے تو بہ شمار آئی
صد بار بفلک بر شد صد بار بزمیں در شد
خاقانی و فغفوری جمشیدی و دارائی
ہم با خود و ہم با او ہجراں کہ وصال است ایں؟
اے عقل چہ می گوئی، اے عشق چہ فرمائی

(۱) اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشق کے دل میں اسقدر وسعت (پہنائی) پیدا ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات (گنبد مینائی) اس میں سما سکتی ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ واقعی کوئی شخص اس ساری کائنات کو اٹھا کر عاشق کے دل میں اس طرح رکھ دیتا ہے جس طرح ہم صندوقچے میں زر و جواہر رکھ دیتے ہیں۔ بلکہ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے جو اس حقیقت کا مظہر ہے کہ جب سالک (عاشق) سیر انفسی (دل کی سیر) شروع کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا بلکہ اس سے بھی زیادہ دل کے اندر موجود ہے چنانچہ امام حسین رضؓ نے اپنے فرزند کو بایں الفاظ وصیت فرمائی تھی۔

اَنّکَ جرمٌ صَغِیرٌ وَفِیکَ عَالَمٌ کَبِیرٌ وَ فِکرُکَ فِیکَ یَکفِیکَ

اے بیٹے تو بظاہر ایک چھوٹا سا جسم ہے لیکن تیرے اندر ایک جہان پوشیدہ ہے اور اگر تو اپنے اندر (دل کی دنیا میں) غور و فکر کرے گا تو یہ سیر انفسی تیرے لیے بالکل کافی ہوگی۔ اسی نکتہ کو خلاق المعانی مرزا بیدل یوں لکھتے ہیں:-

برونِ دل نتواں یافت ہرچہ خواہی یافت ٭ کدام گنج کہ درخانۂ خراب تو نیست

یعنی وہ کونسی دولت ہے جو تیرے دل میں مخفی نہیں ہے؟ پھر تو دنیا والوں کی طرف کیوں دیکھتا ہے؟ بات یہ ہے کہ عرفاء کے نزدیک باہر تو کچھ ہے ہی نہیں جو کچھ ہے اندر ہی۔ جسے دنیا والے دنیا کہتے ہیں وہ انھی کے حواس خمسہ کے احساسات ہیں جنھیں وہ غلطی سے باہر سمجھتے ہیں۔ محسوس کا وجود تو احساس پر موقوف ہے۔ یعنی کوئی شخص ہستی کا مشاہدہ اپنے دل کی دنیا سے باہر ہو کر نہیں کرتا۔

(۲) اسرارِ ازل کنایہ ہے اسمائے مطلق یا ذاتِ حق سے۔ کہتے ہیں کہ اگر تجھے ذاتِ حق کی معرفت مطلوب ہے تو اپنی ذات میں غور کر۔ تجھ میں وحدت بھی ہے، کثرت بھی ہے تو پنہاں بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ بس یہی ذاتِ حق کی صفات

بھی ہیں یعنی صفاتِ حق خود تیرے اندر جلوہ گر ہیں۔ اسی نکتہ کو بیدل نے یوں بیان کیا ہے :-

سر سے اگر بجز بیان غرق بود دریاست ⁂ زسیر عالم دل غافلیم ورنہ حباب

یعنی ہم لوگ اپنی جہالت کی بنا پر دل کی سیر سے غافل ہیں ورنہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اگر حباب (انسان) اپنے دل میں غوطہ لگائے (بر خود نظر کند) تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ میں تو خود دریا (خدا) ہوں۔

(۳) مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو ہر وقت مضطرب رکھتا ہے۔ عاشق کو سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کی جان کو کسی وقت قرار نہیں ہوتا۔ "از دیدہ بروں آمدن" یہ بڑی بلیغ ترکیب ہے۔ کنایہ ہے مسلسل روتے رہنے سے۔ عاشق ہر وقت فراق میں روتا رہتا ہے۔ اس کی جان آہستہ آہستہ آنسوؤں کی شکل میں تبدیل ہو کر آنکھوں سے بہتی رہتی ہے۔

(۴) اس شعر میں شاعر نے بہار کا نقشہ کھینچا ہے یعنی باغ میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ آؤ کچھ دیر باغ میں بیٹھ کر مناظرِ فطرت سے لطف اندوز ہوں۔ لالۂ صحرائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا ہے کہ لالہ بھی عاشق ہے اور قاعدہ ہے کہ ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

(۵) تغزل کے اعتبار سے بہت بلند پایہ شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ معشوق (حسن) میں ہزاروں ادائیں ہوتی ہیں اور عاشق، معشوق کو رام کرنے کے لیے ہزاروں ترکیبیں کرتا ہے۔ معشوق، عاشق کو اپنی بیشمار اداؤں سے اپنا گرویدہ بناتا رہتا ہے اور عاشق، معشوق کو حاصل کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرتا رہتا ہے۔ نہ اس کی اداؤں کا شمار ہو سکتا ہے نہ اس کی کوششوں کا۔

(۶) بفلک بر شدن کنایہ ہے عزت سے اور بہ زمین در شدن کنایہ ہے ذلت سے اس شعر میں شاعر نے دنیا کی نیرنگی پر تبصرہ کیا ہے کہ بہت سے بادشاہ اس دنیا میں عزت حاصل کرتے ہیں اور بہت سے بادشاہ اسی دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں۔

(۷) اس بلیغ شعر میں اقبال نے اس کیفیت کا اظہار کیا ہے جو عشق سے پیدا ہوتی ہے یعنی جس وقت عاشق اپنی ذات میں اس اعتبار سے غور کرتا ہے کہ میں انائے مقید ہوں تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں معشوق سے دور ہوں۔ اس غیریت کے احساس کا دوسرا نام ہجر ہے۔ لیکن جس وقت وہ اپنی ذات میں اس اعتبار سے غور کرتا ہے

کہ انائے مقید بذاتہٖ کچھ بھی نہیں ہے بلکہ وہ انائے مطلق کا پرتو ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ (انائے مطلق) کا جز ہی ہے اسی عینیت کے احساس کا دوسرا نام وصال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عاشق بیک وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ میں اپنے ساتھ بھی ہوں (ہجر) اور اس کے ساتھ بھی ہوں (وصل) چونکہ یہ دونوں حالتیں متضاد ہیں اس لیے عقل اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتی کہ یہ متضاد کیفیتیں بیک وقت ایک شخص پر کیسے طاری ہو سکتی ہیں۔ لیکن عشق اس سوال کا جواب دے سکتا ہے کیونکہ یہ کیفیات اُسی سے پیدا ہوتی ہیں۔

بہ یکے از صوفیہ نوشتہ شد

ہوس منزل لیلیٰ نہ تو داری و نہ من
جگر گرمی صحرا نہ تو داری و نہ من
من جواں ساقی و تو پیر کہن میکدہ
بزم ما تشنہ و صہبا نہ تو داری و نہ من
دل و دیں در گرو زہرہ وشان عجمی
آتش شوق سلیمیٰ نہ تو داری و نہ من
خزفے بود کہ از ساحل دریا چیدیم
دانہ گوہر یکتا نہ تو داری و نہ من
دگر از یوسف گم گشتہ سخن نتواں گفت
تپش خون زلیخا نہ تو داری و نہ من
بہ کہ با نور چراغ تہ داماں سازیم
طاقت جلوہ سینا نہ تو داری و نہ من

نوٹ:۔ یہ نظم اقبال نے اپنے کسی صوفی دوست کو لکھ کر بھیجی تھی جس کا نام انہوں نے مصلحتاً ظاہر نہیں کیا۔ بنیادی تصور جو اس نظم کے تمام اشعار میں مشترک ہے یہ ہے کہ اسلام کی محبت نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے، اور تیرے اور میرے سے پوری قوم مراد ہے۔

(۱) یعنی تو، ہم دونوں (ہم سب) اُلفتِ لیلیٰ کے مدعی ہیں (لیلیٰ کنایہ ہے اسلام سے) لیکن اس کے حصول کے لیے صحرا نوردی کا حوصلہ (جگرا) نہ تجھ میں ہے

نہ مجھ میں۔ یعنی زبان سے ہم سب اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن اس کو سربلند کرنے کے لیے تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔

(۲) میں بظاہر بڑا مستعد کارکن (جواں ساقی) ہوں۔ اور تو ایک پرانے میکدہ (قدیمی خانقاہ) کا سجادہ نشین ہے۔ قوم (بزم) تشنۂ ہدایت ہے لیکن شراب (ہدایت) نہ تیرے پاس ہے نہ میرے۔ یعنی نہ میں ہدایت کا فرض انجام دے سکتا ہوں نہ تو۔

(۳) ہم دونوں غیر اسلامی تصورات و عقاید (زہرہ وشانِ عجمی) کے پیرو ہیں۔ اسلام (سلیمیٰ) کی محبت نہ تیرے دل میں موجزن ہے نہ میرے۔

(۴) ہم دونوں نے ساحل دریا (دینِ اسلام) سے کچھ خزف ریزے یعنی ٹھیکریاں (ظاہری رسوم) جمع کر لی ہیں۔ گوہر یکتا (اسلام کی روح یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ) نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے۔

(۵) ہم کو یوسفِ گم گشتہ (اسلام کی عظمتِ رفتہ) کا ذکر کرنا یعنی اسلام کو سربلند کرنے کا دعویٰ کرنا زیب نہیں دیتا۔ کیونکہ اسلام کی محبت (تپشِ خونِ زلیخا) نہ تیرے دل میں ہے نہ میرے۔

(۶) بہتر یہی ہے کہ ہم اُن تمناؤں کے حصول کی کوشش کریں جو ہمارے دل میں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ خدا کے دیدار (جلوۂ سینا) کی طاقت نہ تجھ میں ہے نہ مجھ میں۔

اس آخری شعر میں بڑا زبردست طنز مخفی ہے جس کا اظہار لفظوں کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔

دلیلِ منزلِ شوقم بدامنم آویز
شرر ز آتشِ نابم بخاکِ خویش آمیز
عروسِ لالہ برون آمد از سراچہ ناز
بیا کہ جانِ تو سوزم ز حرفِ شوق انگیز
بہر زمانہ بہ اسلوبِ تازہ می گویند
حکایتِ غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز
اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است
ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز!

دلیل یعنی رہنما۔ بدامنم آویز یعنی مجھ سے رابطہ پیدا کرے۔

(۱) کہتے ہیں کہ میں عشق کی منزل کا رہنما ہوں اس لیے تو مجھ سے وابستگی پیدا کرے۔ دُوسرے مصرع میں وابستگی کا طریقہ بتایا ہے یعنی میرے کلام کا مطالعہ کر، تاکہ تیرے اندر عشق رسولؐ کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

(۲) میں نے اپنے کلام میں عشق رسولؐ کے اسرار و رموز فاش کر دیئے ہیں۔ اگر تو میری صحبت اختیار کرے (میرے کلام کا مطالعہ کرے)۔ تو تیرے اندر عشق رسولؐ کی آگ بھڑکنے لگے گی۔

(۳) فرہاد عشق صادق کا نمائندہ ہے اور پرویز عشق کاذب (ہوس) کا نمائندہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سچے اور جھوٹے عاشق ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں اور عشق کی ان دونوں قسموں کا اظہار، دُنیا میں نت نئے طریقوں سے ہوتا رہتا ہے۔

(۴) بخارا، کابل اور تبریز یہ تین شہر نمائندے ہیں اُن اسلامی مرکزوں کے جہاں اکثر نامور علماء اور صلحاء پیدا ہوئے۔ مثلاً بخارا سے اشارہ ہے شیخ فریدالدین عطارؒ اور خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ کی طرف۔ کابل سے اشارہ ہے حکیم سنائیؒ کی طرف جن کا وطن غزنی تھا۔ اور تبریز سے اشارہ ہے حضرت شمس تبریزی کی طرف جو عارف رومی کے مرشد تھے کہتے ہیں کہ اگرچہ میں پیدا تو ہندوستان میں ہوا لیکن میں نے دین اسلام کے حقائق و معارف ان بزرگوں سے حاصل کئے جو بخارا، کابل اور تبریز میں پیدا ہوئے تھے۔ یعنی میرے افکار کا سرچشمہ ہندی (عجمی) نہیں ہے بلکہ اسلامی ہے۔

در جہانِ دل ما دورِ قمر پیدا نیست
انقلابیست ولے شام و سحر پیدا نیست

وائے آں قافلہ کز دونیٔ ہمت می خواست
رہگزارے کہ در و ہیچ خطر پیدا نیست

بگذر از عقل و در آویز بموجِ یمِ عشق
کہ در آں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

آنچہ مقصود تگ و تازِ خیال من و تست
ہست در دیدہ و مانند نظر پیدا نیست

(۱) کہتے ہیں کہ دل کی دُنیا، اس مادّی دُنیا سے بالکل مختلف ہے، وہاں انقلاب تو رونما ہوتا ہے لیکن نہ گردشِ شمس و قمر ہے نہ زیرِ عمل شام و سحر ہے یعنی دل کی دنیا، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے کیونکہ وہ غیر مادّی ہے اور روحانیات میں عالمِ مادّی کے قوانین کارفرما نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ دُنیا ہے جس کی نوعیت لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کی جا سکتی۔

(۲) افسوس ہے مسلمانوں کی اُس جماعت پر جو اپنی پستیٔ ہمت کی وجہ سے جہاد (راہِ پُر خطر) سے جان چُراتی ہے۔

(۳) اے مخاطب! عقل سے اپنا تعلق منقطع کرے اور عشق کے سمندر میں غوطہ لگا۔ کیونکہ عقل کی نہر میں موتی نہیں مل سکتا یعنی عقل کی مدد سے محبوبِ حقیقی کا دیدار حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۴) اے مخاطب! میرے اور تیرے خیالات کی نگاہ پر کا مقصود (ذاتِ حق تعالےٰ) وا ٓنکھ (دل میں تو ہے لیکن نظر کی طرح نظر نہیں آتا۔ قاعدہ ہے کہ انسان اپنی آنکھ کی بدولت ساری دنیا کو دیکھ سکتا ہے لیکن اپنی نگاہ (قوتِ بصارت) کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس اسی طرح انسان خدا کی ہستی کو دل میں محسوس کرتا ہے لیکن آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اکبر الہ آبادی نے اس نکتہ کو بڑے دلکش انداز سے پیش کیا ہے:-

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ÷ بس جان گیا میں، تری پہچان یہی ہے

گریۂ ما بے اثر نالۂ ما نارساست

حاصلِ ایں سوز و ساز یک دلِ خونیں نواست

در طلبش دل تپید دیر و حرم آفرید

ما بہ تمنائے او، او بہ تماشائے ماست

پردگیاں بے حجاب من بہ خودی در شدم

عشقِ غیورم نگر ایں بہ تماشا کراست

مطربِ میخانہ دوش نکتۂ دلکش سرود

بادہ چشیدن خطاست، بادہ کشیدن رواست

زندگیٔ رہرواں در تگ و تاز است و بس

قافلۂ موج را جادہ و منزل کجاست

شعلہ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من

مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ ما کبریا است"

(۱) مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ عشقِ حقیقی سے عاشق کو کسی قسم کی دنیاوی

وہاں (فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ گریۂ بے اثر اور نالۂ نارسا کا نتیجہ یا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ دل میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور عاشق کی نگاہ میں یہ کیفیت اس درجہ قیمتی ہوتی ہے کہ وہ اس کے مقابلہ میں تاجِ شاہی تو کیا شے ہے خدائی بھی نہیں قبول کرتا۔ ع

مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

(۲) جب ہمارے دل میں اس کی محبت (اس سے ملنے) کا جذبہ موجزن ہوا تو اس نے دیر و حرم (بتخانہ اور کعبہ) پیدا کر دیا یعنی ہم سے کہا کہ مجھے ان مقامات میں ڈھونڈو لیکن یہ نکتہ یہ ہے کہ جس طرح ہم اس کے ملنے کے آرزو مند ہیں وہ بھی تو ہم سے ملنے کا مشتاق ہے۔

یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے اور اس کو انہوں نے اپنی تمام تصانیف میں مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زبورِ عجم سے ایک شعر نقل کرتا ہوں ؎

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجو است ÷ چوں ما نیازمند و گرفتارِ آرزو است

مقصد یہ ہے کہ انائے مقید انائے مطلق کا غیر تو ہے نہیں۔ جو غیریت کا یہ احساس (ربط باہمی میں مزاحم ہو۔ اول الذکر تو آخر الذکر ہی کا عکس یا پرتو ہے لہٰذا اصل (خدا) کو اپنے ظل (انسان) سے ملنے کی آرزو ہو تو اس میں کون سی بات تعجب کی ہے؛

(۳) بڑا بلیغ شعر ہے۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ جب دنیا کی پردہ نشین حسین عورتیں (پردگیاں) میرے سامنے ہوئیں تو میں نے ان کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنی طرف دیکھا (تاکہ ان کی طرف نہ دیکھ سکوں) بات یہ ہے کہ میں غیور عاشق ہوں۔ اپنے محبوب کے علاوہ کسی دوسری عورت کی طرف دیکھنا عشق کی توہین سمجھتا ہوں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بے شک ہر شے میں محبوبِ حقیقی کے جمال کا عکس نظر آتا ہے۔ لیکن میں اپنے دل کی دنیا (انفس) کی سیر میں اس قدر منہمک ہوں کہ مجھے اشیائے کائنات کے باطنی حسن (پردگیاں) کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ہے۔ بلکہ اس طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہوتی۔

نوٹ: مطالعہ باطن کو اصطلاح میں انفس اور مشاہدۂ کائنات کو سیرِ آفاق کہتے ہیں اور قرآن حکیم نے دونوں کے مطالعہ یا مشاہدہ کا مشورہ دیا ہے۔

"وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ"

یعنی یقین کرنیوالوں کیلئے ہماری ہستی اور قدرت کی نشانیاں کائنات میں بھی ہیں اور اے صورت مزید کیے خود تمہارے نفوس میں بھی ہیں پس تم غور کیوں نہیں کرتے۔

(۴) بڑا بلیغ شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ میخانہ (خانقاہ) میں ایک مطرب (عارف) نے کیسا دلپذیر نکتہ بیان کیا کہ شراب پینا جرم ہے شراب سازی کوئی جرم نہیں ہے۔

اقبال نے اس شعر میں علم کلام کے مشہور مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خلق شر، شر ہے یا نہیں؟ اقبال کہتے ہیں کہ کسب شر قبیح (خطا) ہے، خلق شر، قبیح نہیں ہے یعنی جائز (روا) ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے لوہا پیدا کیا ہے۔ نہ لوہا بذات خود برا ہے اور نہ لوہے کا پیدا کرنا فی نفسہٖ مذموم ہے لیکن اگر کوئی شخص لوہے کی تلوار بنائے اور پھر اپنے ارادہ اور اپنے اختیار سے کسی بے گناہ کی گردن اڑادے تو اس کا یہ فعل ضرور قبیح یا مذموم (خطا) ہوگا۔ اس کے اس فعل سے لوہے یا لوہے کے پیدا کرنے والے پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا میں "شر" کہیں نہیں ہے الرگ اپنی نادانی سے بعض امور کو شر کا مصداق سمجھتے ہیں۔ اس شعر میں اقبال نے اسی غلطی کی اصلاح کی ہے کہ جسے تم اپنی نادانی سے شر کہتے ہو ہم تمہاری خاطر اسے مانے لیتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے لیکن (بزعم شما) یہ خلق شر فی نفسہٖ مذموم نہیں ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو کہ زہر، سانپ، بچھو، افیون، شیر، چیتا، بھیڑیا یہ سب شر ہیں مہلک ہیں مضر ہیں وغیرہ وغیرہ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی شر نہیں ہے۔ ان کا غلط استعمال ان کو شر میں تبدیل کر دیتا ہے مثلاً افیون اگر طبیب کے مشورہ سے مناسب مقدار میں استعمال کی جائے تو وہ دوا ہے، تریاق ہے مفید ہے اس لیے خیر ہے لیکن وہی افیون، اگر اس کا غلط استعمال کیا جائے گا تو مہلک بن جائے گی۔

لہذا ثابت ہوا کہ پوست افیون کا پیدا کرنا فی نفسہٖ قبیح یا مذموم نہیں ہے اچھا اب ہم اس مرتبہ سے بالاتر ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہارے نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو ساری کائنات "شر" میں تبدیل ہو کر رہ جائے گی۔ مثلاً اگر زہر اس لیے شر ہے کہ اس سے موت وارد ہو سکتی ہے تو دست انسانی، رائفل، آلات جنگ ریل گاڑی، ہوائی جہاز، آلات برقی، دریا، پہاڑ، برف، ابر، ریگستان، درخت آگ، پانی اور عورت سب شر کی فہرست میں داخل ہو جائیں گی۔ کیونکہ ان سب

چیزوں کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ ریل اور ہوائی جہاز کی بنا پر تو چند روز سے اموات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، عورت کا وجود تو زلیخا کے زمانے سے مرد کے حق میں پیامِ موت بنا ہوا ہے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے وہ وہ کون سا دن نہیں بلکہ کون سا لمحہ ایسا گذرا ہے جب کسی نہ کسی مرد کا سر کسی نہ کسی عورت کے چرنوں میں بھینٹ نہ چڑھایا گیا ہو؟ کیا قائلین شر اپنے نظریہ کے مطابق عورت کے وجود کو شر قرار دینے کے لیے تیار ہیں؟ اگر جواب اثبات ہے تو وہ اس شر کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کیا کوشش کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ اس کے وجود کو شر نہیں سمجھتے اور جب یہ بات ثابت ہو گئی تو ہمارا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ خلقِ شر، شر نہیں ہے، کسبِ شر، شر ہے۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کا غلط استعمال اسے شر نہ بنا دے۔ اگر خلقِ شر کو شر تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان، یہ چاروں "شر" کا سب سے بڑا منبع قرار پائیں گے۔ حالانکہ کوئی ہوش مند انہیں شر نہیں قرار دے سکتا۔

(۵) عاشقوں کی زندگی ہر وقت مجاہدہ باطنی اور جہاد فی سبیل اللہ میں بسر ہوتی ہے۔ دیکھو! موجوں کو کبھی قرار نصیب نہیں ہوتا، نیز جس طرح موجوں کی کوئی منزلِ مقصود نہیں ہوتی، بس ہر وقت تڑپنا اور ابھرنا ہی ان کا مقصدِ حیات ہے، اسی طرح ہر وقت تڑپنا اور جدوجہد کرنا، عاشق کی زندگی کا مقصد ہوتا ہے سے

ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

(۶) کہتے ہیں کہ مرشد رومی نے یہ کہہ کر کہ "منزلِ ما کبریاست" میرے اندر عشقِ الٰہی کی آگ بھڑکا دی۔ مولانا کا وہ شعر جس میں "منزلِ ما" مذکور ہے یہ ہے:

ما ز فلک برتریم وز ملک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم منزلِ ما کبریاست

یعنی ہم چونکہ ذاتی مجد و شرف کے اعتبار سے کائنات (فلک) اور فرشتے دونوں سے افضل ہیں اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان سے بالاتر ہو جائیں کیونکہ ہماری منزلِ مقصود تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اقبال نے اس شعر میں، رومیؒ کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ انہوں نے مجھے مسلمان کے نصب العین سے آگاہ کیا۔

سوزِ سخن ز نالۂ مستانۂ دل است
ایں شمع را فروغ ز پروانۂ دل است
مشتِ گلیم و ذوقِ فغانے ندا شتیم
غوغائے ما ز گردشِ پیمانۂ دل است
ایں تیرہ خاکداں کہ جہاں نام کردہ ٔ
فرسودہ پیکرے ز صنم خانۂ دل است
اندر رصد نشستہ حکیم ستارہ بیں
در جستجوے سرحدِ ویرانۂ دل است
لاہوتیاں اسیر کمندِ نگاہِ او
صوفی ہلاکِ شیوۂ ترکانۂ دل است
محمود غزنوی کہ صنم خانہ ہا شکست
زنّاریٔ بتانِ صنم خانۂ دل است
غافل تر ے زمرد مسلماں ندیدہ ام
دل در میانِ سینہ و بیگانۂ دل است

نوٹ:۔ اقبال نے یہ ساری غزل، دل کی شئونِ مختلفہ کی توضیح و تشریح میں لکھی ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کی نظر میں دل ہی سب کچھ ہے۔ اسی کی بدولت سخن میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہوتا ہے اور انسان میں ذوقِ فغاں کارفرما ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ دنیا، صنم خانۂ دل ہی کا ایک فرسودہ پیکر ہے جسے باہر نکال دیا گیا ہے۔ یعنی اگر دل نہ ہوتا تو نہ کہیں یہ دنیا ہوتی اور نہ اس کے ہنگامے ہوتے ۱۲

(۱) اقبال نے غالباً ۱۹۰۵ء میں یہ شعر کہا تھا:۔

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے ٭ یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

پندرہ سولہ سال کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب دیا ہے کہ ع

سوزِ سخن ز نالۂ مستانۂ دل است

یعنی جب دل میں عشق کا جذبہ برانگیختہ ہوتا ہے تو سخن میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعری کو شمع قرار دے کر دل کو پروانہ بنایا ہے یعنی جب تک دل میں عشق (پروانہ کا رنگ) جلوہ گر نہ ہو، شاعری کی شمع کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۲) ہم کیا ہیں؟ ایک مشت گل ہیں اور خاک (مٹی) میں عاشقی کا جذبہ پیدا

ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہمارے اندر جو یہ عشق کا جذبہ نظر آتا ہے یہ سب حضرت دل کا کرشمہ ہے یعنی جسم مادی، مرکز عشق نہیں بن سکتا کیونکہ اس میں تو یہ صلاحیت ہی نہیں ہے ہاں دل چونکہ غیر مادی ہے اس لیے وہ اس جذبہ کا مرکز بن سکتا ہے۔

(۳) یہ مادی (تیرہ) دنیا جسے جہان کہتے ہیں، بذات خود کوئی ہستی نہیں رکھتی حقیقت حال یہ ہے کہ دل کے اندر ایسے ہزاروں جہان (صنم) آباد ہیں انہی اصنام (جہانوں) میں سے ایک فرسودہ صنم کو باہر نکال دیا گیا ہے۔ اور لوگوں نے اس پرانی گھسی ہوئی صورت کو "جہان" سے تعبیر کر دیا ہے۔ ورنہ اس جہان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس شعر میں اقبال نے اپنے محبوب موضوع کو باندازِ دگر پیش کیا ہے کہ باہر کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے اندر ہی ہے اور یہ دنیا ہمارے باطنی احساسات کا نتیجہ ہے یعنی اگر ہم اپنے حواس خمسہ سے اس کا احساس نہ کرتے تو اس کا خارج میں کوئی وجود متحقق نہ ہوتا۔ مثلاً اگر ہمارے اندر دیکھنے کی قوت نہ ہوتی تو دنیا میں رنگ کا وجود نہ ہوتا۔ اور سننے کی قوت نہ ہوتی تو آواز کہاں ہوتی؟ اور سونگھنے کی قوت نہ ہوتی تو خوشبو اور بدبو کو کون جانتا؟ اور چکھنے کی قوت نہ ہوتی تو میٹھاس کھٹاس کا احساس کیسے ہوتا؟

آپ ایک ایسا آدمی فرض کریں جو حواس خمسہ سے محروم ہو، آپ لاکھ کوشش کریں کہ مگر وہ روشنی، آواز، رنگ و بو، ذائقہ، شیرینی، تلخی، نرمی، درشتی، سردی گرمی، لطیف، کثیف، کسی شئی کا احساس نہیں کر سکتا اور دنیا انہی احساسات کے مجموعہ کا نام ہے۔ بالفاظِ دگر اس کے لیے اس دنیا کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے۔ اب اگر تمام انسان حواس خمسہ سے عاری ہو جائیں تو کائنات کا تحقق کیسے ہو سکے گا؟ اسی کو مسلک تصوریت کہتے ہیں اور اقبال اسی مسلک کے علمبردار ہیں۔

مرزا بیدل نے اس مضمون کو اس شعر میں نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اور یہ شعر خود اقبال کو اس قدر پسند آیا کہ اس پر ایک نظم بطور تضمین لکھدی جو ضرب کلیم کے ص ۱۴۱ پر مندرج ہے۔ بہر کیف وہ شعر یہ ہے:۔

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود

یعنی دل (مینا) میں وسعت کم تھی اس لیے کائنات (رنگ مے) مینا سے باہر نظر آرہی ہے اگر دل میں کافی وسعت ہوتی تو باہر کچھ بھی نہ ہوتا باہر اگر کچھ نظر آرہا ہے تو اس لیے نہیں کہ باہر بھی کچھ ہے، بلکہ محض اس لیے کہ اندر (دل میں) گنجائش نہ تھی اس لیے اندر کا کچھ سامان باہر نکال دیا گیا۔

(۴) شعر تو آسان ہے مگر اس میں "ویرانۂ دل" کی ترکیب غور طلب ہے چونکہ دنیادار انسان کے دل میں ہزاروں تمنائیں کارفرما ہوتی ہیں اس لیے شعرا ایسے دل کو آباد قرار دیتے ہیں لیکن عاشق کے دل میں محبوب کے تصور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اس لیے شعرا اسے "ویرانہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور جب کسی شخص کا دل غیر اللہ کے تصور سے خالی ہو جاتا ہے یعنی ویران ہو جاتا ہے تو اس میں اس قدر وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات اس کے ایک گوشہ میں سما سکتی ہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رکھ کر اب اس شعر کو پڑھیے تو مطلب بالکل واضح ہو جائے گا۔ یعنی ایک ہیئت دان جب رصدگاہ میں بیٹھ کر کائنات کی وسعت کا اندازہ کرتا ہے تو دوسرے لفظوں میں وہ دل کی سرحدوں کی جستجو کرتا ہے یعنی جس طرح یہ کائنات غیر محدود ہے اسی طرح دل کی دنیا بھی غیر محدود ہے۔

(۵) لاہوتیاں سے عالم لاہوت مراد ہے جو عالم ناسوت، ملکوت اور جبروت ان تینوں عالموں سے بالاتر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل چونکہ مرکز عشق ہے اس لیے اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ عالم ناسوت کے علاوہ عالم لاہوت کو بھی مسخر کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ صوفی (سالک) ایسے دل کے حصول کا آرزومند ہوتا ہے "ہلاکِ شیوۂ ترکانہ" کنایہ ہے کسی مقصد کے حصول کی آرزو سے۔

(۶) دل (عشق) کی قوت تسخیر کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محمود غزنوی بھی جس نے بہت سے صنم کدے ویران کر دیے، دل (عشق) کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔ "زناریٔ بتاں" کنایہ ہے اتباعِ مسلکِ عشق سے۔

(۷) کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں مسلمان سے زیادہ غافل کسی کو نہیں پایا۔ دوسرے مصرعہ میں اس دعویٰ پر دلیل ہے کہ اس کی غفلت شعاری کا ثبوت یہ ہے کہ دل جیسی بے بہا دولت اس کے پاس (سینہ میں) ہے اسکے باوجود وہ اس سے بے گانہ ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ

(۱) اسلام دراصل عشقِ رسول کا دوسرا نام ہے۔ یعنی مسلمان کا مذہب ہی عشق ہے۔

(ب) اس لیے ہر مسلمان کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ مسلک عشق پر گامزن ہو۔

(ج) اس کے باوجود مسلمان عشقِ رسول سے بے گانہ ہے۔

(د) لہٰذا ثابت ہو گیا کہ دنیا میں کوئی قوم اس سے بڑھ کر غافل نہیں ہے۔

سطوت از کوہ ستانند و بکاہے بخشند
گل رخیم گلی گدائے سرراہے بخشند
در رہِ عشق فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست
یدِ بیضائے کلیمے بسیاہے بخشند
گاہ شاہی بجگر گوشۂ سلطان ندہند
گاہ باشد کہ بزندانی چاہے بخشند
فقر را نیز جہاں بان و جہاں گیر کنند
کہ بایں راہ نشیں تیغ نگاہے بخشند
عشق پامالِ خرد گشت و جہاں دیگر شد
بود آیا کہ مرا رخصت آہے بخشند

(۱) مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی حقیر اور فرومایہ کیوں نہ ہو، مسلک عشق اختیار کرے تو اس میں سطوتِ کوہ (غیر معمولی طاقت اور شوکت) پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اگر ایک فقیر (گدائے سرراہ) اس مسلک پر عامل ہو جائے تو اسے بادشاہوں کی سی عظمت اور شان حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) اس شعر کا پہلا مصرع جامیؒ کے اس مصرع سے ماخوذ ہے:۔

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یدِ بیضائے کلیمے کنایہ ہے فوق الفطرت طاقتوں سے روحانیت میں بلند مقام سے۔ بسیاہ کنایہ ہے حبشی یا ادنیٰ درجہ کے انسان سے۔ حضرت بلال حبشیؓ کی ذات بھی مراد ہو سکتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ عاشق کیلئے ذات پات یا علم و فضل یا دولت و ثروت کی شرط

نہیں ہے اگر ایک حبشی مسلکِ عشق اختیار کرے تو وہ بھی روحانیت کے اعتبار سے بلند ترین مقام حاصل کر سکتا ہے۔ کبیر نے اسی نکتہ کو یُوں بیان کیا ہے :۔

جات پات پوچھے نا کوئے ÷ ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

یعنی عشق کی دنیا میں یہ دریافت نہیں کیا جاتا کہ عاشق کی ذات کیا ہے؟ جو شخص بھی ہر (خدا) کا ذکر کرے گا وہ ہر (خدا) کا محبوب ہو جائے گا۔

(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ نہیں ہوتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر بادشاہ بننے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا لیکن انسان (مشیت ایزدی کی بدولت) بادشاہ بن جاتا ہے۔ مثلاً جب حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں ڈال دیا تو بظاہر کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ یہ زندانی سپاہ ایک دن مصر کا بادشاہ بن جائے گا۔ لیکن مشیتِ ایزدی کو چونکہ یہی منظور ہوا اس لیے حضرت یوسف ؑ شاہِ مصر بن گئے۔

(۴) مشیت ایزدی گدائے گوشہ نشین (صاحب فقر) کو بھی جہان بانی اور جہانگیری کا مرتبہ عطا کر دیتی ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جو کام دُنیاوی بادشاہ تیغ و سپر سے انجام دیتے ہیں، فقیر (بندہ مومن) وہ کام اپنی نگاہ سے انجام دے سکتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کی نگاہ میں وہ تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ جو اس کے سامنے جاتا ہے اُسی کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ اسی مضمون کو بالِ جبریل میں یُوں ادا کیا ہے :۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا ÷ یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

(۵) کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں کفر (خرد) کو اس قدر عروج حاصل ہوا ہے کہ اُس نے دین (عشق) کو مغلوب کر لیا ہے یعنی عالم دگرگوں ہو چکا ہے۔ اندریں حالات میرا دل یہ کہتا ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر اب کسی مومن کو آہ کرنے کی ضرور اجازت دیں گے یعنی مشیت ایزدی اب کسی مومن کو ضرور پیدا کرے گی۔ جو عشق (آہ) کی تاثیر دنیا میں ظاہر کرے گا۔ اور اس کی مدد سے دین کو دوبارہ عزت حاصل ہو گی۔

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی
ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بیباک تر نہ در حریم جانِ مشتاقاں
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی
بغارت می بری سرمایۂ تسبیح خواناں را
بشبخونِ دلِ زنّاریاں ترکانہ می آئی
گہے صد لشکر انگیزی کہ خونِ دوستاں ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی
تو بر نخلِ کلیمے بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمعِ یتیمے صورتِ پروانہ می آئی
بیا اقبال جامے از خمستانِ خودی درکش
تو از میخانۂ مغرب ز خود بیگانہ می آئی

(۱) کہتے ہیں کہ خدا نہ مسجد میں ہے نہ مندر میں۔ وہ تو صرف اُن لوگوں کو مل سکتا ہے جو اُس سے محبت کرتے ہیں۔ دُوسرا مصرع اُس حدیث قدسی کا ترجمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میری طرف بقدر یک بالشت بڑھتا ہے میں اُس کی طرف بقدر یک گز بڑھتا ہوں۔ اور جو میری طرف ایک قدم چلتا ہے میں اس سے ملنے کیلئے دس قدم آگے بڑھتا ہوں۔ بھگوت گیتا میں شری کرشن مہاراج بھی یہی اپدیش دیتے ہیں کہ اے ارجن! میں نہ کسی سے محبت کرتا ہوں نہ نفرت، میرے لیے سب افراد یکساں ہیں لیکن جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے تو وہ مجھ میں ہے اور میں اُس میں ہوں۔ (۹-۲۹)

(۲) تغزل کے اعتبار سے بہترین شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ اے محبوب! ہم عاشقوں کے دل میں آزادانہ داخل ہو! آخر تو اس گھر کا مالک ہے پھر چوروں کی طرح ڈرتے ڈرتے کیوں قدم رکھتا ہے! اس شعر کا لطف اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس نکتہ کو مدنظر رکھا جائے کہ حق تعالیٰ سے ملنے کے لیے انسان کو عموماً بہت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ بآسانی کسی عاشق کے دل میں داخل نہیں ہو جاتا۔ شاعر نے خدا کے اس طریق کار کو "دزدانہ می آئی" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اے محبوب! ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کے سوا کسی کی محبت نہیں ہے اس لیے آپ اطمینان کے ساتھ ہمارے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہو جائیں۔

(۳) اے خدا! تو تسبیح خوانوں (مسلمانوں) اور زنّار بندوں (غیر مسلموں) یعنی اپنے سب عاشقوں کا خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، بہت سخت امتحان لیتا ہے۔

(۴) کبھی تو اپنے عاشقوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ میدانِ جنگ میں تیری راہ میں اپنا سر کٹائیں اور کبھی یہ کہ مسندِ ارشاد پر بیٹھ کر لوگوں کو تیری طرف بلائیں۔

(۵) اے خدا! انسان تیری مشیّت کے اسرار کو بھلا کیا سمجھ سکتا ہے! حضرت موسیٰؑ نے تجھ سے خود درخواست کی کہ اے خدا مجھے اپنا جلوہ دکھا دے لیکن تُو نے ان کی یہ التجا قبول نہیں کی۔ اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی التجا کے بغیر از خود اپنا دیدار دکھایا۔ (اشارہ ہے معراجِ نبویؐ کی طرف)

نوٹ:۔ اقبال نے "صورتِ پروانہ" کی وجد آور اور ایمان افروز ترکیب استعمال کرکے کنایۃً یہ بھی واضح کر دیا کہ حقیقتِ محمدیہ شمع ہے اور ذاتِ خداوندی پروانہ ہے۔ اقبال چونکہ خود عشقِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے اپنے مسلک کی تبلیغ کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ راقم الحروف کی رائے میں کلامِ اقبال کی یہی تو وہ ادائیں ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ۱۲

(۶) اس شعر میں اقبال سے وہ مسلمان مراد ہیں جو اپنے دین اور اپنی ثقافت سے آگاہی حاصل کیے بغیر یورپ چلے جاتے ہیں اور وہاں کی غیر اسلامی تہذیب و ثقافت سے متاثر اور مرعوب بلکہ مغلوب ہو کر، اور بسا اوقات ملحد یا اشتراکی بن کر اپنے وطنِ عزیز کو واپس آ کر قوم کے حق میں انگشتِ ششم بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اے اقبال! چونکہ تو یورپ سے مغربی علوم حاصل کرکے آیا ہے جنھوں نے تجھے اسلام سے بیگانہ اور مغربی تہذیب کا دیوانہ بنا دیا ہے اس لیے تو مجھ سے خودی کا سبق پڑھ لے تاکہ تجھے اس حقیقت سے آگاہی ہو سکے کہ اسلامی تہذیب انسان کو روحانیت کے اس بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں حکمائے مغرب کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔

تب و تابِ بتکدۂ عجم نرسد بسوز و گداز من
کہ بیک نگاہِ محمدِ عربیؐ گرفت حجاز من
چہ کنم کہ عقلِ بہانہ جو گرہے بروے گرہ زند
نظرے بگردشِ چشمِ تو شکند طلسمِ مجاز من
نرسد فسوں گریٔ خرد بہ تپیدنِ دلِ زندۂ
ز کنشتِ فلسفیاں درآ بحریمِ سوز و گداز من

(۱) تب و تاب بتکدۂ عجم کنایہ ہے غیر اسلامی تصورات سے۔ محمد عربیؐ کنایہ ہے اسلامی تعلیمات سے۔ اور حجاز زمین کنایہ ہے قلبِ عاشق سے۔ کہتے ہیں کہ سرکارِ مدینہؐ کی پاکیزہ تعلیمات نے آں واحد میں میرے دل و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا ہے کہ اب عجمی تصورات (غیر اسلامی خیالات) میری نگاہ میں بالکل بے قیمت ہو کر رہ گئے ہیں یعنی عاشقِ رسولؐ غیر اسلامی خیالات سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

(۲) اے میرے آقاؐ! میں کیا کروں! یہ عقل بہانہ جو، مجھے دنیا کا پرستار بنانے کیلئے ہر روز نئے نئے حیلے تراشتی رہتی ہے اور نت نئے نئے سبز باغ دکھاتی رہتی ہے۔ اگر میں ایک گرہ کھولتا ہوں تو وہ دوسری گرہیں لگا دیتی ہے یعنی اگر میں عورت کی طرف سے منہ پھیرتا ہوں تو وہ دولت اور جاگیر میرے سامنے پیش کر دیتی ہے اور دبی زبان سے یوں کہتی ہے۔ ع۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

چونکہ میں کمزور ہوں، عقل کی دلفریب باصرہ نواز پیشکش کو رد نہیں کر سکتا، اس لیے آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ چونکہ گیتی نواز ہیں اس لیے میرے حال پر کرم کی نظر فرمائیں تو عقل کا یہ سارا طلسم آں واحد میں پاش پاش ہو جائے گا۔ بس آپ مجھے ایک محبت بھری نگاہ سے دیکھ لیں یعنی اپنا دیوانہ بنا لیں تو میں عقل کی غلامی سے نجات حاصل کر لوں گا۔

(۳) اے مخاطب! عقل کی حیلہ سازیاں، عیاریاں اور فریب کاریاں عاشق کے دل کی تپش کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یعنی عشق میں جو لذت حاصل ہوتی ہے، عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس لیے تو فلسفہ اور منطق کے بتخانہ سے نکل کر سوز و گداز (عشق) کے دائرہ مقدس میں داخل ہو جا یعنی مسلکِ عشق اختیار کرے۔

پیش آئینہ مشو محو جمالِ دگراں
از دل و دیدہ فروشوئے خیالِ دگراں
آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز
آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں
در جہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں
مرد آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا
می تواں کشت بہ یک جامِ زلالِ دگراں

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگہ
ہجر تو خوشتر م آید ز وصالِ دگراں!

نوٹ:۔ یہ غزل مسلسل ہے۔ اس میں اقبال نے مختلف طریقوں سے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ دوسروں کے سہارے زندگی مت بسر کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم قیامت تک اپنی زندگی کے مقصد کو حاصل نہیں کر سکو گے۔ دوسروں کا دستِ نگر یا محتاج ہونا دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا، دوسروں کی غلامی کرنا۔ دوسروں کی اطاعت کرنا، یہ سب باتیں حیوانات (مثلاً فرس، بقر، حمار اور کلب) کی زندگی کی خصوصیات ہیں۔ اگر انسان بھی یہی طریق اختیار کرے۔ تو پھر اس میں اور حیوانات میں کیا فرق رہ جائے گا!

چونکہ "محوِ جمالِ دگراں اور مست خیالِ دگراں" ہونا اقبال کے فلسفۂ خودی کی ضد ہے، اس لیے انہوں نے اپنی ہر تصنیف میں اس طریقِ حیات کی مذمت کی ہے۔ اور انسان کو اس سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔

(۱) اے مخاطب! آئینہ کی طرح دوسروں کے حسن و جمال پر فریفتہ مت ہو، اگر تو اپنی خودی کو ایک نظر دیکھ لے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو خود بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اے مخاطب! دوسروں کا خیال دماغ سے بالکل نکال دے، جو دوسروں کے پاس ہے وہی تیرے پاس بھی ہے۔ مگر تو نے کبھی اپنے مخفی خزانے کی طرف نگاہ نہیں کی۔ اور نگاہ اس لیے نہیں کی کہ دیکھنے کا طریقہ کسی مرشد سے نہیں سیکھا۔

حضرت شاہ بھیک نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

بھیکا بھوکا کوئی نہیں، سبکی گٹھڑی لعل ﷺ گرہ کھول جانتے نہیں، اس بد بھئے کنگال

اے بھیک! دنیا میں کوئی مفلس نہیں یعنی دوسروں کا محتاج نہیں ہے۔ سب کی شخصیت (گٹھڑی) میں ترقی کی صلاحیت (لعل) مخفی ہے۔ لیکن وہ اپنی شخصیت یا خودی کی ترقی کا طریقہ (گرہ کھولنا) نہیں جانتے۔ اس لیے مفلس ہو گئے۔

(۲) اے مسلمان! جو آشیانہ تو نے غیروں کے درخت پر بنایا ہے، اس کو نالۂ مرغانِ حرم کی آگ میں جلا دے یعنی سچے مسلمانوں کی صحبت اختیار کر، تاکہ تجھ میں اس قدر طاقت اور غیرتِ ایمانی پیدا ہو سکے کہ تو غیر اسلامی تصورات کو اپنے دل سے نکال سکے۔ اور غیر مسلموں سے دلی تعلقات منقطع کر سکے۔

(۳) یہ شعر تو میری رائے میں مثنے باقی کی رُوح ہے اور اقبال کا فلسفۂ خودی اسی نکتہ کی تشریح ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو ترقی کرنا (اُڑنا) چاہتا ہے، تو خود اپنے بازوؤں میں طاقت پیدا کر۔ دُوسروں کے بازوؤں کی مدد سے اڑنا تو عقلاً ناممکن ہے یعنی جب تو اغیار سے اڑنے کے لیے بازو (طاقت یا سامان) حاصل کرے گا، تو قبل اس کے کہ تو اُڑ سکے، اُن کا غلام بن جائیگا۔ اور جب تو اُن کا غلام بن گیا۔ تو کتنا ہی عروج کیوں نہ حاصل کرے، غلام ہی رہے گا۔ کیا خوب کہا ہے جگت گیر نے :-

ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں ÷ جس کا ہاتھی اس کا ناؤں

(۴) کہتے ہیں کہ اے مخاطب (مَیں چونکہ مسلمان (مردِ آزاد) ہوں۔ اس لیے اس درجہ غیور ہوں کہ اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے، تو مجھے اغیار کے ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ پلا دے۔

(۵) اے خدا! تو مجھ سے میری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ) اس کے باوجود میری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ تاہم تیرا ہجر مجھے دوسروں کے وصل سے خوشتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ انسانوں سے ارتباط و اختلاط کا نتیجہ ہمیشہ مختلف تکالیف کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اور تو اگرچہ نگاہوں سے پوشیدہ ہے، اس کے باوجود عاشق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ تو رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔

دُوسرا مطلب یہ ہے کہ تیری تلاش میں وہ لطف ہے جو دوسروں کی ملاقات میں بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی ملاقات عارضی اور فانی ہوتی ہے یعنی جُدائی یقینی ہے۔ اور جدائی کا نتیجہ اذیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، لیکن تیری تلاش میں عاشق کو بے اندازہ رُوحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اور یہ مسرت غیر فانی ہوتی ہے کیونکہ تلاش کا سلسلہ جیتے جی ختم نہیں ہو سکتا۔

جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند
ہمیں بس است کہ آئینِ چاکری داند
نہ ہر کہ طوفِ بُتے کرد و بست زنّارے
صنم پرستی و آدابِ کافری داند
ہزار خیبر و صد گونہ اژدر است اینجا

نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند
بچشمِ اہلِ نظر از سکندر افزون است
گدا گرے کہ مآلِ سکندری داند
بعشوہ ہائے جوانانِ ما سیما چیست
در آں حلقہ پیرے کہ دلبری داند
فرنگ شیشہ گری کرد و جام و مینا ریخت
بحیرتم کہ ہمیں شیشہ را پری داند!
چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے
جز ایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند
یکے بہ صنم کدۂ من گذر کن و بنگر
ستارہ سوختۂ کیمیا گری داند!
بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

(۱) آسان شعر ہے یعنی جہانِ عشق میں عاشقوں کو سرداری حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس دُنیا میں جو سردار ہوتا ہے وہ سب کا خادم ہوتا ہے عشقِ صادق، انسان کو خدمتِ خلق پر آمادہ کرتا ہے، چنانچہ فاروقِ اعظمؓ اپنی عدیم المثال سطوت و شوکت کے باوجود غلاموں کی طرح بیواؤں اور مسکینوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ کاش! پاکستان میں بھی اللہ تعالٰی کسی عمر کو بھیج دے!

(۲) کہتے ہیں کہ جب تک انسان میں ذاتی بزرگی موجود نہ ہو، بزرگوں کے سجادہ (مسند) پر بیٹھنے یا ان کے مزار کا طواف کرنے یا جبّہ و عمامہ (زنار بستن) پہن لینے سے کوئی شخص بزرگ نہیں بن سکتا۔

دوسرے معنٰی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ صنم پرستی بھی آسان نہیں ہے ہر وہ شخص جو ایک جنیؤ پہن لے یا کسی بُت کے سامنے ڈنڈوت کرے، بُت پرست نہیں بن سکتا۔ کافری (بت پرستی) میں بھی کچھ قوانین ہیں جن کی اطاعت لازمی ہے اور قوانین کی اطاعت بہر حال بہت مشکل ہوتی ہے کیونکہ قوانین عموماً نفسِ امّارہ کی خواہشات کے خلاف ہوتے ہیں اور نفس کے خلاف عمل کرنا بہت مشکل ہے۔

(۳) سبحان اللہ! کیا بات پیدا کی ہے! کہتے ہیں کہ بازوؤں میں زورِ حیدری پیدا کرنے کے لیے صرف نانِ جویں کھانا کافی نہیں ہے اس کے لیے عشقِ رسولؐ بھی

ضروری ہے یعنی ہر وہ شخص جو نانِ جویں کھاتا ہے حیدرِ کرارؓ نہیں بن سکتا۔

(۴) عقلمندوں کی نظر میں وہ گدا، جو بادشاہت کے انجام سے آگاہ ہے، یعنی یہ جانتا ہے کہ ع "سکندر جب گیا دُنیا سے، دونوں ہاتھ خالی تھے"۔ بلاشبہ سکندر سے کہیں زیادہ لائقِ احترام ہے۔

(۵) نوجوانوں کے عشووں میں کوئی لطف نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کا حُسن چند روزہ ہے اور عشوے غمزے عمر کے ساتھ اچھے معلوم ہوتے ہیں ورنہ

بوڑھے مونہہ مہاسے ✽ رگ دیکھیں تماسے

والا مضمون ہو جاتا ہے جب حُسن غائب ہو جاتا ہے تو ان محبوبوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ جس طرح اُس کنیز کو اُس زرگر سے نفرت ہو گئی تھی، جو "پیش دختر می گداخت"۔ اس لیے اے مخاطب! ان بتانِ نوخیز کے بجائے کسی ایسے پیر کے حلقہ میں شامل ہو جا، جو دلبری کے رموز سے واقف ہو۔ لفظ "پیر" میں ایہام ہے (۱) بوڑھا، جوان کا مدمقابل، (۲) شیخِ طریقت۔

(۶) شیشہ گری (۱) عیاری مکاری جسے موجودہ اصطلاح میں ڈپلومیسی کہتے ہیں (۲) شیشہ یا کانچ کے آلات بنانا۔ جام و مینا ریختن، یعنی شراب نوشی کے لوازم مثلاً صراحی، بوتل، گلاس، پیالہ وغیرہ بنانے۔ کہتے ہیں کہ اہلِ یورپ نے سائنس میں کمال حاصل کر لیا اور بہت سے آلات ایجاد کر لیے۔ یہ بات اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان لوگوں نے بس اسی مادی ترقی کو زندگی کی معراج یقین کر لیا ہے۔

بالفاظِ دگر انھوں نے شراب نوشی کے لیے جام و مینا تو بڑے خوبصورت بنائے ہیں۔ لیکن ان کے پاس شراب بالکل نہیں ہے۔ مجھے ان کی حماقت پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ جام و مینا ہی کو شراب (پری) سمجھتے ہیں اور خالی برتنوں پر پھولے نہیں سماتے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں اقبال نے شیشہ کی رعایت سے "پری" کا لفظ بہت برمحل استعمال کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ محاورہ میں کسی کو رام کرنے کے مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں کہ "کیا پوچھتے ہو! بڑی مشکلوں سے پری کو شیشہ میں اتارا ہے" یعنی بڑی دشواری کے بعد معشوق کو راضی کیا ہے۔

لفظ پری سے معنوی خوبی یہ پیدا ہوئی کہ پری اور شیشہ میں مغائرت ہے۔

اسی طرح شراب اور بوتل میں مغائرت ہے مگر اہلِ فرنگ اپنی حماقت کی بنا پر بوتل کو شراب (شیشہ کو پری) سمجھے بیٹھے ہیں۔

(۷) اے مخاطب! میں تجھ سے دورِ جدید کے مسلمان کے اسلام کا کیا ذکر کروں! مختصراً یوں سمجھ لے کہ پیدا تو مسلمانوں میں ہوا ہے لیکن اس کی زندگی بُت پرستوں کی سی ہے۔

نوٹ:۔ پورِ خلیل بمعنی فرزندِ ابراہیم مُراد ہے وہ شخص جو ان کی ملت میں ہو یعنی مسلمان۔ آذری منسوب بہ آذر۔ آذر نام ہے حضرت ابراہیم کے باپ کا جو بُت پرستوں کا پیشوا تھا۔ آذری سے بُت پرستی مراد ہے۔

(۸) اس شعر میں چونکہ ذاتی حالت کا بیان ہے اس لیے غضب کا طنز پوشیدہ ہے کہتے ہیں کہ اگر تو کبھی مجھ سے ملے تو تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ میری زندگی بڑی عبرت انگیز ہے یعنی میں کیمیاگر ہوں۔ مٹی کو سونا بنا سکتا ہوں۔ لیکن چونکہ بدقسمت (ستارہ سوختہ) ہوں اس لیے کنجِ عزلت اور گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

نوٹ:۔ اقبال کا اپنے متعلق ہمیشہ یہ خیال رہا کہ میں کیمیاگر ہوں۔ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں:۔

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیاگر ہوں ٭ یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

چونکہ وہ کیمیاگر تھے اس لیے انھیں ساری عمر یہ افسوس رہا کہ میری قوم کے نوجوان مجھ سے یہ فن کیوں نہیں سیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جگہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ ع

مرے کام کچھ نہ آیا یہ طریقِ نے نوازی

بہرکیف چونکہ وہ اس فن سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے انھوں نے محل کہ اپنے آپ کو "ستارہ سوختہ" سے تعبیر کیا ہے۔

(۹) آؤ چلیں! اقبال کی مجلس میں بیٹھ کر دو ایک ساغر پیئیں۔ اگرچہ وہ پیروں کی سی وضع قطع تو نہیں رکھتا لیکن تصوف کے اسرار سے آگاہ ہے۔

خواجہ نیست کہ چوں بندہ پرستارش نیست
بندہ نیست کہ چوں خواجہ خریدارش نیست

گرچہ از طور و کلیم است سخن‌ہا حافظ
تابِ آں جلوہ با آئینۂ گفتارش نیست

پیرما مصلحتاً رو بہ مجاز آوردہ است
ورنہ با زہرہ وشاں ہیچ سروکارش نیست

دل بہ او بند و ازیں خرقہ فروشاں بگریز
نشوی صیدِ غزالے کہ ز تاتارش نیست
نغمۂ عافیت از بربطِ من می طلبی؟
از کجا برکشم آں نغمہ کہ در تارش نیست
دلِ ما قشقہ زد و برہمنی کرد و لے
آں چناں کرد کہ شایستۂ زنارش نیست!
عشق در صحبتِ میخانہ بگفتار آید
زانکہ در دیر و حرم محرمِ اسرارش نیست

(۱) دنیا میں کوئی بڑا آدمی (خواجہ) ایسا نہیں ہے جو بندوں (غلاموں) کی طرح اس محبوب کا پرستار نہ ہو اور کوئی چھوٹا آدمی (بندہ) ایسا نہیں ہے جو بڑے آدمیوں (خواجگان) کی طرح اس کے دیدار کا آرزومند نہ ہو۔ یعنی کائنات میں ہر شخص خواہ وہ آقا ہو یا غلام حق تعالیٰ سے ملنے کا مشتاق ہے۔

(۲) اگرچہ جناب واعظ اپنے وعظ میں دیدارِ الٰہی (طور و کلیم) کا تذکرہ اکثر و بیشتر فرماتے رہتے ہیں، لیکن ان کے وعظ کے آئینہ میں اس کے جلوہ کی چمک کہیں دور دور نظر نہیں آتی۔ یعنی اُن کی گفتگو سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خود انھوں نے بھی اپنی زندگی میں کبھی دیدارِ الٰہی کا شرف حاصل کیا ہے۔ ع خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

(۳) اس شعر میں آجکل کے جھوٹے پیروں پر طنز ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے پیر صاحب مصلحتاً مجاز کی طرف مائل ہو گئے ہیں، ورنہ دراصل انھیں زہرہ وشوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ زہرہ وش یعنی وہ عورت جو زہرہ کی طرح حسین و جمیل ہو، اور زہرہ بابل میں ایک نہایت حسین طوائف تھی جس پر ہاروت و ماروت دونوں بیک وقت فریفتہ ہو گئے تھے۔

(۴) اے مخاطب! تو اپنے دل میں خدا کی محبت کو جگہ دیدے اور ان نقلی پیروں سے کنارہ کرے۔ (خرقہ یعنی لباسِ درویشاں) کسی ایسے پیر یا درویش (غزال) کا مرید (صید) مت ہو جانا۔ جو اُس (خدا) کے دربار (تاتار) سے تعلق نہ رکھتا ہو۔

نوٹ:- تاتار کا لفظ غزال سے مناسبت کی بنا پر لائے ہیں کیونکہ تاتار کے ہرن اپنے مشک کیلئے مشہور ہیں۔ ع نکل وطن سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

(۵) اے مخاطب! تو میرے کلام (بربط) میں عافیت اور راحت کا پہلو بے سود تلاش کر رہا ہے۔ میں نے تو قوم کو جہاد کا پیغام دیا ہے۔ اندریں صورت میں اُسے "فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے" کا نغمہ کیسے سُنا سکتا ہوں؟

(۶) اس شعر میں بڑا لطیف طنز پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے اسلام ترک

کرکے کفر اختیار کیا۔ لیکن افسوس کہ ہم کفر میں بھی خلوصِ نیت کا اظہار نہ کر سکے۔ قشقہ زدن یا قشقہ کشیدن۔ ماتھے پر تلک لگانا۔ یہ رسم ہندو دھرم کے شعائر میں سے ہے۔ برہمنی کردن یعنی بت پرستی کرنا۔ زنار یعنی جنیئو یعنی وہ تاگا جو اونچی ذات کے ہندو گلے میں پہنتے ہیں۔ یہ رسم ہندو دھرم کی اہم رسوم یعنی سولہ سنسکاروں میں داخل ہے، اور در اصل ایک ہندو کی مذہبی زندگی کا سنگِ بنیاد ہے۔ یعنی جنیئو پہن لینے کے بعد تمام مذہبی فرائض اس پر عائد ہو جاتے ہیں۔

(۷) میخانہ ــ مجاز عقلی ہے یعنی اربابِ میخانہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عشق کی ماہیت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو دیر و حرم کے بجائے خانقاہ میں جاؤ کیونکہ ان دونوں مقاموں میں کوئی شخص اس کے اسرار کا محرم نہیں ہے یعنی ان کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

بیا کہ بلبلِ شوریدہ نغمہ پرداز است
عروسِ لالہ سراپا کرشمہ و ناز است
نوا ز پردۂ غیب است اے مقام شناس
نہ از گلوئے غزل خواں نہ از رگِ ساز است
کسے کہ زخمہ رساند بتارِ سازِ حیات
ز من بگیر کہ آں بندہ محرمِ راز است
ز رازِ پردگیان جہاں خبر دادند
ولے زباں نکشائیم کہ چرخ کج باز است
سخن درشت مگو در طریقِ یاری کوش
کہ صحبتِ من و تو در جہاں خدا ساز است
کجاست منزلِ ایں خاکدانِ تیرہ نہاد؟
کہ ہر چہ ہست چو ریگِ رواں بپرواز است
تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

(۱) اس شعر میں تغزل کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! بہار کا موسم ہے باغ میں پھول کھلے ہوئے ہیں، بلبلیں ہر سمت چہک رہی ہیں اور گلِ لالہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ دعوتِ تماشا دے رہا ہے۔

(۲) پردہ (۱) حجاب، آڑ یا روک (۲) ستار کے پردے جن پر انگلی رکھنے سے مختلف سُر نکلتے ہیں۔ پردۂ غیب کنایہ ہے فیضانِ سماوی سے۔ مقام شناس (۱) سالکِ راہِ طریقت (۲) ماہرِ فن

موسیقی: کہتے ہیں کہ نغمے میں سوز و گداز کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ نہ تو غزل خواں کے گلے میں پنہاں ہے اور نہ ساز کے پردوں میں، بلکہ اس کا منبع عشق ہے اور عشق کا تعلق نیستانِ ہماری سے ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ موسیقی میں تاثیر ہوتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ یہ تاثیر نہ گلے میں ہے نہ ساز میں، بلکہ خود ہماری روح میں ہے یعنی حق تعالیٰ نے ہر روح کے اندر اپنی محبت کا جذبہ پنہاں کر دیا ہے۔ جب ہماری روح نغمہ سنتی ہے تو اس کے دل میں محبوبِ حقیقی کی یاد چٹکیاں لینے لگتی ہے یعنی جدائی کا احساس شدید ہو جاتا ہے اور اس شدتِ احساس سے دل میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کی روح میں محبت کا جذبہ یعنی جدائی کا احساس فنا ہو جاتا ہے اُن پر موسیقی سے کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ سوز و گداز نہ آواز میں ہے نہ ساز میں، بلکہ خود ہمارے دل میں پوشیدہ ہے۔ اسی نکتہ کو مُرشد رومیؒ نے یُوں بیان کیا ہے :-

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست ؛ از کجامی آید ایں آوازِ دوست !

(۳) محرمِ راز وہ شخص ہے جو زندگی کے تاروں کو چھیڑ سکے یعنی مرشدِ کامل وہ ہے جو مُرید کے دل میں انقلاب پیدا کر سکے۔ یعنی اس کے دل کو زندہ کر سکے۔

(۴) پردگیان یعنی کائنات کے اسرار و رموز جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، کہتے ہیں کہ عشق کی بدولت مجھے اس کائنات کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل ہو گئی ہے لیکن میں اُن کو اس لیے برملا بیان نہیں کرتا کہ فلک میری گھات میں لگا ہوا ہے یعنی اگر میں اسرارِ عشق آشکار کر دوں تو میرا حشر بھی وہی ہو گا جو منصور کا ہوا۔

(۵) اے مخاطب! کسی کے ساتھ درشت کلامی نہ کر بلکہ ہر شخص کے ساتھ محبت کا برتاؤ کر کیونکہ ہم دنیا میں چند روز کے لیے آئے ہیں اور خبر نہیں کب رخصت ہو جائیں گے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکے ہمیں دوسروں کے ساتھ محبت سے پیش آنا چاہیے۔

(۶) اس شعر میں مقامِ حیرت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا معلوم اس دنیا کی منزلِ مقصود کہاں ہے! اتنا تو ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ اس دنیا میں جو شئی بھی ہے وہ ریگِ رواں کی طرح اڑی چلی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس خاکدان کی منزل فنا ہے، دیکھ لو ہر شئے بسرعت تمام فنا کی طرف رواں ہے۔

(۷) اس شعر میں اقبال نے اپنی شخصیت کا تجزیہ کیا ہے کہ حسب و نسب کے لحاظ سے میں کشمیری ہوں، دل (عقائد) کے لحاظ سے حجازی (مسلمان) ہوں اور میری

شاعری میں سعدی اور حافظ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم
در نیلگوں یمے بتلاشِ کنارہ ایم
بود و نبود ماست ز یک شعلۂ حیات
از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم
با ما ازاں بگو کہ ز عقل بلند دست
ما خاکیاں بدوشِ ثریا سوارہ ایم
در حسن غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم
چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن
روبند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم

نوٹ:- یہ غزل مسلسل ہے اس میں اقبال نے انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو آشکار کیا ہے۔

(۱) اگرچہ خودی (روح) جسم کی قید میں ہے مگر "جسم خاکی مانع پرواز نیست" اس لیے ہماری روح ستاروں کی طرح سیار ہے اور فضائے کائنات (یم نیلگوں) میں ہر وقت غیر محدود (ذات مطلق) کی تلاش میں مصروف۔ اس شعر کے دو مطلب ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ ہمارا جسم خاکی ہے اس لیے ایک جگہ ساکن نظر آتا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہر وقت مصروف سیر رہتا ہے۔ یعنی انسان ساکن بھی ہے سیار بھی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم اگرچہ محدود ہیں لیکن خودی چونکہ ذاتِ خداوندی کا پرتو ہے اور ذاتِ مطلق، غیر محدود ہے اس لیے وہ محدود ہونے کے باوجود غیر محدود کی تلاش میں مشغول رہتی ہے۔

(۲) شعلہ کنایہ ہے انائے مطلق سے اور شرر کنایہ ہے انائے مقید سے۔ اقبال نے اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیے اپنے کلام میں خدا اور خودی کو شعلہ اور شرر، بحر اور موج مطلق اور مقید سے تعبیر کیا ہے۔ اس شعر میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے کہ تمام افراد انسانی کی اصل ایک ہی شعلۂ حیات یعنی انائے مطلق ہے۔ انفرادیت کے شوق (لذتِ خودی) نے ہمیں شرر کی طرح شعلہ سے جدا کر دیا ہے۔ یعنی ہم سب اللہ ہی کے پاس سے آئے ہیں اور انجام کار اسی کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

(۳) فرشتوں سے کم ہو کر انسان کو خدا نے عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ اور اس نعمت

کی بدولت ہمیں اُن پر فضیلت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہم نے اسی عقل کی بدولت کائنات کو مسخر کر لیا ہے (بدوشِ ثریا سوار ہستیم)

(۴) روحانیت (عشق) کے اعتبار سے ہم اس قدر لطیف اور نازک ہیں کہ بادِ صبح ہمیں لرزہ براندام کر سکتی ہے اور جسمانیت کے لحاظ سے ہم پتھر کی طرح سخت ہیں۔ یعنی عاشق کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ محبوب کی ذرا سی بے اعتنائی اُسے فنا کر سکتی ہے لیکن وہی عاشق جب دُنیا میں زندگی بسر کرتا ہے تو حیرت انگیز جفاکشی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

(۵) اے خدا! ہم نے نرگس کی طرح اس دنیا میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی ہے لہٰذا اپنی ایک جھلک ہمیں دکھا دے کیونکہ ہم اشتیاقِ دید میں سراپا نظر بنے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر محدود سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے۔

عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا
تپش است زندگانی تپش است جاودانی
ہمہ ذرہ ہائے خاکم دلِ بے قرار بادا
نہ بہ جادۂ قرارش نہ بہ منزلے مقامش
دلِ من مسافرِ من کہ خداش یار بادا
خرد از ہنر کہ بندد بہ نقشِ نارسائی
دلِ ما بروگشائے کہ گسستہ تار بادا
تو جوان خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ می سرایم بہ تو سازگار بادا
چو جہانِ من درائی دگر آرزو نہ بینی
مگر ایں کہ شبنمِ تو یمِ بے کنار بادا

نشود نصیبِ جانت کہ دمے قرار گیرد
تب و تابِ زندگانی بہ تو آشکار بادا

(۱) اس شعر میں اقبال نے خدا تعالیٰ سے یہ دُعا کی ہے کہ عرب اور عجم یعنی تمام اسلامی ممالک کے مسلمانوں کو یہ توفیق عطا فرما کہ وہ میرے کلام (سرشکِ خون اور نفس) سے نئی زندگی حاصل کریں۔ عجم کو رمیدہ بو اس لیے لکھا ہے کہ عجمی ممالک کے مسلمان اسلام کی روح سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں۔

(۲) زندگی یعنی مسلمان کی زندگی دراصل عشقِ رسولؐ کی آگ میں جلتے رہنے اور تڑپتے رہنے کا نام ہے اور یہ تپش انسان کو ابدیت سے ہمکنار کر سکتی ہے اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ایسا کرے کہ میری خاک کے تمام ذرات دلِ بیقرار بن جائیں یعنی میں سراپا عشق بن جاؤں۔

(۳) میرا دل آتشِ عشق میں جل رہا ہے اور عاشق کو کسی جگہ قرار نہیں ہو سکتا اور نہ وہ کسی منزل میں مستقل طور سے قیام کر سکتا ہے کیونکہ قیام کا نتیجہ سکون ہے اور سکون کا نتیجہ موت ہے لہٰذا میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس سفر میں میرے دل کا محافظ ہو کہ وہ کسی حال میں بھی اپنے مقصودِ حیات سے غافل نہ ہو جائے۔

(۴) اے مخاطب! مسلکِ عقل سے ہمیشہ اجتناب کرنا کیونکہ اس کی پیروی کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی و نامرادی ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا دل ہمیں اُس سازِ (عشق) کی طرف لیجاتا ہے جس کے تار خدا کرے ہمیشہ شکستہ ہی رہیں۔ یعنی دل کی پیروی ہمارے اندر عشق کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ سازِ گسستہ تار کنایہ ہے حالتِ بیخودی سے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اتباعِ عقل کا نتیجہ نامرادی ہے اور اتباعِ دل کا ثمرہ مستی اور بیخودی ہے۔

(۵) آخری تین شعر مسلسل ہیں ان میں قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے نوجوان! تیرے اندر ابھی عشق کا رنگ پختہ نہیں ہوا ہے اور میرا کلام رموزِ عاشقی سے معمور ہے خدا کرے تو میرے کلام سے صحیح معنوں میں استفادہ کر سکے۔ یعنی خدا تجھے عشقِ رسولؐ کی دولت سے مالا مال کر دے۔

(۶) جب تو میرے کلام کا مطالعہ کریگا تو یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے گی کہ شاعری سے میرا مقصد یہ ہے کہ تیری شبنم (خودی) یم بیکنار (خدا) کے رنگ میں رنگین ہو جائے۔ یعنی قطرۂ شبنم (سمندر) یم بیکنار کی سی وسعت اختیار کرے۔

(۷) خدا کرے تو ہر وقت عشق کی آگ میں جلتا رہے۔ تجھے کسی گھڑی قرار نصیب نہ ہو۔ تاکہ تیری خودی کے کمالات تجھ پر آشکار ہو سکیں۔ واضح ہو کہ خودی کی مخفی صلاحیتیں صرف عشق کی بدولت بروئے کار آسکتی ہیں۔

نظر تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی
نرسی جز بہ تقاضائے کلیم اللہی
راہ کو راست بجز غوطہ زن اے سالک!
جادہ را گم نکند در تہ دریا ماہی

لہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

حاجتے پیش سلاطیں نبرد مرد غیور
چو تواں کرد کہ از کوہ نیاید کاہی
گفتم از نغمۂ شوقم کہ بیابی ورقے
رمز درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی
نغمہ باز کنند آنچہ بہ گل کرد نسیم
اگر از لذت آہ سحری آگاہی
اے فلک چشم تو بیباک و بلا جوست ہنوز
می شناسم کہ تماشائے دگر می خواہی

(۱) نظر کنایہ ہے حواس خمسہ سے۔ ز کسی یعنی کامیاب نخواہی شد۔ تقاضائے کلیم کنایہ ہے آرزوئے دیدار سے۔ مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! اگر حواس اور خرد کی مدد سے خدا کو نہیں پا سکتا۔ اگر تو کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اپنے اندر وہی جذبہ پیدا کر جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں موجزن تھا یعنی عشق اختیار کر، کیونکہ اس میں یہ طاقت ہے کہ تجھے خدا تک پہنچا سکتا ہے۔

(۲) بہت بلند شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے مانا کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ دشواریوں سے معمور ہے لیکن تو مایوس مت ہو۔ میں تجھے کامیابی کا طریقہ بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تو اپنی خودی میں غوطہ زن ہو۔ جس طرح مچھلی قعر دریا کی تاریکی کے باوجود اپنا راستہ گم نہیں کرتی کیونکہ وہ اس کی فطرت کے مطابق ہے، اسی طرح تو بھی دل کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جا۔ یقین رکھ تو اپنا راستہ گم نہیں کرے گا۔ (کیونکہ یہ طریق کار تیری فطرت کے مطابق ہے)

اس میں نکتہ یہ ہے کہ عشق، راہ بھی ہے منزل بھی ہے، اس لیے جب سالک دل کا دروازہ کھول دیتا ہے (غوطہ لگاتا ہے) تو فوراً منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ راہ کا وجود ہی باقی نہیں رہتا، تو اس کے گم کرنے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گا؟ دشواری جو کچھ ہے وہ غوطہ لگانے میں ہے۔ ادھر غوطہ لگایا، ادھر واصل ہوا، قصہ کوتاہ اس کو دوسری مثال سے یوں سمجھو کہ دشواری جو کچھ لاحق ہوتی ہے وہ محمل تک پہنچنے اور پردہ ہٹانے میں ہوتی ہے، ادھر پردہ اٹھایا، ادھر جلوہ نظر آیا۔

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے ٭ کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

(۳) اے مخاطب! کسی بادشاہ (نواب، جاگیردار، زمیندار، سرمایہ دار) کے سامنے دست سوال دراز مت کر کیونکہ سوال کرنے سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے، یاد رکھ مسلمان (مرد غیور) کبھی کسی بادشاہ سے سوال نہیں کرتا۔ کیوں! اس لیے کہ مسلمان اگر وہ کبھی غلامی

رکھا ہی نہیں کر سکتا۔ کرہ کبھی کاہ نہیں بن سکتا۔ مسلمان کبھی دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر سکتا یا اظہار عاجزی نہیں کر سکتا وہ صرف خدا کے سامنے جھک سکتا ہے۔

(۴) اے مخاطب! میرے کلام سے بے اعتنائی مت کر کیونکہ میں نے اس میں درویشی (دین) اور شاہنشاہی (دنیا) دونوں کے حصول کا طریقہ بتا دیا ہے۔

(۵) اگر تو لذت آہِ سحر سے آگاہ ہو جائے یعنی اگر تو اپنے دل میں جذبۂ عشق پیدا کرے تو پھر میرا کلام تیرے حق میں وہی ثابت ہوگا جو نسیم غنچہ کے حق میں ثابت ہوتی ہے۔

نوٹ:۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اقبال نے یہ نہیں کہا کہ میرا کلام تیرے اندر جذبۂ عشق پیدا کر دیگا بلکہ یہ کام خود طالب کو کرنا پڑیگا کیونکہ اگر ہمارے اندر صلاحیت ہی دوسرا پیدا کر دے اور پھر تاثیر بھی غیر ہی کی طرف سے آئے۔ تو ہم نے کیا کیا؟

اسی لیے قرآن حکیم نے یہ قانون نافذ فرمایا ہے کہ پہلے بندہ اپنے اندر ہمت اور اختیار سے کام لیکر استعداد پیدا کرے، پھر اللہ تعالیٰ یا رسولؐ یا مرشد تاثیر (تبدیلی) پیدا کریگا۔ مسلمانانِ عالم اس نکتہ سے غافل ہو کر دین و دنیا دونوں میں ذلیل ہو گئے ہیں۔

(۶) اے فلک! میں دیکھ رہا ہوں کہ تیری آنکھ میں ہنوز بے باکی اور خونریزی کا رنگ جھلک رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو پھر کوئی نیا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں اقبال نے دوسری جنگ عظیم کی پیشگوئی کی ہے اور مرحوم کی بصیرت لائق تحسین ہے کہ انہوں نے سترہ سال پہلے حالات زمانہ کی رفتار سے معلوم کر لیا تھا کہ عنقریب دوسری عالمگیر جنگ برپا ہوگی۔

سرخوشی از بادۂ تو خم شکنے نیست کہ نیست
مستِ لعلین تو شیریں سخنے نیست کہ نیست
در قبائے عربی خوشتر ک آئی بہ نگاہ
راست بر قامتِ تو پیرہنے نیست کہ نیست
گرچہ لعلِ تو خموش است ولے چشمِ ترا
با دلِ خون شدۂ ما سخنے نیست کہ نیست
تا حدیثِ تو کنم بزم سخن می سازم
ورنہ در خلوتِ من انجمنے نیست کہ نیست

اے مسلماں دگر اعجاز سلیماں آموز
دیدہ بر خاتم تو اہرمنے نیست کہ نیست

نوٹ: یہ غزل اقبال نے حافظ کی اُس غزل کے جواب میں لکھی ہے جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے سہ

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست ٭ منتِ خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

(۱) آسان شعر ہے مطلب یہ ہے کہ اے محبوب! دنیا میں وہ کونسا انسان ہے جو تیری محبت کی شراب سے مست نہیں ہے۔ اور وہ کونسا شیریں سخن رشاعر ہے جو تیرے سُرخ ہونٹوں پر متوالا نہیں ہے۔ خم شکن یعنی بلانوش، وہ شخص جو مٹکے کا مٹکا چڑھا جائے۔ لعلین کنایہ ہے لب لعلین سے پہلے زمانہ میں معشوقوں کے ہونٹ، لعل کی طرح سُرخ ہوا کرتے تھے۔

(۲) اے محبوب! اگرچہ تو ہر لباس میں دلکش معلوم ہوتا ہے لیکن جب عربی لباس پہن لیتا ہے تو تیرے حسن و جمال میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ قبائے عربی کنایہ ہے اسلامی تہذیب و ثقافت سے۔

(۳) اگرچہ تیرے ہونٹ خاموش ہیں لیکن تیری آنکھیں سرگرم گفتگو ہیں بلکہ دنیا جہان کی باتیں کر رہی ہیں۔

(۴) اے محبوب! میں نے جو یہ محفل آراستہ کر رکھی ہے اس کا باعث یہ ہے کہ میں لوگوں سے تیری گفتگو کرنی چاہتا ہوں، ورنہ وہ کونسی انجمن ہے جو میری خلوت میں نہیں ہے یعنی میں تو اپنی خلوت میں گھنٹوں، پہروں تجھ سے مسلسل گفتگو کرتا رہتا ہوں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا ٭ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(۵) اے مسلمان! تو از سر نو اپنے اندر جنات (روشنان دین) کو مسخر کرنے کی طاقت پیدا کرے۔ کیونکہ اس زمانہ میں وہ کونسا دشمن دین (اہرمن) ہے جو تیرے ایمان (خاتم) پر ڈاکہ ڈالنے کیلئے آمادہ نہیں ہے؟ اعجاز سلیمان کنایہ ہے طاقت تسخیر جنات سے۔

اگرچہ زیب سرش افسر و کلاہے نیست
گدائے کوئے تو کمتر ز پادشاہے نیست

بخواب رفتہ جوانان و مردہ دل پیراں
نصیب سینۂ کس آہ صبحگاہے نیست

بایں بہانہ بہ دشتِ طلب زپا منشیں
کہ در زمانۂ ما آشنائے راہے نیست

ز وقت خویش چہ غافل نشستۂ دریاب
زمانہ کہ حسابش ز سال و ماہے نیست
دریں رباط کہن چشم عافیت داری؟
ترا بکشمکش زندگی نگاہے نیست
گناہ ما چہ نویسند کاتبان عمل
نصیب ما ز جہان تو جز نگاہے نیست
بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم
کہ او ز خرقہ فروشان خانقاہے نیست

نوٹ :- یہ غزل بھی اقبال نے حافظ کی اس غزل کے جواب میں لکھی ہے جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے :-

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن ٭ کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

(۱) اے محبوب! یہ سچ ہے کہ تیرے کوچہ کا گدا (عاشق) سر پر تاج نہیں پہنتا، لیکن شان و شوکت اور عروج خلائق کے اعتبار سے وہ کسی بادشاہ سے کم نہیں ہے۔

(۲) افسوس! قوم کے نوجوان تو سو رہے ہیں اور بوڑھوں کے دل الفت دین سے خالی ہو چکے ہیں (آتش عشق سرد ہو چکی ہے)، افسوس! مسلمانوں میں کوئی شخص بھی طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہو کر تہجد نہیں پڑھتا یعنی خدا کی بارگاہ میں آہ و زاری نہیں کرتا۔

نوٹ :- اقبال کے نظام افکار میں آہ صبحگاہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ خود مدتوں تک پچھلی رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے رہے اور بعد نماز انکا معمول تھا کہ بکمال خشوع و خضوع درگاہ باری تعالیٰ میں اپنے اشکوں کا نذرانہ پیش کیا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ آہ سحرگاہی کے بغیر دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو ٭ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی

(۳) اے مسلمان! اس عذر لنگ کی بنا پر اس زمانہ میں کوئی مرشد (آشنائے راہ) نہیں ملتا، تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھ۔ مَنْ جَدَّ وَجَدَ۔ اے مسلمان اگر تو تلاش کرے گا تو کوئی نہ کوئی مرشد تجھے یقیناً مل جائے گا۔

(۴) اے مخاطب! تو اپنے وقت یعنی اپنی زندگی سے اس قدر غافل کیوں ہے؟ اٹھ! اور اس زمانہ کو حاصل کر جس میں نہ سال ہے نہ مہینہ، نہ دن ہے نہ رات، یہ بلاشبہ بہت بلیغ شعر ہے۔ وقت خویش میں صنعت ایہام ہے (۱) اپنا وقت یعنی اپنی زندگی (۲) وقت بمعنی حالت یا مقام (۳) اپنی حقیقت کیونکہ جو شخص وقت کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اپنی حقیقت سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو اپنی خودی کی تربیت کر تاکہ تو حاکم زمان (حکمران

ہو سکے اقبال کے نزدیک حقیقی زمان، اس مسلسل زمان سے بالاتر ایک روحانی حقیقت ہے جس کا ہماری روح کے ساتھ نہایت شدید رابطہ ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے پیام مشرق کی مشہور نظم نوائے وقت، صفحہ ۱۰۲ کا مطالعہ کر لیا جائے ۱۲

(۵) اے طالب! تو اس دنیا میں آسائش اور عافیت کا امیدوار ہے! کیا تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہے کہ یہ دنیا رزمگاہِ حیات ہے۔ یہاں ہر لحظہ تنازع للبقا کا قانون کار فرما ہے۔ اس دنیا میں وہی شخص زندہ رہ سکتا ہے جو ہر وقت جدوجہد کرتا رہے۔ دیکھ لو! جو قومیں عافیت کوش ہوتی ہیں، وہ انجام کار زندہ قوموں کی غلام بن جاتی ہیں۔ شال مصلحتاً نہیں لکھتا ممکن ہے کسی کی دلآزاری ہو جائے۔

(۶) بہت خوب شعر ہے۔ تغزل بھی ہے، فلسفہ بھی ہے کہتے ہیں کہ اے خدا! تیرے فرشتے ہمارے نامۂ اعمال میں اگر کوئی گناہ درج نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ:۔

(۱) ہم تو تیری نگاہِ ناز کے کشتہ ہیں۔ ہم نے تجھے ایک نظر دیکھنے کے بعد پھر کسی کی طرف دیکھا ہی نہیں جو گناہ کا امکان ہوتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تو ایک نگاہ سے بے خود ہو گئے۔ اور جب ہوش نہ رہا تو گناہ یا ثواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۷) آؤ! اقبال کا دامن تھام لیں! اس سے عشق و محبت کا طریقہ سیکھیں، کیونکہ وہ موجودہ زمانہ کے خرقہ فروشوں میں سے نہیں ہے۔ خرقہ فروش کنایہ ہے ان سجادہ نشینوں سے جو "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کے مصداق ہیں اور محض اس لیے خانقاہوں میں مسندِ ارشاد پر فائز ہیں کہ ان کے آباء و اجداد اس مسند پر براجمان تھے۔

شعلہ در آغوش دارد عشقِ بے پروائے من
بر نخیزد یک شرار از حکمت نازائے من
چوں تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز
قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرائے من
بہرہ گیر از ہندوستاں آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من
تیغِ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّائے من

گردشے باید کہ گردوں از ضمیرِ روزگار

دوشِ من باز آورد اندر کسوتِ فردائے من

از سپہرِ بارگاہت یک جہاں وافر نصیب

جلوۂ داری دریغ از وادیٔ سینائے من!

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار

یا رسول اللہ! او پنہان و تو پیدائے من!

نوٹ:۔ اس غزل میں (جو اس مجموعہ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے) اقبال نے سرکارِ دو عالم صلعم کی خدمت میں اُن جذبات کا والہانہ انداز میں اظہار کیا ہے جو مرحوم کے دل میں حضورؐ سے محبت کی بنا پر موجزن تھے۔ اور یہ جذبات اُن تمناؤں پر مشتمل ہیں جو مرحوم کے سینہ میں تا دمِ وفات پوری شدت کے ساتھ کار فرما رہیں۔

اس غزل میں پہلے دو شعر بطور تمہید لکھے ہیں اور تیسرے شعر سے آخری شعر تک حضورِ انور صلعم سے براہِ راست مخاطبہ کی عزت حاصل کی ہے۔ ان اشعار کو پڑھنے کے بعد یہ مصرع بے اختیار زبان پر جاری ہو جاتا ہے:۔

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

(۱) پہلے مصرع میں عشق کی ماہیت بیان کی ہے کہ وہ شعلۂ درآغوش ہوتا ہے۔

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی ❊ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اور چونکہ عشق مجسم آتش ہوتا ہے اس لیے عاشق کو بے پروا یعنی بیباک اور جسور بنا دیتا ہے دوسرے مصرع میں مقابلۃً عقل کی ماہیت واضح کی ہے کہ عقل، انسان کے دل میں کسی قسم کا جوش یا ولولہ پیدا نہیں کر سکتی (یعنی اُسے سرکف ہونے پر مائل نہیں کر سکتی) اور اسی لیے اُسے "نازا" یعنی بانجھ قرار دیا ہے۔

(۲) عقل پر عشق کی برتری ثابت کرنے کے بعد دوسرے شعر میں عشق کا ثمرہ بیان کرتے ہیں کہ جب عاشق (نیاز) اپنے عشق کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے تو عاشق خود معشوق (ناز) بن جاتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب لوہا اپنے آپ کو آگ میں فنا کر دیتا ہے تو اس میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔ بس اسی طرح عاشق میں معشوق کی صفات جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ یہ مفہوم ہے "نازی گر دو نیاز" کا۔

اس تو ضیح سے اقبال کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان اپنے آپ کو سرکارِ دو عالم صلعم

کی محبت میں فنا کر دے جسے اصطلاح میں فنا فی الرسول کا مقام کہتے ہیں، تو اس میں حضور انور صلعم کی صفات کا عکس نمایاں ہو جائے گا۔ یعنی قیس خود لیلیٰ بن جائے گا۔ افسوس! مرحوم کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

(۳) اب شاعر تخیل کے پر لگا کر اڑتا ہے اور روضۂ مقدسہ پر حاضر ہو کر مواجہ شریف میں کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے آقا اور مولا! میں ہندوستان سے چل کر حضور کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی دہلیز مبارک پر وہ سجدے ادا کروں جو مدتوں سے میری ناصیہ پیشانی میں تڑپ رہے ہیں۔ یعنی میں مدتوں سے سجدہ پاشی کے لیے بیتاب تھا۔

(۴) اے میرے آقا! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ تیغ لا مجھے عطا فرما دیجیے تاکہ میں دنیا کو "الا" کا دلنواز اور روح افروز نقشہ دکھا سکوں یعنی میرے دل سے غیر اللہ کی محبت نکال دیجیے تاکہ میں دنیا میں اللہ کے نام کو بلند کر دوں۔

واضح ہو کہ لا اور الا سے کلمہ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ مراد ہے۔ یعنی ساری کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود ہے نہ مطلوب ہے نہ مقصود ہے نہ موثر فی الوجود ہے اور نہ حقیقی معنی میں کوئی موجود ہے۔ اس بات کے کہنے سے اقبال کا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہو جائے کہ ساری کائنات میں کوئی ہستی معبود سے بالا نہیں ہے (لَا اِلٰہَ) سوائے اللہ کے جو واحد لاشریک ہے (اِلَّا اللہ) تو وہ ساری کائنات پر حکمران ہو جائے گا۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت اُسے مغلوب نہیں کر سکے گی۔ وہ کسی طاقت کے سامنے اپنا سر نہیں جھکا سکے گا۔ اور یہی اس کلمہ طیبہ کا حقیقی مفہوم ہے جس سے وہ ایک ہزار سال سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اسی مفہوم کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے:۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا ٭ اُتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِیْکَ لَہٗ

(۵) آپ مجھے عمل کی توفیق عطا فرمائیں تاکہ میں آسمان کو ایسی گردش دے سکوں کہ وہ میرے مستقبل کے لباس میں میرے ماضی کو جلوہ گر کر سکے۔ یعنی میں دنیا میں قوم کو آمادہ سعی کر سکوں تاکہ مستقبل قریب میں اسلام کی گذشتہ عظمت و شوکت کا نقش پھر تازہ ہو سکے اور ملت کو وہی سربلندی حاصل ہو سکے جو گذشتہ زمانہ میں حاصل تھی۔

(۶) اے میرے آقا! آپ کی بارگاہِ عالیہ سے ساری کائنات فیض یاب ہو رہی ہے حضور واسطہ ہیں بین الخالق والمخلوق ایسی یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے وادی سینائے من (اپنی شان کریمی کی تجلی) سے محروم رکھیں گے؟ دوسرے مصرع میں بظاہر استفہام کا رنگ نظر آتا ہے مگر در اصل استفہام کے پردہ میں شاعر اپنے یقین کا اظہار کر رہا ہے۔

(۴) آخری شعر میں اقبال نے اپنا مسلک واضح کر دیا ہے۔ یعنی اے میرے آقا! میں نہ تو براہ راست خدا تک پہنچ سکتا ہوں اور نہ اس سے ہمکلام ہو سکتا ہوں کیونکہ وہ پردے میں ہے بلکہ میں نے اسے دیکھا نہیں لہٰذا اس سے خطاب کروں تو کیسے؟ لیکن آپ تو میری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں یعنی آشکار ہیں۔ اس لیے خدا سے عرض کروں گا تو بالواسطہ اور آپ سے عرض کروں گا تو بلاواسطہ۔

نوٹ:۔ میں نے ایک دفعہ حضرت علامہؒ سے اس شعر کا مفہوم دریافت کیا تھا تو انہوں نے میرے سوال کے جواب میں ایک تقریر کی تھی جو میری ڈائری میں محفوظ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے کبھی مجھ کو ملفوظات اقبال شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائی تو یہ تقریر اور دوسرے جواہرات تمام و کمال قرینے کے ساتھ سجا کر تشنگانِ علم کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے یہ نکتہ بھی بیان کیا تھا کہ عقل تو کسی شخص کو لیس خدا کی ہستی کا یقین نہیں پیدا کر سکتی۔ میں اگر خدا پر ایمان رکھتا ہوں تو محض اس لیے کہ میرے آقا و مولیٰ یہ فرماتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اس کے بعد ان پر حسب معمول رقت طاری ہو گئی۔ اگر حضورؐ کا وجود نہ ہوتا تو ہم کہاں ہوتے! میرے لیے جو کچھ ہیں وہ حضور ہی ہیں۔ میرا دین، میرا ایمان، میری روح، میری جان سب کچھ آپ ہی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

قوّتِ قلب و جگر گردد نبیؐ ؎ از خدا محبوب تر گردد نبیؐ ؎

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی ظاہری وضع و قطع کو دیکھ کر کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص عشق رسولؐ میں سرتاپا غرق ہے لیکن کچھ مدت تک قریب سے دیکھنے کے بعد اس شعر کی صداقت آشکار ہو جاتی تھی۔

بیا بمجلس اقبالؔ و یک دو ساغر کش ؎ اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

راقم الحروف اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ اقبال قلندری (عاشقی) سے خود بھی آگاہ تھے اور انہوں نے اس دور مادیت میں مغرب زدہ مسلمانوں کو بھی اسکے اسرار و رموز سے آشنا کیا۔ اور ان کا یہ احسان اتنا عظیم الشان ہے کہ ملت اسلامیہ صدیوں تک اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گی۔ وہ خود کہتے ہیں:۔

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے ؎ کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

بتانِ تازہ تراشیدۂ دریغ از تو
درونِ خویش نہ کاویدۂ دریغ از تو
چناں گداختۂ از حرارتِ افرنگ
ز چشمِ خویش تراویدۂ دریغ از تو
بچیزے کہ دہد خاک را بہائے بلند
بہ نیم غمزہ نیرزیدۂ دریغ از تو
گرفتم ایں کہ کتابِ خرد فرو خوانی
حدیثِ شوق نہ فہمیدۂ دریغ از تو
طوافِ کعبہ زدی گردِ دیر گردیدی
نگہ بخویش نہ پیچیدۂ دریغ از تو

نوٹ:- اس مسلسل غزل میں اقبال نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ یہ ساری غزل تاسف کے ان جذبات کی آئینہ دار ہے جو مرحوم کے دل میں ملت کی تغافل شعاری کی بناء پر موجزن رہتے تھے اور انہی جذبات نے ان کو مرتے دم تک قلق اور اضطراب میں مبتلا رکھا۔ کہتے ہیں کہ

(۱) اے مسلمان! افسوس ہے تجھ پر کہ تو نے نئے بتوں کی پرستش شروع کر دی اور کبھی اپنی خودی کی تربیت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر تو اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا، تو وہ بت (انگریز) جن کی پرستش تیرا مقصدِ حیات ہے، خود تیری پرستش کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

(۲) اے مسلمان! افسوس ہے تجھ پر کہ تو اپنی غفلت شعاری اور نادانی اور اپنے آقا سے غداری کی بدولت انگریزوں کی غلامی میں مبتلا ہو گیا اور ان دشمنانِ اسلام نے تجھ کو کفر کی بھٹی میں جھونک دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تو بالکل پگھل گیا اور آنسو بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ گیا۔ یہ شعر بہت بلیغ ہے۔ چند لفظوں میں اقبال نے ان تمام مظالم کی داستان قلمبند کر دی ہے جو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک مسلمانوں پر محض اس لیے روا رکھے کہ وہ مسلمان ہیں یعنی غازی نورالدین زنگی اور غازی صلاح الدین ایوبی کے ہم مذہب ہیں۔ چنانچہ اللہ اور رسول ﷺ کے ان علانیہ دشمنوں نے مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ بنانے کیلئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی اور چونکہ نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سجادہ نشینوں، موروثی پیروں، نقلی صوفیوں، ضمیر فروش علماء، خطابات کے امیدواروں اور مناصبِ عالیہ کے طلبگاروں نے

ملت اسلامیہ کے ان دشمنوں کی ہر طرح تائید کی، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو اسلام اور قرآن یعنی سرکارِ دو عالم ؐ کی محبت سے بالکل بیگانہ بنا دیا۔ اس بیگانگی کو اقبالؔ نے "گداختن از حرارتِ افرنگ" سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) اے مسلمان! افسوس ہے تجھ پر کہ عشق و محبت کے بازار میں تیری قیمت ایک کوڑی بھی نہیں ہے یعنی تو اگر محبوبؐ کے کوچہ میں جائے اسرار و حیاں اور خان بہادر اور کے سی ایس آئی اور جاگیروں کی سند کے ساتھ تو حضورؐ تیرے ناپاک وجود کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں فرمائیں گے کیونکہ تیرا یہ وجود اس دولت کا نتیجہ ہے جو تو نے اللہ اور اس کے رسول سے غداری کر کے جاگیروں کی شکل میں انگریزوں سے حاصل کی ہے۔

(۴) میں نے مانا تو نے انگریزوں کے قائم کردہ کالجوں میں فلسفہ اور سائنس کا بہت مطالعہ کیا ہے لیکن افسوس ہے تجھ پر کہ تو نے عشقِ رسول ؐ کا فلسفہ بالکل نہیں سمجھا۔ اور جب تو عاشقِ رسول ؐ نہیں ہے، تو کچھ بھی نہیں ہے۔

(۵) اے مسلمان! ساری عمر انگریزوں کی غلامی میں بسر کرنے کے بعد اور ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کرنے کے بعد تو نے کعبہ کا طواف بھی کیا اور واپس آکر پھر انگریز کی چوکھٹ پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اگرچہ و زیرِ گردیدی! لیکن افسوس کہ تو نے کبھی اپنی خودی کی تربیت کی طرف توجہ نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تو ساری عمر اندھا ہی رہا۔ اور قرآن حکیم کا یہ فیصلہ ہے:۔ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ یعنی جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا۔ بالفاظِ دگر تیری پوری زندگی اکارت چلی گئی۔

maablib.org

حصهٔ چهارم

نقش فرنگ

پیام

از من ای باد صبا گوی بدانای فرنگ
عقل تا بال گشود است گرفتار تر است
برق را این بجگر می‌زند آن رام کند
عشق از عقل فسون پیشه جگردار تر است
چشم جز رنگ گل و لاله نبیند ورنه
آنچه در پردهٔ رنگ است پدیدار تر است
عجب آن نیست که اعجاز مسیحا داری
عجب این است که بیمار تو بیمار تر است
دانش اندوخته‌ای دل ز کف انداخته‌ای
آه زان نقد گرانمایه که درباخته‌ای
حکمت و فلسفه کاری است که پایانش نیست
سیلی عشق و محبت به دبستانش نیست
بیشتر راه دل مردم بیدار زنند
فتنه‌ای نیست که در چشم سخندانش نیست
دل ز ناز خنک او به تپیدن نرسد
لذتی در خلش غمزهٔ پنهانش نیست
دشت و کهسار نوردید و غزالی نگرفت
طوف گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست

چاره این است که از عشق گشادے طلبیم
پیش او سجده گذاریم و مرادے طلبیم

عقل چوں پائے دریں راه خم اندر خم زد
شعله در آب دوانید و جہاں برہم زد
کیمیا سازی او ریگ رواں را زر کرد
بر دلِ سوخته اکسیرِ محبت کم زد
وائے بر سادگی ما که فسونش خوردیم
رہزنے بود کمیں کرد و رہِ آدم زد
ہنرش خاک بر آورد ز تہذیبِ فرنگ
باز آں خاک بچشمِ پسرِ مریم زد

شررے کاشتن و شعله درودن تا کے
عقده بر دل زدن و باز گشودن تا کے

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آں که برد دانهٔ افتاده ز خاک
آں که گیرد خورش از دانهٔ پرویں دگر است
دگر است آں که زند سیرِ چمن مثلِ نسیم
آں که در شد به ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آں سوئے نہ پرده گشادن نظرے
ایں سوئے پرده گمان و ظن و تخمیں دگر است

اے خوش آں عقل که پہنائے دو عالم با اوست
نورِ افرشته و سوزِ دلِ آدم با اوست

ما ز خلوتکدهٔ عشق بروں تاخته ایم
خاکِ پا را صفتِ آئینه پرداخته ایم
در جگر ہست مارا که بدوے نگنجیم
دو جہاں را که نہاں بود عیاں ساخته ایم
پیش ما مے گذرد سلسلۂ شام و سحر
بر لبِ جوئے رواں خیمه برافراخته ایم
در دلِ ما که بریں دیرِ کہن شبخوں ریخت
آتشے بود که در خشک و تر انداخته ایم

شعله بودیم شکستیم و شرر گردیدیم
صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

عشق گردید هوس پیشه و هر بند گسست
آدم از فتنهٔ او صورتِ ماهی در شست
رزم بر بزم پسندید و سپاهی آراست
تیغِ او جز به سر و سینهٔ یاران ننشست
رهزنی را که بنا کرد جهانبانی گفت
ستمِ خواجگیِ او کمرِ بنده شکست
بی حجابانه به بانگِ دف و نی می رقصد
جامی از خونِ عزیزانِ تنک مایه به دست

وقت آن است که آئینِ دگر تازه کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازه کنیم

افسرِ پادشهی رفت و به یغمائی رفت
نی اسکندری و نغمهٔ دارائی رفت
کوهکن تیشه به دست آمد و پرویزی خواست
عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت
یوسفی را ز اسیری به عزیزی بردند
همه افسانه و افسونِ زلیخائی رفت
رازهائی که نهان بود به بازار افتاد
آن سخن سازی و آن انجمن آرائی رفت

چشم بگشای اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پیِ تعمیرِ جهانِ دگر است

من درین خاکِ کهن گوهرِ جان می بینم
چشمِ هر ذره چو انجم نگران می بینم
دانه ای را که به آغوشِ زمین است هنوز
شاخ در شاخ و برومند و جوان می بینم
کوه را مثلِ پرِ کاه سبک می یابم
پرِ کاهی صفتِ کوهِ گران می بینم
انقلابی که نگنجد به ضمیرِ افلاک
بینم و هیچ ندانم که چسان می بینم

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

زندگی جوے روان است و رواں خواہد بود
ایں مے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

عشق از لذتِ دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاقِ نمود است و عیاں خواہد بود
آں زمینے کہ برو گریۂ خونیں زدہ ام
اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود

"مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"

پیام

تمہید اس نظم میں اقبال نے اہلِ یورپ کو یہ پیغام دیا ہے کہ اگر مقصدِ حیات حاصل کرنا چاہتے ہو تو عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بناؤ۔ اس نظم میں نوٗ بند ہیں:-

پہلے بند میں جو انھوں نے بطور تمہید لکھا ہے۔ دانایانِ فرنگ کی غلط روش پر اظہارِ تاسف کیا ہے۔

دوسرے بند میں انھوں نے عقل (حکمت و فلسفہ) کی کوتاہیوں، اور مضرتوں

کو واضح کیا ہے۔

تیسرے بند میں عقل پرستی کے مضر نتائج بیان کئے ہیں۔

چوتھے بند میں عقل اور عشق میں موازنہ کیا ہے اور ضمناً آخر الذکر کی برتری ثابت کی ہے۔

پانچویں بند میں انھوں نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان کی اصل عشق ہے۔

چھٹے بند میں انھوں نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جب انسان نے مسلکِ عشق کے بجائے مسلکِ عقل اختیار کیا، تو معاشرت (سوسائٹی) میں فساد رونما ہو گیا۔

ساتویں بند میں انھوں نے اس انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے، جو اس وقت دنیا میں رونما ہے۔

آٹھویں بند میں انھوں نے اس انقلاب کے نتائج سے آگاہ کیا ہے۔

نویں بند میں انھوں نے اس صداقت کو پیش کیا ہے کہ زندگی ایک ارتقائی حرکت ہے اور اس حرکت کا رُخ خوب سے خوب تر کی طرف ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ نظم اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ یورپ کی تمام مشہور زبانوں میں شائع کیا جائے تاکہ اس نظم کے حقیقی مخاطب، اقبال کے پیغام سے آگاہ ہو سکیں۔ لیکن جن لوگوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے جب وہی اس سے غافل ہیں تو اغیار کو کس طرح آگاہ کر سکتے ہیں؟

پہلا بند

(۱) کاش کوئی اللہ کا بندہ میرا پیغام حکمائے فرنگ تک پہنچا دیتا کہ تم جس عقل پر نازاں ہو، اس کی حالت یہ ہے کہ وہ جس قدر ترقی کی کوشش کرتی ہے، اسی قدر تنزلی کی طرف جاتی ہے۔

(۲) عقل کی پرواز صرف اس حد تک ہے کہ اس نے عناصر کائنات مثلاً برق کو مسخر کر کے بعض آلات مثلاً تلغراف، ٹیلیفون، لاسلکی، ریڈیو وغیرہ ایجاد کر دیئے ہیں لیکن عشق میں یہ طاقت ہے کہ وہ خود انسان کو خرمنِ برق بنا دیتا ہے یعنی عشق کے مقابلہ میں عقل کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ عقل محض اتنا کر سکتی ہے کہ انسان کو برق کے استعمال کا طریقہ بتائے۔ لیکن عشق تو خود انسان کے اندر برق کے خواص پیدا کر دیتا ہے بلکہ اسے مجسم برق بنا دیتا ہے۔ یعنی عشق کی اتباع سے انسان تمام مادی اسباب و وسائط سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ عشق

بمقابلہ عقل زیادہ حوصلہ مند ہے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ تاثیر کے چار درجے ہیں:۔

(۱) تاثیر انعکاسی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص عطر لگا کر محفل میں آ جائے اور اس کی خوشبو تمام اہل محفل کے دماغ کو معطر کر دے۔ یہ تاثیر کا ادنیٰ درجہ ہے۔ کیونکہ اس خوشبو کا اثر اسی وقت تک ہے جب تک وہ شخص محفل میں بیٹھا رہے۔

(۲) تاثیر انقائی۔ جیسے کوئی شخص بتی اور تیل کسی مٹی کے پیالہ میں ڈال کر لائے اور دوسرا شخص جس کے پاس آگ ہو، اس بتی کو روشن کر دے۔ اس قسم کی تاثیر، مؤثر کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ لیکن دیر پا نہیں ہوتی۔ مثلاً ہوا کا ایک جھونکا اس چراغ کو گل کر سکتا ہے۔

(۳) تاثیر اصلاحی۔ مثلاً دریا یا کنوئیں کے پانی کو خزانہ میں جمع کریں، اور خزانے کی راہ کو حوض کے فوارے تک صاف کر کے خوب زور سے اس میں پانی چھوڑیں، تاکہ فوارہ بہت زور سے اُبلنے لگے۔ یہ تاثیر پہلی دونوں صورتوں سے زیادہ قوی ہے۔ لیکن اگر خزانہ میں کمی ہو جائے تو فوارہ کے جوش میں بھی کمی ہو جائے گی۔

(۴) تاثیر اتحادی۔ پہلی تین مثالوں میں مستفید بہرحال منبعِ فیض کا محتاج ہے لیکن اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ مؤثر، منبعِ فیض کو مستفید کے حوالہ کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مستفید سے بار بار استفادہ کی حاجت نہیں رہتی۔

عشق یہی چوتھی صورت اختیار کرتا ہے یعنی منبعِ فیض (برق) کو مستفید کے حوالہ کر دیتا ہے۔ تاثیر کا یہ آخری اور اکمل درجہ ہے اور صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔ عقل بے چاری اس مقام تک کہاں پہنچ سکتی ہے! وہ تو خود اس خمسہ کی محتاج ہے۔ اور جو خود محتاج ہو، وہ دوسروں کو کیا دے سکتا ہے؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عشق خود انسان میں برق کے خواص پیدا کر دیتا ہے یعنی ذاتِ عاشق کو منبعِ انوار و فیوضات (برق) بنا دیتا ہے۔ عاشق خود "پاور ہاوس" بن جاتا ہے۔ اس لیے اُسے دوسروں سے برق حاصل

کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔ اگر ناظرین ان تصریحات کو مدِ نظر رکھ کر اس شعر کو پڑھیں گے، تو مجھے یقین ہے کہ اس شعر کی بلاغت معنویت اور بلند پایگی کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

(۳) کہتے ہیں کہ افسوس اس بات کا ہے کہ اہلِ یورپ (ظاہر پرستوں) کی آنکھ ظاہر (رنگ) کے علاوہ باطن کو نہیں دیکھ سکتی، ورنہ وہ حقیقت (قدرتِ ایزدی) جو رنگ کے پردہ میں پوشیدہ ہے، اربابِ وطن کی نظر میں تو رنگ سے بھی زیادہ نمایاں اور آشکارا ہے یعنی دراصل ہر شئے مظہرِ خدا ہے۔ لیکن جو لوگ ظاہر پرست ہیں یا مادہ پرست ہیں وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے وحدۃ الوجود کی طرف اشارہ کیا ہے، چونکہ سابقہ رباعیات اور نظموں میں اس مسئلہ کو کسی قدر واضح کر چکا ہوں، اس لیے یہاں ان مباحث کا اعادہ چنداں ضروری نہیں ہے۔

(۴) تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ تو (دانائے فرنگ یا عقل پرست) اعجازِ مسیحا رکھتا ہے (کیونکہ ہر وہ شخص جو فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ کرتا ہے، حیرت انگیز اشیاء اور آلات ایجاد کر سکتا ہے) تعجب کی بات یہ ہے کہ تیرا بیمار (یورپ) صحت یاب ہونے کے بجائے اور بھی بیمار ہوتا جاتا ہے یعنی اقوامِ یورپ کی اخلاقی حالت بہتر ہونے کے بجائے بدتر اور زبوں تر ہوتی جاتی ہے۔

(۵) اے حکیم (دانائے فرنگ) بے شک تو نے سائنس اور فلسفہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ تو نے اپنی شخصیت کے روحانی پہلو (دل) کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔

دوسرا بند سائنس اور فلسفہ ایسا میدان ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، لیکن اس کے مدرسوں میں عشق و محبت کا درس کہیں نہیں دیا جاتا۔ ان علوم کے طالع سے اکثر صاحبانِ علم روحانیت اور پاکیزگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سے دل میں محبت کی آگ پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی فلسفہ اور سائنس انسان کو خدا پرستی نہیں سکھاتا۔ بلکہ اکثر حالات میں بے دینی کی طرف لے جاتا ہے۔

حکمت اور سائنس اُس صیاد کی طرح ہے جو مدتوں دشت نوردی میں مصروف رہے، لیکن ایک ہرن بھی شکار نہ کر سکے۔ یا برسوں گلشن کا طواف کرے مگر ایک پھول بھی اسے نصیب نہ ہو سکے یعنی فلسفی ساری عمر حقیقت کی تلاش میں بسر کر دیتا ہے لیکن حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

اس لیے اقبال اہلِ یورپ کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس خرابی کا ازالہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بنائیں۔

تیسرا بند

جب عقل نے دُنیاوی معاملات میں دخل دینا شروع کیا، دراوِ خم اندر خم کنایہ ہے حیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں سے، تو زندگی کے ہر شعبہ میں فساد برپا کر دیا (شعلہ در آب دوانیدن کنایہ ہے فتنہ و فساد برپا کرنے سے)۔

یہ تو سچ ہے کہ سائنس کی بدولت اہلِ یورپ (دانایانِ فرنگ) نے مٹی کو سونے میں تبدیل کر دیا۔ مثلاً گھڑیوں کے پُرزے جو فولاد کے بنے ہوتے ہیں، آج کل ایک ہزار روپے تولہ کے حساب سے بکتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لیکن عقل نے ان کو بنی آدم کے زخموں پر مرہم لگانے کا فن نہیں سکھایا یعنی اُن کے دِل میں خوفِ خدا یا ہمدردی کا مادہ پیدا نہیں کیا۔

نوٹ:۔ اسی لیے بائبل نے بنی آدم کو اس حقیقت سے مطلع کر دیا کہ "خداوند کا خوف، دانائی کا آغاز ہے"۔ لیکن افسوس کہ اہلِ یورپ نے اس پاکیزہ روحانی تعلیم کو صدیوں سے پسِ پشت ڈال دیا ہے اور مُدتوں سے زر پرستی کو اپنا شیوہِ حیات بنا لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ افسوس ہے کہ اہلِ یورپ عقل کے افسوں کا شکار ہو گئے۔ عقل تو ایک رہزن ہے جس کا کام ہی گھات میں بیٹھنا اور بھولے بھالے بے خبر مسافروں کو لوٹنا ہے۔ یورپ نے عقل پرستی کی بدولت سائنس میں بہت ترقی کی۔ لیکن جو تہذیب اس الحاد پرور سائنس کی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ اُس نے جناب مسیح کی قابلِ قدر اخلاقی تعلیمات کو شدید نقصان پہنچایا۔ چشمِ پسرِ مریم کنایہ ہے مذہبِ عیسوی سے۔

اے افسونگران! تم اب تک عقل پرستی کے گرداب میں مبتلا رہو گے!
اب تم [illegible] شاخ [illegible] اور [illegible] بہار کاٹتے رہو گے؟ کب تک
[illegible] اور دنیا کو صنم خانہ بناتے رہو گے؟ کب تک

ایک دشواری کا حل دریافت کرنے کے سلسلے میں بہت سی دشواریاں بنی آدم کے لیے پیدا کرتے رہو گے؟

چوتھا بند واضح ہو کہ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں، اقبال کی وضع کردہ اصطلاحیں ہیں۔ اول الذکر سے ان کی مراد وہ عقل ہے جو حواسِ خمسہ پر مبنی ہے۔ اور اس لیے محدود اور ناقص ہے۔ اسی کو منطقی اصطلاح میں قوتِ مدرکہ کہتے ہیں۔ لفظ خود بیں سے اُن کی مراد متکبر نہیں ہے۔ بلکہ محدود ہے۔ اسی کو انھوں نے "جزو بیں" سے بھی تعبیر کیا ہے۔ آخر الذکر سے اُن کی مراد وہ عقل ہے جو "ادب خوردۂ دل" ہے۔ جو "کل" کو دیکھ سکتی ہے، یعنی عشق۔ ان دونوں اصطلاحوں کو انھوں نے اس شعر میں واضح کر دیا ہے:-

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست
لیکن ایں بے چارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست

اُن کا مقصد اس مرادیہ سے یہ ہے کہ عقل چونکہ صرف اپنے آپ کو دیکھ سکتی ہے (خود بیں ہے) کل کو نہیں دیکھ سکتی، اس لیے اس کے بجائے عشق کو رہنما بناؤ جو "جہاں بیں" ہے۔ یعنی کل کو دیکھ سکتا ہے۔ یعنی ساری کائنات کا آنِ واحد میں احاطہ کر سکتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اسی عقلِ جہاں بیں یعنی عشق کو انھوں نے "دستِ جہاں کشا" سے تعبیر کیا ہے:-

عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را
جامِ جہاں نما مجو، دستِ جہاں کشا طلب

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عقل، انسان کو حقیقت سے ہمکنار نہیں کر سکتی، یہ نعمت عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ عشق انسان کو زمان و مکان کی قید سے بالاتر کر دیتا ہے۔ ان تصریحات کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ تو اس بند کا مطلب بآسانی واضح ہو جائے گا۔

کہتے ہیں کہ چیل اور شاہین دونوں بازو رکھتے ہیں۔ لیکن چیل کے بازوؤں میں وہ طاقت کہاں، جو شاہین کے بازوؤں میں پائی جاتی ہے۔ اسی پر عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں کو قیاس کر سکتے ہیں۔ "دانہ افتادہ برخاک" کنایہ ہے پستی اور مادیات سے۔ اور "دانۂ پرویں" کنایہ ہے بلندی اور رُوحانیت سے۔ جس طرح چیل اپنے بازوؤں کی مدد سے صرف زمین پر گرے پڑے دانے چگ سکتی ہے۔ لیکن شاہین فضائے آسمانی میں پرواز کر سکتا ہے۔ اسی طرح فلسفی صرف مادیات میں بحث کر سکتا ہے۔ اس کی عقل صرف اعراض واوصاف کو سمجھ سکتی ہے۔ لیکن عاشق کی نظر اعراض سے گذر کر ضمیرِ کائنات کو دیکھ سکتی ہے۔ یعنی حقیقتِ اشیاء سے آگاہ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح عقل "گمان وظن وتخمین" سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یعنی عقل کاوش کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا کی ہستی کا گمان پیدا ہو سکتا ہے۔ اور گمان میں خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے۔ لیکن عشق، انسان کے دل میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا کر سکتا ہے۔

اس تقابل کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ مبارک اور خوش نصیب ہے، وہ انسان جسے عقل جہاں بیں حاصل ہو جائے۔ کیونکہ کائنات کی تمام وسعتیں، فرشتوں کی نورانیت اور دلِ آدم کا سوز وعشق، یہ سب نعماء اس کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں۔

پانچواں بند اس بند میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان کی اصل، مادہ نہیں ہے بلکہ عشق ہے۔

(۱) خلوت کدۂ عشق کنایہ ہے ذاتِ مطلق سے۔ کہتے ہیں کہ انسان، عناصرِ مادی کی ترکیب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ انسانی خودی کا منشا، ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ خودی، مادی نہیں ہے بلکہ نقطۂ نوری ہے۔ اس کی اصل نور ہے۔ اور چونکہ یہ اَنا یا خودی جسم خاکی میں مقید ہے۔ (اسی لیے اسے انائے مقید کہتے ہیں)، اس لیے اس خودی نے جسم خاکی (خاکِ پا) کو بھی اپنے نور سے منوّر کر دیا ہے۔

(۲) عاشق کی ہمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہم نے

دونوں عالم کو ایک داؤ پر لگا دیا۔ یعنی عاشق اس کائنات کو پرکاہ سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتا۔ وہ خدا کو خوش کرنے کے لیے دونوں جہان سے روگردانی کر لیتا ہے۔

عیاں باختن کنایہ ہے اس حقیقت سے کہ عاشق خدا کیلئے دُنیا کو ترک کر دیتا ہے۔ نہاں بُردن کنایہ ہے اس حقیقت سے کہ جب وہ خدا کے لیے دُنیا ترک کر دیتا ہے، تو خدا اس سے خوش ہو کر اس دُنیا کو اس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی عاشق بظاہر بازی ہار جاتا ہے۔ (دُنیا ترک کر دیتا ہے) مگر دراصل بازی جیت جاتا ہے (دُنیا اس کے قدموں میں آ جاتی ہے)

(۳) جب عاشق، عشق کی بدولت، حقیقی زندگی حاصل کر لیتا ہے، تو وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ اس کائنات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ جوئے رواں کنایہ ہے زندگی سے۔ اور خیمہ برافراختن کنایہ ہے تمکین و وجاہت سے جو عشق کا ثمرہ ہے۔

(۴) عاشق کے دل میں عشق کی آگ کارفرما ہوتی ہے۔ اور وہ اس آگ کی بدولت ساری کائنات کو فتح کر لیتا ہے۔

(۵) اس شعر میں اقبال نے حضرتِ انسان کی حقیقت واضح کی ہے کہ ہم مادی نہیں ہیں بلکہ انائے مطلق (شعلہ) ہیں۔ لیکن "لذتِ خودی" کی وجہ سے انائے متقید (شرر) نظر آتے ہیں۔ اور اسی تعیین کی بنا پر ہمارے اندر ذوق، تمنا اور نظر پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی ہم اس لیے مقید ہیں کہ مطلق سے ملنے کے لیے جدوجہد کریں۔

بودیم ما ست ز یک شعلۂ حیات

از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

چھٹا بند

کہتے ہیں کہ ہماری اصل تو عشق ہے۔ لیکن جب انسان نے دُنیا میں آ کر اپنی اصل کو فراموش کر دیا، اور مادیات میں گرفتار ہو کر ہوا و ہوس کو اپنا شعارِ زندگی بنا لیا (نفسِ امارہ کی غلامی اختیار کر لی) تو اس غلط بینی اور غلط کاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے خدا تعالیٰ کے تمام قوانین (شریعت) کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور اس کا وجود بنی آدم کے حق میں بلائے بے درماں

بن گیا۔

(۲) اس نے امن و امان کے بجائے جنگ و جدل کو مقصدِ حیات بنا لیا۔ اور اپنے بھائیوں کو قتل کرنے پر کمر باندھ لی۔

(۳) اس نے رہزنی کو رہنمائی اور جہاں سوزی کو جہاں بانی، یعنی نافرمانی کو اطاعت قرار دیا۔ اور دُنیا میں اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کے بجائے اپنا قانون نافذ کر دیا۔ یعنی خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیا۔ اور دُنیا میں تمام فتنہ و فساد، قتل و غارت، بدامنی اور بے چینی کا بنیادی سبب صرف یہی ہے کہ انسان خدا کا نائب بننے کے بجائے خود خدا بن بیٹھا۔ نتیجہ اس فرعونیت کا یہ نکلا کہ ملوکیت (رسمِ خواجگی) نے اللہ تعالےٰ کے بندوں کو تباہ کر دیا۔

نوٹ:۔ اس سے ثابت ہوا کہ ملوکیت اس دُنیا میں ساری خرابیوں کا منبع ہے۔ اسی ملوکیت کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری بن گیا ہے۔ رات دن اپنے عزیزوں کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے اور دادِ عیش دے رہا ہے۔

لہذا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس فرسودہ نظامِ ملوکیت کو ختم کر دیں۔ اور دُنیا میں خدا کی بادشاہت قائم کر دیں (آئینِ دگر تازہ کنیم)

ساتواں بند اس بند میں اقبال نے اہلِ یورپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کی ہے کہ اب دُنیا نئے نظام کی تلاش میں سرگرم ہے۔

کہتے ہیں کہ جو انقلابات اس صدی میں ہماری آنکھوں کے سامنے رُونما ہوئے ہیں، ان پر غور کرو۔ یہ انقلابات زبانِ حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ بنی آدم نظامِ نو کی تشکیل پر آمادہ ہیں۔ کیونکہ وہ ملوکیت اور اس کے تضمنات یعنی سرمایہ داری اجاگیرداری وغیرہ سے تنگ آچکے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سکندر اور دارا مطلق العنان بادشاہوں کا دَور ختم ہو رہا ہے اور جمہور کا زمانہ آ رہا ہے۔ دیکھ لو! مزدور (کوہکن) انقلاب کا علم بلند کر رہا ہے (تیشہ بدست) اور غلامی کے بجائے خود حکومت کا آرزومند ہے (پرویزی می خواہد) بادشاہوں کے عیش اور مزدوروں کی غلامی کا زمانہ

ختم ہو رہا ہے (زلیخا یعنی مزدور۔ زلیخا کنایہ ہے ملوکیت سے۔ یوسف کنایہ ہے مزدور طبقہ سے۔ اب بچہ بچہ ملوکیت کے مفاسد سے آگاہ ہو چکا ہے (راز بہ بازار افتاد) اور اب ملوکیت کا نظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا۔

اے مخاطب! اگر تو صاحبِ نظر ہے اور حالاتِ حاضرہ سے کوئی سبق حاصل کر سکتا ہے تو غور کر۔ تجھے صاف نظر آجائے گا کہ اب انسان اس پرانی دُنیا (پرانے نظام) سے تنگ آچکا ہے۔ اور اس لیے وہ نئی دُنیا (نیا نظام) پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی دُنیا جس میں نہ کوئی بادشاہ ہو نہ نواب، نہ سرمایہ دار ہو نہ جاگیردار، بلکہ ایسی دُنیا جس میں ہر انسان کو اس کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں حاصل ہو سکیں۔ یعنی (۱) رہنے کو مکان (۲) پہننے کو کپڑا (۳) کھانے کو روٹی (۴) ضمیر کی آزادی۔

نوٹ: قرآنِ حکیم جو نظام دُنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ان چار ضرورتوں کا ضامن ہے۔ چنانچہ فاروقِ اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کو یہ چاروں نعمتیں حاصل تھیں اور اگر یہ نظام دوبارہ مروج ہو جائے تو ہم بھی ان برکات سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ تفصیل تو لکھ نہیں سکتا، صرف اتنا لکھتا ہوں کہ جس نظام کی رُو سے ہر شخص اپنی دولت، اللہ تعالیٰ کی محبت میں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لیے خرچ کرے گا۔ اس معاشرہ (سوسائٹی) میں کوئی شخص ننگا بھوکا کیسے رہ سکتا ہے؟

آٹھواں بند اس بند میں اقبال نے انقلاب کی پیشگوئی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے اس فرسودہ کائنات (خاکِ کہن) میں از سرِ نو زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ ہر شخص (ذرہ) بیدار ہو چکا ہے۔ ہر طرف ایک ہنگامہ بپا ہے۔

(۲) دانہ سے قومیں بھی مُراد ہو سکتی ہیں اور تحریکیں بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جو قومیں یا تحریکیں ابھی ظاہر نہیں ہوئی ہیں، وہ عنقریب دُنیا میں پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہو جائیں گی۔

(۳) کوہ کنایہ ہے ملوکیت سے اور کاہ کنایہ ہے مزدور طبقہ سے۔ مطلب واضح ہے کہ وہ زمانہ آنے والا ہے اور جلد آنے والا ہے، جب ملوکیت دنیا میں ذلیل ہو جائے گی۔ اور جمہور (یعنی عوام) کو عروج حاصل ہوگا۔

(۴) انقلاب بسرعت تمام آرہا ہے۔ اگرچہ میں اس کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اس کے آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے نیز اگر کوئی مجھ سے یہ دریافت کرے کہ اس دعویٰ پر تمہارے پاس دلیل کیا ہے۔ تو میں اُسے دلیل تو نہیں دے سکتا مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری آنکھ آنے والے انقلاب کو دیکھ رہی ہے۔

نوٹ :- اقبال نے یہ نظم ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی، اگر ہم گذشتہ تیس۳۰ سال کے واقعات کا جائزہ لیں تو مرحوم کی بصیرت (رموز شناسی فراست) کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ "انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک" میں اس عظیم الشان انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو دس سال کے اندر اندر روس اور امریکہ کی آویزش کی بدولت دُنیا میں برپا ہوگا۔

کہتے ہیں کہ مبارک ہے وہ شخص جو موجودہ حالات (آثار و قرائن) کو دیکھ کر مستقبل میں زندہ رہنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔

نواں بند آخری بند میں ساری دُنیا سے خطاب کیا ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ اے لوگو! (علی الخصوص مسلمانو!) خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ زندگی ایک "جوئے رواں" ہے۔ یہ تو بہتی چلی آئی ہے اور اسی طرح بہتی چلی جائے گی۔ بات یہ ہے کہ سیلان، اس کی ذاتیات میں داخل ہے۔ زندگی نام ہی ہے حرکت کا۔ اگر سیلان بند ہو جائے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔

(۲) زندگی بہتری کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ جو خرابی نظر آتی ہے، وہ رفتہ رفتہ دُور ہو جائے گی۔ جو ہے لیکن نہیں ہونا چاہیئے، وہ معدوم ہو جائے گا۔ اور جو نہیں ہے۔ لیکن ہونا چاہیئے، وہ موجود ہو جائے گا۔ (اس نظریہ کو (MELIORISM) کہتے ہیں)۔

(۳) عاشق، اشتیاقِ دید کی شدت سے سراپا نظر بن گیا ہے۔ یعنی عاشق طالبِ دید ہے تو معشوق بھی اپنے حسن و جمال کی نمائش کے لیے

اسی قدر بے تاب ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات نے کائنات میں جس قدر خوبیاں پوشیدہ کر دی ہیں، وہ طالب ظہور ہیں۔ اور قانونِ فطرت کے مطابق ان کا ظہور ہو کر رہے گا۔

(۴) اور جو قومیں میرے کلام کا مطالعہ کر کے یا اپنی فراست کی بنا پر اپنے آپکو اس انقلاب میں حصہ لینے کے لیے تیار کریں گی، وہ کامیاب ہو جائے گی۔ وبرعکس اس، جو قومیں زندگی کے اہم اور بنیادی مسائل سے قطع نظر کر کے فروعی مسائل میں اپنا وقت ضائع کر دیں گی، وہ کامیاب اقوام کی غلام ہو جائیں گی۔

نوٹ:- فروعی مسائل سے میری مراد وہ مسائل ہیں جن میں اقبال کی قوم کم و بیش ایک ہزار سال سے منہمک ہے تفصیل اس لیے نہیں درج کرتا کہ پھر یہ شرح مسلمانوں کے زوال کی داستان بن جائے گی۔

جمعیت الاقوام

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن
دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

نوٹ:- دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور ایشیائی قوموں کو بیوقوف بنانے کے لیے مغرب کی چالاک وعیار اور باطل پرست اقوام نے ۱۹۲۰ء میں "جمعیتہ الاقوام" (لیگ آف نیشنز) کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی۔ جس کا مقصد بانیانِ انجمن کے الفاظ میں یہ تھا کہ "عدل و انصاف کی بنیاد پر اقوامِ عالم کے تعلقاتِ باہمی کو استوار کیا جائے اور ان میں مادی اور ذہنی تعاون کی رُوح پیدا کی جائے، تاکہ دُنیا سے جنگ وجدل کا خاتمہ ہو سکے۔"

لیکن نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہوا۔ یعنی جن قوموں نے تخفیفِ اسلحہ کے حق میں مؤثر ترین تقریریں کیں (مثلاً روس اور جرمنی)، انھوں ہی

نے اپنی اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ مسلح کیا۔ ۱۹۳۵ء میں مسولینی نے حبشہ پر حملہ کر کے جمعیتہ اقوام کے وقار پر سب سے پہلی مہلک ضرب لگائی۔ اس کے بعد جرمنی اور روس نے اپنے طرزِ عمل سے اس کا رہا سہا وقار ختم کر دیا جمعیتہ مذکورہ کا آخری اجلاس ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مجلس کو ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی "پرانی شراب" کو "یو، این، او" کی نئی بوتل میں دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ "مجلس اقوام متحدہ (یو، این، او) جمعیتہ اقوام آنجہانی کی جائز وارث قرار پائی۔ اور جمعیتہ کا سارا اثاثہ اس کے حوالہ کر دیا۔ اس اثاثہ میں سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ کتب خانہ ہے، جو ۳ لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے۔ شاید ناظرین کے لیے یہ اطلاع دلچسپی کا موجب ہو کہ اس کتب خانہ کے لیے راک فیلر دسفیرا نے صرف دو کروڑ روپیہ عطیہ دیا تھا۔

نوٹ:- الحمدللہ کہ بیٹی بہت خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے بلکہ فیض رسانی کے لحاظ سے تو حاتم سے بھی گوئے سبقت لے گئی ہے اور ہم تو اس کے احسانات سے ابداً آباد تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ۱۲

نظم کا مطلب چنداں دشوار نہیں ہے۔ پہلے بعض الفاظ کی وضاحت کرتا ہوں۔ برافتادن بمعنی مغلوب شدن، یہاں مراد ہے ختم شدن۔ دزدِ مندانِ جہاں، کنایہ ہے اُن اقوام سے جو بنی نوع آدم کی بہبود کی مدعی ہیں، مثلاً روس امریکہ، فرانس، جرمنی، اطالیہ۔

کہتے ہیں کہ انسانیت کے بہی خواہوں نے دنیا سے جنگ و جدل کا خاتمہ کرنے کی غرض سے ایک انجمن بنائی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس انجمن کے متعلق میری رائے دریافت کرے، تو میں یہ کہوں گا کہ یہ جمعیتہ اقوام نہیں ہے بلکہ دُنیا کے شاطر اور ماہر فن کفن چوروں نے ایک انجمن بنائی ہے تاکہ قبروں (ایشیائی یا کمزور اقوام) کو دیانتداری کے ساتھ آپس میں تقسیم کر سکیں اور بعد تقسیم اُن قبروں سے بقدرِ ظرف، استفادہ کر سکیں۔

نوٹ:- کفن دُزدکی تشبیہ کی خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ جس طرح مُردہ بدستِ زندہ، ہوتا ہے یعنی اگر کوئی اُس کے جسم سے اُس

کا کفن اُتار لے، تو وہ قطعاً مزاحمت نہیں کرتا، اس طرح کمزور قوم بالکل خاموش رہتی ہے۔

شوپن ہار و نیٹشا

مرغے ز آشیانہ بہ سیر چمن پرید
خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید

بد گفت فطرت چمن روزگار را
از درد خویش و ہم ز غم دیگراں تپید

داغے ز خون بیگنہے لالہ را شمرد
اندر طلسم غنچہ فریب بہار دید

گفت این سرا کہ بنایش فتادہ کج
صبح کجا کہ چرخ درو شامہا نچید

نالید تا بحوصلہ آں نوا طراز
خوں گشت نغمہ و ز دو چشمش فرو چکید

سوز فغان او بہ دل ہدہدے گرفت
با نوک خویش خار ز اندام او کشید

گفتش کہ سود خویش ز جیب زیاں برآر
گل از شگاف سینہ زر ناب آفرید

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

تمہید اس نظم میں اقبال نے شوپن ہار اور نیٹشا کے فلسفہ کے بنیادی اصولوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اس لیے جب تک ان حکمار کے بنیادی افکار سے آگاہی نہ ہو نظم کا مطلب پُورے طور سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ میرے لیے اُن کے فلسفیانہ نظام کو وضاحت کے ساتھ درج کرنا تو ناممکن ہے۔ کیونکہ اس شرح کے محدود صفحات تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ناظرین کی سہولت کے لیے ان حکمار کے بنیادی تصورات ذیل درج کئے دیتا ہوں جو حضرات تفصیل کے خواہشمند ہوں، وہ کسی مستند تاریخ فلسفہ کا بطور خود مطالعہ کرلیں۔

(۱) شوپن ہار ۱۷۸۸ء میں بمقام ڈینزگ (جرمنی) پیدا ہوا تھا، اس نے فلسفہ کی ابتدائی تعلیم گوٹنجن یونیورسٹی میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸۱۱ء میں برلین یونیورسٹی میں فلسفہ کے علاوہ سائنس اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ اور ۱۸۱۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

۱۸۱۴ء میں اس نے اپنی پہلی تصنیف موسومہ "عقل کی اصل چہارگانہ" شائع کی۔ اور ۱۸۱۹ء میں اپنا شاہکار شائع کیا جس کا نام "عالم بحیثیت ارادہ و تصور" تھا۔ اس کی شہرت کا دارومدار اسی کتاب پر ہے۔ اور اس کو سمجھنے کے لیے

افلاطون اور کانٹ سے واقفیت اشد ضروری ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ان دونوں سے بڑھ کر وہ گوتم بدھ اور اُپنشدوں کی تعلیمات سے متاثر ہوا۔ بلکہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اُس نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ سے اُنیسویں صدی میں بودھ دھرم کی بنیادی تعلیمات کو یورپ میں دوبارہ زندہ کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے فلسفہ کو کانٹ کے بعض تصورات پر مبنی کرتا ہے۔ بلکہ کانٹ کا فلسفہ اُس کے فلسفہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ لیکن آخر الامر اس کا فلسفہ بالکل گوتم بدھ کا فلسفہ بن جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کی لکھنے کی میز پر کانٹ کی تصویر کے پہلو میں گوتم بدھ کی مورتی بھی ہمیشہ رکھی رہتی تھی۔

ان دو کتابوں کے علاوہ اُس نے فلسفۂ یورپ کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ جسے وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ فرصت کے اوقات میں اُس نے مختلف عنوانات پر مضامین بھی لکھے، جن میں عورت بہت دلچسپ ہے۔ اُس نے ۱۸۶۰ء میں وفات پائی۔

شوپن ہار کا فلسفہ وہ کہتا ہے کہ خواہشِ زیست، حیات کی اصلی بنیاد ہے۔ خواہش یا ارادہ (WILL) ایک غیر شعوری طاقت ہے، جو انسان کو زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہ طاقت ہی اس ساری کائنات میں واحد حقیقت ہے جس کے علاوہ اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یعنی اس کے فلسفہ میں ارادہ کو وہی حیثیت حاصل ہے، جو مذہب میں خدا کو حاصل ہے۔ یہ غیر شعوری طاقت، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ اور ہمارا علم اسی طاقت کا غلام ہے۔ یہ طاقت انسان میں آکر "خواہشِ زیست" کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کی بدولت انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ لیکن انسان کا ماحول ہر قدم پر چلنے میں اور آرزوؤں کے حصول میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ دُکھ اور رنج و غم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے

(ا) دُنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے۔"

(ب) یہ دُنیا سراسر دُکھ ہے، عذاب ہے۔ مذموم ہے۔ قبیح ہے، مختصر یہ کہ یہ دُنیا بدترین دُنیا ہے۔

(ج) شر (بدی اور برائی) اس دنیا کی ذات میں داخل ہے۔
(د) اس بدی یا دُکھ سے نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ زندگی کو ختم کر دیا جائے۔
(ہ) اس لیے دانشمندی یہ ہے کہ زندگی کی آرزو یا جینے کی خواہش کو فنا کر دو۔
(و) وہ کہتا ہے کہ "ہماری ہر سانس موت کو دفع کرنے کی کوشش کا دُوسرا نام ہے۔ ہم جب تک زندہ رہتے ہیں، موت سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور انجام کار موت ہم پر غالب آجاتی ہے۔"
("عالم بحیثیت ارادہ و تصور" باب چہارم فصل ۵۷)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:۔
۱۔ زندگی سراسر کلفت اور رنج والم اور مصیبت کا نام ہے۔ اس لیے مذموم ہے۔
۲۔ زندگی سراپا خود غرضی اور رعونتِ نفس کا نام ہے اس لیے مذموم ہے۔
لہٰذا جو شئی سراسر کلفت اور کمینگی ہو، وہ اس لائق کب ہے کہ کوئی عقلمند آدمی اس سے وابستہ رہے! یہ ہے شوپن ہار کے فلسفہ کا خلاصہ۔
اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اس کے فلسفہ اور بودھ دھرم کی تعلیمات میں کیا فرق ہے؟

(۲) نیٹشا ۱۸۴۴ء میں بمقام روکن (جرمنی) پیدا ہوا تھا۔ بان اور لائپزگ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ادبیات عالیہ (لاطینی اور یونانی) اور لسانیات میں شاندار طریقہ پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۱۸۶۸ء میں باژل یونیورسٹی میں یونانی ادب کا پروفیسر مقرر ہوا، لیکن ۱۸۷۹ء میں خرابیٔ صحت کی بناء پر ایک سو بیس پاؤنڈ سالانہ پنشن پر سبکدوشی حاصل کر لی۔ ۱۸۸۹ء میں آثارِ جنوں نمایاں ہوئے اور دس سال تک اسی حالتِ دیوانگی میں بسر کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں فوت ہو گیا۔
اقبال نے ایک مصرع میں اس کی ساری زندگی قلمبند کر دی ہے۔ ؎

قلب او مومن دماغش کافر است

نیٹشے کا فلسفہ

نطشہ نے شوپن ہار کے فلسفہ "خواہشِ زیست" کو اپنے افکار کا نقطۂ آغاز بنایا لیکن اپنی جدت طرازی کی بدولت وہ نتائج اخذ کیے، جو اس کے قنوطی استاد کے فلسفہ کی ضد ہیں۔ یعنی شوپن ہار یہ کہتا ہے کہ زندگی کی نفی کرو۔ لیکن نیٹشے یہ تعلیم دیتا ہے کہ زندگی کا اثبات کرو۔ اور پوری طاقت کے ساتھ اثبات کرو۔

اس نظریہ کو "خواہشِ غلبہ و اقتدار" کہہ سکتے ہیں کیونکہ فوق البشر کی غایت یہی ہے کہ وہ دنیا میں جباری اور قہاری کا مظہر ہو گا۔

(ا) چونکہ مقصدِ حیات، حصولِ طاقت ہے اس لیے نطشہ ایک مخصوص اخلاق نظریہ کا علمبردار ہے یعنی حلم، بردباری، ایثار، ہمدردی، غمگساری، دلسوزی، رحمدلی، عاجزی، مسکینی اور فروتنی یہ تمام خصائل رذیلہ اور قبیحہ ہیں، اس لیے ان سے اجتناب لازم ہے۔

(ب) چونکہ مسیحیت اور بدھ دھرم دونوں انہی اخلاق کے حامی ہیں، اس لیے نیٹشے ان دونوں مذاہب کا سخت مخالف ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو "ضِدُّ المسیح" کہا کرتا تھا اور مسیحیت کی تردید میں اسی نام سے اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

(ج) وہ کہا کرتا تھا کہ بنی آدم کو فطرت نے دو گروہوں میں منقسم کر دیا ہے۔ اربابِ ضعف اور اربابِ قوت۔ کمزور قومیں، ترکِ دنیا، عاجزی، مسکینی اور فروتنی کی صفات کو محمود قرار دیتی ہیں۔ اور طاقتور قوموں کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

(د) مسیحیت چونکہ روم کے غلاموں میں شائع ہوئی۔ اس لیے غلامانہ اخلاق کی علمبردار اور حامی بن گئی۔ یعنی نرمی، فروتنی، حلم اور ایثار وغیرہ۔

(ہ) انسان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ طاقت حاصل کرے تاکہ دنیا پر حکومت کر سکے۔

(و) پس ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ایک طاقتور نسل کی پیدائش کے لیے کوشش کریں، جس کا ہر فرد "فوق البشر" ہو گا۔

(ز) اس فوق البشر کے تصور کو اس نے اپنی غیر فانی تصنیف "اقوالِ زردشت"

میں پوری وضاحت سے بیان کیا ہے۔ نطشہ کے افکار سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اقبال نے شوپن ہار کے ساتھ نیٹشے کا ذکر کیوں کیا؟ یعنی جو کانٹے اوّل الذکر کے تن نازک میں چبھ گئے تھے انہیں آخرالذکر نے کیوں نکلوایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

(ا) شوپن ہار کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا بری ہے اور زندگی دکھ ہے اس لیے دونوں سے قطع تعلق کر لو۔ اس کے برعکس

(ب) نطشہ کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا اچھی ہے اور زندگی راحت ہے۔ اس لیے دونوں کو حاصل کرو اور حصول کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر طاقت پیدا کرو۔

ان متضاد نظریوں کا موازنہ کرنے کے بعد ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ شوپن ہار کے زہر کا تریاق نطشہ ہی کے افکار میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے آخری شعر کے آخری مصرع میں اسی حقیقت کو رمز وایما کے پردہ میں بیان کیا ہے۔

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

یعنی دنیا سے فرار (نفی خودی) بالکل احمقانہ فعل ہے (یہ تو ضعفا کا طریق ہے) اس کے بالکل برعکس تم اپنے اندر جفاکشی کی بدولت طاقت پیدا کرو۔ یعنی کانٹا چبھے تو برداشت کرو۔ اور طاقت کے ذریعہ سے دنیا کو فتح کرو۔ اور اس سے تمتع حاصل کرو۔ (سراپا چمن بن جاؤ) اسی کو "فوق البشر" کا فلسفہ کہتے ہیں

اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں:۔

مطلب

جب شوپن ہار (مرغ) نے دنیا کے حالات وواقعات کا مشاہدہ کیا (سیر چمن پدید) تو اس نے دیکھا کہ یہاں تو قدم قدم پر دکھ اور تکلیف ہے (خار) اور اس کا نتیجہ رنج وغم ہے (خلید) یہ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا برائی اور بدی کا گھر ہے (بدگفت) چنانچہ اس نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا کہ خود اپنی تکالیف اور دوسروں کی تکالیف پر آہ وزاری کرتا ہے (تپید)۔

چونکہ اس نے دنیا کو "بلاخانہ" تصور کیا، اس لیے اُسے ہر طرف بلائیں اور مصیبتیں ہی نظر آنے لگیں۔ مثلاً اُس نے گل لالہ کو دیکھا تو اس کا ذہن اس طرف

منتقل ہو کر لالہ نے بے گناہوں کے قتل پر اس قدر تأسف کیا ہے کہ اُس کا جگر داغدار ہو گیا ہے۔ اور جب اُس نے عورت (غنچہ) کو دیکھا تو اُسے فطرت کا شاہکار تصور کرنے کے بجائے فطرت کی عیاری کا مظہر (فریبِ بہار) یقین کیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ شوپن ہار نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان "عورت" ہے، بالصراحت درج کیا ہے کہ۔

"عورت دراصل وہ دام ہے جسے فطرت نے کمال عیاری سے کام لے کر، مردوں کے پھانسنے کے لیے بچھایا ہے۔ اور اسی لیے اس کو چند سال کے لیے دلکشی عطا کر دی ہے تاکہ مرد اُس سے شادی کر کے فطرت کے مقصد (تسلسلِ حیات) کی تکمیل کر سکے"

شوپن ہار کا فلسفہ یہ ہے کہ بدی، بُرائی، دُکھ اور رنج اس دُنیا کی ذات میں داخل ہے (رنبائیش فتادہ کج)، اس لیے ہر شخص کی زندگی، دُکھ اور رنج کی مسلسل داستان ہے۔ جب اسے اس بات کا یقین ہو گیا تو وہ ساری عمر اہلِ دُنیا کو ترکِ دُنیا کی تلقین کرتا رہا۔ اور پوری طاقت کے ساتھ دُنیا اور علائقِ دُنیوی کی مذمت کرتا رہا۔ اور اس طریقِ کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کی زندگی بالکل تلخ ہو گئی۔ اور یہ دُنیا اُسے انتہائی خوفناک نظر آنے لگی۔ اُس نے اپنی معصوم زندگی عالمِ تجرد میں بسر کر دی۔ عورت کے بجائے کُتّے کو اپنا رفیقِ زندگی بنایا۔ اور ساری عمر (از ۱۸۳۶ء تا ۱۸۶۰ء) ہوٹل میں تنہا بیٹھ کر کھانا زہر مار کیا۔ اور مناظرِ فطرت کے بجائے اپنشد میں اپنی مسرت کا سامان تلاش کیا۔

جب اُس کی آہ و فغان (قنوطی فلسفہ) ایک ہُدہُد نے سُنی (ہُدہُد سے نطشہ مُراد ہے) تو اُس نے اُس کے غلط خیالات کی تردید کی (رخنہ ز اندام او کشید) اور اُس سے کہا کہ تُو ذرا عقل سے کام لے۔ اس دُنیا کو غور سے دیکھ! اس کی تخلیق اس نہج پر ہوئی ہے کہ یہاں ہر رنج کے پردہ میں راحت کی دیوی پوشیدہ ہے۔ اگر تو ذرا تحمل سے کام لے، تو دُکھ اور مصیبت سے فوائدِ عظیمہ حاصل ہو سکتے ہیں، یعنی ہم جس قدر جدوجہد کریں گے۔ (خواہ اس سلسلہ میں ہمیں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ درپیش ہوں)، اسی قدر ہماری

سیرت پختہ ہو گی - اور جس قدر سیرت پختہ ہو گی - اسی قدر کامیابی کے امکانات روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ لہٰذا دُکھ، درد، تکلیف، ناکامی، مصیبت اور مفلسی۔ اگر غور سے دیکھو، تو یہ سب "برائی" کے پردہ میں بھلائی ہے۔ کیونکہ

(۱) حکومت اور سروری، پختگی سیرت پر موقوف ہے - اور

(۲) پختگی سیرت، جدوجہد اور جفاکشی پر منحصر ہے - اور

(۳) جب تک مصائب نہ آئیں، انسان جدوجہد کی طرف مائل کیسے ہو سکتا ہے؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اگر اس پر مصیبت وارد ہو، تو نہ واویلا کرے، نہ اس سے بھاگنے کی کوشش کرے بلکہ اُسے خوش آمدید کہے۔ بلکہ خود مصیبتوں کو دعوت دے، اور درد کو درماں یقین کرے ؎

راست می گویم عدو ہم یار تست ٭ ہستیِ او رونقِ بازار تست

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است ٭ فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است

کشتِ انساں را عدو باشد سحاب

ممکناتش را برانگیزد ز خواب! (اسرارِ خودی)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر انسان خار کا خوگر ہو جائے یعنی مصائب برداشت کر کے اپنی خودی کو پختہ کر لے گا، تو اس کی زندگی سراپا چمن بن جائے گی۔ یعنی وہ دُنیا پر حکمران (انسانوں پر غالب) ہو جائے گا۔"

فلسفہ و سیاست

فلسفی را با سیاست داں یکے داں ٭ چشمِ آں خورشید کورے دیدۂ ایں بے نمے

آں تراشد قولِ حق را حجتے نا استوار ٭ ویں تراشد قولِ باطل را دلیلِ محکمے!

اس نظم میں اقبالؔ نے فلسفہ اور سیاست کی خصوصیت بھی بتائی ہے - اور ان کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں کسی شاعر نے فلسفی اور سیاستدان کی تعریف اس سے بہتر طریق پر نہیں کی ہے کاش غالبؔ زندہ ہوتا، تو وہ اس نظم کی بلاغت کی داد اقبالؔ کو دیتا۔

کہتے ہیں کہ فلسفی اور سیاستدان کو ایک خانہ میں مت رکھو، ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ فلسفی کی آنکھ آفتاب کو نہیں دیکھ سکتی۔ یعنی فلسفی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ عمر بھر مظاہر ہی میں الجھا رہتا ہے، اور سیاستدان کی آنکھ میں نمی نہیں ہوتی، یعنی اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنی قوم کے مفاد کو مدِ نظر رکھتا ہے۔

فلسفی جویائے حقیقت ہوتا ہے، اس لیے کبھی کبھی "حق" اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے یعنی وہ یہ کلمہ اٹھتا ہے کہ "خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے"۔ لیکن وہ اس قولِ حق پر جو دلیل مرتب کرتا ہے وہ نا استوار (کمزور و ناقص) ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل پر اپنی دلیل کی بنیاد رکھتا ہے۔ اور عقل بذاتِ خود کمزور اور ناقص ہے۔ چنانچہ مرشد رومی فرماتے ہیں:۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود ؛ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اب رہا سیاستدان تو وہ جویائے باطل ہوتا ہے (موجودہ سیاست سر بسر عیاری اور مکاری کا دوسرا نام ہے) وہ ہمیشہ دھوکہ اور فریب سے کام لیتا ہے۔ اس لیے اس کی گفتگو سراسر باطل ہوتی ہے۔ لیکن اس کا کمالِ فن یہ ہے کہ وہ اپنی جھوٹی بات کو نہایت محکم دلائل سے سچی ثابت کر دیتا ہے۔ اسی کا نام فریب ہے۔

نوٹ:۔ جو سیاستداں دوسروں کو جس قدر زیادہ بیوقوف بنا سکتا ہے اسی قدر زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ ۱۲

صحبتِ رفتگان

(در عالم بالا)

ٹالسٹائے

بادشمی اندرون لشکری شہریار ؛ از پئے نان جویں تیغ ستم برکشید
زشت بہ چشمش نکوست، مغز زند، مغز پوست ؛ مرد کہ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید!
وارثِ بیہوشی است تاج کلیسا و ملک ؛ جان خدا داد را خواجہ بجامے خرید!

کارلؔ مارکس

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

٭ ٹالسٹائے، روس کا مشہور مصلح جس نے یورپ کی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی۔
٭ کارل مارکس، جرمنی کا مشہور اسرائیلی ماہرِ اقتصادیات جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اس کی مشہور کتاب موسوم بہ سرمایہ کو مذہبِ اشتراکیت کی بائبل تصور کرنا چاہیے۔

ہیگلؔ

جلوہ دہد باغ و راغ مستیِ مستور را | عینِ حقیقت نگر حنظل و انگور را
فطرت ز اضداد خیز لذتِ پیکار داد | خواجہ و مزدور را آمر و مامور را

ٹالسٹائے

عقلِ دو رو آفرید فلسفۂ شور پشت | درسِ نظامی دہد بندۂ مزدور را

مزدک

دانۂ ایران گذشت زار و قیصر بردمید | رگ زمی رقصد نہ در قصرِ سلطان و امیر
فتنے در نقشِ نمرودی سوزِ خلیل | تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز | نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

کوہکن

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است | ستیزہ کیش و ستمگر و فتنہ انگیز است
[illegible] | زبان او ز سیم و زر شکر ریز است
گسست حلقۂ زنجیرِ بے جنبشِ یک پیچ است | دو گام بگیرد بجائے عشق ابریز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد | ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ز خاک تا بفلک ہرچہ ہست رہ پیماست
قدم کشاے کہ رفتارِ کاروان تیز است

تمہید | پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد جو انقلابات دُنیا میں رُونما ہوئے۔ ان میں انقلاب روس سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یعنی اس ملک میں ملوکیت کے بجائے اشتراکیت قائم ہو گئی۔ اشتراکیت کا قیام دراصل سرمایہ دار پر مزدور کی فتح ہے۔ یعنی عوام کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ع

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

چونکہ اسلام بھی ملوکیت اور سرمایہ داری کا دشمن ہے۔ اس لیے اقبال نے اس تمثیلی نظم میں مزدور طبقہ کی حمایت کی ہے۔ اور کوہکن کی زبان سے اُسے ترغیب دی ہے کہ اپنا حق حاصل کرے۔

اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ٹالسٹائے اور کارل مارکس سرمایہ داری کی مذمت کرتے ہیں۔ ہیگل بیچ میں لقمہ دیتا ہے کہ سرمایہ دار اور مزدور دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کی باہمی کشمکش کو برداشت کرنا چاہیئے۔ یہ کشمکش یا پیکار قانونِ فطرت کے مطابق ہے۔ اس پر ٹالسٹائے، مزدور کی حمایت میں ہیگل کو یہ جواب دیتا ہے کہ تیرا فلسفہ غلط ہے کیونکہ وہ مزدور کو غلامی کا درس دیتا ہے۔ اس مرحلہ پر مزدوک، ٹالسٹائے کی تائید کرتا ہے۔ اور آخر میں کوہکن مزدور کو انقلاب کا پیغام دیتا ہے۔

ذیل میں ان مفکرین کے بنیادی افکار درج کرتا ہوں۔ تاکہ نظم کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

(۱) ٹالسٹائے ۔ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے ۱۸۲۸ء میں ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں فوجی ملازمت اختیار کی اور ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا میں حصہ لیا۔ ۱۸۵۵ء میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی اور اپنی بقیہ زندگی تصنیف و تالیف اور اصلاحِ قوم میں بسر کی۔

ٹالسٹائے جامع حیثیات انسان تھا، وہ اقبال کی طرح ایک بلند پایہ شاعر، مصلحِ قوم اور عالمِ دین بھی تھا۔ اور صفِ اوّل کا ناول نگار بھی۔ اس کے ناولوں میں "اینا کرینینا" بہت مشہور ہے جسے نقاد ایک

فن اس کا شاہکار قرار دیتے ہیں۔ اس نے انجیل کا یونانی زبان سے روسی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس نے اپنی جاگیر کو کاشتکاروں پر تقسیم کر دیا تھا۔ اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ سرمایہ داری کے خلاف ساری عمر پوری قوت کے ساتھ جہاد کرتا رہا۔ وہ جس طرح سرمایہ داری کے خلاف تھا اسی طرح ملوکیت کا بھی دشمن تھا۔ اس نے ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

(۲) کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں بمقام ٹرائز (جرمنی) پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک کامیاب وکیل تھا اور بہت علم دوست تھا۔ قانون سے زیادہ فلسفہ کا مطالعہ کرتا تھا۔ اس لئے بچپن ہی سے کارل مارکس میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہو گیا جو تادم وفات قائم رہا۔ ۱۸۳۵ء میں بان یونیورسٹی میں قانون کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ایک سال کے بعد اس کا علمی ذوق اسے برلین یونیورسٹی میں لے گیا۔ یہاں آ کر اس نے ہیگل کے فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ لیکن اس کی افتاد طبع نے اسے خدا پرست کے بجائے مادہ پرست بنا دیا۔ اس لیے اس نے قانون کے بجائے فلسفہ کو اپنا موضوع بنا لیا۔ اور ۱۸۴۲ء میں جینا (UENA) کی یونیورسٹی سے فلسفہ مادیت پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ۱۸۴۳ء میں اس نے ایک شریف خاتون سے شادی کی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر ترک وطن کر دیا۔ دو سال تک پیرس میں رہنے کے بعد ۱۸۴۹ء میں اس نے لندن کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور اسی شہر میں ۱۸۸۳ء میں بحالت مفلسی وفات پائی۔

اس کی تصانیف میں سرمایہ سب سے زیادہ مشہور ہے اور بقول اقبال اس کتاب کو مذہب اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہیئے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انیسویں صدی میں کسی کتاب نے بنی نوع آدم کو اس قدر متاثر نہیں کیا۔ جس قدر اس کتاب نے۔ مارکس جیسا کہ سب جانتے ہیں، سائنٹیفک سوشلزم کا بانی ہے۔ جس کی بنیاد اس نے جدلیاتی مادہ پرستی پر رکھی ہے۔ اس کے افکار کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مذہب عوام کے حق میں بمنزلہ افیون ہے۔ اس لیے دنیا سے مذہب کو مٹانا ہر اس عقلمند آدمی کا پہلا فرض ہے جو عوام کی ہمدردی کا مدعی ہے

یا ان کی بہبود کا آرزومند ہے۔

(۲) اس کائنات میں بقول ہیگل، حقیقت ایک ہی ہے لیکن بخلافِ ہیگل وہ حقیقت "روح" نہیں ہے بلکہ مادہ ہے (ہیگل اپنی اصطلاح میں خدا کو "روح" سے تعبیر کرتا ہے)۔

(۳) اس عقیدہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خدا، روح، معاد، حیات بعد الموت رسالت پر الہام اور وحی یہ سب مہمل بلکہ گمراہ کن الفاظ ہیں۔

(۴) انسان نتیجہ ہے ذرات (سالمات) مادی کی ترکیب کا۔ اس لیے موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔

(۵) مقصد حیات، شکم پری بلکہ شکم پروری ہے اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ سب افراد یکساں طور پر شکم پری کر سکیں [1]

(۶) مارکس کہتا ہے کہ کمیونزم اور میٹیریلزم (مادہ پرستی) میں چولی اور دامن کا رشتہ ہے۔ جب تک ایک شخص مسلک مادیت اختیار نہ کرے یعنی خدا، روح اور مذہب ان توہماتِ سہ گانہ کا انکار نہ کرے، وہ کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔

(۷) کمیونسٹوں کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ ہر ملک میں طبقاتی نزاع کو فروغ دیں۔ کیونکہ جب تک موجودہ معاشرتی نظام کو بزورِ شمشیر تہ وبالا نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک اشتراکیت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اے صعالیکِ عالم! تم سب متحد ہو جاؤ!" اس اعلان سے ثابت ہوتا ہے کہ "طبقاتی نزاع" اشتراکیت کا سنگِ بنیاد ہے۔

(۸) چونکہ انسان میں روح نہیں ہے بلکہ وہ محض جسم یا مادہ ہے، اس لیے اصولی طور پر اس میں اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہر حیوان کی بنیادی ضرورت روٹی ہے نہ کہ اخلاق یا فلسفہ۔ شکم انسان کی زندگی کا محور ہے، اس کی ساری زندگی اسی شکم کے لیے وقف ہے، انسان نہ خدا کے لیے جیتا ہے نہ رسول کے لیے بلکہ اپنے پیٹ کے لیے۔

---

[1] دین آں پیغمبر حق ناشناس ⁂ بر مساواتِ شکم دارد اساس

(۹) ملوکیت، وطنیت اور کلیسا یہ تینوں ادارے مزدوروں (عوام) کے دشمن ہیں۔ اس لیے ان کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دینا چاہیئے [1]

(۱۰) جب دنیا سے مذاہب اور ملوکیت کا خاتمہ ہو جائے گا تو ایسی سوسائٹی معرض وجود میں آ جائے گی جس میں نہ کوئی امیر ہوگا نہ غریب یعنی تمام امتیازات مٹ جائیں گے۔ اس سوسائٹی میں دولت سب افراد کی مشترکہ ملکیت ہوگی، اور ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق قومی خزانہ سے خرچ کرنے کیلئے رقم مل سکے گی (یہی کیمونزم ہے)

نوٹ:۔ مذہب اشتراک کی آخری تعلیم کو پڑھ کر یہ مصرع بے اختیار زبان پر آ جاتا ہے۔ ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

(۲) ہیگل: جرمنی کا یہ نامور فلسفی ۱۷۷۰ء بمقام اسٹٹ گرٹ پیدا ہوا تھا ۱۷۸۸ء میں ٹیوبنجن یونیورسٹی میں الٰہیات کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا اور ۱۷۹۳ء میں ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد یونانی ادبیات اور فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن مذہب کا جو نقش اس کے دماغ پر قائم ہو چکا تھا، وہ مدۃ العمر قائم رہا۔ بلکہ میری رائے میں اس کا اثر اس کے فلسفہ پر بھی مرتب ہوا اور ہر اس شخص کو نظر آ سکتا ہے جو اس کے افکار کا بغور مطالعہ کرے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ مسیحیت کے عقیدۂ تثلیث سے انسان کو خدا کا بہترین تصور حاصل ہو سکتا ہے۔ نیز فرانک فورٹ میں قیام کے دوران میں اس نے حضرت مسیح کی لائف بھی لکھی تھی۔

۱۸۰۵ء میں وہ جینا یونیورسٹی میں فلسفہ کا لیکچرار مقرر ہوا، اور یہیں اس نے اپنی بلند پایہ تصنیف "فنا منالوجی آف مائینڈ" جنگ جینا (۱۸۰۶ء) سے چند گھنٹے پیشتر پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ اس کے استغراق کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ فرانسیسی فوجیں ساری رات شہر پہ گولے برساتی رہیں۔ لیکن وہ اپنے کمرے میں کواڑ بند کئے اس کتاب پہ نظر ثانی کرتا رہا۔

---

[1] اے دنیا کے مزدورو!

[2] کردہ ام اندر مقاماتش نگہ ⁂ لا سلاطین، لا کلیسا، لا اللہ

(جاوید نامہ)

۱۸۱۶ء میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا اور ۱۸۱۸ء میں برلین یونیورسٹی نے اُسے فلسفہ کی کرسی پیش کی جو ۱۸۲۰ء سے تادمِ وفات، جو ۱۸۳۱ء میں واقع ہوئی، وہ بلا شرکتِ غیرے فلسفہ کی دنیا پر حکمران رہا۔

میں اس شرح میں اُس کے فلسفہ کے کسی گوشہ کو بھی بے نقاب نہیں کر سکتا۔ چند معمولی اشارات پر اکتفا کروں گا۔

(۱) ہیگل بھی لائبنز کی طرح وسعتِ معلومات کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

(۲) چونکہ اس کے فلسفیانہ نظام کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا کے تمام علوم کو اپنے نظام میں سمو کر پیش کر دے۔ اس لیے اس کا فلسفہ بلاشبہ نہایت دشوار اور عسیر الفہم ہے۔ مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ:-

"دنیا میں جس قدر بڑے فلسفی گذرے ہیں، ہیگل اُن سب سے زیادہ مشکل ہے۔" (تاریخ فلسفۂ مغرب ص۷۵۷)

(۳) بہت سے فضلاء نے ہیگل کے اسرار و رموز واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہیگل ابھی تک صیغۂ راز ہی میں ہے۔ یہ معلوم کرنا نہایت دشوار ہے کہ اُس کے فلسفہ کا حقیقی مفہوم کیا ہے شاید اسی لیے اقبال نے یہ شعر لکھا ہے ؎

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ٭ ہے اُس کا طلسم سب خیالی

بات یہ ہے کہ اُس نے بعض بعض مقامات پر اپنے فلسفہ کو معمہ یا چیستان بنا دیا ہے۔ اور اندازِ بیان ایسا ہے کہ ہر شخص اپنے خیال کے مطابق اس کی تاویل کر سکتا ہے۔ گویا اس کا فلسفہ بازی گر کی پٹاری ہے جس میں سے جو چاہو نکال سکتے ہو۔ مثلاً:-

(۱) کارل مارکس نے اسی کے فلسفہ پر اپنا ملحدانہ نظامِ فکر مبنی کیا۔

(ب) ایڈورڈ کیرڈ نے اسی کے فلسفہ کی مدد سے مسیحیت کے اصولوں کو عقل کی روشنی میں پیش کیا۔ اسی لیے پروفیسر برجیس لکھتا ہے کہ:-

"درحقیقت ہیگل کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کا جواب ابھی تک کوئی

شخص نہیں دے سکتا ہے ۔" (تاریخ فلسفہ ص۴۲۵)

(۴) ہیگل کو کسی حد تک سمجھنے کے لیے اس کی منطق صغیر اور منطق کبیر کا مطالعہ شرط اولین ہے ۔ اور منطق سے اس کی مُراد، ما بعد الطبیعات ہے ۔

(۵) وہ کہتا ہے کہ تناقض یا تضاد اس کائنات کی بنیاد اور حیات کی اصل ہے ۔ کائنات کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اضداد کو پیدا کرتی رہتی ہے ۔ اور ان کے تصادم سے تیسری چیز پیدا ہوتی رہتی ہے ۔ مثلاً دنیا میں شیرینی پائی جاتی ہے تو اس کی ضد یعنی تلخی بھی موجود ہے ۔ اور ان دونوں سے ایک تیسری چیز پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس تناقض کا باعث یہ ہے کہ ہستی محدود ہے ۔ ؎

(۶) ہیگل بھی اسپنوزا کی طرح وحدۃ الوجود کا قائل ہے ۔ (اگرچہ جزئیات میں اُس سے اختلاف کرتا ہے) چنانچہ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں صرف ایک حقیقت موجود ہے اور اُسے وہ رُوح (خدا) سے تعبیر کرتا ہے ۔ اور تمام انسان اسی انائے مطلق کے اجزا ہیں ۔ اقبال نے اس شعر میں اسی نظریہ کو پیش کیا ہے :-

بود و نبود ماست زیک شعلۂ حیات
از لذّتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

یعنی یہ ساری کائنات، مظہر ذاتِ باری ہے یا ظہورِ انائے مطلق ہے ۔ بالفاظِ دگر، ہیگل کے نزدیک مادہ موجود نہیں ہے خدا ہی کائنات ہے اور کائنات ہی خدا ہے ۔ اسی کو فلسفہ کی اصطلاح میں تصوریت مطلقہ کہتے ہیں ۔ اور ہیگل اسی کا سب سے بڑا علمبردار ہے ۔

نوٹ :- جو بات ہیگل نے ۱۸۳۰ء میں بیان کی مرزا بیدل نے اسی کو سو سال پہلے اس سے زیادہ دلکش انداز میں واضح کر دیا تھا ۔

کہ چوں موج بر خویش پیچیدہ باشد ٭ کسے معنی بحر فہمیدہ باشد
خیال تو رنگے تراشیدہ باشد ٭ چو آئینہ پُر سادہ است ایں گلستاں

؎ جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں (اکبر الہ آبادی)

(۴) مزدک:- ایرانِ قدیم کا یہ بدنصیب فلسفی قبادؔ کے زمانہ میں اس کے حکم سے محض اس خطا پر بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا کہ وہ دُنیا سے خود غرضی، عداوت حسد اور طمع کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں تین چیزیں تمام فتنہ وفساد کی جڑ ہیں۔ زن، زر اور زمین۔ اس لیے ان تینوں کی ایسے منصفانہ طریق پر تقسیم کر دی جائے کہ کوئی متنفس ان تینوں نعمتوں سے محروم نہ رہے۔ مزدک دراصل حکیم زردشت کے مذہب کا مبلغ تھا۔ لیکن وہ غوروفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب تک انسانوں کے اندر حرص وطمع (شہوت) اور مخاصمت (غضب) یہ دو برائیاں موجود ہیں، وہ مذہبی زندگی بسر نہیں کر سکتے یعنی نکوکار نہیں بن سکتے۔

مزدک کی زندگی کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ ۴۹۰ء کے قریب اُس نے اپنے خیالات کی اشاعت شروع کی۔ اور اُسے اپنے مقصد میں اس درجہ کامیابی حاصل ہوئی کہ بادشاہ ایران خسرو قبادؔ اس کا مُرید ہو گیا۔ لیکن اُمرا اُس سے ناراض ہو گئے اور اُسے معزول کر دیا کچھ عرصہ کے بعد قبادؔ دوبارہ تختِ ایران پر قابض ہو گیا۔ اور سابقہ تلخ تجارب کی وجہ سے اُس نے مزدک اور اُس کے عقاید دونوں سے یکسر قطع تعلق کر لیا۔ اس کے فرزند خسرو اوّل نے باپ کو سمجھایا کہ اس خطرناک تحریک کو ختم کر دینا مناسب ہے چنانچہ ۵۳۹ء میں قبادؔ نے تمام بڑے بڑے مزدکیوں کو دعوت کے بہانے سے محل میں بلا کر قتل کر دیا۔ اور اسی رات کو حکیم موصوف کو بھی بیدردی کے ساتھ قضا کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد سارے ملک میں مزدکیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ قوم نے اس عظیم الشان خدمت کے صلہ میں خسرو کو نوشیروان کا لقب عطا کیا۔

تفصیل حالات کے لیے انسائکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم صفحہ ۳۴۰ تا ۳۴۲ کا مطالعہ کافی ہوگا۔ اس تحریک کے اصول کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک، موجودہ روسی کمیونزم کی ابتدائی شکل تھی۔

حکیم مزدک یہ کہتا تھا کہ جب دنیا میں عورت، دولت اور زمین ہر شخص کے پاس ہو گی تو پھر جھگڑا کس بات پر ہو گا؟

(۵) کوہکن: یہ فرہاد کا لقب ہے۔ یہ بدنصیب شخص شیریں پر عاشق تھا، جو خسرو پرویز شاہِ ایران کی محبوبہ تھی۔ بادشاہ نے اس سے نجات پانے کے لیے سُنّتِ ملوکانہ پر عمل کیا۔ یعنی سب سے پہلے اُس سے یہ جھوٹا وعدہ کیا کہ اگر تو کوہ بیستون کاٹ کر شیریں کے محل تک وہ نہر لے آئے جو اس طرف بہ رہی ہے، تو میں اس "جانِ فساد" کو تیرے حوالہ کر دوں گا۔ اور جب وہ اس مہم میں کامیاب ہو گیا، تو بادشاہ نے ملوکیت کے ترکش سے دوسرا تیر نکالا یعنی حوا کی ایک عیار بیٹی کو اُس کے پاس بھیجا۔ جس نے بادیدۂ نم یہ رُوح فرسا خبر اُسے سُنائی کہ کل شب "حرکتِ قلب بند ہو جانے سے" شیریں کا انتقال ہو گیا۔ یہ سُن کر فرہاد نے وہی تیشہ جس سے اُس نے پہاڑ کاٹ کر رکھ دیا تھا، اپنے سر پر دے مارا۔ اور اس طرح شاعروں اور افسانہ نگاروں کے لیے "کافی مواد" مہیا کر دیا۔

اب اس تمثیلی نظم کا مطلب ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:۔

طالسطائے یہ کہتا ہے کہ ملوکیت، بنی آدم کے حق میں بہت بڑی لعنت ہے۔ اور چونکہ ملوکیت کا قیام و استحکام فوجی طاقت پر موقوف ہے، اس لیے بادشاہوں کی فوج کا ہر سپاہی دراصل اُس ہستی کا خادم ہے، جو خالقِ شر اہرمن ہے۔ وہ بدبخت پیٹ کی خاطر بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ چونکہ وہ ملوکیت کا خادم ہے، اس لیے اس کی ذہنیت مسخ ہو جاتی ہے۔ وہ برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی سمجھتا ہے۔ اپنوں کا دشمن اور غیروں کا دوست ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت و تاج، کلیسا اور وطن یہ تینوں ادارے عوام کے حق میں داروئے بے ہوشی (افیون) ہیں۔ انسان، ان کے زیرِ اثر آکر عقل و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

یہ مسئلہ کارل مارکس نے اس کی تائید میں یہ بات کہی کہ کس قدر افسوس

کی بات ہے کہ انسان، جو کائنات کی ہر شئے سے آگاہ ہے، خود اپنی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اور اس کی ساری ذمہ داری سرمایہ داری پر ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بے دریغ اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹتا رہتا ہے بلاشبہ سرمایہ داری ملوکیت کے بعد بنی آدم کے حق میں سب سے بڑی لعنت ہے۔

اس مرحلہ پر ہیگل نے یہ نکتہ بیان کیا کہ اگر انسان اضداد مثلاً باغ و راغ پر غور کرے تو وہ حقیقت جو پوشیدہ ہے، اس پر واضح ہو سکتی ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ اضداد مثلاً روشنی اور تاریکی، الماس اور زغال (ہیرا اور کوئلہ) شرینی اور تلخی (اندرائن اور انگور) ان سب کی اصل ایک ہی ہے۔ یعنی بظاہر دنیا میں اختلافات نظر آتے ہیں۔ لیکن غور کرو تو یہ سب ایک ہی شئی کے مختلف پہلو ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور دونوں میں اُسی کا جلوہ ہے۔

بات یہ ہے کہ فطرت اس دنیا میں اضداد کو پیدا کرتی رہتی ہے، کیونکہ نظام عالم الٰہی اضداد کے ظہور پر موقوف ہے (اگر بدی نہ ہو تو نیکی کو کون پہچانے۔ اور مرض نہ ہو تو صحت کی قدر کیسے معلوم ہو!) اسی لیے فطرت نے اشیائے کائنات میں پیکار (جنگ و جدل) کی لذت مخفی کر دی ہے لہذا سرمایہ دار اور مزدوروں میں جو پیکار کا رنگ نظر آتا ہے، یہ بالکل فطری امر ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جب تک یہ دنیا ہے سرمایہ دار اور مزدور یونہی آپس میں لڑتے رہیں گے۔

یہ سُن کر ٹالسٹائے نے کہا کہ جناب! آپ اپنا یہ آسمانی فلسفہ اپنے ہی پاس رکھیں۔ ہماری رائے میں یہ فلسفہ بالکل غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ انسانی عقل دو رخی ہے۔ وہ چور سے کہتی ہے "چوری کر" اور شاہ سے کہتی ہے "جاگتا رہ" آپ اسی عقل کی بدولت تصوریت (خدا پرستی) کے مبلغ ہیں۔ اور آپ کا شاگرد مارکس اسی عقل کی بنا پر مادیت (مادہ پرستی) کا حامی ہے۔ عقل نے آپ کو خدا پرستی سکھائی اور مارکس کو انکار کی راہ سجھائی۔ ع

درسِ رہنمائی وہی بندۂ مزدور رہا!

بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ اتنے بڑے فلسفی ہو کر مزدور کو سرمایہ دار کی غلامی کا درس دے رہے ہیں۔

نوٹ :۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ ہیگل کا فلسفہ ناقص ہے کیونکہ اس کی رُو سے سرمایہ داری اور مزدوری (غلامی) عینِ حقیقت ہیں اسلئے دونوں کو باقی رہنا چاہیئے"۔

حکیم مزدک نے طالسٹائے کی تائید کرتے ہوئے یہ کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ جو تخم میں نے سرزمین ایران میں پانچویں صدی میں بویا تھا، وہ اب بیسویں صدی میں دُنیا کے مختلف ملکوں میں اُگ رہا ہے۔ یعنی اشتراکیت کی تعلیم جو میں نے اہلِ ایران کو دی تھی اس کو اب یورپ کی اقوام قبول کر رہی ہیں اور ملوکیت کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ بادشاہوں کے محلوں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اور مزدوروں کے گھروں میں گھی کے چراغ جل رہے ہیں!

سچ ہے جب اللہ کے نیک بندے برسوں ملوکیت کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں اُٹھاتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ اللہ کے گھر کو ان نقلی خداؤں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جب تک حضرت ابراہیمؑ نے نمرود اور آتشِ نمرود کا مقابلہ نہیں کیا۔ اس وقت تک توحیدِ الٰہی دُنیا میں قائم نہ ہو سکی۔

اے مزدور! اُٹھ! ملوکیت کا دَور ختم ہو گیا۔ متحدہ کوشش کی بدولت بادشاہوں (خسرو پرویز) سے اپنا حق وصول کرے۔ یعنی حکمرانی ان کا حق نہیں ہے۔ بلکہ تیرا حق ہے۔

یہ حوصلہ افزا پیغام سُن کر کوہکن اپنی قوم (مزدور طبقہ) کے احساساتِ باطنی کی یُوں ترجمانی کرتا ہے کہ سرمایہ دار بظاہر بہت بھولا بھالا اور کم سخن ہے لیکن ظلم و ستم اور فتنہ انگیزی میں کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ بظاہر پُرامن ہے لیکن اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے اس کی زبان پر صلح کے الفاظ ہیں۔ لیکن باطن (دل) چنگیز کی طرح خون آشام ہے۔ اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ جب موقع ملتا ہے تو وہ مزدوروں کا

خون چوس لیتا ہے۔

چونکہ سرمایہ داروں کی عیاری اور ستم کوشی سے تنگ آچکا ہوں۔ اس لیے میں نے عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بنا لیا ہے اور عشق نے مجھے نالہ و فریاد پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لیے میں اپنے ہم پیشہ اور ہم مشرب افراد کو دعوت دیتا ہوں۔ اب وہ دنیا (ملوک) کے سامنے ظاہر ہو کر اپنی قوت کا مظاہرہ کریں اور ملوکیت کو ختم کر دیں۔ اب ہمیں ملوکیت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر دیکھ لو! میں نے اپنی ذاتی جدوجہد سے پہاڑ کاٹ کر پھینک دیا۔ لیکن خسرو کے مقابلہ میں شیریں کو حاصل نہ کر سکا۔ محض اس لیے کہ میں تنہا تھا۔ اس لیے اے تمام دنیا کے مزدورو! متحد ہو جاؤ۔ اور قدرت کے اس قانون کو ہر وقت مدِنظر رکھو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مصروفِ عمل ہے۔ جو شخص عمل نہیں کرتا، وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

نیٹشا

از نیستی عناصرِ انساں دمش تپید   فکرِ حکیم پیکرِ محکم تر آفرید

افگند در فرنگ صد آشوب تازہ

دیوانۂ بکارگہِ شیشہ گر رسید!

تمہید اقبال نے دو شعروں کی اس نظم میں اپنے شاعرانہ فن اور اپنی فکرِ رساں دونوں کا کمال دکھایا ہے۔ یعنی چوتھے مصرع میں نیٹشا کے تمام بنیادی تصورات کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے اس مختصر ترین نظم کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کم از کم اس کی تین تصانیف سے واقفیت ضروری ہے:۔

(ا) نسب نامۂ اخلاق۔

(ب) ماورائے خیر و شر۔

(ج) بقول زرتشت۔

ناظرین کی سہولت کے لیے ذیل میں ان کتابوں کے بنیادی تصورات درج کرتا ہوں تاکہ چوتھے مصرع کا مفہوم واضح ہو سکے۔

(۱) خدا اور ابلیس، جنت اور دوزخ اور عالمِ آخرت کے تمام تخیلات انسان نے اپنی نادانی سے خود پیدا کیے ہیں، ان میں سے کسی شے کا وجود نہیں ہے۔

(۲) اس نے تمام اخلاقی اقدار کو تہ و بالا کر دیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نیکی یا بدی اخلاقی اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ سیاسی اور عمرانی اصطلاحیں ہیں۔ پہلے زمانہ میں طاقتور اور بہادر آدمی کو نیک کہا جاتا تھا۔ اور بد وہ تھا جو کمزور اور بزدل ہوتا تھا۔ جب طاقتور اور بہادر آدمی حکمران بن گئے، تو انہوں نے اپنی مرضی سے ضابطۂ اخلاق مدون کیا یعنی طاقتور کو نیک اور کمزور یعنی محکوم کو بد قرار دیا۔ ان کے بعد پادریوں کا زمانہ آیا۔ انہوں نے ان لوگوں سے انتقام لیا۔ بایں طور کہ کمزوروں اور ناتوانوں کو نیک اور طاقتور کو بد قرار دیا۔ اس طرح لومڑیوں نے عقابوں کی جگہ حاصل کر لی۔

(۳) ضمیر کی آواز انسانی تخیل کی اختراع ہے۔

(۴) مسیحیت ایک مقدس فریب ہے۔ یہ مذہب صرف غلاموں اور کمزوروں کے لیے موزوں ہے۔ چونکہ فوق البشر کا ظہور لازمی اور یقینی ہے۔ اس لیے مسیحیت کے لیے دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

(۵) کفارہ کا عقیدہ بالکل مہمل اور باطل ہے۔

(۶) یہ دنیا ایک مدت سے پاگل خانہ بنی ہوئی ہے۔ جسے دیکھو حماقت میں مبتلا ہے۔

(۷) اس دنیا میں ازلی اور ابدی آواگون کا قانون جاری ہے، جو کچھ آج نظر آ رہا ہے اس سے پہلے بعینہٖ واقع ہو چکا ہے اور آئندہ بھی بعینہٖ واقع ہوگا۔ اس دنیا کا نہ آغاز ہے نہ انجام۔

(۸) چونکہ خدا نہیں ہے، اس لیے انسان کو خود خدا بننا چاہیے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ انسان فوق البشر بننے کی کوشش کرے۔ انسان غلطی سے خدا کو باہر ڈھونڈ رہا ہے۔ حالانکہ اس کی خودی ہی خدا ہے۔ پس اسے اپنی خودی کو مستحکم کرنا چاہیے تاکہ وہ فوق البشر بن سکے۔

نوٹ:- یہاں اگرچہ اس مسئلہ میں نیٹشے اور اقبال میں بادی النظر میں ہم آہنگی یا مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے بعض ناقدینِ اقبال کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ اقبال نے 'مردِ مومن' کا تخیل نیٹشے سے مستعار لیا ہے۔ حالانکہ دونوں کے مفہوم میں بعد المشرقین ہے۔ نیٹشے کا فوق البشر خدا کا منکر ہے بلکہ خود خدا ہے۔ لیکن اقبال کا 'مردِ مومن' خدا کا نائب ہے ؎

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

مماثلت جو کچھ ہے، وہ اس حد تک ہے کہ نطشہ کا فوق البشر اور اقبال کا 'مردِ مومن' دونوں عناصرِ کائنات پر حکمران ہو سکتے ہیں۔[9]

(۹) رہبانیت اور ترکِ دُنیا کا تصور انسان کی سب سے بڑی حماقت ہے۔

(۱۰) انسان کو فوق البشر بن کر دُنیا میں زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ چنانچہ بقولِ زرتشت میں اُس نے فوق البشر کا نغمہ اپنے مخصوص انداز میں دُنیا کو سُنایا ہے، بلکہ یہ کتاب اُس نے اپنے "خونِ جگر" سے لکھی ہے۔

نوٹ:- "خونِ جگر" کی یہ ترکیب میں نے خود نیٹشے ہی سے مستعار لی ہے کیونکہ وہ یہ کہتا ہے کہ غیر فانی شعر وہی ہے جسے شاعر اپنے خونِ جگر سے لکھتا ہے۔[12]

اب میں اس کی اس غیر فانی تصنیف سے چند فقرے ذیل میں درج کرتا ہوں:-

(ا) "کیا لوگوں نے ابھی تک یہ خبر نہیں سُنی کہ خدا مر گیا؟"

(ب) "چونکہ تمام دیوتا مر چکے ہیں۔ اس لیے اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ فوق البشر جیتا رہے۔"

(ج) "میں تم سے پوچھتا ہوں، بھلا لنگور کو انسان سے کیا نسبت ہے! بس یہی نسبت انسان کو فوق البشر سے ہے۔"

(د) جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے، انسان نے آج تک حقیقی معنی میں لطفِ زیست حاصل نہیں کیا ہے۔ اور میری رائے میں یہی اس کا "موروثی گناہ" ہے۔

(۴) "میں تم سے کہتا ہوں کہ خون، انسان کی اصل روح ہے۔ جو کچھ اب تک انسان نے لکھا ہے، مجھے وہی محبوب ہے جو اُس نے اپنے خون سے لکھا ہے۔"

(۵) تم مجھ سے پوچھتے ہو کیا نیک مقصد جنگ کو مقدس بنا سکتا ہے؟

میں جواب دیتا ہوں کہ نیک جنگ، مقصد کو مقدس بنا سکتی ہے۔"

ناظرین مذکورہ بالا تصریحات اور بنیادی افکار کو مدِنظر رکھ کر بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ نیٹشے کے ان خیالات نے اہلِ مغرب کے دماغوں میں وہی ہنگامہ برپا کر دیا ہوگا جو چینی کے برتنوں کی دوکان میں ایک دیوانہ کے داخل ہو جانے سے برپا ہو جائیگا۔ اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں:۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب نیٹشے نے انسان کی کمزوری پر نظر کی تو اس کے دل میں ہمدردی کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس لیے اس نے بنی آدم کے سامنے فوق البشر کا تخیل پیش کیا یعنی ان سے کہا کہ اپنی خودی کو مستحکم کر کے کائنات پر حکمران ہو جاؤ۔

اس کے افکار نے اہلِ یورپ کے دماغوں میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کا فلسفہ کیا تھا؟ بس یہ سمجھو کہ ایک دیوانہ کانچ کے برتنوں کے کارخانہ میں جا گھسا۔ جس طرح دیوانے کے ہاتھ سے کوئی برتن سلامت نہیں رہ سکتا، اسی طرح نیٹشے نے یورپ میں تہذیب کے تمام اصولوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

حکیم آئن شٹائن

جلوہ می خواست مانند کلیم ناصبور
تا ضمیر مستنیر او کشود اسرار نور
از فراز آسمان تا چشم آدم یک نفس
زود پروازی کہ پروازش نیاید در شعور
خلوت او در زغال تیرہ فام اندر مغاک
جلوتش سوزد درختی را چو خس بالای طور
بی تغیر در طلسم چون و چند و بیش و کم
برتر از پست و بلند و دیر و زود و نزد و دور
در نہادش تار و نور و سوز و ساز و مرگ و زیست
اہرمن از سوز او و از ساز او جبریل و حور

من چہ گویم از مقام آن حکیم نکتہ سنج
کردہ زردشتی ز نسل موسی و ہارون ظہور

تمہید: اقبال نے اس نظم میں حکیم موصوف الصدر کے نظریۂ اضافیت کو شاعری کے لباس میں پیش کیا ہے۔ ایک تو یہ نظریہ بذاتِ خود بہت عسیر الفہم ہے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ اقبال نے اسے "حدیثِ خلوتیاں" کے زمرہ میں داخل کر کے رمز و ایما کے پردوں میں پوشیدہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نظم بالکل چیستاں بن کر رہ گئی۔ بقول ڈاکٹر رضی الدین، نظریۂ اضافیت کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ ریاضی کے علاوہ طبیعات سے بھی اچھی خاصی واقفیت درکار ہے۔ چونکہ میں ان دونوں فنون سے نابلد ہوں، اس لیے اس نظریہ کی وضاحت کما حقہٗ تو نہیں کر سکتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس نظریہ کی جو تشریح اس رسالہ میں پیش کی ہے جسے انہوں نے ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کی خاطر لکھنا شروع کیا تھا، اس کی مدد سے اس نظریہ کے مفہوم کو کسی قدر واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے حکیم موصوف کے مختصر سوانح حیات درج کرتا ہوں:-

حکیم آئنسٹائن ۱۸۷۹ء میں ورٹمبرگ (جرمنی) ایک خوشحال یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا زمانۂ طفولیت میونخ میں بسر ہوا۔ بعد ازاں اس کے والدین نے میلان واقع اطالیہ کو اپنا وطن بنا لیا۔ ۱۹۰۹ء میں زیورچ یونیورسٹی میں طبیعات کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اور ۱۹۱۴ء میں اسے قیصر ولیم فزیکل انسٹی ٹیوٹ برلن کا ناظم اعلیٰ بنا دیا گیا۔ وہ ۱۹۳۳ء تک اسی عہدہ پر فائز رہا۔ لیکن جب نازی پارٹی نے اپنے نسلی تعصبات کا اظہار کیا، تو اس گوہرِ بے بہا کو یہودی ہونے کے جرم میں جلا وطن کر دیا۔ اس نے پہلے کچھ دنوں انگلستان میں قیام کیا بعد ازاں امریکہ چلا گیا۔ جہاں اسے وہ عزت حاصل ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔

حکیم موصوف نے اپنا نظریہ سب سے پہلے ابتدائی شکل میں ۱۹۰۵ء میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں اور ۱۹۲۱ء میں اس نظریہ کو کامل وضاحت اور تسلی بخش شواہد کے ساتھ مرتب کیا۔ اپنی کتابوں میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ زمان اور مکان مطلق نہیں ہیں

بلکہ اضافی ہیں۔ اسی طرح حرکت بھی اضافی ہے۔ اور یہی نکتہ نظریۂ اضافیت کی رُوحِ رواں ہے۔ یعنی حرکت کی سُرعت یا سُستی دیکھنے والے کے زاویۂ نگاہ اور دیگر کوائفِ متعلقہ پر موقوف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی حرکت خالد کی نظر میں سریع ہے مگر قاسم کی نگاہ میں بطئی (سُست) ہے۔

اس کے نظریہ کی صحت کی عملی طور پر تصدیق کے لیے حکماء نے اس کو قانونِ ثقل پر منطبق کیا۔ آئینسٹائن نے یہ پیشگوئی کی کہ شعاعِ آفتاب کا انکسار (DEFLECTION) حکیم نیوٹن کے نظریہ کے مقابلہ میں دُگنا ہوگا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب آفتاب کا کسوفِ کامل واقع ہوا، تو حکیم موصوف کے نظریہ کی صحت حکمائے عالم میں مُسلّم ہوگئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء میں امریکہ اور انگلستان کے تمام سائنسدانوں اور ہیئت دانوں نے اُسے اپنا امام تسلیم کرلیا۔

ناظرین کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ عصرِ حاضر کا یہ عظیم المرتبت ریاضی، سائنس اور ہیئت دان، سیاسی عمرانی قومی اور فلسفیانہ مسائل میں بھی بڑی دلچسپی رکھتا ہے اور چونکہ یہودی ہے، اس لیے "صیہونیت" کا بھی حامی ہے۔

اب میں ڈاکٹر رضی الدین کی تصنیف موسومہ اضافیت سے بعض اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ اس نظریہ کا مفہوم کسی حد تک واضح ہوسکے۔

(۱) آئینسٹائن کے نظریہ کی رُو سے زمان و مکان ایک دوسرے سے علیحدہ اور مطلق نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے پر منحصر اور اضافی ہیں۔

(۲) اس کا پہلا مفروضہ "اضافیت کا مفروضہ" کہلاتا ہے جس کی رُو سے تمام مشاہدہ کرنے والے جو سیدھی یکساں رفتار سے حرکت کررہے ہوں، ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی کو دُوسرے پر کوئی ترجیح نہیں ہے۔

(۳) اس کا دوسرا مفروضہ "مستقل رفتارِ نور" کا مفروضہ کہلاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مشاہدہ کرنے والوں کے لیے، چاہے وہ کسی یکساں سیدھی رفتار سے حرکت کررہے ہوں، روشنی کی رفتار

ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی اگر دو مشاہد دو مختلف سمتوں میں مختلف یکساں سیدھی رفتاروں سے جا رہے ہوں، تو دونوں کے لیے روشنی کی رفتار کی قیمت وہی ایک حاصل ہوگی۔

(۴) کائنات میں مطلق حرکت اور مطلق رفتار کا معلوم کرنا کسی طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت کی بنیاد ہی اس نکتہ پر ہے کہ تمام حرکت اضافی ہے۔

(۵) کائنات میں کوئی مادی شئے: روشنی کی رفتار سے زیادہ سرعت کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی۔

(۶) متحرک جسموں کا طول، حرکت کی سمت میں ہمیشہ کم نظر آئے گا۔

(۷) ہر متحرک شئے کی کمیت (QUANTITY) میں اضافہ ہونا لازمی ہے۔

(۸) نظریۂ اضافیت نے انسانی ذہن کو غیر ضروری اور بے کار مفروضوں کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ مثلاً زمان و مکان کے مطلق ہونے کا عقیدہ (تصور) باطل ہو گیا۔ اور ہم وقت کے بھی مطلق طور پر کوئی معنی نہیں رہے۔ قوت بھی مطلق نہیں رہی بلکہ اضافی ہو گئی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس طرح زید یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ گولا زمین پر گر پڑا، اسی طرح خالد یہ کہہ سکتا ہے کہ زمین گولے پر گر پڑی۔

(۹) اسی طرح قوت کا تصور بھی غیر ضروری ہو گیا ہے مثلاً کسی جسم کی حرکت کے متعلق یہ کہنا کہ وہ قوت کی وجہ سے ہوتی ہے بلا وجہ غیر ضروری پیچیدگی پیدا کرنا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ جسم جہاں واقع ہے اس کے اردگرد "مکان زمان" کی حالت ہی کچھ ایسی ہے کہ جسم کا آسان ترین راستہ وہی ہے جو تم کو نظر آ رہا ہے۔ اس نظریہ کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ تجاذب کا تصور بھی باطل ہو گیا۔ یعنی زمین سورج کے گرد اس لیے چکر نہیں لگا رہی ہے کہ کوئی قوتِ تجاذب کارفرما ہے۔ بلکہ زمین اپنے آسان ترین راستہ پر جا رہی ہے بالفاظ دیگر ہم جسے قوت کہتے ہیں، وہ صرف مکان زمان کی ایک خاصیت ہے کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔

(۱۰) جہاں مادہ موجود ہو، اس کے ارد گرد کی فضاء مڑ جاتی ہے یعنی نا اقلیدسی خاصیت اختیار کر لیتی ہے اور اس پیچ و خم سے معمور فضاء میں جسم اپنے لیے آسان ترین راستے اختیار کر لیتے ہیں۔ ع

کارواں تھک کر فضاء کے پیچ و خم میں رہ گیا

(۱۱) روشنی کی شعاع سیدھے خط میں جاتی ہے لیکن صرف اُسی وقت جب فضاء میں کوئی مادہ نہ ہو۔ یہی شعاع کسی مادی جسم کے قریب سے گذرے تو اپنے سیدھے راستہ سے منحرف ہو جائے گی۔ اس نظریہ کی تصدیق ۲۹، مئی ۱۹۱۹ء کو ہوئی۔ جب کسوفِ شمس مکمل طور پر واقع ہوا۔ یعنی پورے سورج کو گرہن لگا۔

(۱۲) حکیم موصوف نے ثابت کیا کہ روشنی میں بھی وزن ہے چنانچہ آفتاب سے نکل کر زمین پر ایک دن میں جس قدر روشنی پڑتی ہے اس کا وزن ۱۶۰ ٹن ہے اور اگر اس روشنی کو تین آنے فی یونٹ کے حساب سے فروخت کیا جائے تو ایک پونڈ کمیت کی روشنی میں اس قدر یونٹ ہوں گے کہ ان کی قیمت دو ارب دس کروڑ روپے ہو گی۔

(۱۳) اس سے بھی بڑھ کر حکیم موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ توانائی اور مادہ اصل میں ایک ہی چیز کی مختلف حالتیں ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ آئن سٹائن کے اس حیرت انگیز انکشاف نے مسلکِ مادیت (MATERIALISM) پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ اب اس کے جانبر ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

(۱۴) اس کے نزدیک یہ کائنات بلحاظِ امکان متناہی ہے مگر بلحاظِ زمان غیر متناہی ہے۔ یعنی نظریۂ اضافیت کی بدولت ہمیں یہ معلوم ہوا کہ فضاء (مکان) کا قدیم تصور غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ حکیم موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ فضاء چپٹی نہیں ہے۔ بلکہ پیچدار اور خمیدہ ہے۔ اس لیے اس کی انتہا ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کی کوئی حد نہ ہو۔

ان تصریحات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ نظریۂ اضافیت نے علمی دنیا میں اور ہمارے قدیم علمی تصورات میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے۔ اور اقبال

نے آئن سٹائن کے انہی علمی کارناموں سے متاثر ہو کر اس نظم میں اس کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

نوٹ:۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ اقبال نے اس نظم میں نظریۂ اضافیت کی تشریح نہیں کی ہے کیونکہ پانچ شعروں میں اس نظریہ کی تشریح بالکل ناممکن ہے بلکہ حکیم موصوف کے علمی مقام کی عظمت واضح کی ہے۔ جیسا کہ آخری شعر سے صاف ظاہر ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نظریۂ اضافیت کا مدار شعاعوں میں لچک کا تصور ہے اور حکیم آئن سٹائن کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے حکیم نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل کو بالکل باطل کر کے شعاعوں میں لچک (انکسارِ نور) کا نظریہ پیش کیا ہے۔

نظم کا مطلب کہتے ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ جلوۂ ذاتِ باری تعالیٰ کے طالب تھے، اسی طرح حکیم آئن سٹائن، روشنی (نور) کی حقیقت سے آگاہی کا آرزومند تھا، چنانچہ اس نے بڑی جدوجہد کے بعد نور کے اسرار دنیا پر واضح کئے ہیں۔ ذیل میں نور کے بعض اسرار درج کرتا ہوں:۔

(۱) حکیم موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ روشنی کی شعاعیں تجاذبی قوت سے متاثر ہوتی ہیں۔

(۲) کائنات میں کوئی مادی شے، روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ سفر نہیں کر سکتی۔ واضح ہو کہ نظریۂ اضافیت میں روشنی کی رفتار بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

(۳) روشنی کی شعاع سیدھے خط میں جاتی ہے لیکن صرف اسی صورت میں جبکہ فضا میں کوئی مادہ نہ ہو۔ اگر یہی شعاع کسی مادی جسم کے قریب سے گذرے گی تو مڑ جائے گی۔ یعنی شعاعوں میں لچک پائی جاتی ہے۔

(۴) روشنی کو بھی وزن کر سکتے ہیں۔

(۵) سورج سے آنے والی شعاعوں کا طولِ موج، ان شعاعوں کے طول کی بہ نسبت جو زمین پر انہی عنصروں سے خارج ہوتی ہیں کسی قدر زیادہ ہوتا ہے

(۶) شعاعوں کا انحراف اور فضا کا پیچ و خم دونوں آپس میں مربوط ہیں۔

۲۔ یہ نور اس قدر زود پرواز ہے کہ انسانی ذہن اس کی سرعت کا تصور نہیں کر سکتا۔ واضح ہو کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار ایک سو بہتر میل فی سیکنڈ ہے۔ یعنی اگر کوئی ہوائی جہاز اسی تیزی سے پرواز کر سکے تو وہ ایک سیکنڈ میں سات مرتبہ کرۂ ارض کے گرد گھوم کر اپنی جگہ بآسانی واپس آسکتا ہے۔

۳۔ نور کی یہی شعاعیں جب معاون (کانوں) کی ظلمت میں داخل ہوتی ہیں، تو ان کی تاثیر سے کوئلہ بنتا ہے۔ اور جب فضائے کائنات میں ظاہر ہوتی ہیں، تو اشیاء کو جلا دیتی ہیں۔

۴۔ نور کی شعاعیں اگرچہ زمان و مکان کے طلسم میں گرفتار ہیں، یعنی دنیا میں ہر جگہ کارفرما ہیں لیکن تغیرات سے پاک ہیں۔ یعنی نور کی شعاع ہر شئے پر پڑتی ہے۔ لیکن کسی شئے سے متغیر نہیں ہوتی۔ اور چونکہ روشنی کی سرعتِ رفتار، تمام رفتاروں کے لیے بمنزلہ معیار ہے اس لیے روشنی، پستی اور بلندی، نزدیکی اور دوری۔ یعنی تمام اضافتوں اور نسبتوں سے بالاتر ہے۔

۵۔ یہ نور مجموعۂ اضداد ہے۔ روشنی اور تاریکی، سوز اور ساز، مرگ اور زیست ابلیس اور جبرئیل۔ غرضکہ ساری کائنات اسی کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے نور سے ذاتِ باری کا نور مراد لیا ہے جو اس کائنات کی حقیقت ہے جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (۲۴ : ۳۵)

اللہ ہی ہے نورِ آسمانوں اور زمین کا۔

نار (ظلمت) رشید (روشنی) سوز و ساز، مرگ و زیست، ابلیس و جبرئیل یہ سب اسی کے نور کی مختلف کرشمہ سازیاں (تجلیات) ہیں۔ وہی ذاتِ واحد مختلف اشکال میں جلوہ گر ہے۔

۶۔ کہتے ہیں کہ میں حکیم موصوف کی جلالتِ شان کا کیا ذکر کروں۔ بس یوں

سمجھو کہ یہودی قوم میں دوسرا زرتشت پیدا ہو گیا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے حکیم موصوف کو زرتشت سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ اسی فلسفی نے دنیا کو سب سے پہلے زر کی اہمیت سے آگاہ کیا۔

حکیم زرتشت غالباً سنہ ۹۰۰ ق م اور سنہ ۸۰۰ ق م کے درمیان، ایران میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ثنویت کے مسئلہ کا دنیائے قدیم میں سب سے بڑا علمبردار تھا۔ لیکن اس کی تعلیم، مرورِ ایام سے آفتاب پرستی، اور بعد ازاں آتش پرستی میں تبدیل ہو گئی۔

بائرنؔ

مثلِ بادی کہ گلِ صحرا ز بید — گہ بہ خاکِ گلستاں تازہ ازو جوش

نبود جوشش بہ گلِ عصر و رنگ — قیدِ پیکر بشکست و بروں جہد پیاش

غیبِ ایام بہ گاہ زنگار است — شبابِ غنچہ بہ لب پوش

گرداشت طائرِ جوش نشیمن خود را

کہ دستگاہ زرِ آرشگفتہ و آتش!

تمہید بائرن کا شمار نہ تو انگلستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہے، اور نہ اس کی سیرت میں شیلی کی سی پاکیزگی اور بلندی پائی جاتی ہے اس لئے ابتداءً مجھے حیرانی ہوئی تھی کہ علامہ نے اس خوش نصیب انسان کو پیامِ مشرق میں کیسے جگہ دی! لیکن کافی غور و فکر کے بعد میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا، کہ بائرن کی شاعری کی خصوصیات نے علامہ کو اس کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرنے پر راغب کیا۔

بائرن کی شاعرانہ خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) اس کے کلام میں بغاوت کا جذبہ ہر جگہ کارفرما ہے۔ کیونکہ اس کی پوری زندگی بغاوت کی تصویر ہے۔ اس نے خدا، مذہب، کلیسا، سوسائٹی، رسوم، فیشن، ضابطۂ اخلاق، تمدنی روایات، الغرض ہر شے کے خلاف بغاوت کی۔ چنانچہ ڈان جوآن میں اس نے اپنے ہم وطنوں کی ان تمام رسوم و روایات پر استہزاء کیا ہے، جن کو وہ نہایت محترم قرار دیتے تھے۔

(۲) اس کی شاعری کی دوسری خصوصیت اُسکا جذبۂ انانیت (EGOTISM) ہے۔ اُس نے اکثر نظموں میں ہیرو کے پردہ میں اپنی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ بالفاظِ دگر، اکثر نظموں کے ہیرو کے لباس میں اُسی کی خودی جلوہ گر ہے۔ اور یہی جذبۂ انانیت اُسے اطالیہ کی رومان انگیز سرزمین سے نکال کر یونان کے ہنگامہ خیز ماحول میں لے گیا۔

(۳) تیسری خصوصیت وہ زورِ کلام ہے جو اس کی بیشتر نظموں میں پایا جاتا ہے، اور اسی زورِ کلام کی وجہ سے وہ بعض اوقات شاعرانہ آداب اور فنی قیود کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔

(۴) چوتھی خصوصیت اس کی زبردست قوتِ تخیل ہے جس کی طرف اقبال نے اپنی نظم کے تیسرے شعر میں اشارہ کیا ہے۔

بائرن کی زندگی مختصر ہونے کے باوجود بڑی دلچسپ ہے۔ وہ ۱۷۸۸ء میں بمقام لندن پیدا ہوا تھا۔ چونکہ اس کا باپ بڑا عیاش تھا۔ اس لیے جارج گارڈن (بائرن) کی پیدائش کے چند ماہ بعد قرض خواہوں کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے بیوی بچوں کو خدا پر چھوڑ کر فرانس چلا گیا۔ اور وہیں وفات پائی۔

جارج کی ابتدائی زندگی عالمِ مفلسی میں بسر ہوئی لیکن ۱۷۹۸ء میں اس کا تایا لارڈ بائرن لاولد مر گیا۔ اس لیے یہ دس سالہ یتیم لڑکا خوبیٔ تقدیر سے لارڈ بائرن بن گیا۔

جارج بائرن کو قدرت نے غیر معمولی مردانہ حسن عطا کیا تھا جس کی وجہ سے بقول ڈاکٹر لانگ "وہ بہت سی بیوقوف عورتوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور اُنھوں نے اُسے بُرے راستہ پر ڈال دیا۔"

۱۸۱۵ء میں اُس نے شادی کی۔ لیکن ایک سال کے بعد ۱۸۱۶ء میں اس کی بیوی نے قانونی طور پر اُس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس واقعہ سے سوسائٹی میں اس کی اس قدر تذلیل ہوئی کہ دل برداشتہ ہو کر اُس نے اپنے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ ۱۸۲۳ء تک وہ اطالیہ میں مقیم رہا۔ ۱۸۲۳ء کے آغاز میں ترکوں کے خلاف اہلِ یونان کی امداد کے لیے یونان پہنچا

اور وہیں اپریل ۱۸۲۴ء میں وفات پائی ۔

نظم کا مطلب

(۱) جام، کنایہ ہے بائرن کے باغیانہ جذبات سے ۔ جو اس کی شاعری میں پائے جاتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ وہ شراب جو اس کے جام میں بھری ہوئی ہے ۔ اگر باغ میں ٹپکائی جائے تو اس کے اثر سے لالہ و گل کی طرح شعلے اُگنے لگیں گے ۔ یعنی اس کا کلام دلوں میں آگ لگا سکتا ہے ۔

(۲) ہوائے سرد فرنگ، کنایہ ہے انگریزوں کی قدامت پرستی سے ۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی قدامت پرستی اس کی افتادِ طبع کے مطابق نہیں تھی ۔ اس کی شاعری میں اس بلا کا جوش و خروش ہے کہ اُس کے پیغامِ بغاوت کے سوز سے خود محبت تڑپ اُٹھی ۔

(۳) خیال سے قوتِ تخیل مراد ہے اور یہ اس کی شاعری کی خصوصیت ہے جس کا تمام نقادانِ فن نے اعتراف کیا ہے ؛ پریخانہ کنایہ ہے اُس دلکشی سے جو اُس کے کلام میں پائی جاتی ہے ؛ شباب کنایہ ہے نوجوان طبقہ سے ؛ رخشِ کند کنایہ ہے پسندیدگی سے یعنی نوجوانوں کو اس کا کلام باغیانہ جذبات کی وجہ سے بہت پسند ہے ؛ جلوہ لبِ بام کنایہ ہے اس کی شاعری سے مطلب یہ ہے کہ بائرن کی شاعری میں نوجوانوں کے لیے دلکشی کا سامان بہت زیادہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اُنہیں بغاوت کا پیغام دیا ہے ۔

(۴) طائرِ معنی سے بلاغت اور معنویت مراد ہے ؛ حلقۂ دام سے اسکی شاعری مراد ہے ۔ کہتے ہیں کہ طائرِ معنی کو اسکی شاعری اس درجہ پسند آئی کہ وہ اپنا نشیمن چھوڑ کر اسکے دام میں گرفتار ہو گیا ۔ یعنی اس کی شاعری معانی سے لبریز ہے ۔

نیٹشا

گر نوا خواہی ز پیشِ او گریز — در نئے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد — دستش از خونِ چلیپا احمر است
آنکہ بر طرحِ حرم بتخانہ ساخت — قلبِ او مومن دماغش کافر است

خویش را در نارِ آں نمرود سوز
زانکہ بستانِ خلیل از آذر است

تمہید نیٹشا پر یہ تیسری نظم ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اقبال کو اس "مجذوب فرنگی" سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ:۔

(الف) اس کے اور اقبال کے بنیادی افکار میں جزوی مماثلت پائی جاتی ہے

(ب) اس کی زندگی خلوص سے معمور تھی، اس لیے اقبال کو اس کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی۔ اس نے اگر خدا کا انکار کیا تو محض اس لیے کہ اس کے زمانہ میں کوئی شخص ایسا موجود نہ تھا جو اُسے مقامِ کبریائی سے آگاہ کر سکتا۔ اسی لیے اقبال نے یہ آرزو ظاہر کی تھی:

کاش بُودے در زمانِ احمدؒ[1]

تا رسیدے بر مقامِ سرمدے

اس نظم میں اقبال نے اس کے پیغام کی نوعیت واضح کرنے کے بعد خود اس کی شخصیت پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اور اس نظم کی توضیح کے لیے ایک "نوٹ" بھی سپردِ قلم کیا ہے جس سے اس کی اہمیت اور معنویت آشکار ہو سکتی ہے۔

امیہ ابن الصلت حضورِ سرورِ کائنات صلعم کا ہمعصر تھا۔ اور اس کی شاعری سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ وہ بت پرستی اور دوسری اخلاقی بُرائیوں سے نفور تھا۔ لیکن جب حضورؐ نے دعوٰئے نبوت کیا تو اُسے حضورؐ پر ایمان لانے کی توفیق حاصل نہ ہو سکی۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ "اس کی زبان مومن تھی لیکن اس کا دل کافر تھا۔" اقبالؔ نے حضورؐ کے اس ارشاد کو بدل کر نیٹشا پر منطبق کیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی بعض اُن اخلاقی اصولوں کی تعلیم دیتا ہے جو اسلامی زاویۂ نگاہ سے محمود ہیں۔ لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ وہ خدا کا منکر ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں:۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تُو نغمۂ دل فروز یا رُومانی شاعری کا آرزومند ہے، تو اس کے کلام کا مطالعہ مت کر کیونکہ اُس کے کلام میں عاشقانہ جذبات نہیں ہیں۔ بلکہ بجلی کا کڑکا (غریو تندر) پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی شاعری سراسر انقلاب انگیز ہے۔ جس نے تمام اخلاقی اقدار

---

[1] احمدؒ سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ مراد ہیں ۱۲

کو تہ و بالا کر دیا ہے۔

دوسرے شعر میں غزنوی تندر کی مثال دیتے ہیں کہ اس نے
(۱) ایک طرف تو مغرب کے دل میں نشتر چبھوئے ہیں۔ یعنی اہل مغرب کے مسلّمہ افکار کی تردید کی ہے، اور ان کی سیاست اور معاشرت دونوں کی لغویت آشکار کی ہے۔

(ب) دوسری طرف مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ اسکی وضاحت سابقہ نظم میں کر چکا ہوں، اس لیے یہاں اعادہ بیکار ہے۔ اقبال نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے کہ "اس کا ہاتھ کلیسا کے خون سے سرخ ہو رہا ہے۔"
(۳) اس نے حرم کی بنیادوں پر بتخانہ تعمیر کیا ہے یعنی نظام تو وہ پیش کیا ہے جو انکار پر خدا پر مبنی ہے۔ لیکن اس نظام میں کہیں کہیں اسلامی تعلیمات (حرم) کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ۔

"قلب او مومن دماغش کافر است"

(۴) اے مخاطب! اگر تو مسلمان ہے تو تیرا فرض منصبی یہ ہے کہ تو حضرت ابراہیمؑ کے نقش قدم پر چلے۔ یعنی دنیا کو توحید کا پیغام سنائے۔ پس جس طرح حضرت خلیلؑ نے نمرود کا مقابلہ کیا تھا۔ تو اپنے زمانہ کے نمرود (نیٹشا) کا مقابلہ کر یعنی اس کے فلسفہ (مسلک) کا ابطال کر۔ اور اہل یورپ کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کر یعنی یہ بتا کہ اسلام نے فوق البشر (مومن) کا جو تخیل پیش کیا ہے، وہ نیٹشا کے فوق البشر سے افضل اور برتر اور بہتر ہے۔

جلال و ہیگل

می کشودم شبے بناخن فکر	عقدہ ہائے حکیم المانی
آنکہ اندیشہ اش برہنہ نمود	ابدی را ز کسوت آنی
پیش اہرمن خیال او گیتی	خجل آمد ز تنگ دامانی
چوں بدریائے او فرو رفتم	کشتی عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونے	چشم بستم زباقی و فانی

مگر شوق تیز تر گردید ‏ — چہرہ بنمود پیر یزدانی
آفتابے کہ از تجلی او ‏ — افق روم و شام نورانی
شعلہ اش در جہان تیرہ نہاد ‏ — بہ بیابان چراغ رہبانی
معنی از حرف او ہمی دید ‏ — صفت لالہ ہائے نعمانی
گفت با من ، چہ خفتۂ؟ برخیز! ‏ — بہ سرابے بحیلہ می رانی؟

"چند در راہ عشق می پوئی؟
بہ چراغ آفتاب می جوئی؟"

تمہید اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہیگل کا فلسفہ اپنی غیر معمولی شوکت اور عظمت کے باوجود "سراب" ہے محض لفاظی ہے۔ یعنی لفظوں کا طلسم ہے معنی پرست ہے جس میں مغز نہیں ہے یا صدف ہے جس میں موتی نہیں ہے بقول اقبال:-

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ؛ ہے اس کا طلسم سب خیالی

ہیگل کا فلسفہ سراب ہے یعنی اس کے مطالعہ سے انسان کو صحیح یا حقیقی علم حاصل نہیں ہو سکتا یہاں علم سے میری مراد معرفتِ الٰہی ہے۔ کیونکہ فلسفہ میں علم کا مقصود اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو "حقیقت" (REALITY) کا علم حاصل ہو جائے۔

ہیگل نے، اس میں شک نہیں کہ مادہ کے بجائے رُوح (خدا) کو حقیقت قرار دیا ہے۔ لیکن اُس نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا ہے، وہ اس قدر مغلق اور مبہم ہے کہ سب کچھ پڑھ جانے کے بعد بھی انسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ یعنی وہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ ہیگل کا مسلک کیا ہے

یہی وجہ ہے کہ:-

(ا) مسیحی علماء نے اس کی تصانیف سے مسیحیت کی تائید میں دلائل حاصل کئے
(ب) ملاحدہ نے انہی تصانیف سے مذہب کے خلاف دلائل اخذ کئے۔
(ج) اس کا ایک شاگرد یہ کہتا ہے کہ وہ خدا پرست تھا۔
(د) دوسرا شاگرد (میک ٹیگرٹ) یہ کہتا ہے کہ وہ خدا کا منکر تھا۔

ہیگل کہتا ہے کہ حقیقت کبریٰ روحِ مطلق (خدا) ہے۔ اسی لیے اس کے فلسفہ کو تصوریتِ مطلقہ کہتے ہیں) اور یہ کائنات اُسی روحِ مطلق کے طریق

فکر کی خارجی صورت ہے۔ اگر خدا کے تفکر کا سلسلہ ختم ہو جائے، تو کائنات خود بخود ختم ہو جائے گی کیونکہ اس کا کوئی مستقل خارجی وجود نہیں ہے۔ یہ نظرت کیا ہے؟ فکرِ ایزدی کا ظہور فی الخارج ہے۔ یعنی خدا کے خیالات بشکلِ کائنات خارج میں متشکل ہو گئے ہیں۔ خدا کی قوتِ ارادی اس قدر طاقتور ہے کہ جو خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ خارج میں متشکل ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام دُنیا ہے۔

ہیگل نے رُوحِ مطلق (خدا) کا جو تصور پیش کیا ہے۔ اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس کے فلسفہ کی رو سے ذاتِ ایزدی محض اس کائنات کے ابدی طریقِ عمل کا نام ہے اور شعورِ ایزدی شعورِ انسانی سے متمیز نہیں ہو سکتا۔ اسی ابہام کا یہ نتیجہ نکلا کہ مارکس، فیور باخ، گرین، بریڈلے، میک ٹیگرٹ وغیرہ سب مختلف الخیال ہیں۔ لیکن سب ہیگل کے شاگرد ہیں اور اپنے اپنے مسلک کی تائید میں اُسی کو پیش کرتے ہیں۔

بریڈلے کہتا ہے کہ ہیگل خالص وجودی ہے۔ یعنی وحدۃ الوجود کا علمبردار ہے لیکن میک ٹیگرٹ کہتا ہے کہ ہیگل خالص منکرِ خدا ہے۔ مارکس کہتا ہے، کہ طبقاتی نزاع کا مسئلہ میں نے ہیگل ہی سے سیکھا ہے۔ اور شلائر میخر کہتا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ ہیگل ہی نے مجھے سمجھایا ہے۔ گرین کہتا ہے اور کیئرڈ اس کا ہمنوا ہے کہ ہیگل مسیحیت کا حامی اور علمبردار ہے۔ فیور باخ کہتا ہے کہ مسیحیت کی تردید کے اصول میں نے ہیگل ہی سے سیکھے ہیں۔ ع

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

افسوس یہ ہے کہ اس شرح میں ہیگل کے فلسفہ پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے فلسفہ میں ابہام کو ثابت کرنے کیلئے ایک مثال ضرور درج کروں گا۔

ہیگل کے سامنے یہ سوال آیا کہ جب ہم کائنات کی توجیہہ کسی فلسفیانہ زاویۂ نگاہ سے کریں گے۔ تو لازمی طور سے یہ بتانا ہمارا فرض ہوگا۔ کہ کائنات کی اس مابعد الطبیعاتی توجیہہ میں ہم طریقِ فکر کے کونسے پہلو کو استعمال کریں گے؟ چونکہ اس سوال کے جواب سے ہیگل کی تعمیر کردہ عمارت کے بہت سے ستونوں کے منہدم ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لیے اس نے اس مسئلہ کو ابہام کے پردوں میں

پوشیدہ کر دیا یعنی اس کے جواب سے ہم کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ سوال یہ ہے کہ اِس محدود دُنیا کے شئونِ متعددہ محض فریبِ نظر ہیں۔ یعنی بقول خواجہ میر دردؔ "یہ توہم کا کارخانہ ہے" یا جو کچھ ہم دیکھتے ہیں یہ حقیقی ہے اور کائنات کے ارتقاء کے لیے ضروری ہے؟ بالفاظِ دگر کیا رُوحِ مطلق کی تمام ترقی رتکمیلِ فعلِ ظہور، محض فریبِ نظر ہے یا رُوحِ مطلق واقعی ترقی کر رہی ہے؟ اگر رُوحِ مطلق واقعی ترقی کر رہی ہے، تو وہ ناقص ہے، اس لیے مطلق نہیں ہو سکتی۔ اور اگر رُوحِ مطلق واقعی ترقی نہیں کر رہی ہے، تو اس فریب سے اُسے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟

ہیگل نے اس کے جواب میں جو لفظی طلسم باندھا ہے، اُس نے انسان کی انفرادیت اور شخصیت دونوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ یعنی اُس نے ہمیں "مطلق" کی آغوش میں پناہ گزینی کی ترغیب دی ہے۔ لیکن یہ تو شاعری ہے نہ کہ فلسفہ۔

ان تصریحات سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اقبال کی اس نظم کا بنیادی تصور واضح ہو جائے، جو اس شعر میں مندرج ہے:-

گفت با من ایں چہ خفتہ برخیز ٭ بے سراب سفینہ می رانی!

نوٹ:- جب میں ان حکما (افلاطون، ارسطو، ڈیکارٹ، ہیوم، کانٹ اور ہیگل) کی قیاس آرائیوں اور موشگافیوں سے دل برداشتہ ہو جانے کے بعد اُس کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں جسے ایک اُمّی (روحی لہ الفداہ) نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔ یہاں نہ ظن ہے نہ تخمین، نہ قیاس ہے نہ گمان، نہ شک ہے نہ شبہ، بلکہ ہر لفظ میں یقین کا نُور ہے جس سے دِل کو اطمینانِ کلی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور جب ایک طالبِ حق اِس آیت پر پہنچتا ہے کہ "اگر تم ہمارے محبوبؐ کی اتباع کرو گے تو اُن کے طفیل میں ہم تمہیں بھی اپنا محبوب بنا لیں گے" تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آبِ حیات مِل گیا۔

کہتے ہیں، کہ میں ایک شب ہیگل کے فلسفہ کا مطالعہ کر رہا تھا، وہی

ہیگل جس کے فلسفیانہ افکار نے، ذاتِ مطلق کو مادی علائق سے قطعاً معرّیٰ کر دیا۔ بلکہ مادہ کا خاتمہ کر کے صرف رُوح کو باقی رکھا اور کائنات کو اسی رُوح کی جلوہ گری قرار دیا۔ اس کے خیالات کی وسعت کے سامنے اس کائنات کی وسعت بالکل تنگ نظر آتی ہے۔ اس کا فلسفہ مابعد الطبیعاتی (معقول) ہے۔ جب میں نے اس کے فلسفہ میں زیادہ غور کیا تو عقل پر تحیّر کا عالم طاری ہو گیا۔ اور میں اسی حالتِ اضطراب میں سو گیا۔

خواب میں مرشد رُومیؒ کی زیارت ہوئی۔ وہی رُومی جس کی تجلیات نے شام اور روم (دُنیائے اسلام) کو منوّر کر دیا۔ اس کا کلام سراسر معانی سے لبریز ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ارے نادان! کیا تو سراب میں کشتی چلا رہا ہے؟ کیا تو ہیگل کے فلسفہ میں حقیقت (پانی) ڈھونڈ رہا ہے؟ جس طرح سراب سے پانی نہیں مل سکتا، اسی طرح ہیگل کے فلسفہ سے حقیقت (معرفت الٰہی) حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہیگل کے فلسفہ کا دار و مدار منطق پر ہے (منطق سے ہیگل کی مراد فلسفہ ہے)۔ اور منطق سے سب کچھ مل سکتا ہے، لیکن خدا نہیں مل سکتا۔

اگر تو جویائے حقیقت ہے تو مسلکِ عشق اختیار کر۔ عقل کے ذریعہ سے خدا تک پہنچنے کی کوشش بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص چراغ لے کر آفتاب کو ڈھونڈنے چلے۔ بھلا آفتاب کی روشنی کے سامنے چراغ کی کیا حقیقت ہے! اسی طرح عقل جز بیں، کُل کو کیسے دیکھ سکتی ہے؟

پٹوفی

شاعر ہنگری کہ در جنگ استقلال وطن جوان کشتہ شد
و نعش او را نیافتند یادگارِ شاعر ...

نغمے در یں گلستاں ز عروسِ گل سرودی
بہ گلے غنچہ فرودی ز دلے غمے ربودی
تو بخونِ خویش بستی کف لالہ رنگ ...
تو بآہ صبحگاہے دلِ غنچہ را کشودی

بنوائے خود گم استی چو تو فرقہ تو
بہ زمیں نہ باز رفتی کہ تو از زمیں بودی!

تمہید ہنگری کا یہ جوانا مرگ شاعر، ضمیر کی پاکیزگی اور سیرت کی پختگی کے اعتبار سے اس مقام پر ہے کہ بائرن اور اسی وضع و قماش کے شعراء اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انگزینڈر پٹوفی کے باپ نے سالہا سال تک ضمیر فروشی کرکے شہنشاہ لیوپولڈ کی بارگاہ سے نوابی کا خطاب اور خلعت "ہفت پارچہ" حاصل کیا تھا۔ لیکن اس نوجوان نے جس کی رگ رگ میں حریت کا نشہ سمایا ہوا تھا۔ اس غلامانہ زندگی کے خلاف پوری قوت کے ساتھ بغاوت کی۔ نتیجہ وہی ہوا جو فرعون کے زمانہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یعنی باپ نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ چار سال تک انگزینڈر نے ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کیں لیکن اپنی حریت ضمیر کو برقرار رکھا۔ اس عرصہ میں اُسے بارہا مسلسل فاقہ کشی بھی کرنی پڑی۔ لیکن اُس نے ضمیر فروش باپ سے امداد طلب نہیں کی۔ جب کبھی میں اس کی لائف پڑھتا ہوں تو بے اختیار یہ مصرع زبان پر جاری ہو جاتا ہے:۔ آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو

اس زندگی نے اور زندگی، مصائب کی کٹھیائی میں پڑنے سے چمکتی ہے اس کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا۔ اس کو حقیقی معنی میں شاعر بنا دیا۔ چنانچہ اس عرصہ میں اُس نے بہت سی نظمیں لکھیں جن کے ہر مصرع سے حریت کی خوشبو آتی ہے۔ لیکن ملوکیت میں حریت کی تلقین کو بغاوت سمجھا جاتا ہے اس لئے نوجوان پٹوفی جس پبلشر کے پاس اپنا مجموعۂ کلام لے کر جاتا تھا، وہ اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا۔ آخرالامر اُس کے ایک قدردان وارس مارتی (VOROSMARTY) نے جو ایک فارغ البال علم دوست، دولتمند تاجر تھا، اپنے ایک دوست پبلشر کو "ان باغیانہ نظموں" کی اشاعت پر آمادہ کیا۔ چونکہ وہ پبلشر یہودی ٹائپ کا تھا۔ اس لیے اُس نے پٹوفی کی مفلسی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اور اس کو صرف ۵۰ فلورن یعنی سو روپے معاوضہ ادا کیا۔ چونکہ پٹوفی اُس زمانہ میں فاقے کر رہا تھا۔ اس لیے "مرتا کیا نہ کرتا" مجبوراً یہ رقم خطیر قبول کرلی۔

ان نظموں نے سارے ملک ہنگری میں آگ لگادی، اور چند ماہ کے اندر بچہ بچہ کی زبان پر پٹوفی کا نام ہو گیا۔ انہی نادیدہ قدردانوں میں ایک شریف خاتون جولیا زندرے (JULIA SZENDRAY) بھی تھی۔ جس نے ۸ ر ستمبر ۱۸۴۷ء کو اس مفلس نوجوان کو اپنا رفیق زندگی بنالیا۔

پٹوفی کا پہلا مجموعہ ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا جبکہ اس کی عمر صرف ۲۱ سال کی تھی۔ اس کے بعد چار سال کے قلیل عرصہ میں اس کی زندگی بخش نظموں کے نو مجموعے اور شائع ہوئے۔ اس کی نظموں میں ورڈ سورتھ کی فطرت پرستی، بائیرن کا تخیل اور شیلے کی مستی، اور کیٹس کا تغزل اور ٹینی سن کا جوش، یہ سب خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان نظموں نے عوام الناس کے دلوں میں محبت وطن کا زبردست جذبہ پیدا کر دیا۔ اس لیے پٹوفی کا نام ہنگری ادب میں غیر فانی ہو گیا۔ ان ساری خوبیوں کے علاوہ ایک بڑی خوبی جسے اس کی خصوصیت کہنا چاہیے یہ ہے کہ اس نے بہترین جنگی نظمیں لکھی ہیں، جن کا جواب دوسری زبانوں کے ادب میں بڑی مشکل سے ملے گا۔ جب ۱۸۴۹ء میں انقلاب رونما ہوا تو عوام نے اس کو اپنا لیڈر بنا لیا اور یہ بہادر محب وطن شاعر ۳۱ر جولائی ۱۸۴۹ء کو سیگسوار (SEGSVAR) کی جنگ میں

"درحمایتِ وطن کشتہ شد"

کہتے ہیں کہ اے شاعر! تو نے اس دنیا میں بہت تھوڑے دن نغمہ سرائی کی۔ لیکن تو نے اپنی غیر فانی نظموں کی بدولت دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ (ابدے عنے فردوی) اور ان کے دلوں کو دنیا کی محبت سے پاک کر دیا۔ یعنی مکروہاتِ دنیوی کا خیال ان کے دلوں سے نکال دیا۔ (زدوے عنے ربودی)

تو نے اپنے خون سے اپنے محبوب وطن کی آزادی کے درخت کی آبیاری کی اور تو نے اپنی قوم کے نوجوانوں (غنچہ) کے دلوں میں اپنے کلام کی گرمی سے آزادی کی آگ روشن کر دی۔

آج دنیا میں تیری کوئی مادی یادگار نہیں ہے نہ کوئی فرزند ہے نہ

قبر گلستان ہے۔ بات یہ ہے کہ تو اس ناپاک دنیا سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے تو نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ تیرا جسم اس دنیا کے حوالے کیا جائے۔ لہذا تو اپنی شاعری میں پوشیدہ ہو گیا۔ اور تیرا کلام ہی تیرا مرقد بن گیا۔ ع

ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند ترا

محاورہ مابین کانگٹ و مرد مزدور

حکیم

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" | ہماں نخل را شاخ و برگ و بر اند
دماغ از خرد دل ز فطرت است | اگر پا زمیں را است از فطرت است
یکے کار فرما یکے کار ساز | نیاید ز محمود کارِ ایاز

نہ بینی کہ از قسمتِ کارِ زیست
سراپا چمن می شود خارِ زیست

تمہید | آگستے کانگٹ ۱۷۹۸ء میں بمقام مانتی پیلیز (فرانس)، پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پیرس کی مشہور درسگاہ پولی ٹیکنیک میں داخل ہوا۔ ریاضی اور سائنس میں امتیاز حاصل کرنے کے بعد ۱۸۲۵ء میں شادی کی جس کی وجہ سے زندگی تلخ ہو گئی۔ لیکن ۱۸۴۲ء تک اس تلخی کو برداشت کرتا رہا۔ انجام کار جدائی ہو گئی۔

اس نے ساری عمر یہ کوشش کی کہ پیرس کے کسی کالج میں پروفیسری مل جائے۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کے شاگرد پروفیسر ہو گئے لیکن وہ یہ حسرت اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے ۱۸۳۰ء میں اپنے فلسفہ کی پہلی جلد شائع کی۔ اور چھٹی ۱۸۴۲ء میں شائع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں بعارضہ سرطان پیرس میں وفات پائی۔

مردِ مزدور

فریبی بحکمت مرا اے حکیم — کہ نتواں شکست ایں طلسمِ قدیم
مسِ خام را از زر اندودہ؟ — مرا خوئے تسلیم فرمودہ؟
کند جبر را آنچناں ایم اسیر — ز خارا بُرد تیشہ ام جوئے شیر
حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج — بہ پرویزِ پرکار و نابردہ رنج؟
خطا را بحکمت گرداں صواب — خضر را نگیری بدامِ سراب
بدوشش زمیں بار، سرمایہ دار — ندارد گذشت از خور و خواب کار
جہاں نعمت بہرہ ای از دستِ مزد — ندانی کہ ایں ہیچ کار است فرد

پئے جرمِ او پوزش آوردہ؟
بایں عقل و دانش فسوں خوردہ؟

اس کا فلسفہ کانگٹ، فلسفہ POSITIRISM کا بانی ہے۔ یہ فلسفہ کائنات کے ظواہر سے بحث کرتا ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یقینی علم صرف ظواہر ہی کا ہے۔ یہ نظریہ بڑی حد تک تصوریت کی ضد ہے۔ اور کانٹ کا فلسفہ اس کا سنگِ بنیاد ہے۔

کانٹ کہتا ہے کہ عقلِ انسانی، حقیقتِ اصلیہ تک نہیں پہنچ سکتی وہ صرف مظاہر کا علم حاصل کر سکتی ہے۔ یہی ہے کانگٹ کے فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہے کہ انسان کو حقیقی علم صرف اُن چیزوں کا حاصل ہو سکتا ہے جو حواسِ خمسہ سے محسوس ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی ساری توجہ ریاضی، طبیعیات، کیمیا اور عمرانیات پر مبذول کر دینی چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ اُس نے منطق، اخلاقیات اور نفسیات کو اپنے فلسفیانہ نظام میں کوئی جگہ نہیں دی۔

اس کا مذہب ۱۸۴۴ء میں اُسے ایک نوجوان اور حسین عورت سے محبت ہو گئی دو سال کے بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ کانگٹ کو اُس کی وفات سے سخت صدمہ ہوا۔ اور جب تک وہ زندہ رہا، اپنے دل میں اُس کی پرستش کرتا رہا۔ محبت کی دُنیا بھی کتنی عجیب و غریب ہے! وہی کانگٹ جو قبل ازیں فطرت کے مظاہر میں مستغرق رہتا تھا۔ اب بالکل بدل گیا۔ چنانچہ اُس نے

سائنس کی دُنیا سے نکل کر مذہب کی ضرورت محسوس کی۔ اور یہ تعلیم دی کہ انسان کو انسانیت کی پرستش کرنی چاہیئے۔ بایں طور کہ جس عورت سے اُسے محبت ہو، اُس کا تصور ذہن میں قائم کرنا چاہیئے۔ ان خیالات کو اُس نے POSIVE POLITY میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے یہ کتاب ۱۸۵۴ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا کے بجائے انسانیت کو اپنا معبود قرار دینا چاہیئے اور سب انسانوں سے محبت کرنی چاہیئے۔

اقبال نے اپنی نظم میں اُس کے فلسفہ کے اسی عمرانی پہلو کو واضح کیا ہے ذیل میں اس کا مطلب درج کرتا ہوں:۔

کانگٹ نے مزدور سے یہ کہا کہ تمام انسان آپس میں اسی طرح مربوط ہیں جس طرح ایک جسم کے اعضا یا ایک درخت کی شاخیں اور پتے۔ اور جس طرح فطرت نے انسانی اعضاء کے مختلف وظائف مقرر کر دیئے ہیں۔ مثلاً دماغ کا کام سوچنا ہے اور پاؤں کا کام چلنا ہے۔ اسی طرح فطرت نے انسانوں کے مختلف طبقات قائم کر دیئے ہیں۔ کوئی مزدور ہے، کوئی سرمایہ دار ہے، کوئی صناع ہے، کوئی کاشتکار ہے۔ کوئی حاکم ہے، کوئی محکوم ہے اور ہر شخص وہی کام کرتا ہے جس کے لیے فطرت نے اُسے موزوں بنایا ہے۔ بادشاہ (محمود) غلام (ایاز) نہیں بن سکتا اور غلام بادشاہی نہیں کر سکتا۔ زندگی میں اس تقسیم کار ہی کی بدولت، راحت اور آسائش کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

یہ سُن کر مزدور نے کہا کہ اے فلسفی! تُو مجھے اپنے فلسفہ سے دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ تیری اس تقریر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس پُرانے نظامِ ظلم قدیم کو نہیں توڑ سکتے۔ تیرا یہ فلسفہ بالکل غلط ہے۔ تُو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ملمع سازی سے مجھے غلامی کا سبق پڑھا رہا ہے۔ لیکن میں تیرے فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ میں اب اپنی قدر و قیمت سے آگاہ ہو چکا ہوں۔

سُن! میری ہی محنت سے سرمایہ داروں کے کارخانے چل رہے

ہیں۔ اور میرے ہی تیشہ کی بدولت پہاڑوں سے دُودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ میں ہی پٹرول نکال کر سرمایہ داروں کی تجوریاں بھر رہا ہوں۔ تُو کوہکن (مزدور) کا حق، پرویز (سرمایہ دار) کو دینا چاہتا ہے۔ یہ تیری سراسر نادانی ہے! تُو جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش مت کر۔ تُو خضر (مزدور) کو سراب (فلسفہ) سے مطمئن نہیں کر سکتا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ سرمایہ دار کا وجود، دوشِ زمین پر ایک بار ہے۔ وہ کھانے اور سونے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتا۔ پھر

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار؟

یاد رکھ! دُنیا میں جس قدر فارغ البالی اور شادمانی نظر آتی ہے، یہ سب مزدور کی جفاکشی کا ثمرہ ہے۔

افسوس ہے تیری عقل و دانش پر کہ تُو سرمایہ دار کے بجائے مزدور کو مجرم سمجھتا ہے۔

ہیگل

حکمتش معقول و با محسوس در خلوت نرفت
گرچہ بکر فکر او پیرایہ پوشد چوں عروس

طائرِ عقلِ فلک پروازِ او دانی کہ چیست؟
ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس

تمہید ہیگل کا فلسفہ، جیسا کہ قبل ازیں بیان کر چکا ہوں، تصوریتِ مطلقہ کا علمبردار ہے۔ یعنی افکارِ مجردہ سے بحث کرتا ہے۔ جن کا عالمِ محسوس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ "صرف معقول ہی حقیقی ہے اور حقیقی ہی معقول ہے" THE RATIONAL IS REAL ALONE اسی بات کو اقبال نے پہلے مصرع میں "حکمتش معقول" سے ظاہر کیا ہے یعنی اس کا فلسفہ محض مجردات سے۔ بحث کرتا ہے۔ عالمِ محسوس سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے یعنی "با محسوس در خلوت نرفت"۔

اقبال کہتے ہیں کہ ایسا فلسفہ جو کائناتِ خلقت سے بالکل بے تعلق ہو، عملی طور پر ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ انسان محض افکار مجردہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ روح اور جسم مادی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور جب تک وہ زندہ ہے جسمانی علائق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے انھوں نے ہیگل کے فلسفہ کو خاگی انڈے سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح خاگی انڈے سے بچہ نہیں پیدا ہو سکتا، اسی طرح ہیگل کے فلسفہ سے کوئی ایسا نتیجہ جو ان کے لیے زندگی میں مفید ہو، برآمد نہیں ہو سکتا۔

اقبال نے اس نظم میں آخری مصرع کی رعایت سے ازدواجی زندگی کا تلازمہ باندھا ہے۔ ہیگل کی فکر کو ایک باکرہ قرار دے کر یہ کہا ہے۔ اگرچہ اس نے دلہن کا لباس پہن لیا ہے لیکن عالمِ محسوس کے ساتھ، جو بمنزلہ شوہر ہے خلوتِ صحیحہ کی منزل سے نہیں گذری۔ یعنی اس نے اپنی فکر کو عالمِ محسوس سے مربوط نہیں کیا۔

بے شک اس کی فکر (عقل) فلک پرواز ہے۔ لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مرغی میں بغیر قربتِ خروس، اپنی ہی مستی سے انڈے دینے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسے انڈوں سے بچے نہیں نکل سکتے۔

نوٹ:۔ لغات میں خایہ گذاشتن یعنی انڈے دینا تو ملا، لیکن خایہ گرفتن نہیں ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاورہ ہندی اودیا رنے وضع کیا ہے۔ ۱۲

جلال و گوئٹے

نکتہ دانِ المنی را در ارم — صحبتے افتاد با پیرِ عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب — نیست پیغمبر و لے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرارِ قدیم — قصۂ پیمانِ ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار — تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکرِ تو در کنجِ دل خلوت گزید — ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدہ — در صدف تعمیرِ گوہر دیدہ

ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست — ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

"دانہ آں گو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

(رومی)

تمہید جلال سے مولانا جلال الدین المعروف بہ مرشدِ رومیؒ مراد ہیں۔ اقبالؔ چونکہ گوئٹے کے کمالِ فن کے معترف ہیں، اس لیے انھوں نے رومیؒ کی زبان سے نکتہ دانِ المنی کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ ایک دن جنت میں گوئٹے کو مرشدِ رومیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ کون رومیؒ؟ وہی جس کی شان یہ ہے کہ:۔

"نیست پیغمبر و لے دارد کتاب"

گوئٹے نے رومیؒ کو اپنا شاہکار (فاؤسٹ) پڑھ کر سنایا تو انھوں نے یہ کہا کہ بلا شبہ تو نے شاعری کے قالب میں نئی روح پھونک دی ہے۔

"تو ملکِ صید است و یزداں شکار"

میں تلمیح ہے رومیؒ کے اس شعر کی طرف:۔

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مرداں اند ❊ فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

اے گوئٹے! تو نے عشق و محبت کے اسرار فاش کر کے اس دنیا کو نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ تو نے اپنے ڈرامے میں زندگی کی حقیقت (سوز و ساز) کو آشکار کر دیا ہے۔ صدف میں گوہر کی تعمیر کا مشاہدہ کیا ہے۔ یعنی انسان کی روحانیت کے تمام مدارج واضح کر دیئے ہیں۔ یہ سچ ہے ہر شخص اس بلند مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی عشق کے کمالات کا بیان کرنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ صرف خوش نصیب اور محرمِ راز ہی اس نکتہ کو سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی خصوصیت عقل نہیں ہے بلکہ عشق ہے۔ ابلیس نے عقل کو اپنا رہنما بنایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مردود ہو گیا۔ لیکن آدم نے عشق کو اپنا راہنما بنایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مقبولِ بارگاہ ہو گیا۔

پیغامِ برگساںؒ

تا بر تو آشکار شود رازِ زندگی
خود را جدا ز شعلہ مثالِ شرر مکن
بہرِ نظارہ جز نگہِ آشنا میار
در مرز و بومِ خود چو غریباں گزر مکن
نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

تمہید ہنری برگساں، دورِ حاضر کا نامور فلسفی ۱۸۵۱ء میں بمقام پیرس (فرانس) پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ یہودی الاصل موسیقار تھا۔ خدا کی شان دیکھو! باپ کی آواز پیرس کی حدود سے آگے نہ جا سکی، لیکن بیٹے کے نغموں سے سارا عالم گونج اٹھا۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۲۷ء تک فرانس کی مختلف درسگاہوں میں فلسفہ کا پروفیسر رہا۔ اسی سال اُسے ادب میں نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

اُس کا فلسفہ اس کا فلسفہ سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل کتب کا مطالعہ لازمی ہے:-

(۱) ٹائم اینڈ فری وِل (زمان اور اختیار)

(۲) میٹر اینڈ میموری (مادہ اور شعور)

(۳) تخلیقی ارتقاء۔

(۴) اخلاق اور مذہب کے دو ماخذ۔

ان تصانیف میں اُس نے حسبِ ذیل مسائل پر اظہارِ خیالات کیا ہے:-
عقل اور وجدان اور ان کا باہمی تعلق؛ مابعد الطبیعاتی مسائل (روح، مادہ، جبر و اختیار، ارتقاء، تغیر، جوشِ نمو، فکر اور شعور)؛ ابدیتِ روح،

(۸) کائنات میں ایک قوت کارفرما ہے جو شاعر کی تخلیقی قوت سے بڑی مماثلت رکھتی ہے۔ یعنی جس طرح شاعر کی تخلیقی قوت اُسے شعر گوئی پر اُبھارتی ہے، اسی طرح یہ قوت کائنات کو ظہور پر برانگیختہ کرتی ہے۔ اُسے جوشِ نمو یا قوتِ حیات (ELANVITAL) کہتے ہیں۔ یہ ایک زندہ، زندگی بخش اور آگے بڑھنے والی طاقت ہے۔

(۹) کائنات میں صرف انسانی شعور، غیر فانی ہے۔ یعنی مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا۔

(۱۰) زندگی کیا ہے؟ شعور انسانی کا مادہ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا۔

مطلب اگرچہ نظم کا مفہوم، افکار مذکورہ بالا کے ضمن میں واضح کر چکا ہوں۔ تاہم ناظرین کی سہولت کے لیے یکجائی طور پر دوبارہ لکھے دیتا ہوں:۔

اقبال نے ان تین شعروں میں برگساں کے فلسفہ کے تین بنیادی اصول بیان کئے ہیں اور بلاشبہ اس کا سارا فلسفہ انہی تین اصولوں پر مبنی ہے:۔

(۱) کہتے ہیں کہ اگر تو رازِ زندگی (زندگی کی ماہیت) سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، تو اپنے وجدان (شرر) کو حیات (شعلہ) سے جُدا مت کر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وجدان، زندگی سے جُداگانہ کوئی شئے نہیں ہے۔ وجدان کیا ہے؟ زندگی کا اپنے آپ کو دیکھنا۔

(۲) چونکہ زندگی اور وجدان میں کوئی مغیریت نہیں ہے (وجدان) زندگی کی فعلیت ہی کا دُوسرا نام ہے اس لیے تُو اپنے آپ کو اپنے وجدان کا غیر مت سمجھ، یعنی زندگی کا مطالعہ اس طرح مت کرو کہ وہ اور ہے اور تم اور ہو۔ اس شدید رابطہ کو جو زندگی اور وجدان کے درمیان پایا جاتا ہے، اقبال نے بڑے دلکش شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یعنی اپنے گھر میں اجنبی کی طرح

اخلاق اور مذہب ؛ حیات اور حقیقت ؛

اس کے بنیادی افکار کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) انقلاب پیہم یا تغیر مسلسل، قانونِ حیات ہے ؎

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے ؛ یہی دُنیا کا کارخانہ ہے

(۲) اس تغیر میں قرار نہیں ہے۔

(۳) سائنس اور منطق (عقلی دلائل) سے حقیقت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ "حقیقت" عقل کی دسترس سے بالاتر ہے۔ اسی لیے برگساں کے فلسفہ کو ماوراء العقل فلسفہ کہتے ہیں۔

(۴) وجدان ہی حقیقی زندگی ہے۔ اصلی اور بلا واسطہ زندگی۔ اس لیے اگر زندگی سے آگاہی مطلوب ہے تو اس کو وجدان سے جُدا مت کرو۔ ع

خود را جدا از شعلہ مثالِ شرر مکن

(۵) عقل، تخریبی ہے۔ اس لیے کائنات کو اجزا میں تقسیم کر دیتی ہے۔
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت اس کی گرفت میں نہیں آسکتی، وجدان کُل کو
دیکھ سکتا ہے اس لیے وجدان کو رہنما بناؤ۔

(۶) زندگی وجدان سے جدا نہیں ہے۔ وجدان کیا ہے؟ زندگی کا اپنے
آپ کو دیکھنا۔ پس ہمیں زندگی کو وجدان کا عین نہیں سمجھنا چاہیے۔ ع

در مرز و بوم خود چو غریباں گذر مکن

(۷) اگرچہ عقل ناقص ہے لیکن بالکل ہی بے کار نہیں ہے۔ صحیح علم، عقل اور
وجدان کے امتزاج سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر انسانی عقل وجدان کی
رہنمائی تسلیم کرے تو حقیقت تک پہنچ سکتی ہے۔ ع

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

مت حاصل ہو۔ ع   تو صاحب خانۂ آخر چرا آوارہ می آئی

(۳) عقل کی روشنی میں جو کچھ تم نے سمجھا ہے، وہ سب غلط ہے۔ عقل
تجزیہ ہے، اس لیے ناقص ہے۔ یعنی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہٰذا
اُسے وجدان کے تحت رکھو۔ یعنی صحیح علم عقل اور وجدان کے امتزاج سے
حاصل ہو سکتا ہے۔

میخانۂ فرنگ

یاد ایامے کہ بودم در خمستان فرنگ   جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشم مست مے فروشش بادہ را پروردگار   بادہ خواران را نگاہش ساقی بیپرواست
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل   عقل ناپروا متاع عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست
رند این میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

تمہید | اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ یورپ میں سب کچھ ہے یعنی فلسفہ بھی
ہے، سائنس بھی ہے، مگر عشق (روحانیت) نہیں ہے۔ اس کا سبب
اقبال نے ضرب کلیم میں یہ بیان کیا ہے۔ ع   مُردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق

یورپ میں لادینی افکار کا سبب چونکہ بہت تفصیل طلب ہے، اس لیے اقبالؔ نے مصلحتاً سکوت اختیار کیا۔ جب تک یورپ کی بارہ سو سال کی تاریخ پیش نظر نہ ہو، ایک طالب علم یہ نہیں سمجھ سکتا کہ سترھویں صدی سے یورپ میں الحاد اور بے دینی کی حکومت کیونکر قائم ہوگئی۔ اس موضوع پر ڈاکٹر ڈریپر کی عالمانہ تصنیف موسومہ "یورپ کے ذہنی ارتقا کی تاریخ" کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

مطلب کہتے ہیں کہ کبھی کبھی مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب میں یورپ میں مقیم تھا۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں ہر طرف سائنس اور فلسفہ کا بازار گرم ہے — "مغبچگان فرنگ" کنایہ ہے یورپ کی مشہور دانش گاہوں سے "جام" کنایہ ہے فلسفیانہ نظریات سے "مے فروش" کنایہ ہے اساتذہ سے "بادہ خوار" کنایہ ہے طالبان علم سے۔

کہتے ہیں کہ ان دانش گاہوں میں علم تو ہے لیکن ایمان نہیں ہے۔ یعنی یہاں کی تعلیم سے عقل تو بہت روشن ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں پیدا ہو سکتا اس بات کو اقبال نے دلکش شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ وہاں "جلوہ" تو ہے مگر اس کے دیکھنے والوں میں کوئی کلیم (اللہ کا بندہ) نظر نہیں آتا۔ اور وہاں شعلہ تو ہے لیکن اس میں کوئی خلیل (اللہ کا بندہ) نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں عقل کی حکومت ہے۔ اور عقل کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ عشق سے برسرپیکار رہتی ہے۔ یعنی اس کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔

نوٹ: یہی وجہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو یورپ سے مرعوب و متأثر ہو کر واپس آتے ہیں، مذہب سے متنفر ہو جاتے ہیں، کیونکہ مذہب کی بنیاد ہی ان اصولوں پر ہے جو عقل کی گرفت یا دسترس سے بالاتر ہیں۔ اور میخانۂ فرنگ کی تعلیم یہ ہے کہ جو بات تمہاری عقل میں نہ آئے اُسے تسلیم مت کرو۔ ۱۲

آخری بند میں اقبال اس بات پر اظہار تأسف کرتے ہیں کہ یورپ میں سب کچھ ہے لیکن وہاں کے عقلا، اور حکما میں عشق کا رنگ نہیں ہے۔

"آہ بے تابانہ" اور "لغزش مستانہ" کنایہ ہے مسلک عاشقی سے ؎

اسی لیے اقبال نے یورپ کو عشق کا پیغام دیا ہے اور اسی لیے وہ برگساں کے مداح ہیں۔ کیونکہ وہ بھی عقل پر وجدان (عشق) کو ترجیح دیتا ہے۔

موسیو لینن و قیصر ولیم

موسیو لینن

بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن
مثال دانہ تہ سنگ آسیا بودہ است
فریب زاری و افسون قیصری خوردہ است
اسیر حلقۂ دام کلیسیا بودہ است
غلام گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر
قمیص خواجہ کہ رنگیں ز خون ما بودہ است

شرار آتش جمہور کہنہ ساماں سوخت
ردائے پیر کلیسا، قبائے سلطاں سوخت

قیصر ولیم

گناہ عشوہ و ناز بتاں چیست؟
طواف اندر سرشت برہمن است
دمادم نو خداونداں تراشد
کہ بیزار از خدایانِ کہن است
ز جور رہزناں کم گو کہ رہرو
متاع خویش را خود راہزن است
اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن است
ہوس اندر دلِ آدم نمیرد
ہماں آتش میانِ مرزغن است
عروسِ اقتدارِ سحر فن را
ہماں پیچاکِ زلفِ پرشکن است

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن است

تمہید اس تمثیلی نظم میں اقبال نے قیصر ولیم کی زبان سے اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ طاقتور کی غلامی، انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ ع طواف اندر سرشتِ برہمن است
اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی غلامی کے لیے پیدا کیا ہے اس لیے قدرتی طور پر غلامی کا مادہ اس کی سرشت میں ودیعت کیا ہے لیکن انسان کی حماقت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی غلامی کی بجائے، (جو سب سے بڑی عزت ہے)، انسان کی غلامی کرتا ہے، (جو سب سے بڑی ذلت ہے)۔
اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ غلامی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس لیے

طرزِ حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری، انسان بہرحال غلامی میں مبتلا رہے گا۔ مثلاً جب ملکِ روس میں شخصی حکومت تھی تو روسی عوام، زارِ روس کے غلام تھے۔ اب وہاں اشتراکی (جمہوری) حکومت ہے، تو وہاں کے باشندے لینن اور اسٹالین کے جانشین موسیو مینکوف کے غلام ہیں۔ اور جس طرح گذشتہ زمانہ میں مطلق العنان بادشاہ اپنے دشمنوں کو قتل کرا دیا کرتے تھے، اسی طرح موجودہ زمانہ میں جمہوریتوں کے صدر اپنے مخالفین کو بے دریغ موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب تک دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم نہیں ہوگی، انسان اسی طرح انسان کی غلامی میں مبتلا رہے گا۔ اور یہی اس نظم کا بنیادی تصور ہے۔

(۱) لینن۔ اشتراکی روس کا پہلا صدر ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۹۳ء میں اُس نے کارل مارکس کا مسلک اختیار کیا اور اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ ۱۸۹۵ء میں اسے جلاوطن کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں وہاں سے فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ میں پناہ گزین ہوا۔ اور یہاں سے ۱۹۰۵ء میں سینٹ پیٹرز برگ میں واپس آیا اور ٹراٹسکی کو ساتھ ملا کر انقلابی تحریک کا سرغنہ بن گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب زار کی حکومت کا خاتمہ ہوا، تو اشتراکیوں نے اسے جمہوریہ روس کا پہلا صدر منتخب کر لیا۔ چونکہ اس کی ذات میں عمل کے ساتھ علم بھی جمع تھا، اس لیے اپنی مصروفیات کے باوجود ساری عمر تالیف و تصنیف بھی کرتا رہا۔ اس کی وفات ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ اور اسٹالین نے اس کی تصانیف کا مجموعہ ۲۹ جلدوں میں شائع کیا تھا اس کے نظریات سے اختلاف کے باوجود اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔

(۲) قیصر ولیم۔ فریڈرک ولہلم المعروف بہ قیصر ولیم ثانی شہنشاہِ جرمنی ۱۸۵۹ء میں بمقام برلین (جرمنی) پیدا ہوا تھا۔ اپنے باپ فریڈرک ثالث کی وفات کے بعد ۱۸۸۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ جارج پنجم شاہ انگلستان کا حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھا۔ لیکن سیاسی اعتبار سے ان دونوں میں دُور کی رشتہ داری بھی نہیں تھی۔ بلکہ وہ ساری عمر برطانوی اقتدار کو شکست دینے

کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں اُس نے اسٹریا کے ولیعہد کے قتل کو اعلانِ جنگ کا بہانہ بنایا۔ اور ۱۹۱۸ء تک "جنگِ عظیم" جاری رکھی لیکن جب نومبر ۱۹۱۸ء میں جرمن فوج نے ہتھیار ڈال دیئے، تو وہ ہالینڈ میں گوشہ نشین ہو گیا اور اسی جلاوطنی کی حالت میں ۱۹۴۱ء میں اس دارِ ناپائیدار سے سیکڑوں حسرتیں ساتھ لیے ہوئے رخصت ہو گیا۔

مطلب لینن نے قیصر ولیم سے یہ کہا کہ عوام صدیوں سے اس دنیا میں دانوں کی طرح چکی کے پاٹوں میں پس رہے تھے۔ یعنی قیصر اور زار کی غلامی کر رہے تھے اور کلیسا کے دام میں گرفتار تھے (اقبال نے کلیسا کو چکی کے نیچے کے پاٹ سے اور ملوکیت کو اوپر کے پاٹ سے تشبیہ دی ہے)۔ لیکن انجام کار جب عوام نے اس ذلیل زندگی سے تنگ آکر اپنے آقاؤں کو ختم کر دیا یعنی پیرِ کلیسا کی چادر اور سلطان کی قبا دونوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

بالفاظ دگر روس میں ملوکیت اور کلیسا دونوں کا خاتمہ ہو گیا اور عوام آزاد ہو گئے۔

یہ سُنکر قیصر ولیم نے یہ کہا کہ تو غلط کہتا ہے، عوام آزاد نہیں ہوئے۔ بدستور غلام ہیں۔ فرق صرف یہ ہوا کہ آقا بدل گیا۔ پہلے وہ لوگ زار (ملوکیت) کے غلام تھے، اب اشتراکیت کے غلام ہیں۔

تو ملوکیت (عشوہ و نازِ بتاں) کو عبث بدنام کر رہا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ غلام تو انسان (برہمن) کی سرشت میں داخل ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان جدت پسند واقع ہوا ہے۔ اس لیے وہ پُرانے خداؤں سے بیزار ہو کر نئے خدا تراشتا رہتا ہے۔ پہلے خداؤں کا لقب قیصر اور زار ہوتا تھا۔ موجودہ خداؤں کا لقب صدرِ جمہوریہ اور آمرِ مطلق (ڈکٹیٹر) ہوتا ہے۔

رہزنوں (ملوک) کی شکایت مت کرو۔ رہرو (عوام) خود ہی اپنے راہزن ہیں۔ اقتدار کی دلہن بدستور عوام کو اپنا غلام بنانے میں مصروف ہے اور عوام اس کے سامنے اسی طرح سربسجود ہیں جس طرح قیصر اور کسریٰ کے زمانہ میں تھے۔

شیریں تو عاشقوں کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ اگر خسرو (زار) نہ ہوگا۔ تو کوہکن (لینن) ہوگا۔ یعنی عوام ہمیشہ غلام رہیں گے۔ خواہ شاہزادہ ان پر حکومت کرے یا مزدور زادہ۔

حکما

لاک

ساغرش را سحر از بادۂ خورشید فرخت
ورنہ در محفلِ گل لالہ تہی جام آمد

کانٹ

فطرتش ذوقِ مے آئینہ فام آورد
از شبستانِ ازل کوکبِ جامے آورد

برگساں

نہ مے از ازل آورد نہ جامے آورد
لالہ از داغ جگر سوزِ دوامے آورد

تمہید اقبال نے اس فلسفیانہ مجلسِ مذاکرہ میں، فطرت انسانی سے متعلق یورپ کے تین نامور حکماء کی آراء شاعری کے لباس میں پیش کی ہیں۔ اور ہر فلسفی کے بنیادی تصور کو صرف ایک شعر میں درج کر کے اپنی ژرف نگاہی اور کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔

پہلے ہر فلسفی کے مختصر سوانح حیات درج کرتا ہوں، بعد ازاں اس کے فلسفہ کی روشنی میں شعر کا مطلب بیان کروں گا۔

(۱) لاک - یہ فلسفی ۱۶۳۲ء میں بمقام رنگٹن (انگلستان) پیدا ہوا تھا ۱۶۵۸ء میں آکسفورڈ سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۱۶۶۶ء تک اسی یونیورسٹی میں فلسفہ کا لیکچرار رہا۔ اور ۱۶۶۷ء سے ۱۶۸۲ء تک لارڈ اشلیے کا معتمد رہا۔ ۱۶۸۳ء میں چارلس دوم نے اسے جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ وہ چھ سال تک ہالینڈ میں خلوت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۱۶۸۹ء میں انگلستان میں واپس آیا۔ اور جلاوطنی کے زمانہ میں جس قدر لکھا تھا، اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔ اس کی تصانیف میں "فہم انسانی" اس کا شاہکار ہے۔ اور اسی کتاب پر اس کی شہرت کا دارومدار ہے۔ اس نے ۱۷۰۴ء میں وفات پائی۔

مذکورہ بالا کتاب میں اُس نے علم کی ماہیت اور انسانی فکر کی محدودیت سے بحث کی ہے۔ ان مباحث پر اس کے افکار کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ انسانی ذہن اس قدر محدود ہے کہ "حقیقت" اس میں سما ہی نہیں سکتی۔

۲۔ ہمارے علم کا منبع، صرف وہ مشاہدات ہیں جو ہم حواسِ خمسہ کی مدد سے حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ ذہن انسانی، جبلی یا فطری تصورات سے یکسر خالی ہے۔ یعنی انسان جب دُنیا میں آتا ہے تو کسی قسم کے فطری یا جبلی تصورات اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ اور نہ اس میں کسی قسم کی تخلیقی قوت ہوتی ہے۔

۴۔ انسانی ذہن ایک سادہ صفحہ کی مانند ہے جس پہ کوئی عبارت تحریر نہ ہو۔ وہ ایک آئینہ ہے جس پر کوئی تصور، کوئی خیال پہلے سے منقش نہیں ہے، ہمارے حواس جو کچھ اس کے سامنے رکھتے ہیں، اسکا نقش اس پر ثبت ہو جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لاک کی رائے میں انسان، بطن مادر سے کوئی تصور اپنے ساتھ لیکر نہیں آتا۔ یہی نکتہ اس کے فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور اقبال نے اسی نکتہ کو اپنے شعر میں رمز و ایماء کے لباس میں پیش کیا ہے:-

تشریح شاعر یا جام کنایہ ہے ذہنِ انسانی (MIND) سے + سحر کنایہ ہے حواسِ خمسہ سے + بادہ خورشید کنایہ ہے اُن مشاہدات یا تجارب سے جو بذریعہ حواس خمسہ حاصل ہوتے ہیں + محفلِ گل، کنایہ ہے کائنات سے + لالہ کنایہ ہے انسان سے + تہی جام، کنایہ ہے اس نظریہ سے کہ انسان جب دُنیا میں آتا ہے تو اُس کا ذہن، لوحِ سادہ کی طرح صاف ہوتا ہے۔

کن بات کا پردہ ہٹا دیا جائے تو شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو کسی قسم کا تصور اپنے ساتھ نہیں لاتا۔ اس کا ذہن ہر قسم کے تصورات سے خالی رہتی، ہوتا ہے۔ جب وہ صاحبِ شعور ہو جاتا ہے تو حواسِ خمسہ کی بدولت تجارب حاصل کرتا ہے۔ اور ان تجارب کے مجموعی اثر یا نتیجہ کو علم کہتے ہیں۔

اس فلسفہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی فلسفی "حقیقت" کا علم حاصل نہیں کر

سکتا کیونکہ حقیقت یا خدا حواس خمسہ کی دسترس سے بالاتر ہے۔

(۲) کانٹ۔ یہ نامور فلسفی ۱۷۲۴ء میں بمقام کانگزبرگ (جرمنی) نہایت مفلس خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھو! اس موچی کے گھر میں جو اپنے گیارہ بچوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھلا سکتا تھا، ایسا لعل شب چراغ پیدا ہوا جس نے اپنی تابانی اور درخشانی سے ساری دنیا کو منور کر دیا۔ تمام عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ عصر جدید میں عمانوئیل کانٹ سے بڑھ کر عالم مابعد الطبیعیات پیدا نہیں ہوا۔ ۱۷۵۵ء میں ڈاکٹریٹ حاصل کی اور مدتوں تک دولتمند خاندانوں میں اتالیق کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۷۷۰ء میں اسی یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۷۹۷ء میں سبکدوشی حاصل کی۔ اور ۱۸۰۴ء میں وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں تنقیدات سہ گانہ بہت مشہور ہیں:۔

(ا) تنقید عقل خالص ۱۷۸۱ء

(ب) تنقید عقل عملی ۱۷۸۸ء

(ج) تنقید تصدیقات ۱۷۹۰ء

واضح ہو کہ کانٹ کا انداز بیان نہایت دشوار، پیچیدہ اور عسیر الفہم ہے اسی مقصد سے اس نے بہت سی مصطلحات وضع کیں، تاکہ اس کا مفہوم ان خود ساختہ مصطلحات کے پردوں میں پوشیدہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر ان تینوں کتابوں کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تنقید سے اس کی مراد تنقید و تبصرہ نہیں ہے، بلکہ جانچ پڑتال ہے اور عقل خالص سے اس کی مراد وہ تصورات ہیں، جو حواسِ خمسہ پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ وہ تصورات جو ہم فطری طور پر اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آئے ہیں۔ اسی طرح عقل عملی سے اس کی مراد عقل عملی نہیں ہے بلکہ اخلاقی حاسہ یا ضمیر کی آواز ہے۔

اس کا بنیادی کانٹ جیسا کہ ہم نے بیان کیا، اٹھارہویں صدی میں گذرا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کو پوپ، اور کلیسا کی غلامی سے نجات مل چکی تھی۔ اور اس کا منطقی نتیجہ انکار، الحاد اور تشکیک کی شکل میں برآمد ہوا تھا۔ جرمنی، فرانس اور انگلستان یعنی ترقی یافتہ ملک میں مذہب

کے خلاف بغاوت کا بازار گرم تھا۔ اندریں حالات کانٹ نے اپنے دل میں یہ کہا کہ میں بطور خود تحقیق کروں گا کہ خدا ہے یا نہیں ہے؛ چنانچہ اُس نے نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنی زندگی اسی سوال کا جواب دینے میں بسر کر دی اور اس سلسلہ میں اُس نے ساری دُنیا کے حکماء کے خیالات کو عقل کی کسوٹی پر جانچا، تو فکرِ انسانی کے ہر گوشہ کو نہایت ژرف نگاہی اور منطقی صحت کے ساتھ بے نقاب کیا۔ اور آخرالامر ۱۷۸۱ء میں ۲۵ سال تک فلسفہ کی مختلف وادیوں میں سیاحت کے بعد اُس نے دُنیا کو اس اعلان سے متحیر اور حیران کر دیا کہ انسانی فکر یا قوتِ مدرکہ، جو کہ اس خبر سے بے نیاز ہے، واجب الوجود کا اثبات نہیں کر سکتی۔ تنقید عقل خالص، کتاب نہیں تھی بلکہ ایک بم تھا جس نے فلسفۂ الٰہیات کے دو ہزار سال کے قلعہ کو منہدم کر دیا۔ ناظرین اس اعلان کی اہمیت کا اندازہ اس وقت کر سکتے ہیں جب اس حقیقت کو مدِ نظر رکھیں کہ ارسطو کے زمانہ سے لیکر اٹھارہویں صدی تک تمام حکماء یہ یقین رکھتے تھے، کہ خدا کی ہستی، عقل کے ذریعہ سے ثابت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کانٹ کی ولادت سے صرف پندرہ سال قبل ڈاکٹر سموئیل کلارک نے اثبات واجب الوجود پر ایک عالمانہ کتاب لکھ کر شائع کی تھی، جس نے علمی دُنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب کا نام ہے "اثباتِ ذات و صفات باری تعالیٰ"۔ [۱]

(ا) کانٹ نے اپنی کتاب میں اثبات واجب الوجود کے تمام دلائل عقلیہ کو عقل ہی کی مدد سے باطل کر دیا۔ ع تزلزل در ایوانِ حکمت فتاد

(ب) کانٹ نے کہا کہ عقلِ خالص مظاہر کو جان سکتی ہے، حقیقت کو نہیں پہچان سکتی، اس لیے وہ واجب الوجود کا اثبات کیسے کر سکتی ہے!

ع خدا باہر ہے حدِّ دوربیں سے

---

[۱] راقم الحروف کے پاس اس کتاب کا ایک نادر الوجود نسخہ تھا، جو لندن میں ۱۷۲۹ء میں چھپا تھا۔ اس میں وہ مراسلت بھی شامل تھی جو مصنف اور رابرٹ برائل کے مابین، وجوب و امکان کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔
واحسرتا کہ ۱۹۴۷ء میں یہ گوہر بے بہا اُس قوم کے قبضہ میں چلا گیا جس کو مشیتِ ایزدی نے مسلمانوں کو سزا دینے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ۱۲۰

(۳) لیکن کانٹ منکرِ خدا نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تنقید عقل عملی میں وہ یہ کہتا ہے کہ اگرچہ عقلِ خالص، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی، لیکن ہمارے اندر عقل کے علاوہ ایک اور قوت (کرکب) بھی تو ہے، جسے اخلاقی حاسہ کہتے ہیں۔ یہ حاسہ ہمیں نیکی اور بدی میں امتیاز کرنا سکھاتا ہے۔ اسی کو ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ یہ ضمیر اس دُنیا میں سب سے بڑی صداقت ہے، سب سے بڑی حقیقت ہے، جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ خدا نہیں ہے، لیکن ضمیر کا تقاضا یہ ہے کہ خدا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر خدا ہے تو کہاں ہے؟ اس کا جواب وہ تیسری کتاب میں دیتا ہے جس کا نام تنقیدِ تصدیق ہے کہ خدا فطرت کے حسین ٹریزائن میں پوشیدہ ہے۔[1]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کانٹ کی رائے میں خدا کی ہستی کا اثبات عقل کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن "اخلاقی ضابطہ جو ہمارے اندر یعنی دل میں پوشیدہ ہے اور تاروں بھرا آسمان یعنی نظامِ فطرت جو باہر ہے یہ دونوں خدا کی ہستی پر شاہد ہیں۔

کانٹ کہتا ہے کہ "انسانی عقل مجبور ہے کہ وہ اُن سوالات پر غور کرے جن کا جواب اس کے اختیار میں نہیں ہے۔"

مجبور اس لیے ہے کہ عقل خود وہ سوالات پیدا کرتی ہے، اور ان سوالوں کی نوعیت ایسی ہے کہ عقل ان کا جواب نہیں دے سکتی۔

دوسرے لفظوں میں ہر شخص جذبۂ تحقیق (ذوق م) ساتھ لے کر آتا ہے اور دوسری چیز جو وہ اپنے ساتھ لاتا ہے، یہی اخلاقی حس ہے جسے کانٹ ضمیر کے "فرمانِ واجب الاذعان" سے تعبیر کرتا ہے۔

اب اقبال کا شعر پڑھیے:-

ذوق سے آئینہ فام کنایہ ہے جذبۂ تحقیقِ حق یا جذبۂ خدا پرستی سے

---

[1] جو بات کانٹ نے سینکڑوں صفحات میں بیان کی ہے وہ اکبرالہ آبادی نے صرف ایک شعر میں قلمبند کر دی ہے:-

صاف آ گئی نظر صانعِ عالم کی جھلک ٭ سامنے کچھ نہ رکھا آئینۂ فطرت کے سوا

کہ کب جام کنایہ ہے ضمیر کی آواز یا حاسہ اخلاقی سے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا میں تہی جام نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ ایک رہنما (حاسۂ اخلاقی) لے کر آیا ہے۔ جو اُسے ہر قدم پر، ہر مرحلہ پر نیکی اور بدی میں امتیاز کرنا، بھلائی اور برائی میں فرق کرنا سکھاتا رہتا ہے۔ اور ضمیر کی یہ آواز ایسی صداقت ہے جس کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔

(۳) برگساں۔ اِس نامور فرانسیسی مفکر کے مختصر سوانح حیات قبل ازیں لکھ چکا ہوں۔ اس لیے یہاں اس کے بنیادی افکار کا خلاصہ درج کرتا ہوں:۔

برگساں کہتا ہے کہ "اشیائے کائنات کے ضمیر یا باطن میں جو شئے نمود کار فرما ہے۔ ایک حقیقت ہے جو نت نئی صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے" اس ذوقِ نمود کو وہ اپنی اصطلاح میں (ELAN VITAL) یا تقاضائے حیات سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ تقاضائے حیات ہی وہ قوت ہے جو تمام ارتقائی عمل کے پس پشت کار فرما ہے۔ اگر یہ تقاضا کار فرما نہ ہو تو ارتقائی عمل یکلخت ختم ہو جائے۔ اسی تقاضائے حیات کو برگساں "خدا" قرار دیتا ہے۔ کائنات میں جس قدر نئی اشیا ظہور پذیر ہوتی ہیں، ان کا باعث یہی تقاضا ہے۔ بلکہ ساری کائنات اسی تقاضائے حیات کا ظہور ہے۔ اسی "خدا" نے انسان میں مسلسل ترقی (سوز) کا جذبہ ودیعت کر دیا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو "تخلیقی ارتقا" صفحہ ۲۷)

اب شعر کی تشریح کرتا ہوں:۔

داغِ جگر کنایہ ہے تقاضائے حیات سے اور سوزِ دوام کنایہ ہے تخلیقی عمل سے۔ جو تقاضائے حیات کے زیرِ اثر کائنات میں ہر وقت رونما ہو رہا ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ برگساں کی رائے میں انسان بطنِ مادر سے نہ مئے لایا ہے نہ جام بلکہ تقاضائے حیات کی بدولت تخلیقی عمل کی صلاحیت لے کر آیا ہے تاکہ ہمیشہ ارتقائی منازل طے کرتا رہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس شعر میں برگساں کے اس نظریہ کو یوں

بیان کیا ہے:-

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

شعرا

براؤننگ

بے پشت بود بادۂ سرجوش زندگی　　آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن

از منتِ خضر نتواں کرد سینہ داغ　　آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالب

"تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر　　بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم"

رومی

آمیزشے کجا گہرِ پاک را سزد
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

زندگی میں کیف کیسے پیدا کیا جائے؟ ان چاروں شعراء سے اسی سوال کا جواب دیا ہے۔

تمہید اس مجلسِ مذاکرہ کی تہ میں جو بنیادی تصور کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کو پر کیف کیسے بنایا جائے؟ یا اس میں مستی اور سرخوشی کا رنگ کیسے پیدا کیا جائے؟ اقبال نے اس مجلس میں چار شاعروں کو جمع کیا ہے اور ہر ایک کے جواب کو ایک ایک شعر میں پیش کیا ہے۔

میرا قیاس یہ ہے کہ اقبال نے ان اشعار میں بادہ اور ساغر کا جو تلازمہ باندھا ہے، وہ غالب کے شعر سے ماخوذ ہے۔ یعنی اسی کے اسلوب بیان سے متاثر ہو کر انہوں نے باقی ماندہ شعراء کے فلسفۂ حیات کو بادہ

اور ساغر کے کنایہ میں پیش کیا ہے۔

پہلے ہر شاعر کے مختصر سوانح حیات درج کروں گا۔ بعد ازاں شعر کا مطلب لکھوں گا۔

(۱) براؤننگ:- انگلستان کا یہ نامور شاعر ۱۸۱۲ء میں بمقام کیمبرویل (متصل لندن) پیدا ہوا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ مرتب کیا، لیکن کوئی ناشر اس کو طبع کرنے پر آمادہ نہ ہوا، اس لیے مایوس ہو کر اس نے اس مجموعہ کو نذر آتش کر دیا، چونکہ اس کی شاعری رمزیہ تھی اس لیے عرصۂ دراز تک اسے قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی، لیکن وہ ناقدین کے اعتراضات سے مطلق بددل نہیں ہوا۔ ۱۸۴۵ء میں اس کی زندگی میں ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ مس الیزبیتھ بیرٹ نے جو ایک نامور شاعرہ تھی۔ اپنی ایک نظم میں اس کے محاسن شاعری کی طرف اشارہ کیا۔ اس نظم کو پڑھ کر براؤننگ اس سے ملنے آیا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ ۱۸۴۶ء میں انہوں نے خفیہ طور پر نکاح کیا اور اطالیہ چلے گئے۔ جب ۱۸۶۱ء میں الیزبیتھ کا انتقال ہو گیا۔ تو براؤننگ انگلستان واپس آیا۔ اور جب ۱۸۶۸ء میں اس نے "دی رنگ اینڈ دی بک" شائع کی تو انگریزوں نے اس کو اپنے زمانہ کا بڑا شاعر تسلیم کر لیا۔ اس نے ۱۸۸۹ء میں وفات پائی۔

اس کی شاعری ایک واضح پیغام کی علمبردار ہے۔ اور اگر اس کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو اقبال کے پیغام سے اس کی مماثلت عیاں ہو سکتی ہے یعنی براؤننگ بھی اقبال کی طرح امید، رجائیت، مجد و شرف انسانی، اور جد و جہد کا پیغام دیتا ہے۔ اس نے بلاشبہ انیسویں صدی کی تشکیک پسند دنیا کو واضح الفاظ میں یقین محکم کا درس دیا ہے۔

راقم الحروف نے اپنی کالج لائف میں اس کی ایک مشہور نظم ربی ابن عذرا پڑھی تھی۔ اس میں اس نے رمزیہ انداز میں دنیا کو ایمان، یقین، عمل اور جد و جہد کا پیغام دیا ہے۔ اس نظم کا یہ بند راقم الحروف کو اس قدر پسند آیا کہ ۱۹۱۶ء سے اب تک دل پر نقش ہے اور اس بند کی خصوصیت یہ ہے

کہ اس میں اس کے پیغام کا بنیادی تصور پوشیدہ ہے۔

"جب یہ یقینی بات ہے کہ خدا نے ہمارے اندر مشکلات پر غالب آنے کی صلاحیت ودیعت کر دی ہے۔ تو ہمیں ہر ناکامی اور شکست کو خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ یعنی ناکامی اور شکست سے مطلق دل برداشتہ یا مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ شکست ہی وہ طاقت ہے جو ہماری زندگی کو حوصلہ سے لبریز کر دیتی ہے۔ اور ہمیں یہ حکم دیتی ہے کہ نہ بیٹھو نہ کھڑے ہو بلکہ آگے بڑھو..... پس ہمیں لازم ہے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں"

جہاں تک میں نے براؤننگ کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ انگریزی شاعری میں سعیٔ پیہم اور جد وجہد کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کا لطف مسلسل جد وجہد میں مضمر ہے۔

پہلے الفاظ کی تشریح کرتا ہوں:۔

مے بے پشت بود بادۂ سرجوش زندگی

پشت بادہ ان لوازمات کو کہتے ہیں جن کو شراب کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، تاکہ سرور اور کیف میں اضافہ ہو جائے۔ مثلاً تلی ہوئی مچھلی۔

آب از خضر بگیرم۔ یہاں خضر زندگی کی نئی نئی شاہراہوں یا منزلوں کی تلاش کا نمائندہ (SYMBOL) ہے۔ چونکہ وہ ہر وقت صحرا نوردی میں مصروف رہتا ہے ؎

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل (بانگ درا)

اس لیے اقبال کے یہاں اس کے نظام افکار میں، خضر، سعیٔ پیہم یا مسلسل جد وجہد کا مظہر ہے۔ "آب از خضر گرفتن" یعنی خضر کی زندگی سے سبق حاصل کرنا۔ یا خضر کو اپنے لیے نمونہ بنانا۔ "ساغر" کنایہ ہے زندگی سے۔

اب شعر کا مطلب بیان کرتا ہوں:۔

براؤننگ کہتا ہے کہ میں خضر کی زندگی سے سبق حاصل کروں گا۔ اس کو نمونہ بناؤں گا۔ یعنی اس کی طرح جدوجہد اور سعیٔ پیہم (مقاصد آفرینی) کی بدولت اپنی زندگی کو پرکیف اور سرور انگیز بناؤں گا۔

نوٹ:۔ براؤننگ، ساغر زندگی میں آمیزش کا قائل ہے اور وہ آمیزش خارجی ہے ۱۲

(۲) **بائرن**۔ اس شاعر کی سوانح حیات تو قبل ازیں قلمبند کر چکا ہوں، اس جگہ اس کی شاعری پر تبصرہ کرتا ہوں:۔

بائرن کی شاعری یا اس کی خصوصیات کو تین لفظوں میں بیان کر سکتے ہیں:۔

(۱) جذبۂ بغاوت (ب) جذبۂ انانیت (جس کی سرحد تکبر سے مل گئی ہے)۔

(۳) زور کلام اور سوز و گداز (جس کی بنا اس کی عاشقانہ زندگی ہے)۔

بائرن کی زندگی اور اس کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ وہ باغیانہ فطرت لے کر آیا تھا، اسی لیے اس نے ہر پہلو سے زندگی کے خلاف بغاوت کی۔ اس نے اپنی سوسائٹی اور اس کی رسوم، آداب اور روایات کے خلاف بغاوت کی، اس نے مذہب، اخلاق اور کلیسائی نظام کے خلاف بغاوت کی، اور میرا یہ خیال ہے کہ شاید اقبال کو اس کی زندگی اور شاعری میں بغاوت کا یہ جذبہ ہی اس درجہ پسند آیا کہ انھوں نے اس پر ایک نظم بھی لکھی اور شاعروں کی اس منتخب مجلس میں بھی اس کو جگہ دی۔

اس کی زندگی کی دوسری خصوصیت اس کی انانیت ہے جس کی سرحدیں میری رائے میں تکبر اور خود بینی سے مل جاتی ہیں اور اس کی وجہ بلکہ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ساری عمر انگلستان، ہسپانیہ، اطالیہ اور یونان کی حسین ترین عورتوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ اسی جذبۂ انانیت کی بنا پر ایک دفعہ اس نے فخریہ انداز میں یہ بات کہی تھی کہ "انگلستان میں کوئی دولت مند یا نامور خاندان ایسا نہیں ہے جس میں میرا احسان شامل نہ ہو۔"

بہرحال اس کی پرائیویٹ زندگی کیسی ہی کیوں نہ ہو، اس کی شاعری میں یہ خصوصیات ضرور پائی جاتی ہیں۔ اور انہی خصوصیات کی بنا پر اس کے کلام کو انگلستان سے زیادہ، یورپ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس

جذبۂ انانیت ہی کی وجہ سے وہ یہ کہتا ہے کہ ع

از منتِ خضر نتواں کرد سینہ داغ

جس شخص میں انانیت (EGOTISM) کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کا احسان لینا گوارا نہیں کر سکتا۔

دوسرے مصرع میں "آب از جگر گرفتن" کنایہ ہے ذاتی جذبۂ بغاوت اور جذبۂ انانیت سے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ بائیرن کہتا ہے کہ میں اپنی زندگی کو پرکیف ضرور بنانا چاہتا ہوں لیکن غیر کا احسان گوارا نہیں ہے؎

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

اس لیے میں اپنے ہی جگر یعنی اپنی ہی شخصیت کے بعض نمایاں پہلوؤں مثلاً جذبۂ بغاوت اور جذبۂ انانیت سے اپنی زندگی کو پرکیف بناؤں گا میں سرور کا پہلو خود اپنی شخصیت کو اجاگر کر کے پیدا کروں گا۔ میں اپنی فطرت کے اقتضا پر عمل کروں گا (آب از جگر خویش بگیرم) اور اس عمل سے سرور کا عنصر اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔

نوٹ:۔ بائیرن بھی آمیزش کا قائل ہے لیکن بخلاف براؤننگ وہ کسی قسم کی خارجی آمیزش (بیرونی اثرات) کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اس کے یہاں بھی آمیزش ہے مگر داخلی ۱۲

(۳) غالبؔ:۔ ہندوستان کا یہ سب سے بڑا فلسفی شاعر[1] ۱۷۹۷ء میں بمقام اکبر آباد (ہندوستان) پیدا ہوا۔ جس کی آنکھوں نے اپنی حکومت تہذیب اور علم و فضل کے بے بہا سرمایہ کو بے دردی کے ساتھ تاراج ہوتے دیکھا جس نے اپنی زندگی کے ایام تڑپ تڑپ کر بسر کئے اور انگاروں

---

[1] فلسفی شاعر سے میری مراد وہ شاعر ہے جس نے اپنے کلام میں فلسفیانہ خیالات نظم کئے ہوں، اور شاعر فلسفی سے میری مراد وہ فلسفی ہے جس نے اپنے فلسفہ کو شعر کے لباس میں پیش کیا ہو۔ مثلاً گوئٹے، براؤننگ اور غالب فلسفی شاعر ہیں۔ اور اقبال شاعر فلسفی ہیں ۱۲

پر لوٹ لوٹ کر کاٹے جس کے لطیف احساسات نے اس پستی کے زمانہ میں ناقدری اور تملق پسندی کے ہاتھوں چرکوں پر چرکے کھائے"۔ ؎ جس نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک انگریزوں کی بربریت، وحشت، سفاکی، سنگدلی، بہیمیت اور حیرت دشمنی کا پورا ڈرامہ ازاول تا آخر بڑے غور سے دیکھا، جس نے بھوک سے تنگ آکر اور افلاس سے مجبور ہو کر انہی انگریزوں کی شان میں قصیدے لکھے، بالفاظِ دگر جو ع؎ سرِ کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

جس نے ۱۸۲۷ء سے ۱۸۶۷ء تک مسلسل تیس سال توقعات کی دنیا میں بسر کئے، جس نے ساری عمر گداگری کو انشا پردازی کے پردہ میں چھپایا اور ہر خط میں طلب کا نیا اسلوب، نیا انداز اور نیا پیرایہ اختیار کیا جس نے اس مفلسی کے باوجود "ظلِ سبحانی" سے یہ درخواست کی کہ "اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی کلیم کے کلام کے مقابلہ میں تول لیا جائے"

جس نے کمر و وفا کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کے احسانات کا بارِ گراں اٹھا کر ۱۸۶۹ء کو "قیدِ حیات و بندِ غم" دونوں سے بیک وقت رہائی پائی، اور اب اُجڑی ہوئی دلی میں آرمیدہ ہے۔

شعر کا مطلب بیان کرنے سے پہلے الفاظ کی تشریح قلمبند کرتا ہوں:۔

بادہ کنایہ ہے زندگی سے ⁂ تلخ تر کنایہ ہے، شدتِ سوز و گداز سے ⁂ سینہ کنایہ ہے ذاتِ شاعر یا اس کی شخصیت سے جو زندگی کی شیون مختلف کا مشاہدہ کر رہی ہے ⁂ آبگینہ کنایہ ہے قلب سے ⁂ اور ساغر کنایہ ہے زندگی سے ⁂

نوٹ:۔ واضح ہو کہ بادہ اور سینہ میں مغائرت حقیقی نہیں ہے۔ بلکہ اعتباری ہے۔ دراصل بادہ اور سینہ یا زندگی اور شخصیت

؎ یہ فقرہ مجتبیٰ پروفیسر سید شوکت سبزواری ایم، اے کی گراں بہا تالیف "فلسفۂ کلام غالب" سے ماخوذ ہے۔ غالب کے کلام پر اس سے بہتر تبصرہ اردو زبان میں آج تک شائع نہیں ہوا ہے ۱۲۔

ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ جس طرح انسان خود ہی عالم ہے، خود ہی معلوم ہے۔ یا مدرک کون ہے؟ نفس، مدرک کون ہے؟ نفس اور خود ادراک کیا ہے؟ وہی نفس، اسی طرح بادہ اور مینا یا آبگینہ اور ساغر میں جو مغائرت ہے، وہ محض اعتباری ہے ورنہ درحقیقت آبگینہ (قلب) اور ساغر (شخصیت یا زندگی) ایک ہی معنیٰ کی دو تعبیریں ہیں۔ زندگی قلب ہے، اور قلب زندگی ہے۔۱۲

غالب یہ کہتا ہے کہ لطفِ زندگی اس میں ہے کہ ہماری زندگی غمِ عشق سے تلخ تر ہوتی چلی جائے۔ دل مرکزِ عشق ہے، اس لیے اس کو پگھلا کر زندگی کے ساغر میں شامل کر دینا چاہیے یعنی غمِ عشق یا غمِ ہستی اختیار کر لینا چاہیے تاکہ زندگی سراپا سوز و گداز ہو جائے۔

دل کو پگھلا کر ساغر میں ڈال دو یعنی زندگی کو سوزِ عشق سے پر کیف بنا لو یا زندگی میں سوز و گداز کا عنصر شامل کر دو۔ واضح ہو کہ غالب زندگی کے ارتقائی سفر کو غمِ عشق یا غمِ ہستی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس لیے اس کی رائے میں زندگی کو پر کیف بنانے کی صورت صرف یہ ہے، کہ خود آبگینہ کو پگھلا دیا جائے۔ یعنی دل کو غمِ عشق کا مرکز بنا دیا جائے۔ اس غم سے جو دراصل "سوزِ دروں" کا دوسرا نام ہے، انسانی زندگی دلچسپیوں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ غالب کی نظر میں زندگی ایک اضطرابِ پیہم کا نام ہے، اور چونکہ یہ اضطراب صرف عشق سے پیدا ہو سکتا ہے اس لیے وہ زندگی (ساغر) میں سوزِ دروں (گدازِ آبگینہ) کا عنصر شامل کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) مرشد رومیؒ۔ آنجناب کی ولادت ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں بمقام بلخ ہوئی چند سال کے بعد اُن کے والد نے ترکِ وطن کر دیا ۱۲۱۳ء میں نیشاپور آئے حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ اور دعا دی۔ وہاں سے بغداد اور حرمین ہوتے ہوئے لارندہ پہنچے، وہاں سات سال قیام کیا۔ آخر الامر مولاناؒ نے قونیہ کو اپنا وطن بنا لیا اور

میں ۶۷۲ھ میں انتقال فرمایا۔

حضرت موصوف نے علوم ظاہری میں کمال حاصل کرنے کے بعد درس دینا شروع کیا لیکن شمس تبریزی کی صحبت نے مس خام کو کندن بنا دیا، اور آج ساری دنیا آنجنابؒ کو مرشد رومیؒ کے لقب سے یاد کرتی ہے ؎

من چہ گویم وصفِ آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

مولینا نے ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں دنیائے اسلام کو از سرِ نو اسلام کی رُوح سے آشنا کیا۔ مسلمان ایک عرصہ سے فلسفہ اور منطق کی وادیوں میں سرگرداں تھے۔ اور اس حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ

مولینا نے مسلمان کو بتایا کہ اسلام فلسفہ دانی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی اہلیت پیدا کرنے کا نام ہے :۔

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

اسی لیے اقبال نے "دید" کو مقصدِ حیات قرار دیا ہے ؎

گفت، دینِ عامیاں ؟ گفتم شنید
گفت، دینِ عارفاں ؟ گفتم کہ دید

اور اس دیدار کا طریقہ عشق ہے، اس لیے مرشد رُومیؒ نے دُنیا کو عشق کا پیغام دیا اور انہی کی تقلید اس زمانہ میں اقبال نے کی ہے۔

بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من

چونکہ اس شرح کے صفحات مولینا کے کمالات کی تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس لئے قلم روکتا ہوں اور شعر کا مطلب بیان کرتا ہوں :۔

کہ پاک اور کجا! یعنی زندگی اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں کسی قسم کی آمیزش

جائز نہیں ہے۔ دِ تاک، انگور کی بیل، شراب کی اصل، کنایہ ہے ذات باری تعالیٰ سے جو اصل و منبع حیات ہے ۔

مرشد رومیؒ فرماتے ہیں کہ حیات بذاتِ خود اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں کسی شے کی آمیزش مناسب نہیں ہے، زندگی بہت پاکیزہ شے ہے، اس لیے وہ صرف مبداء فیض (خدا) سے رابطہ پیدا کرنے کی بدولت پُرکیف بن سکتی ہے۔ لہٰذا تاک سے براہ راست شراب لے کر ساغر میں ڈالو یعنی خدا سے براہِ راست تعلق پیدا کرو۔

مولیٰنا کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک معشوقِ حقیقی سے براہ راست رابطہ پیدا نہ ہو، اس وقت تک دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ غالب بھی سوز و گداز کا طالب ہے۔ لیکن مولیٰنا اُس سے بلند تر ہو کر یہ فرماتے ہیں کہ جب تک دیدار نصیب نہ ہو۔ جب تک منبع حیات سے "ڈائرکٹ کنکشن" نہ ہو، اس وقت تک تمہارے اندر آبگینہ کو پگھلانے کی طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

تبصرہ:- براؤننگ، بائرن اور غالب یہ تینوں شاعر آمیزش کے قائل ہیں لیکن مرشد رومیؒ کسی قسم کی آمیزش پسند نہیں کرتے، ان کی تعلیم یہ ہے، کہ منبعِ حیات (خدا) سے براہِ راست تعلق پیدا کرو، اور اس کی مرضی پر چل کر اپنی زندگی کو خوشگوار بناؤ۔ زندگی میں حقیقی کیف و سرور اسی صورت سے پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی مرضی اور خدا کی مرضی میں ہم آہنگی پیدا کرے ۔

خراباتِ فرنگ

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ ۔۔۔ شوخ گفتاریِ رندے سخنم از دست ربود

گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے ۔۔۔ صحبتِ دخترکِ زہرہ وشے، نغمۂ رود

ایں خراباتِ فرنگ است و ز تاثیرِ مَیش ۔۔۔ آنچہ مذموم شمارند، نماید محمود

نیک و بد را بترازوے دگر سنجیدیم ۔۔۔ چشم [illegible] صافی و دُرد

[illegible] ۔۔۔ زشت خوب است [illegible]

[illegible] حیات ۔۔۔ ہر کہ اندازہ [illegible]

فاش گفتم تو اسرار نہاں از زیست
مجھے یاد نگاہم کہ بے پایاں نشود

تمہید اس دلکش طنزیہ نظم میں اقبال نے دول مغرب کی سیاست پر تنقید کی ہے اور بنیادی تصور اس نظم کا یہ ہے کہ یورپ کے ماہرین سیاست کا مذہب یا مسلک سراسر عیاری اور فریب کاری پر مبنی ہے۔ اور ان کی نظر میں طاقت، معیار حق و باطل ہے۔ یعنی ہر وہ فعل جس سے اقتدار میں اضافہ ہو محمود ہے۔ خواہ اخلاقی زاویہ نگاہ سے وہ فعل مذموم ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ فعل جس سے مملکت کو ضعف پہنچے مذموم ہے خواہ مذہب یا اخلاق کی رو سے وہ فعل محمود ہی کیوں نہ ہو۔

واضح ہو کہ یورپ میں اس ایسی سیاست کا بانی میکیاولی تھا جس نے مملکت کو انسانوں کا معبود بنا دیا۔ انیسویں صدی میں نیٹشے نے اسی نظریہ کی اشاعت کی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ "خواہش اقتدار" اس کے فلسفہ کا سنگ بنیاد ہے اور چونکہ وہ خدا کا قائل نہیں ہے اس لیے اسے اس بات کی مطلق پروا نہیں ہے کہ مذاہب یا اخلاق کی تعلیم کیا ہے۔

مطالب کہتے ہیں کہ کل مجھے مغرب کے ماہرین سیاست کی مجالس میں شرکت کا موقع ملا تو وہاں ایک ماہر سیاست (رند) کی کھری باتوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ (رند سے نیٹشے مراد ہے)

(۲) وہ کہنے لگا کہ اے اقبال! یہ کلیسا نہیں ہے جہاں تجھے دختران دلفریب کی صحبت اور نغمہ و سرور کی لذت نصیب ہو سکتی ہے۔

(۳) یہ تو رندوں (ارباب سیاست) کی محفل ہے اور یہاں کی تعلیم (شراب) کا اثر یہ ہے کہ جن باتوں کو کلیسا کے پیر مذموم سمجھتے ہیں، وہ یہاں محمود سمجھی جاتی ہیں۔ یعنی ارباب مذہب جن امور کو برا سمجھتے ہیں ارباب سیاست ان کو اچھا سمجھتے ہیں۔

(۴) "چشم داشتن ترازو" یعنی زیادتی پلہ ترازو بر پلہ دگر یعنی ترازو کے

ایک پلڑ کا ایک طرف جھک جانا۔ اس سے مراد ہے ترازو کا صحیح نہ ہونا۔ چونکہ اہل مذہب (یہود و نصاریٰ) کی ترازو صحیح نہیں ہے۔ (ارباب سیاست کی رائے میں مذہبی ضابطہ اخلاق صحیح نہیں ہے) اس لیے ہم نے خیر و شر کو وزن کرنے کے لیے دوسری ترازو بنائی ہے یعنی نیکی اور بدی کا نیا معیار واضح کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ

(۵) ہر وہ نیکی جو کمزور کر دے برائی ہے۔ اور ہر وہ برائی، جو تجھے طاقتور بنا دے اچھائی ہے۔ یعنی اقتدار، معیار خیر و شر ہے۔

(۶) اے اقبال! اگر تو غور کرے گا، تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ زندگی ریاکاری فریب اور مکاری کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے جو شخص راستبازی اور دیانت کی پیروی کرے گا۔ وہ تباہ اور برباد ہو جائے گا۔

(۷) چونکہ صدق و صفا یعنی راستی اور ایمانداری مکر و فریب کے لیے نقاب کا کام بہت اچھا دے سکتی ہے۔ (چونکہ راستی کے پردہ میں ریاکاری کو بآسانی چھپایا جا سکتا ہے)۔ اس لیے ہمارے پیر مغاں (مرشد) کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ (مس) پر سچائی (سیم) کا ملمع کر دو یعنی اپنے جھوٹ کو سچ کے پردہ میں چھپاؤ۔ یعنی مغربی سیاست ملمع سازی کا دوسرا نام ہے اور ہم لوگ اسی فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

(۸) اے اقبال! میں نے تجھ کو دنیا میں شاندار اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے تمام اسرار بتا دئے ہیں۔ لیکن تو ان کو کسی پر ظاہر مت کرنا۔ اگر تو نے ان حقائق عالیہ کو ایشیائی اقوام پر ظاہر کر دیا۔ تو پھر کامیابی ناممکن ہے۔

خطاب بہ انگلستان

مشرقی بادہ چشیدست ز مینائے فرنگ
عجبے نیست اگر توبۂ دیرینہ شکست

فنے کہ از دو آتشۂ تدبیر آموخت
جوشش زندگی او رنگ تصویر پرست

ساقیا گلہ ز مستی مستانہ مکن
خود تو انصاف بدہ این ہمہ ہنگامہ کہ بست؟

بوے گل خود بہ چمن راہنما شد ز نخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست

تمہید اس نظم کا مطلب سمجھنے کے لیے موجودہ صدی میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے واقفیت ناگزیر ہے۔ قصہ یہ ہے کہ

(۱) انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو دبانا، اور ہندوؤں کو ابھارنا شروع کیا۔

(۲) انہوں نے خود ہندوؤں کو حقوق طلبی کے طریقے سکھائے چنانچہ کانگریس کا سنگِ بنیاد ایک انگریز مسٹر ہیوم ہی نے اپنے پرتر ہاتھوں سے رکھا تھا۔

(۳) ۱۹۰۱ء میں یوپی کے لفٹیننٹ گورنر نے ہندوؤں کو ترغیب دی کہ اردو ہندی مناقشہ پیدا کریں۔

(۴) انگریزوں نے مختلف طریقوں سے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی مثلاً ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔

(۵) جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہندوؤں نے "ہوم رول" کا مطالبہ کیا۔ اس پر انگریزوں نے ۱۹۱۹ء میں اصلاحات کی دوسری قسط عنایت فرمائی۔ لیکن ہندو اس کھلونے سے مطمئن نہیں ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو ساتھ ملا کر کل ہند پیمانہ ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ جس کا سلسلہ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ اقبال نے یہ نظم ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی۔ اس وقت تمام ملک میں ہنگامے برپا ہو رہے تھے۔

اقبالؔ نے اس نظم میں انگریزوں سے یہ بات کہی ہے اور بالکل بجا کہی ہے کہ جب تم نے خود ہندوؤں کو حقوق، مراعات، اصلاحات بائیکاٹ، ریزولیوشن، مطالبات، ایجی ٹیشن، ہنگامہ آرائی، جلسے، جلوس اور نعرے سکھائے ہیں تو اب ان باتوں پر خفگی لینی چہ! ع

خود تو انصاف بدہ ایں ہمہ ہنگامہ کہ بست

نظم کا مطلب مشرق کنایہ ہے ہندوستان کے باشندوں سے ؛ بادہ کنایہ ہے جذبۂ آزادی سے ؛ مینائے فرنگ کنایہ ہے انگریزی سیاست سے ؛ توبہ شکستن کنایہ ہے طلب آزادی سے؛

کہتے ہیں کہ چونکہ ہندیوں کو انگریزوں نے مغربی سیاست کے اور طریقے سکھا دیئے ہیں۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اگر وہ اب آزادی کے طلب گار نظر آتے ہیں۔

(۲) فکر نوزادہ کنایہ ہے سیاسی شعور یا بیداری سے اجو ہندوؤں میں انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئی ٭ شیوۂ تدبیر کنایہ ہے، حقوق طلبی کے مختلف طریقوں سے ٭ بندۂ تقدیر پرست، کنایہ ہے باشندگان ہندوستان سے جو تقدیر پرستی کے لیے چار وانگ عالم میں مشہور ہیں۔ اور جب تک جہالت کا عفریت ان پر مسلط رہے گا اسی ذہنی پستی میں مبتلا رہیں گے ٭

مطلب یہ ہے کہ اس شعور کی بدولت ہندیوں میں حصول آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

(۳) ساقیا کنایہ ہے انگریزوں سے ٭ تنگدل کنایہ ہے ۱۹۱۹ء کے مارشل لا، اور ۱۹۲۱ء کے تشدد آمیز رویے سے ٭ شورش مستاں، کنایہ ہے ہندوؤں اور علی الخصوص مسلمانوں کی ہنگامہ آرائیوں سے لہ

لہ مسٹر گاندھی چونکہ غیر معمولی ذہانت اور دور اندیشی کے مالک تھے اس لیے انہوں نے کمال چابکدستی سے کام لے کر بطل حریت مولانا محمد علی جنت آشیانی کو اپنا امام بنا لیا تھا۔ انہوں نے مسٹر موصوف کی توقعات کے مطابق دو ہی سال میں سارے ہندوستان میں آگ لگا دی چنانچہ سر ویلنٹائن شرل اپنی کتاب "ہندوستان کی بے چینی" میں لکھتا ہے کہ "مسلمانان ہند کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری علی برادران (محمد علی اور شوکت علی) پر ہے جنہوں نے کانگریس میں داخل ہو کر امن پسند ہندوؤں کے اندر شورش اور جسارت کے جذبات پیدا کیے حتیٰ کہ مسلمان سپاہیوں اور فوجیوں کو ملک معظم کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔" واضح ہو کہ امن پسند ہندوؤں کو باغی بنانے کیلئے ہی مسٹر گاندھی نے علی برادران کو اپنا امام بنایا تھا؟!

اقبال انگریزوں سے کہتے ہیں کہ حقوق طلبی کے یہ طریقے تمہارے ہی تو سکھائے ہوئے ہیں۔ پھر اب تم کیوں چیں بجبیں ہو رہے ہو؟ یہ شعر حاصل نظم ہے۔ اسی بات کے اظہار کے لیے انہوں نے یہ نظم لکھی ہے اور آخری شعر اپنے مدعا کی تائید میں نقل کیا ہے کہ خود بوئے گل نے بلبل کی رہنمائی باغ کی طرف کی، ورنہ اس بیچاری کو کیا خبر تھی کہ دنیا میں باغ بھی کوئی شئے ہے؟ بوئے گل کنایہ ہے انگریزوں کی تعلیم سے ؛ چمن کنایہ ہے آزادی سے ؛ بلبل کنایہ ہے ہندی سے ؛ گلزار کنایہ ہے آزادی سے ؛

یعنی انگریزوں نے خود ہندوؤں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کی ورنہ ان کے دماغ میں حصول آزادی (سوراجیہ) کا تصور کبھی ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا تھا وہ تو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کرتے چلے آرہے تھے۔

قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگ ارغنون کلیسا از آن تو
نخلے کہ شہ خراج برو مے نہد ز من — باغ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آن تو
تلخابۂ کہ درد سر آرد از آن من — صہبائے پاک آدم و حوا از آن تو
مرغابی و تذرو و کبوتر از آن من — ظل ہما و شہپر عنقا از آن تو

این خاک و آنچہ در شکم او از آن من
وز خاک تا بہ عرش معلیٰ از آن تو

تمہید اس نظم میں جس کا ہر شعر طنز کی تصویر ہے، اقبال نے سرمایہ دار کی ذہنیت کو عریاں کیا ہے۔ اقبال نے ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک یعنی تا دمِ وفات، سرمایہ داری کے خلاف پوری قوت کے ساتھ احتجاج کیا۔ اور اگرچہ اس ناپاک اور ملعون نظامِ زندگی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کوئی تحریک قائم نہیں کی۔ لیکن آئندہ اس قسم کی تحریکوں کی کامیابی کے لیے بنیادیں استوار کر دی ہیں۔

مطلب سرمایہ دار، مزدور سے کہتا ہے کہ اے بھائی! آؤ ہم تم اسباب معیشت کی منصفانہ طریق پر تقسیم کرلیں تاکہ کسی کو شکایت کا موقع باقی نہ رہے۔

(۱) فولاد اور لوہے کے تمام کارخانے میری ملکیت ہیں، کلیسا کے تمام نغمے اور گیت تیری ملکیت ہیں۔

(۲) دنیا کے تمام باغات اور کھیت؛ درخت میری ملکیت ہیں، جنت کے تمام باغات اور نہریں بلکہ حوریں بھی تیری ملکیت ہیں۔

(۳) شراب جس سے دردِ سر پیدا ہوتا ہے، میری ملکیت ہے۔ پانی جو آدم اور حوا کا مرغوب شربت ہے تیری ملکیت ہے۔

(۴) مرغابیاں، بٹیریں، تیتر، چکوریں اور کبوتر میری ملکیت ہیں، ہُما کا سایہ اور عنقا کا پَر اور ققنس کی دُم یہ تیری ملکیت ہے۔

واضح ہو کہ ہُما، عنقا، ققنس اور سیمرغ سب فرضی پرندے ہیں، جن کا خارج میں کہیں وجود نہیں ہے۔

(۵) خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ دھرتی ماتا اور جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے (کوئلہ، لوہا، پتھر، جواہرات، سونا، چاندی، تیل، پٹرول وغیرہ) یہ سب میری ملکیت ہے، اور زمین سے لے کر آسمان، بلکہ عرش بریں تک ساری کائنات تیری ملکیت ہے۔

سرمایہ دار کی فیاضی داد طلب ہے کہ اس نے صرف زمین کو اپنی ملکیت بنانے پر قناعت کی ہے۔ اور ساری کائنات جس میں جنت بھی شامل ہے مزدور کے حوالے کردی ہے۔

نوائے مزدور

زمزدِ بندۂ کرپاس پوش محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
ز خوئے فشانیٔ من لعلِ خاتمِ والی
ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر

زغوغائے من چو زُنّار بہی کلیسا را
بزور بازوئے من دست سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشک گلستاں ز گریۂ سحرم
شباب لالہ و گل از طراوت جگرم
بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگ ساز
مئے کہ شیشہ گدازد بساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تاکے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

تمہید اس ولولہ انگیز نظم میں اقبال نے مزدور طبقہ کے جذبات کی ترجمانی جس خلوص کے ساتھ کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ان کے دل میں اس مظلوم طبقہ کی حمایت کا نہایت شدید جذبہ موجزن تھا۔ ایک بڑے سے بڑا اشتراکی بھی اس سے بڑھ کر مزدوروں کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک مزدور طبقہ کی حمایت اور مزدوری کی عزت کا سوال ہے، دینِ اسلام اشتراکیت سے بکلی ہم آہنگ ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

الکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہ۔

یعنی مزدور اللہ کا دوست ہے

نیز آپ کا ارشاد ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کے پسینہ کے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ اگر مسلمانانِ عالم، قرآن حکیم کی تعلیمات پر عامل ہو کر ملوکیت، سرمایہ داری، اکتناز، احتکار، جاگیر داری اور زمینداری کو ختم کردیں۔ (اسلام میں نہ کسی بادشاہ کی گنجائش ہے نہ کسی سرمایہ داری کی) تو یہ صدی ختم نہیں ہوگی کہ سارا روس مسلمان ہو جائے گا۔ اور جب روس مسلمان ہو جائے گا تو امریکہ اور انگلستان کا مسلمان ہو جانا

کوئی مشکل نہیں ہے۔

پہلا بند | اس بند میں مزدور یہ کہتا ہے کہ دنیا میں جس قدر شان و شوکت کے آثار نظر آتے ہیں، یہ سب میری محنت اور مشقت کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً

(۱) مزدور، خود تو ٹاٹ پہنتا ہے، لیکن اسی کی جفاکشی کی بدولت "خواجہ" جو مطلق ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا، ریشم اور حریر کا لباس پہنتا ہے۔

(۲) مزدور نہایت مشقت کے ساتھ کان کھودتا ہے تو "نواب صاحبان" اپنے ہاتھوں میں لعل اور یاقوت، نیلم اور الماس کی انگوٹھیاں پہن کر دالان میں جاتے ہیں اور جشن برپا کرتے ہیں۔ نیز مزدور ہی کی محنت کا یہ ثمرہ ہے کہ دولت مند حضرات گھوڑوں پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے باہر نکلتے ہیں۔

(۳) مزدور کہتا ہے کہ کلیسا کے عہدیدار میرا ہی خون چوس چوس کر اس قدر فربہ ہوتے ہیں۔ اور میرے ہی زورِ بازو کی بدولت ملوکیت کو یہ اقتدار حاصل ہوا ہے۔

(۴) میرے آنسوؤں سے یعنی میری محنت سے ویران اور بنجر زمین، رشکِ گلستان بن گئی ہے اور میری ہی جفاکشی کی بدولت امراء، اور سرمایہ دار (لالہ و گل) کے چہرے پر رونق نظر آ رہی ہے۔

دوسرا بند | اس بند میں مزدور تمام دنیا کے مزدوروں کو دعوتِ اتحاد اور پیغامِ عمل دیتا ہے۔ (نوائے تازہ، کنایہ ہے، اشتراکیت سے)۔

(۱) اے مزدور! آؤ دوستو! سازِ کائنات سے نیا نغمہ نکل رہا ہے! یعنی اشتراکیت کا نظام دنیا میں قائم ہو رہا ہے، اس نظام کو مضبوط بناؤ۔

آؤ ہم اشتراکیت قبول کر لیں، تاکہ سرمایہ داری اور ملوکیت دونوں کا خاتمہ کر سکیں۔

مئے کنایہ ہے اشتراکیت سے ٭ شیشہ کنایہ ہے ملوکیت سے ٭

در ساغر انداختن کنایہ ہے اشتراکی اصولوں کو تسلیم کر لینے سے ٭

(۲) اے مزدور! آؤ ہم دنیا میں وہ نظامِ حیات رائج کریں جس میں ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات حاصل ہو سکیں، اور اس نظام کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم نظامِ کہن (ملوکیت) کا دنیا سے خاتمہ کریں۔ (یہ وہ نقطہ ہے جہاں آکر اسلام اور اشتراکیت دونوں مل جاتے ہیں، اور اسی لیے اقبال نے مزدور کی حمایت کی ہے)۔

(۳) آؤ! اب موقع ہے کہ ہم بادشاہوں اور سرمایہ داروں (رہزنانِ چمن) سے انتقام لیں، اور ان کا خاتمہ کر کے دنیا میں (بزمِ غنچہ و گل میں) نیا نظام قائم کریں۔

(۴) اے مزدورو! تم کب تک دنیا میں سرمایہ داروں کی غلامی کرتے رہو گے؟ اور تم کب تک اپنی حقیقت سے غافل رہو گے؟ تم کب تک پروانوں کی طرح شمع کا طواف کرتے رہو گے؟

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے\
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے\
کرمکِ ناداں! طوافِ شمع سے آزاد ہو!\
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو! [۱]

آزادیٔ بحر

بطے می گفت بحر آزاد گردید\
چنیں فرماں ز دیوانِ خضر رفت\
نہنگے گفت رَو ہر جا کہ خواہی\
ولے از ما نباید بے خبر رفت

---

[۱] اقبال نے پیامِ مشرق اور بانگِ درا کی یہ نظمیں ۱۹۲۲ء میں لکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کا اندازِ بیان بالکل یکساں ہے۔ ۱۲

تمہید اقبال نے اس مختصر ترین نظم میں موجودہ زمانہ کی آزادی کی تصویر کھینچی ہے کہ مغربی سیاست چونکہ سراسر ملمع سازی اور عیاری ہے، اس لیے آزادی حاصل ہوجانے کے بعد کمزور افراد بدستور طاقتور افراد کے غلام رہتے ہیں دنیا کو حقیقی آزادی صرف دین اسلام کی بدولت حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ اس کے قائم کردہ نظام میں امیر قوم، قوم کا خادم ہوتا ہے نہ کہ مخدوم اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مجلس آئین ساز یعنی انسانوں کے بجائے تبارک وتعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اندریں حالات اس کی حکومت ننگوں کو ضعفا پر ظلم وستم کرنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟

مطلب ایک کمزور آدمی (ربط) نے یہ کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ملک آزاد ہوگیا۔ یا ہمیں آزادی حاصل ہوگئی۔ یہ سن کر ایک طاقتور آدمی یعنی سرمایہ دار (ننگ) نے یہ کہا کہ ہاں آزادی تو حاصل ہوگئی ہے مگر ہم سے یعنی ہمارے اثر اور رسوخ سے غافل مت ہوجانا۔ مطلب یہ ہے کہ جمہوری حکومت میں عوام بظاہر آزاد ہوتے ہیں لیکن بباطن سرمایہ داروں اور زمینداروں کے غلام ہوتے ہیں۔

اگر کسی کو شک ہو تو کچھ دنوں کسی گاؤں میں قیام کرے، انشاءاللہ تھوڑے ہی دنوں میں آزادی کی حقیقت آشکار ہوجائے گی۔

حصۂ پنجم

خضر راہ

می خورد ہر ذرۂ ما پیچ و تاب
محشرے در ہر دم ما مضمر است
با سکندر خضر در ظلمات گفت
مرگ مشکل زندگی مشکل تر است

تمہید اُردو کثیر المعانی لفظ ہے۔ اقبال نے اسے نکتہ یا باریک بات کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اس حصّہ میں جس قدر اشعار انہوں نے درج کئے ہیں، ان سب میں انہوں نے کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور بیان کیا ہے۔ ذیل میں علی الترتیب ان کی تشریح بیان کرتا ہوں:۔

دُردانه اوانشاں یہ پیاست
از گردشیں ہے پیاچہ اند

سکندر سے طالب زندگی اور خضر سے دانائے رموزِ زندگی مراد ہے اور زندگی سے کامیاب زندگی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے حیوانوں کی سی بے مقصد زندگی بسر کرنی تو آسان ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا کوئی مقصد معین کرتا ہے تو اس مقصد کا حصول بہت دشوار ہے کیونکہ دنیا میں ہر وقت ایسے حالات رُونما ہوتے رہتے ہیں جو حصولِ مقصد کو دشوار بنا دیتے ہیں۔ چوتھے مصرع میں اقبال نے لفظ مشکل دو جگہ استعمال کیا ہے۔ لیکن دونوں جگہ مفہوم مختلف ہے مرگ مشکل است۔ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ آدمی بہت مشکل سے مرنے پر راضی ہو سکتا ہے۔ حتی المقدور موت کو رفع کرتا ہے۔ مرتا تو ہے مگر بڑی مشکل سے۔ یعنی اس وقت مرتا ہے جب زندگی کی کوئی صورت اس کے اختیار میں نہیں رہتی۔

زندگی مشکل تر است۔ یہاں مشکل سے مراد یہ ہے اور اسی میں ان کا بنیادی تصور پوشیدہ ہے کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنا یا کامیاب زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے انسان کو ہر قدم پر دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ چوتھا مصرع اس قطعہ کی جان ہے جس میں وہ یہی بتانا چاہتے ہیں کہ کامیابی بہت مشکل سے حاصل ہوتی ہے، اس مصرع کی خوبی اس کے اندازِ بیان میں مضمر ہے۔

گلگ رانالہ از تہی مغزی است
قلم سر مہ دار صریرے نیست

اس فرد کا مطلب یہ ہے کہ موتی بھی اگرچہ ایک دانہ ہی ہے۔ لیکن اس کی ساری زندگی سمندر میں گذری ہے، اس لیے وہ دانہ کی مصیبت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو چکی کے پاٹ میں پس کر سرمہ ہو جاتا ہے۔ یعنی دولت مند انسان بھی بظاہر انسان ہی ہے۔ مگر اس کی زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوتی ہے اس لیے وہ مفلس انسان کی مصیبتوں کا اندازہ نہیں کر سکتا جو نانِ شبینہ کے لیے صبح سے شام تک محنت کرتا رہتا ہے۔

منم کہ طوفِ حرم کردہ ام بتے بہ کنار
منم کہ پیشِ بتاں نعرہ ہائے ہُو زدہ ام
دلم ہنوز تقاضائے جستجو دارد
قدم بہ جادۂ باریک تر ز مُو زدہ ام

اس فرد میں حسن تعلیل ہے۔ کہتے ہیں کہ قلم چونکہ اندر سے خالی (تہی مغز) ہوتا ہے۔ اس لیے جب کاتب کی انگلیوں کی گرفت میں آتا ہے تو (نالہ) آواز پیدا کرتا ہے۔ لیکن پنسل چونکہ پُر مغز (اندر سے بھری ہوئی) ہوتی ہے اس لیے لکھنے کی مشقت خاموشی سے برداشت کرتی ہے۔

اس شعر میں "تہی مغز" کی ترکیب سے معنوی خوبی پیدا کی ہے۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) اندر سے خالی (۲) بیوقوف۔ یہ مدنظر رہے کہ قلم واسطی سے لکھتے وقت ایک آواز پیدا ہوتی ہے جسے صریرِ خامہ کہتے ہیں:-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اسی صریرِ خامہ کو اقبال نے "نالہ" سے تعبیر کر کے شعر میں لطف پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تکلیف کے وقت عقلمند آدمی خاموش رہتا ہے، لیکن تہی مغز (بیوقوف) نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔

گل گفت کہ عیشِ نوبہارے خوشتر
یک صبح چمن ز دوز گارے خوشتر
زاں پیش کہ کس تاج ابد ستانند
مردن بکنارِ شاخسارے خوشتر

اس قطعہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جادۂ جستجو، بال سے بھی زیادہ باریک ہے یعنی انسان کو اپنے مقصد کے حصول میں بہت دشواریاں لاحق ہوتی ہیں یا مقصد کا حصول بہت دشوار ہے۔

کہتے ہیں کہ مذہب کے ظاہری پہلو پر عمل کرنا تو بہت آسان ہے، مثلاً ایک انسان دنیاوی خواہشات کو اپنے دل میں چھپا کر کعبہ کا طواف کر سکتا ہے اور دل میں پوشیدہ طور پر بتوں سے محبت کرنے کے باوجود دنیا کے سامنے بتوں کی مذمت کر سکتا ہے وجہ یہ ہے کہ دنیا تو ظاہر بین ہے۔ اسے دل کا حال معلوم نہیں ہو سکتا لیکن مذہب کے باطنی پہلو پر عمل کرنا بہت دشوار ہے یعنی اگر دل میں خدا سے ملنے کی آرزو موجزن ہو جائے (جسے اقبال نے جستجو سے تعبیر کیا ہے) تو پھر انسان کو ہر قدم پر نفس امارہ سے جنگ کرنی پڑے گی اور یہ کام بہت مشکل ہے۔ یعنی مسلک عاشقی بال سے بھی زیادہ باریک ہے یعنی بہت دشوار ہے۔

سخن گو غنک در برنا و پیراست
سخن را سائے رہا ہے نباشد

بنیادی تصور اس رباعی کا یہ ہے کہ غلامی کی زندگی اختیار کرنے سے پہلے مر جانا بدرجہا بہتر ہے۔ اس نکتہ کو اقبال نے "گل" کی زبان سے بیان کیا ہے:۔

ایک گل نے دوسرے گل سے کہا کہ عیش نو بہار بہت خوش آیند ہوتا ہے اور جو زندگی چمن میں بسر ہو وہ بھی بہت خوش آیند ہوتی ہے۔ اس لیے میں تجھے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ قبل ازاں کہ کوئی شخص تجھے شاخ سے توڑ کر زیب دستار کرے، تو اس ذلت سے بچنے کے لیے موت کی تلخی گوارا کرے۔

گل سے مراد مومن ہے۔ عیش نو بہار سے حریت نفس مراد ہے جو اسلامی زندگی کا ثمرہ ہے۔ جمیع چمن سے اجتماعی زندگی مراد ہے۔ اور یہ نعمت بھی اسلامی زندگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ "زیب دستار" کنایہ ہے حالت غلامی سے جو اسلامی زندگی کی ضد ہے کنار شاخسار کنایہ ہے اسلامی زندگی سے۔

اقبال نے گل کے پردہ میں ایک حقیقی مسلمان کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ غلامی

پر موت کو ترجیح دیتا ہے کیونکہ غلامی اسلام کی ضد ہے۔

چشم را بینائی افزاید سہ چیز
سبزہ و آبِ روان و روئے خوش

مطلب یہ ہے کہ شاعری کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے، یہ ایک عطیہ الٰہی ہے۔ اس لیے ایک بچہ بھی اسی طرح شعر کہہ سکتا ہے اور کہتا ہے جس طرح ایک جوان یا بوڑھا آدمی۔ یعنی دُنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں جن کے لیے عمر، عقل، تجربہ اور تعلیم درکار ہے مگر سخن گوئی (شاعری) ان تمام قیود سے آزاد ہے۔ جس شخص میں شاعری کا ملکہ موجود ہوتا ہے، وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگتا ہے۔ مثلاً براؤننگ نے پہلی نظم چھ سال کی عمر میں لکھی تھی۔

کالبد را فربہی می آورد
جامۂ قزّ ا جان بے غم و بوئے خوش

کہتے ہیں کہ تین چیزیں بینائی کو قوت دیتی ہیں، سبزہ، آبِ رواں، اور روئے زیبا، اسی طرح جسم کو تین چیزیں فربہ کرتی ہیں، ریشمی لباس، فارغ البالی اور خوشبو۔

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگِ سبک داں مرگ را خوابِ گراں

مطلب یہ ہے کہ زندگی اور موت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ غور سے دیکھو تو خواب (نیند) موت ہی کی ایک ہلکی پھلکی صورت ہے اور موت کیا ہے؟ وہ نیند کی ایک شدید صورت ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں ضرب المثل ہے:۔

اَلنَّوْمُ اُخْتُ الْمَوْتِ۔ یعنی نیند، موت کی (چھوٹی) بہن ہے۔

طاقتِ عفو در تو نیست اگر
خیز و با دشمناں ولا پستیز
سینہ را کارگاہ کینہ مساز
سر کہ در انگبین خویش مریز

بنیادی تصور یہ ہے کہ کینہ (بغض وعناد) انسان کی سیرت کو اسی طرح فاسد کر دیتا ہے جس طرح سرکہ کی آمیزش سے شہد ناکارہ ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! مردانگی تو اس میں ہے کہ تو اپنے دشمنوں کو معاف کر دے۔ لیکن اگر تو عفو پر عامل نہیں ہو سکتا تو انتقام لے لے، یعنی اٹھ اور اپنے دشمنوں سے جنگ کر اور اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ یہ سب کچھ جائز ہے مگر تو اپنے سینہ کو کینہ کا مخزن مت بنا۔ کیونکہ اس سے تیری سیرت تباہ ہو جائے گی جس طرح سرکہ کی آمیزش سے شہد کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔

از نزاکت ہائے طبعِ نکتہ گیراں او مپرس
کز دمِ باد ے زجاجِ شاعرِ ما بشکند
کے تواند گفت شرحِ کار زار زندگی
"می پرد در نغمہ اش جامِ حباب چوں بدریا بشکند"

بنیادی تصور اس قطعہ کا یہ ہے کہ جو شاعر خود مصائب زندگی برداشت نہیں کر سکتا وہ اپنے کلام میں دنیا کو مردانگی (زندگی) کا پیغام نہیں دے سکتا۔

کہتے ہیں کہ ہندوستان کے شعرا کی نازک مزاجی کا عالم کچھ مت پوچھ! ہوا کا ایک جھونکا ان کی زندگی کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔

بھلا وہ شخص جس کا رنگ، شکستِ حباب سے فق ہو جائے۔ دنیا کو مردانگی کا کیا درس دے سکتا ہے؟ جو شخص بلبلہ کے ٹوٹنے سے لرزہ براندام ہو جائے کسی انسان کی موت کا حال کیا بیان کر سکتا ہے!

در جہاں مانند جوئے کوہسار	از نشیب و ہم فراز آگاہ شو
یا مثالِ سیل بے زنہار خیز	فارغ از پست و بلند راہ شو

اقبال نے اس قطعہ میں ہم کو یہ بتایا ہے کہ دنیا میں با عزت زندگی بسر کرنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ یا تو جوئے کوہسار (عام انسانوں) کی طرح

زندگی بسر کرو یعنی کبھی وہ ترقی اور سروری (فراز) کا لطف اٹھاتی ہے، کبھی تنزل اور محکومی (نشیب) کی تلخی چکھتی ہے۔ فراز کنایہ ہے عزت اور دولت سے نشیب کنایہ ہے ذلت اور افلاس سے۔ یا سیل بے زنہار (مرد مومن) کی طرح زندگی بسر کرو کہ وہ سارے امتیازات مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے سامنے پستی اور بلندی دونوں ایک ہو جاتی ہیں۔ یعنی ہم مومن کی زندگی کو سیل بے زنہار سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو مومن بن جاؤ اور جو سامنے آئے اُسے ہٹا دو، اور نہ ہٹے تو مٹا دو۔ اور ساری دنیا میں اصلاحی مساوات کا قانون نافذ کر دو۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر عقلمندی اس میں ہے کہ فراز کے ساتھ نشیب کو بھی برداشت کر لو۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ (۱) یا تو اپنے آپ کو دنیا کے سانچے میں ڈھال دو۔ مزے میں رہو گے[1] اور اگر یہ پسند نہ ہو تو (۲) دنیا کو اپنے (اسلام کے) سانچے میں ڈھال دو۔ زندہ ہو جاؤ گے۔ بس زندگی بسر کرنے کے یہ دو ہی طریقے ہیں۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہے اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے :۔

طبع بہم رساں کہ بسازی بعالمے ٭ یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

---

[1] اے کہ گل چیدی منال از نیش خار
خار ہم می روید از باد بہار

بنیادی تصور اس فرد میں یہ ہے کہ انسان کو راحت کے ساتھ ساتھ رنج کا خوگر بھی ہونا لازمی ہے کیونکہ رنج بھی زندگی ہی کی ایک شان ہے اور سیرت کی تشکیل و تکمیل کے لیے اسی قدر ضروری ہے جس قدر راحت، بلکہ میری رائے میں راحت سے دس گنا زیادہ ضروری ہے۔

اقبال نے اس نکتہ کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اے مخاطب! پھول توڑتے وقت اگر کانٹا چبھ جائے تو رنجیدہ کیوں ہوتا ہے! ارے نادان! کانٹا بھی تو اسی بہار نے پیدا کیا ہے جس نے یہ گل بوٹے بنائے ہیں یعنی دراصل دونوں ایک ہی حقیقت (زندگی) کے دو رُخ ہیں۔ چنانچہ خود حضرت اقبال کہتے ہیں :۔

بیروں از شاخ بینی خار و گل را ٭ درون او نہ گل پیدا نہ خار است

لیکن شعر زیر بحث میں اقبال نے یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ کانٹے کو راحت سمجھو

اُسے بھی اسی خدا نے پیدا کیا ہے جس نے گل اور لالہ کو پیدا کیا ہے۔
دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر راحت کے بعد مصیبت وارد ہو جائے، تو شکوہ مت کرو۔ یہ مصیبت بھی اسی خدا کی بھیجی ہوئی ہے جس نے قبل ازیں تمہیں راحت عطا کی تھی۔

مزن وسمہ بر ریش و ابروئے خویش
جوانی ز وزدیدن سال نیست

ظرافت کے اعتبار سے بہترین شعر ہے کہتے ہیں کہ اے انسان! خضاب لگا کر لوگوں کی نگاہ میں جوان بننے کی کوشش مت کر۔ اے نادان! کہیں عمر کم کر کے دکھانے سے جوانی واپس آ سکتی ہے! جوانی، سیاہ بالوں کا نام تو نہیں ہے۔ اس کا وجود "اعتدالِ عناصر" پر موقوف ہے۔ اگر صحت درست ہے تو ساٹھا بھی پاٹھا ہے یعنی ساٹھ سال کی عمر میں بھی ایک انسان بیس سال کے نوجوان کی سی طاقت رکھتا ہے، اور اگر صحت خراب ہو تو ایک انسان عالمِ شباب میں بوڑھا ہو جاتا ہے۔

ندارد کار با دون ہمتان عشق
تذرو مردہ را شاہین نگیرد

بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عشق ایک بلند ترین (اعلیٰ اور ارفع) جذبہ ہے۔ یہ جذبہ صرف اعلیٰ سیرت رکھنے والوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جس طرح شاہین زندہ پرندے کا شکار کرتا ہے، مردار نہیں کھاتا۔ اسی طرح عشق بھی شریف (زندہ) انسان کے دل کو شکار کرتا ہے۔ کمینہ (مردار) سے کوئی ربط نہیں پیدا کرتا۔ یعنی ذلیل فطرت انسان، عشق نہیں کر سکتا۔

نقدِ شاعر در خورِ بازار نیست
نان بسیم نسترن نتوان خرید

بنیادی تصور جو اس فرد میں پوشیدہ ہے یہ ہے کہ شاعری (آرٹ) سے

زندگی کے اہم بنیادی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ کشمکش حیات میں آرٹ کارآمد نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی میں اس کی جگہ بھی ہے۔ لیکن کامیابی کے بعد یعنی پہلے جدوجہد پھر کامیابی اس کے بعد آرٹ اور اس کا نتیجہ ؟ مناسب یہی ہے کہ ناظرین براہ راست فرانس کے فنکاروں اور پیرس کی دیواروں سے پوچھ لیں۔

کہتے ہیں کہ شاعر کا کلام یوں تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے بازار میں فروخت کرنا چاہیں تو کوئی ٹکے سیر بھی نہیں لیگا۔ بات یہ ہے کہ موتیا اور چنبیلی کے پھول نہایت حسین اور نہایت سفید (بالکل چاندی کی طرح) ہوتے ہیں، لیکن ان کے عوض کوئی نانبائی روٹی تو نہیں دے گا۔ روٹی خریدنے کیلئے اصل چاندی درکار ہے۔ بس یہی حال شعر کا ہے وہ بظاہر نہایت حسین، نہایت دلکش اور نہایت قیمتی معلوم ہوتا ہے لیکن کوئی شخص دیوان حافظ سے اپنی پیکارڈ[۱] کا تبادلہ نہیں کر سکتا۔

چہ خوش بودے اگر مرد نکو پے
ز بند پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

اس قطعہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کو اپنے بزرگوں یا اپنے اجداد کی کورانہ تقلید سے اجتناب کرنا چاہیئے کیونکہ اگر تقلید (آنکھ بند کر کے دوسروں کی پیروی کرنا) کوئی اچھی بات ہوتی یا اس میں کوئی خوبی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے آباؤ اجداد کی تقلید فرماتے لیکن حضور نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ہم مسلمانوں کو بھی کورانہ تقلید سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

---

[۱] پیکارڈ۔ ایک قیمتی موٹر کا نام ہے۔

maablib.org

اقبال / اقبالیات

افکارِ اقبال	علامہ اقبال مترجم: ڈاکٹر محمد ریاض
تاریخ تصوف	علامہ اقبال ڈاکٹر صابر کوری
روزگارِ فقیر (جلد اول و جلد دوم)	فقیر وحید الدین
داستانِ اقبال	آمنہ صدیقہ
علامہ اقبال اور دو ہزار سوالات	محمد کلیم ارائیں
بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صدیق جاوید
تنویرِ اقبال	ڈاکٹر عبد المغنی
حیاتِ اقبال کا سفر	پروفیسر ہارون الرشید تبسم
اقبال اور جدید دنیائے اسلام	ڈاکٹر معین الدین عقیل
اقبال جو اقبال ہے	پروفیسر ہارون الرشید تبسم
اقبال پیغمبرِ خودی	ڈاکٹر منظور ممتاز
نگارشاتِ اقبال	پروفیسر زیب النساء
روحِ اقبال	یوسف حسن خان
اقبال کامل	مولانا عبد السلام ندوی
باقیاتِ اقبال	مرتبہ عبد اللہ قریشی
بیت بازی اقبالیات	پروفیسر ہارون الرشید تبسم

ISBN 978-969-8980-69-6

مکتبہ تعمیرِ انسانیت

غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، پاکستان